شرح حدیث

جنود عقل وجہل

مؤسسه تنظیم ونشر آثار امام خمینیؒ
بین الاقوامی امور



شرح حدیث

جنود عقل وجہل

مؤسسہ تنظیم ونشر آثار امام خمینیؒ
بین الاقوامی امور

خمینی، روح‌الله، رهبر انقلاب و بنیانگذار جمهوری اسلامی ایران، ۱۲۷۹ـ ۱۳۶۸.
شرح حدیث جنود عقل و جهل. اردو / امام خمینی. تهران: مؤسسه تنظیم و نشر آثار امام خمینی(س)، ۲۰۰۳ م. = ۱۳۸۲. ۳۹۲ ص.
ISBN: 964 - 335 - 612 - 4
فهرستنویسی براساس اطلاعات فیپا.
اردو. کتابنامه : به صورت زیرنویس. ۱. احادیث خاص (جنود عقل و جهل) ـ نقد و تفسیر. الف. مؤسسه تنظیم و نشر آثار امام خمینی(س) ـ معاونت امور بین‌الملل. ب. عنوان.
۸ خ ۹۰۴۶۲۲ ج / ۱۴۵ BP ۲۹۷ / ۲۱۸
کتابخانه ملی ایران ۹۴۴۶ـ ۸۲ م
کد / م ۱۶۶۷



نام کتاب: شرح حدیث جنود عقل و جہل

از: حضرت امام خمینی (رضوان اللہ تعالیٰ علیہ)

ناشر: مؤسسہ تنظیم ونشر آثار امام خمینیؒ ـ بین الاقوامی امور

چھاپ: اول — ۲۰۰۳

پتہ: جمہوری اسلامی ایران

تہران خیابان شہید باہنر خیابان یاسر خیابان سودہ / ۵

پوسٹ کوڈ: ۱۹۷۷۶ پوسٹ بکس: ۱۹۵۷۵ـ۶۱۴

ٹیلی فون: ۵ـ۲۲۹۰۱۹۱ ـ ۲۲۸۳۱۳۸

فیکس: ۲۲۸۷۷۷۳

تعداد: ۳۰۰۰

قیمت: ۱۵۰۰۰ ریال

ایمیل: info@imam-khomeini.org

کتاب شرح حدیث جنود عقل وجهل به زبان اردو

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ ربّ العالمین و الصلاۃ علی رسول اللہ و آلہ الطاہرین

مقدمہ تحقیق:

کتاب شریف ''شرح حدیث جنود عقل وجہل'' ایک عرفانی اور اخلاقی کتاب ہے جو علمی عرفان، اسلامی فلسفے، اخلاق، شرح احادیث، معرفت انسان اور تفسیر کے بارے میں قیمتی اور گرانقدر مباحث کے ساتھ ساتھ اخلاقی نصائح اور مواعظ پر بھی مشتمل ہے۔ یہ شرح اپنی نوعیت کی بے نظیر کتابوں میں سے شمار ہوتی ہے جو عارف باللہ اور واصل بہ محبوب حق، حضرت روح اللہ الخمینی ؒ کے توانا قلم کا نتیجہ ہے۔

امام خمینی ؒ نے اپنے بلند علمی و عملی مقام ومنزلت کے ساتھ عقلی ونقلی علوم میں تبحر رکھتے ہوئے، فقہ اکبر (عرفانِ عملی) اور فقہ اصغر (شریعت) کے باہمی توشے سے استفادہ کرتے ہوئے ''جنودِ رحمٰن وشیطان'' جیسی نورانی حدیث کی شرح کی ہے گویا اس حدیث میں پنہان لطیف نکات کی تفسیر وتبیین کرنے میں امام خمینی ؒ عرفانی واخلاقی کتب کے دوسرے مصنفین اور شارحین سے سبقت لے گئے ہیں۔ انہوں نے اس کتاب میں ایک ایسی مقدس اور الٰہی روح پھونک دی ہے کہ جس سے سالک (راہ حق) کا قلب مطمئن ہو جاتا ہے اور وہ (اس راستے میں) پائیدار قدم اٹھا سکتا ہے۔

معصومین (علیہم السلام) کی نورانی احادیث کی شرح ایک عارف کامل اور تائید شدہ شخصیت کے ذریعے ہی ممکن ہے، چونکہ یہ احادیث ایسے بلند مرتبہ الٰہی معارف پر مشتمل ہیں کہ جو کشف تام محمدی ؐ اور ولایت علوی ؑ کی برکت سے خلائق عالم کو حقائق کے منکشف ہونے کیلئے القاء کی گئی ہیں۔ اسی لئے علمائے ربانی میں سے بہت کم ہی علماء کو اس اہم کام کو انجام دینے کی ہمّت ہوئی ہے اور وہ سالکین پر ان احادیث کے باطنی ابواب کو کھولنے کی جرأت کر سکے ہیں۔ کیونکہ ان ذوات مقدسہ کے کلمات قدسی کی بارگاہ میں عرفان نظری اور فلسفۂ الٰہی میں اجتہاد کے بغیر داخل ہونا ہر ایک کیلئے ممکن نہیں۔ اس کام کیلئے نتیجہ کلام کو سمجھنے

میں بہت زیادہ جدوجہد اور راہ محبوب میں جہاد کے علاوہ اس کے غیر سے مکمل طور پر بے اعتنا ہونے کی ضرورت ہے۔

اس کتاب کی اہمیت فقط مختلف علوم میں مؤلف کے تسلّط کی وجہ سے ہی نہیں، بلکہ امام خمینیؒ کا کروڑوں حق پرست انسانوں کی قیادت کرنا اور ان کا مربی ہونا بھی مؤلف کے صادق ہونے پر بہترین شاہد ہے۔ جس جوان نے صد سالہ راستے کو ایک رات میں طے کیا ہو اور انوار معارف جس کے قلب پر جلوہ گر ہوئے ہوں وہی صراط مستقیم کی واضح کسوٹی اور علم و عمل کا استاد بن سکتا ہے۔

ہمارا فریضہ ہے کہ ہم اس دُرّیگانہ کے افکار کی نشر واشاعت کیلئے کوشش کریں تا کہ امام خمینیؒ کے عرفانی افکار کے سلسلے میں اہم مقام ومنزلت کی حامل اس کتاب کو اسلام ناب محمدیؐ کے مشتاق لوگوں تک پہنچائیں جو مؤلف محترم کی آخری اخلاقی کتاب بھی شمار ہوتی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت سے اسلام ناب کی جانب، حضرت روح اللہ الخمینیؒ کی معرفت کے ساتھ ایک اور دریچہ کھل جاتا ہے۔

روش تحقیق:

۱۔ افسوس کے ساتھ گم ہو جانے کی وجہ سے اس کتاب کا اصلی نسخہ ادارے کے پاس موجود نہیں تھا۔ فقط حضرت امام خمینیؒ کے شاگردوں کے ہاتھ سے لکھے ہوئے دو نسخے موجود تھے۔ لہذا ابتدائی تحقیق انہی دو نسخوں کے ذریعے انجام پذیر ہوئی ہے۔ تحقیق کے دوران جمہوری اسلامی کی وزارت اطلاعات کی طرف سے کاپی شدہ نسخہ بھی مل گیا تھا۔ جس کی وجہ سے مزید تحقیقی کام کرنا پڑا اور اس نفیس کتاب کی اشاعت میں تاخیر بھی شاید اسی وجہ سے ہوئی ہے۔

۲۔ متن کتاب کا قلمی نسخوں کے ساتھ موازانہ انتہائی دقت کے ساتھ انجام پایا ہے۔ لہذا بہت سے موارد میں حتی مؤلف کے رسم الخط میں بھی امانت کی رعایت کی گئی ہے۔ متن کتاب کی طرف رجوع کرنے سے اس کے رسم الخط کہ جو تقریباً پچپن سال پہلے کا خط ہے اور موجودہ خط میں واضح فرق نظر آئے گا۔

۳۔ تصحیح اور نوک پلک درست کرنے کے دوران اس کتاب کے کلمات اور عبارات میں کسی قسم کا تصرف نہیں کیا گیا، بلکہ فقط علائم سجاوندی کے ذریعے قارئین کیلئے جملات کے فہم کو آسان بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگر متن کتاب میں کسی عنوان یا عبارت کا اضافہ کیا گیا ہے تو اسے بریکٹ ( ) کے درمیان لکھا

گیا ہے۔

۴۔ اس کتاب پر مختلف مناسبتوں سے بہت سے حواشی اور نوٹ بھی لکھے گئے ہیں تا کہ قارئین کیلئے اضافی معلومات بھی فراہم کی جائیں۔ بہت سے حواشی میں ایسے قارئین کیلئے توضیحات یا ثانوی منابع بھی لکھے گئے ہیں جو کتاب کے اصلی منابع وماٴخذ سے آگاہ نہیں ہیں۔

مؤسسہ تنظیم ونشر آثار حضرت امام خمینیؒ یہ گرانقدر کتاب، معارف الٰہی سے دلچسپی رکھنے والے افراد اور دانشوروں کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے امید کرتا ہے کہ وہ مستقبل قریب میں امام خمینیؒ کے عرفانی واخلاقی مکتب فکر اور اس کے دوسرے بلند پایہ عرفائے اسلام کی کتابوں کے ساتھ موازنے پر مبنی مزید تحقیقی کتابیں اور مقالات پیش کر سکے گا۔

مؤسسہ تنظیم ونشر آثار امام خمینیؒ

گروہ تحقیق

قم، اسلامی جمہوری ایران

پیش لفظ

الحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ العالَمِیْنَ وَصَلَّی اللّٰهُ عَلیٰ سَیِّدِنا مُحَمَّدٍ وَآلِهِ الطَّیِّبِیْنَ الطّاهِرِیْن
وَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلیٰ أعْدآئِهِمْ أجْمَعِیْن

خداوندا! عقل اور رحمانی لشکروں کو ہمارے دلوں میں موجود جہل اور شیطانی لشکروں پر غالب فرما۔ ہماری روح کی گہرائیوں میں اپنی معرفت کی بنیادوں کو استحکام بخش۔ اپنے علاوہ دوسروں سے ہماری امیدوں کو منقطع فرما۔ ہماری آنکھوں کو اپنی ذات اور اپنے معارف کے ذریعے منور فرما۔ ہمارے باطن کو شیطان اور اس کے لشکروں کے عمل دخل سے محفوظ اور اسے صرف اپنے قبضہ قدرت میں رکھ۔ ہمیں اپنی خصوصی عنایات اور مخصوص معارف کے ذریعے پہلے سے زیادہ قرب عطا کر۔ ہمیں اپنی محبت کا اسیر قرار دے اور ہمیں نوافل وفرائض کے ذریعے اپنی قربت[1] حاصل کرنے کی توفیق عطا فرما۔ محمد وآل محمدؑ کے عظیم المرتبت دامن سے ہمارے دست توسل کو محروم نہ فرما۔ ان کے مقدس نور کو ہمارا ساتھی بنا دے اور ہمیں ان کی شفاعت نصیب فرما۔ اِنَّکَ ذُوْ فَضْلٍ عَظِیْم۔

امابعد:

اہل بیت عصمت وطہارت (علیہم السلام) خلفائے رحمان اور بنی نوع انسان کا نچوڑ ہیں۔ ان کے کلام واحادیث میں وہ معنویت اور نورانیت ہے جو دیگر لوگوں کے کلام میں نظر نہیں آتی، کیونکہ ان کا کلام

۱۔ یہ اشارہ ہے اس حدیث قدسی کی طرف: ﴿... وَما تَقَرَّبَ اِلَيَّ عَبْدٌ بِشَيءٍ أحَبَّ اِلَيَّ مِمّا افْتَرَضْتُ عَلَيْهِ. وَاِنَّهُ لَيَتَقَرَّبَ اِلَيَّ بِالنّافِلَةِ حَتّیٰ أحِبَّهُ...﴾ کسی بندے نے میرا تقرب میری طرف سے واجب شدہ فرائض سے زیادہ کسی محبوب تر چیز سے حاصل نہیں کیا۔ وہ نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا ہے یہاں تک کہ میں اسے چاہنے لگتا ہوں۔
اصول کافی، ج۲، ص۲۶۳۔۲۶۲، کتاب الایمان والکفر، باب۱۴۵، حدیث ۸،۷۔

علم ربانی اور فیض سبحانی کے سرچشمے سے نازل شدہ ہے، نیز یہ علم خواہشات نفسانی اور نفس امارہ کے اثرات سے دور اور شیطان پلید کی خیانت سے محفوظ ہے۔ ان بزرگان دین اور اولیاء یقین کا معنوی نور اور ان کی روحانی پاکیزگی ان کے کلام میں جلوہ گر ہے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ کلام خداوندی کا نور ان کی احادیث میں جلوہ گر ہے۔ ﴿قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلىٰ شاكِلَتِه﴾۱ بنا بریں مؤمنین کو (جو ان کی باقی ماندہ طبیعت سے خلق۲ اور ان کی محبت کے پانی سے مخلوق ہوئے ہیں) ان احادیث شریفہ سے وہ روحانی جوش، وجد اور معنوی مسرتیں حاصل ہوتی ہیں جن کی تعریف ممکن نہیں، نیز ان احادیث کی برکت سے معصومین ؑ کی ارواح مقدسہ اور ان مؤمنین کے پاکیزہ قلوب کے درمیان معنوی رابطہ برقرار ہوتا ہے۔

قرآن کو آسمان سے لے کر زمین تک کھینچی ہوئی رسی۳ کہا گیا ہے۔ اس کی ایک وجہ بھی شاید یہی ہو کہ قرآن عالم قدس اور انسانی ارواح کے درمیان رابطے کی حیثیت رکھتا ہے۔

بنا بریں ہم معصومین (علیہم الصلاۃ والسلام) کے فرامین کو (جو عالم قدس سے منسلک ارواح اور حضرت انسان پر منتہی نفوس سے صادر ہوئے ہیں) بھی آسمان سے لے کر زمین تک پھیلی ہوئی رسی کے نام سے یاد کر سکتے ہیں، کیونکہ ہمارے ان بزرگان نے لوگوں کی ہدایت اور اصلاح کیلئے جو کچھ فرمایا ہے وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم لدنی سے مأخوذ ہے، جبکہ رسول ؐ وحی خداوندی اور علم ربانی کو بیان فرماتے تھے جو شیطان کی ایجاد کردہ قیاسات وایجادات سے محفوظ اور منزہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں: ﴿وَما يَنْطِقُ عَنِ الهَوىٰ ☆ اِنْ هُوَ اِلاّ وَحْيٌ

۱۔ کہہ دو کہ ہر کوئی اپنے طریقے پر چلتا ہے۔ سورۂ اسراء ۸۴۔

۲۔ اشارہ ہے اس حدیث نبوی ؐ کی طرف جس میں امیر المؤمنین ؑ سے فرمایا گیا ہے: ﴿... شِيعَتُکَ خُلِقُوا مِنْ فَضْلِ طِينَتِنا ...﴾ آپ کے شیعہ ہماری بچی ہوئی طینت سے خلق ہوئے ہیں۔

بحار الانوار، ج ۵۶، ص ۷، کتاب الایمان والکفر، باب ۱۵، ح ۱۔

۳۔ اشارہ ہے اس حدیث نبوی ؐ کی طرف: ﴿... كِتابُ اللهِ حَبْلٌ مَمْدُودٌ مِنَ السَّماءِ اِلَى الأَرْض ...﴾ اللہ کی کتاب ایک رسی ہے جو آسمان سے لے کر زمین تک پھیلی ہوئی ہے۔

بحار الانوار، ج ۲۳، ص ۱۰۸، کتاب الامامۃ، باب ۷، ح ۱۱، ۱۲۔

یُوحیٰ﴾ ۱ جو فرمان جاری کیا ہے وہ ائمہ معصومین ؑ پر بھی صادق آتا ہے۔ چنانچہ احادیث میں اس نکتے کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ ۲

پس اس حقیر نے یہ سوچا کہ اصول کافی میں موجود ''جنود عقل و جہل'' ۳ والی حدیث (جو اہم صفات حمیدہ وصفات رذیلہ کے بیان پر مشتمل ہے) کی بقدر ممکن اور مختصر تشریح کروں تا کہ شاید کسی مؤمن کو اس سے نفع حاصل ہو، نیز یہ امر خود اس بندۂ پر تقصیر کے عیوب و نقائص کو دور کرنے کا سبب بھی ہو۔

میں نے اس کتاب کو ایک تمہید، چند مقالوں (مضامین) اور ایک خاتمہ پر مشتمل قرار دیا ہے۔

۱۔ (رسول ؐ) نفسانی خواہشات کے تحت بات نہیں کرتا، بلکہ وہ جو کچھ کہتا ہے وہ نازل شدہ وحی ہے۔ سورۂ نجم ۳، ۴۔

۲۔ امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''میری حدیث میرے والد (امام باقر علیہ السلام) کی حدیث ہے، میرے والد کی حدیث میرے جدّ (امام سجاد علیہ السلام) کی حدیث ہے، میرے جدّ کی حدیث حسین علیہ السلام کی حدیث ہے، حسین ؑ کی حدیث حسن علیہ السلام کی حدیث، حسن ؑ کی حدیث امیر المؤمنین علیہ السلام کی حدیث، امیر المؤمنین ؑ کی حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے اور رسول اللہ ؐ کی حدیث اللہ کا کلام ہے۔ (اصول کافی، ج ۱، ص ۴۲، کتاب فضل العلم، باب ۱۵، ح ۱۴)۔

۳۔ اصول کافی، ج ۱، ص ۱۵، کتاب العقل والجہل، باب ۱، ح ۱۴۔

تمهید

واضح رہے کہ راقم کا ارادہ یہ نہیں ہے کہ وہ اس حدیث شریف کے علمی پہلوؤں پر بحث کرے جس کی درج ذیل وجوہات ہیں:

۱۔ اس سلسلے میں میری لیاقت و معلومات کی کمی۔

۲۔ یہ کہ اصول کافی شریف[۱] کے شارحین (جو صف اول کے علما، فضلا، محققین، قابل تقلید مفکّرین نیز علم و عرفان کے اساتید اور فلسفہ و عرفان کے ماہرین پر مشتمل ہیں) نے کسی اور کیلئے مزید گفتگو کی گنجائش نہیں رکھی ہے اور انہوں نے اپنے بعد والوں کیلئے کسی بھی موضوع پر تبصرہ کرنے کا موقع نہیں چھوڑا، ﴿جَزاهُمُ اللّٰهُ عَنِ الاِسْلامِ خَیْراً﴾ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا کرے۔

۳۔ یہ کہ علمی نکات سے صرف صاحبان علم و فضل ہی استفادہ کر سکتے ہیں اور عام لوگ ان سے محروم رہتے ہیں، جبکہ ہمارا مدنظر عمومی بلکہ عوامی استفادہ ہے۔

۴۔ چوتھی وجہ جو سب سے اہم ہے یہ ہے کہ ان احادیث کے بیان اور علوم الٰہیہ کی ترویج کا بنیادی مقصد علمی، فلسفی، تاریخی اور ادبی نکات کی وضاحت نہیں ہے، بلکہ اصل مقصد نفوس انسانی کو مادیات کے تاریک

۱۔ اصول کافی کی بہت ساری شرحیں اور حاشیئے لکھے گئے ہیں جن میں سب سے معروف درج ذیل ہیں:

۱۔ حکیم الٰہی میر داماد کا حاشیہ۔

۲۔ صدر الحکماء صدر الدین شیرازی المعروف ملاصدرا کا حاشیہ۔

۳۔ ملا محمد محسن فیض کاشانی کی شرح جو ''الوافی'' کے نام سے معروف ہے۔

۴۔ ملا محمد صالح مازندرانی کی شرح جو ''جامع الاصول'' کے نام سے معروف ہے۔

۵۔ علامہ محمد باقر مجلسی کی شرح ''مرآۃ العقول''۔

مزید معلومات کیلئے دیکھئے آغا بزرگ تہرانی ؒ کی تصنیف ''الذریعہ'' ج ۱۳، ص ۱۰۰، ۹۴۔

اور سنگین بوجھ سے آزاد کرنا اور ارواح کو غیب کی طرف متوجہ کرنا اور روح کے پرندے کو دنیوی درخت کی شاخ سے بے نیاز بنانا ہے جو شجرۂ خبیثہ کی اصل ہے، نیز اسے عالم قدس اور محفل انس (جو شجرۂ طیبہ کی روح ہے) کی فضاؤں میں محو پرواز کرنا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ مقصد اس وقت تک حاصل نہ ہوگا جب تک عقول کا تصفیہ اور نفوس کا تزکیہ عمل میں نہ آئے، نیز احوال کی اصلاح اور اعمال کو خالص بنانے کی کوشش نہ کی جائے۔ چنانچہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اصول کافی کی حدیث میں علم کو صرف تین چیزوں [۱] پر مشتمل قرار دیتے ہوئے پہلی قسم، یعنی علم عقائد کو ''محکم نشانی اور آیت'' کے نام سے یاد فرمایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علوم عقائد کو بھی اللہ کی نشانی ہونا چاہئے اور اس کا مقصد طلب حق اور محبوب حقیقی کی جستجو ہونا چاہئے، کیونکہ اگر علم عقائد کا کوئی عالم اپنی زندگی کو عقائد وکلام اور فلسفہ کے مختلف موضوعات کو سمجھنے پر صرف کرے لیکن یہ علم اللہ کی نشانیوں کی پہچان، حق کی تلاش اور حق پسندی سے عاری ہو تو یہ خود ایک حجاب (پردہ) بلکہ حجاب اکبر شمار ہوگا۔ یوں نہ اس کا علم، علم الٰہی ہوگا نہ اس کا فلسفہ، فلسفہ الٰہی، بلکہ علمی بحث وتمحیص اور بے شمار قیل وقال کے بعد مادیات کی طرف اس کی قلبی توجہ میں اضافہ ہوگا اور شجرۂ خبیثہ سے اس کا روحانی لگاؤ مستحکم ہوگا۔

انسان اس وقت حکیم الٰہی یا عالم ربانی وروحانی ہونے کا مرتبہ حاصل کرتا ہے جب اس کا علم الٰہی وربانی ہو۔ پس اگر وہ علم توحید وتجرید کی بحث تو کرے لیکن اس بحث کی بنیاد طلب حق اور خدا خواہی کے جذبے پر استوار نہ ہو، بلکہ خود علم وفن یا نفس اور اس کی خواہشات نے اسے علم وفن کے حصول پر راغب کیا ہو تو نہ اس کا علم خدا کی نشانی بن سکتا ہے اور نہ اس کی حکمت، حکمت الٰہیہ ہو سکتی ہے، بلکہ یہ نفسانی اور مادی ہوں گے۔ بنابریں میری نظر میں علما کے یہاں معروف یہ مقولہ درست نہیں کہ علم کی ایک قسم وہ ہے جو بذات خود مطلوب ہے۔ (یہ وہ علم ہے جو عملی علوم کے مقابلے میں شمار ہوتا ہے) [۲] بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر علم کسی مقصد کے

۱۔ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی حدیث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ﴿... إِنَّمَا العِلْمُ ثَلاثَةٌ: آيَةٌ مُحْكَمَةٌ، أَوْ فَرِيضَةٌ عَادِلَةٌ، أَوْ سُنَّةٌ قَائِمَةٌ، وَمَا خَلاهُنَّ فَهُوَ فَضْلٌ﴾۔ اصول کافی، ج۱، ص۲۴، کتاب العلم، باب۳، ح۱۔

۲۔ بظاہر یہ بات منطق شفا میں مذکور شیخ الرئیس بوعلی سینا کے اس قول کی طرف اشارہ ہے: ﴿والفلسفة النظرية انما الغاية فيها تكميل النفس بأن تعلم فقط﴾ یعنی، فلسفہ نظری کا واحد مقصد روح کی تکمیل ہے اس لحاظ سے کہ اسے علم حاصل ہو۔ دیکھئے الشفاء، ج۱، ص۱۲، حصہ منطق، مقالہ اول، فصل دوم۔

حصول کیلئے اور کسی خاص چیز کی تمہید ہوتا ہے۔ پس علم توحید اور علمی توحید دونوں توحید قلبی کے حصول کا ذریعہ ہیں۔

یاد رہے کہ قلبی توحید ہی عملی توحید ہے جو مسلسل کوشش، غور وفکر اور ریاضت سے حاصل ہوتی ہے۔ بہت سے لوگ توحید علمی کے حصول کیلئے زندگیاں صرف کرتے ہیں اور اپنے تمام اوقات کو مطالعہ ومباحثہ اور تعلیم وتعلّم میں گزار دیتے ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ توحید کے رنگ میں رنگے نہیں جاتے۔ یہ لوگ نہ عالم ربانی بنتے ہیں نہ حکیم ربانی۔ ان کا قلبی تزلزل دوسروں سے زیادہ ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے علم میں آیت اور نشانی بننے کی صلاحیت موجود نہیں ہوتی اور وہ قلبی ریاضتوں سے سروکار نہیں رکھتے جبکہ خیال کرتے ہیں کہ صرف پڑھنے پڑھانے سے ہی مقصد حاصل ہوتا ہے۔

عزیزو! تمام علوم شرعیہ معرفت خداوندی کے حصول اور حقیقت توحید کے ادراک کیلئے مقدمہ اور تمہید کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ ہے صبغۃ اللہ (اللہ کا رنگ) ﴿وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللهِ صِبْغَةً﴾[۱] البتہ ان امور میں سے بعض تمہید کی حیثیت رکھتے ہیں اور بعض دور کی، نیز ان میں سے بعض بلا واسطہ تمہید ہیں اور بعض بالواسطہ۔ علم فقہ کو ہی لیجئے کہ یہ عمل کی تمہید ہے اور عملی عبادات بھی بجائے خود دیگر معارف اور توحید وتجرید کے حصول تمہید ہیں بشرطیکہ یہ عبادات روحانی وجسمانی اور ظاہری وباطنی طور پر شرعی آداب کے مطابق بجالائی جائیں۔

اس بات سے انکار کی گنجائش نہیں کہ ہماری چالیس پچاس سالہ عبادات سے ہمیں ذرا بھر معارف وحقائق حاصل نہیں ہوئے، نیز ہمارے علوم کے ذریعے بھی کوئی خاص قلبی انقلاب اور کیفیت حاصل نہیں ہوسکی[۲] جبکہ یہی چیز اولیا (علیہم السلام) کیلئے آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔

ملکی نظام، گھریلو امور، تعمیر بلاد اور امور زندگی سے مربوط فقہی علوم بھی ان کاموں کی تمہید ہیں جو توحید اور معارف الٰہیہ کے حصول میں مکمّل دخیل ہیں اور ان کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ اسی طرح علم

۱۔ کس چیز کا رنگ اللہ کے رنگ سے بہتر ہے؟۔ سورۂ بقرہ ۱۳۸۔

۲۔ یہ خیال شیخ بہائیؒ کے اس شعر سے ماٴخوذ ہے:

علم رسمی سر بسر قیل است وقال — نی ازو کیفیتی حاصل نہ حال (دیکھئے کلیات اشعار شیخ بہائیؒ ص ۱۸۱)

اخلاق میں مذکور نجات بخش اور مہلک امور کا علم تہذیب وتزکیہ نفس کی تمہید ہے اور تزکیہ نفس خود تمہید ہے نفس کو مشاہدہ حق کا اہل بنانے اور معارف الٰہیہ کے حصول کی۔ یہ بات صاحبان معرفت کیلئے روز روشن کی طرح واضح ہے، البتہ منکرین اس کے ادراک سے قاصر ہی رہیں گے اگرچہ بقول لے: "مثنوی ہفتاد من کاغذ شود"۔[1]

ہم اپنے موضوع بحث سے کچھ دور نکل گئے اور لکھتے لکھتے ایک اور وادی میں پہنچ گئے جو نہایت عمیق ہے۔ ہمارا مقصود کلام یہ ہے کہ قرآن وحدیث کا ہدف عقول کو پاک وصاف کرنا اور تزکیہ نفس ہے تاکہ توحید کا بلندترین مقصد حاصل ہو سکے۔ احادیث شریفہ کے شارحین اور مفسرین قرآن کریم نے عام طور پر اس نہایت بنیادی نکتے پر توجہ نہیں دی ہے اور ان کے سرسری مطالعے پر اکتفا کیا ہے۔ انہوں نے ان موضوعات میں زیادہ تحقیق اور عمیق بحث کی ہے جو نزول قرآن اور بیان احادیث کا بنیادی ہدف ہرگز نہیں ہے۔ مثال کے طور پر ادبی، فلسفی، تاریخی اور اس قسم کے دیگر موضوعات۔ یہاں تک کہ علمائے اخلاق (جنہوں نے علم اخلاق کی بنیاد رکھی ہے، نیز علم اخلاق کا علمی اور فلسفی تجزیہ کیا ہے) کی علمی تالیفات بھی تہذیب اخلاق، تزکیہ نفس اور اصلاح باطن کے معاملے میں مکمّل طور پر نہ ہوتو کافی حد تک غیر مؤثر ہیں۔ مثال کے طور پر کتاب طہارۃ الاعراق[2] جو عظیم محقق ابن مسکویہ[3] کی تالیف ہے یا اخلاق ناصری[4] جو حکیم الٰہی، متبحر فلسفی، افضل

۱۔ مکمّل بیت کچھ اس طرح ہے:

گر بگویم شرح ایں بے حد شود — مثنوی ہفتاد من کاغذ شود

مثنوی معنوی، جلال الدین مولوی رومی، دفتر سوم، ص ۲۰۸ رمضانی، وص ۲۰۸ بیت نمبر۲، نکلسن۔

۲۔ طهارة الاعراق في تحصيل الاخلاق علم اخلاق پر ایک بے نظیر کتاب ہے۔ اس کے مصنف عالم ربانی، ابوعلی ابن مسکویہ رازی، متوفی ۴۲۱ ہجری ہیں۔ یہ کتاب تہذیب الاخلاق اور طہارۃ النفس کے نام سے بھی موسوم ہے۔ یہ ایران، مصر اور لبنان سے بھی کئی بار چھپ چکی ہے۔ (دیکھئے الذریعہ، ج ۱۵، ص ۱۸۸)۔

۳۔ احمد بن محمد بن یعقوب خازنؒ، جن کی کنیت ابوعلی ہے اور وہ ابن مسکویہ کے نام سے مشہور ہیں، شہر رے میں پیدا ہوئے۔ زندگی کے آخری ایام تک اصفہان میں رہے۔ ان کا شمار نامی علما و فلاسفہ میں ہوتا ہے۔ وہ شیخ الرئیس ابوعلی سینا کے معاصر تھے اور عضد الدولہ کے خواص میں شامل تھے۔ فلسفہ، اخلاق اور تاریخ میں ان کی کئی تالیفات ہیں جن میں طہارۃ الاعراق سب سے زیادہ معروف ہے۔ (دیکھئے الکنیٰ الالقاب، تالیف شیخ عباس قمی، ج ۱، ص ۳۲۵)۔

۴۔ اخلاق ناصری، علم اخلاق کی فارسی کتاب ہے۔ اس کے مؤلف محقّق و فلسفی، خواجہ نصیر الدین طوسیؒ، متوفی ۶۷۲ ہجری ہیں۔ یہ کتاب گویا ابن مسکویہ کی کتاب طہارۃ الاعراق کی شرح ہے۔ البتہ اس میں دو مقالات کا اضافہ ہوا ہے جن -->

المتأخرین نصیر الملۃ والدین خواجہ نصیر الدین طوسی (قدس سرہ) ۱ کی تالیف ہے، نیز احیاء العلوم ۲ جو غزالی ۳ کی تالیف ہے کہ بہت سارے موارد وغیرہ۔ ان کتب اور مباحث کو ہم تاریخ اخلاق کہہ سکتے ہیں جو قصص وحکایات اور امثال وواقعات پر مشتمل ہے۔ ان چیزوں کا مطالعہ انسان کو اس کے اصلی ہدف اور مقصد سے ہٹانے کا باعث بنتا ہے۔ غزالی کی کتاب احیاء العلوم کو تمام علما مدح وتحسین کی نظر سے دیکھتے اور یاد کرتے ہیں، نیز اسے علم اخلاق میں حرف اول وآخر سمجھتے ہیں ۴ لیکن میری نظر میں یہ کتاب اخلاق کی اصلاح کرنے، خرابیوں کا خاتمہ کرنے اور باطن کو سنوارنے کے معاملے میں مفید ومددگار نہیں ہے، بلکہ خود ساختہ مباحث کی کثرت، علمی وغیر علمی موضوعات کی زیادتی، نیز سچے اور جھوٹے نکات کا بے جا

<- کے نام ''تدبیر منزل'' اور ''سیاست مدن'' ہیں۔ محقق طوسی نے یہ کتاب امیر ناصر الدین عبدالرحیم کے نام زندان قہستان میں لکھی۔ یہ کتاب تین ابواب اور تین فصلوں پر مشتمل ہے۔ (دیکھیے الذریعہ، ج ۱، ص ۳۸۰)۔

۱۔ محمد بن محمد بن حسن المعروف ''خواجہ نصیر الدین طوسی''، علم وحکمت اور ریاضی کے جیّد عالم تھے۔ بہت سے علما اور بزرگان دین نے ان کی تعریف کی ہے۔ وہ گیارہ جمادی الثانی ۵۹۷ھ کو طوس میں پیدا ہوئے اور بروز عید غدیر ۶۷۲ کو ان کی وفات ہوئی اور کاظمین میں دفن ہوئے۔

مختلف علوم وفنون، مثلاً فلسفہ، کلام، ریاضیات، علم ہیئت، نجوم اور اخلاق وغیرہ میں ان کی بے شمار تالیفات ہیں جن میں سب سے معروف، شرح الاشارات، تجرید الاعتقاد، تحریر اقلیدس، اخلاق ناصری اور اوصاف الاشراف ہیں۔

(دیکھیے الکنیٰ والالقاب، ج ۳، ص ۲۵۱)۔

۲۔ احیاء علوم الدین، اخلاق اسلامی کے موضوع پر شیخ ابو حامد محمد غزالیؒ کی کتاب ہے۔ وہ ۴۵۰ ہجری میں متولد ہوئے اور ۵۰۵ یا ۵۰۷ھ میں راہی ملک بقا ہوئے۔ یہ کتاب علم اخلاق کی عظیم ترین اور تفصیلی ترین کتابوں میں سے ایک ہے یہاں تک کہ اس کے بعد لکھی جانے والی بہت ساری کتابوں میں اس کتاب کی خوشہ چینی کی گئی ہے۔ احیاء العلوم کئی بار چھپ چکی ہے۔

(دیکھیے محمد علی خیابانی کی ریحانۃ الادب، ج ۴، ص ۲۳۷)۔

۳۔ ابو حامد محمد بن محمد بن احمد المعروف ''حجۃ الاسلام غزالیؒ''، عظیم شافعی عالم تھے۔ وہ ۴۵۰ میں طوس کے گاؤں غزالہ میں پیدا ہوئے اور وہیں ۵۰۵ یا ۵۰۷ میں وفات پائی۔ ۴۸۴ھ میں مدرسہ نظامیہ بغداد کے مدرس مقرر ہوئے۔ ان کی تالیفات بہت زیادہ ہیں جن میں سے اکثر ان کی اپنی فکری تخلیق ہیں۔ ان میں زیادہ مشہور علم اخلاق میں، احیاء العلوم، اور شافعی فقہ میں، الوجیز، ہیں۔ (ریحانۃ الادب، ج ۴، ص ۲۳۷)۔

۴۔ دیکھیے تعریف الاحیاء بفضائل الاحیاء (جو احیاء العلوم کے ساتھ چھپی ہے)، ج ۵، ص ۵، ۷۔

نقل کیا جاتا[۱] انسان کو اس کے اصلی ہدف سے دور رکھتا ہے اور اسے اخلاق کی تطہیر و اصلاح سے روکتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ اس حقیر کی نظر میں اخلاق کا علمی اور تاریخی مطالعہ، اسی طرح تفسیر و حدیث کی ادبی اور علمی بحثیں ہمیں اصلی مقصود و مطلوب سے دور رکھنے کا باعث ہیں۔ راقم کا یہ نظریہ ہے کہ علم اخلاق اور اس سے مربوط احادیث و آیات کی تشریح کے سلسلے میں یہ نکتہ اہم ہے کہ لکھنے والے کو تشویق، تخویف، وعظ و نصیحت اور یاد دہانی کے ذریعے اپنے مطالب کو لوگوں کے ذہنوں میں جاگزین کرنا چاہئے۔ بعبارت دیگر اخلاقی کتابوں کو تحریری وعظ کا مصداق ہونا چاہئے تا کہ وہ براہ راست روحانی عیوب اور بیماریوں کا علاج کریں نہ یہ کہ علاج کا صرف راستہ دکھائیں۔

اخلاقی بنیادوں اور علاج کے طریقوں کی نشاندہی کسی شخص کو اس کے منزل مقصود سے نزدیک کر سکتی ہے نہ کسی تاریک قلب کو منور کر سکتی ہے اور نہ ہی کسی کے فاسد اخلاق کی اصلاح کر سکتی ہے۔ اخلاق کی اصلی کتاب وہ ہے جس کے مطالعے سے دل کی سختی نرمی میں بدل جائے، غیر مہذب آدمی مہذب بن جائے اور تاریک دل منور ہو جائے۔ یہ اس صورت میں ممکن ہے کہ عالم راستہ دکھانے کے ساتھ ساتھ منزل تک پہنچانے کا بھی اہتمام کرے اور علاج کا طریقہ سکھانے کے ساتھ ساتھ معالجہ بھی کرے۔ اسی طرح کتابوں کو بھی درد کی دوا کا کام دینا چاہئے نہ صرف دوا کی تشخیص پر مشتمل نسخے کا۔ روحانی معالج کے کلام میں دوا والی تأثیر ہونی چاہئے نہ صرف نسخے والی۔ مذکورہ بالا کتب نسخے ہیں دوا نہیں، بلکہ اگر زیادہ جسارت نہ ہو تو یہ عرض کروں کہ ان میں سے بعض کتب کا نسخہ ہونا بھی مشکل اور مشکوک ہے۔ بہر حال اس بحث کو یہیں چھوڑ دینا ہی بہتر ہے۔

راقم نے اخلاقی کتاب لکھنے کے طریقے کی ابتدا کی ہے تا کہ اگر تحریر و تقریر پر قادر کوئی مصنف عالم لکھنا چاہے تو اس نہج پر لکھے۔ میرا دعویٰ یہ نہیں کہ میرے اندر ایسی صلاحیت یا میرے قلم شکستہ میں اتنی توانائی یا میرے تاریک دل میں اتنی روشنی موجود ہے جس کے سہارے میں خود یہ عظیم کام انجام دے سکوں۔ یہ بھی واضح رہے کہ تنقید کرنا آسان ہے لیکن اس کا حل پیش کرنا مشکل ہے۔

۱۔ اس نکتے کی طرف درج ذیل افراد نے اشارہ کیا ہے:
فیض کاشانی نے ''المحجۃ البیضاء'' ج ۱، ص ۲، ۱ میں۔ اور علامہ امینی نے ''الغدیر'' ج ۱۱، ص ۱۶۷، ۱۶۱ میں۔

خداوند متعال سے اس بات کی توفیق طلب کرتا ہوں کہ وہ ہمارے سخت دلوں کو نرمی اور اخلاص عطا کرے تا کہ اس ٹوٹی پھوٹی تحریر کا شاید کسی دل پر کوئی اثر ہو۔

انَّهُ وَلِيٌّ الفَضْلِ وَالاِنْعام

مقالہ / ۱

حدیث شریف کے الفاظ اور اس کی سند

بِاسْنادِي المُتَّصِلِ المَذْكُورِ بَعْضُها فِي كِتابِنا "الأَرْبَعِين"۱ اِلىٰ ثِقَةِ الاِسْلامِ الشَّيْخِ

۱۔ کتاب الاربعین (چہل حدیث)، کتاب ہذا کے مؤلف حضرت امام خمینیؒ ہیں۔ انہوں نے یہ کتاب ۱۳۵۸ھ میں فارسی زبان میں تحریر فرمائی۔ اس کتاب میں امام خمینیؒ نے رسول اکرمؐ اور اہل بیت طاہرینؑ کی چالیس احادیث کی تشریح فرمائی ہے۔ یہ کتاب اخلاقی، اعتقادی اور عرفانی موضوعات پر مشتمل ہے۔ یہ گرانبہا کتاب "تنظیم ونشر آثار امامؒ" نامی ادارے کی جانب سے چھپ چکی ہے۔

امام خمینیؒ کی کتاب چہل حدیث کی ابتدا میں اس حدیث کی سند یوں مذکور ہے:

أخبرني اجازة مكاتبةً ومشافهةً عدّة من المشايخ العظام، والثقاة الكرام منهم:

الشيخ العلامة المتكلم، الفقيه الأصولي الأديب المتبحر الشيخ محمّد رضا آل العلامة الوفي الشيخ محمّد تقي الأصفهاني أدام الله توفيقه حين تشرفه بقم الشرفة.

والشيخ العالم الجليل المتعبد الثقة العين الثبت الحاج الشيخ عباس القمي دام توفيقه. وكلاهما عن المولى العالم الزاهد العابد الفقيه المحدث الميرزا حسين النوري نوّر الله مرقده الشريف عن العلامة الشيخ مرتضى الأنصاري.

ومنهم السيد السند الفقيه المتكلم الثقة الثبت العلامة السيد محسن الأمين العاملي أدام الله تأييداته، عن الفقيه العلامة صاحب المصنفات العديدة السيد محمّد بن هاشم الموسوي الرضوي الهندي المجاور في النجف الأشرف حياً وميتاً (قدس الله سره)، عن العلامة الأنصاري. ومنهم العالم الثقة الثبت السيد أبو القاسم الدهكردي الأصفهاني، عن السيد السند الأمجد الميرزا محمّد هاسم الأصفهاني (قدس سره)، عن العلامة الأنصاري. ولنا طرق أخرىٰ غير منتهية الى الشيخ تركناها، عن المولى الأفضل أحمد النراقي، عن السيد مهدي الملقب بـ"بحر العلوم" صاحب الكرامات (رضوان الله عليه)، عن أستاذ الكل الأقا -->

الأَكْبَرِ الأَقْدَ مُحَمَّدِ بْنِ يَعْقُوبَ الكُلَيْنِي (رضوان الله عليه)۱ في جَامِعِهِ الكَافِي الشَّرِيف ۲، عَنْ عِدَّةٍ مِنْ أَصْحَابِنَا، عَنْ أَحْمَدَ بْنِ مُحَمَّدٍ، عَنْ عَلِيِّ بْنِ حَدِيد، عَنْ سَمَاعَةَ بْنِ مِهْرَانَ، قَالَ:

كُنْتُ عِنْدَ أَبِي عَبْدِالله عليه السلام وَعِنْدَهُ جَمَاعَةٌ مَنْ مَوَالِيهِ فَجَرىٰ ذِكْرُ العَقْلِ وَالجَهْلِ، فَقَالَ أَبُو عَبْدِالله عليه السلام: اِعْرِفُوا العَقْلَ وَجُنْدَهُ وَالجَهْلَ وَجُنْدَهُ تَهْتَدُوا.

<-- محمّد باقر البهبهاني، عن والده الأكمل محمّد أكمل، عن المولى محمّد باقر المجلسي، عن والده المحقّق المولى محمّد تقي المجلسي، عن الشيخ المحقّق البهائي، عن والده الشيخ حسين، عن الشيخ زين الدين الشهير بـ"الشهيد الثاني"، عن الشيخ علي بن عبد العالي الميسي، عن الشيخ شمس الدين محمّد ابن المؤذن الجزيني، عن الشيخ ضياء الدين علي، عن والده الحائز للمرتبتين الشيخ شمس الدين محمّد بن مكي، عن الشيخ أبي طالب محمّد فخر المحقّقين، عن والده آية الله الحسن بن مطهر العلامة الحلي، عن الشيخ أبي القاسم جعفر بن الحسن بن سعيد الحلي المحقّق على الاطلاق، عن السيد أبي علي فخار بن معد الموسوي، عن الشيخ شاذان بن جبرئيل القمي، عن الشيخ محمّد بن أبي القاسم الطبري، عن الشيخ أبي علي الحسن، عن والده شيخ الطائفة، أبي جعفر محمّد بن الحسن الطوسي(رحمه الله)، جامع "التهذيب والاستبصار" عن امام الفقهاء والمتكلمين، الشيخ أبي عبدالله محمّد بن محمد بن نعمان"الشيخ المفيد"، عن شيخه رئيس المحدثين الشيخ أبي جعفر محمّد بن علي بن الحسين بن موسىٰ بن بابويه القمي، صاحب كتاب "من لا يحضره الفقيه"، عن الشيخ أبي القاسم جعفر بن قولويه، عن الشيخ الأجل ثقة الاسلام محمّد بن يعقوب الكليني، صاحب "الكافي".

۱۔ محمد ابن یعقوب ابن اسحاق کلینی کی کنیت ابوجعفر ہے اور وہ ثقۃ الاسلام کے نام سے معروف ہیں۔ کلینی علماء امامیہ میں سب سے زیادہ موثق اور نقل حدیث میں سب سے زیادہ معتبر ہے۔ کلینی نے غیبت صغریٰ کے دوران زندگی گزاری اور ۳۲۹ ہجری میں بغداد میں وفات پائی اور باب کوفہ میں مدفون ہوئے۔ (رجال نجاشی، ص ۲۷۸، نمبر ۱۰۲۶)۔

۲۔ "کافی" حدیث کی چار اہم ترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس کا شمار حدیث کی بنیادی کتابوں میں ہوتا ہے جن پر محدّثین اعتماد اور اس سے استناد کرتے ہیں۔ اہل بیت رسولؐ سے مروی روایات واحادیث کی جمع آوری میں "کافی" جیسی کتاب نہیں لکھی گئی۔ ثقۃ الاسلام کلینیؒ نے غیبت صغریٰ کے دوران بیس سال کے عرصے میں "کافی" لکھی۔ "کافی" چونتیس کتابوں تین سو چھبیس ابواب اور سولہ ہزار احادیث پر مشتمل ہے۔ اس کے تین اہم حصے ہیں: اصول کافی، فروع کافی اور روضہ کافی۔ اسی لئے عقائد، توحید، اخلاق اور فقہ کے علماء اس کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ کافی پر بہت سی شرحیں اور حاشیے لکھے گئے ہیں جن میں سے ایک علامہ محمد باقر مجلسیؒ کی شرح "مرآۃ العقول" ہے جو پوری کتاب کی شرح ہے۔
(دیکھئے الذریعہ، ج ۱۷، ص ۲۴۵)۔

قالَ سَماعَةُ، فَقُلْتُ: جُعِلْتُ فِداکَ! لانَعْرِفُ إلّا ما عَرَّفْتَنا.

فَقالَ أبوعَبْدِالله(ع): إنَّ اللهَ خَلَقَ العَقْلَ وَهُوَ أوَّلُ خَلْقٍ مِنَ الرُّوحانِيِّينَ عَنْ يَمِينِ العَرْشِ مِنْ نُورِهِ، فَقالَ لَهُ: أدْبِرْ فَأدْبَرَ، ثُمَّ قالَ لَهُ: أقْبِلْ فَأقْبَلَ. فَقالَ اللهُ تَعالىٰ: خَلَقْتُکَ خَلْقاً عَظِيماً، وَكَرَّمْتُکَ عَلىٰ جَمِيعِ خَلْقِي.

قالَ: ثُمَّ خَلَقَ الجَهْلَ مِنَ البَحْرِ الأُجاجِ ظُلْمانِيّاً، فَقالَ لَهُ: أدْبِرْ فَأدْبَرَ، ثُمَّ قالَ لَهُ: أقْبِلْ فَلَمْ يُقْبِلْ. فَقالَ لَهُ: اسْتَكْبَرْتَ، فَلَعَنَه.

ثُمَّ جَعَلَ لِلْعَقْلِ خَمْسَةً وَسَبْعِينَ جُنْداً. فَلَمّا رَأى الجَهْلُ ما أكْرَمَ اللهُ بِهِ العَقْلَ وَما أعْطاهُ أضْمَرَ لَهُ العَداوَةَ، فَقالَ الجَهْلُ: يا رَبِّ! هٰذا خَلْقٌ مِثْلِي خَلَقْتَهُ وَكَرَّمْتَهُ وَقَوَّيْتَهُ، وَأنا ضِدُّهُ وَلا قُوَّةَ لِي بِهِ، فَأعْطِنِي مِنَ الجُنْدِ مِثْلَ ما أعْطَيْتَه. فَقالَ: نَعَمْ! فَإنْ عَصَيْتَ بَعْدَ ذٰلِکَ أخْرَجْتُکَ وَجُنْدَکَ مِنْ رَحْمَتِي. قالَ: قَدْ رَضِيتُ. فَأعْطاهُ خَمْسَةً وَسَبْعِينَ جُنْداً.

فَكانَ مِمّا أعْطَى العَقْلَ مِنَ الخَمْسَةِ والسَّبْعِينَ الجُنْد:

الخَيْرُ وَهُوَ وَزِيرُ العَقْلِ، وَجَعَلَ ضِدَّهُ الشَّرَّ وَهُوَ وَزِيرُ الجَهْلِ، وَالإيمانُ وَضِدَّهُ الكُفْرَ، وَالتَّصْدِيقُ وَضِدَّهُ الجُحُودَ، وَالرَّجاءُ وَضِدَّهُ القُنُوطَ، وَالعَدْلُ وَضِدَّهُ الجَوْرَ، وَالرِّضا وَضِدَّهُ السَّخَطَ، وَالشُّكْرُ وَضِدَّهُ الكُفْرانَ، وَالطَّمَعُ وَضِدَّهُ اليَأسَ، وَالتَّوَكُّلُ وَضِدَّهُ الحِرْصَ، وَالرَّأفَةُ وَضِدَّها القَسْوَةَ، وَالرَّحْمَةُ وَضِدَّها الغَضَبَ، وَالعِلْمُ وَضِدَّهُ الجَهْلَ، وَالفَهْمُ وَضِدَّهُ الحُمْقَ، وَالعِفَّةُ وَضِدَّها التَّهَتُّکَ، وَالزُّهْدُ وَضِدَّهُ الرَّغْبَةَ، وَالرِّفْقُ وَضِدَّهُ الخُرْقَ، وَالرَّهْبَةُ وَضِدَّها الجُرْأةَ، وَالتَّواضُعُ وَضِدَّهُ الكِبْرَ، وَالتُّؤَدَةُ وَضِدَّها التَّسَرُّعَ، وَالحِلْمُ وَضِدَّهُ السَّفَهَ، وَالصَّمْتُ وَضِدَّهُ الهَذَرَ، وَالاِسْتِسْلامُ وَضِدَّهُ الاِسْتِكْبارَ، وَالتَّسْلِيمُ وَضِدَّهُ الشَّکَّ، وَالصَّبْرُ وَضِدَّهُ الجَزَعَ، وَالصَّفْحُ وَضِدَّهُ الاِنْتِقامَ، وَالغِنىٰ وَضِدَّهُ الفَقْرَ، وَالتَّذَكُّرُ وَضِدَّهُ السَّهْوَ، وَالحِفْظُ وَضِدَّهُ النِّسْيانَ، وَالتَّعَطُّفُ وَضِدَّهُ القَطِيعَةَ، وَالقُنُوعُ وَضِدَّهُ الحِرْصَ، وَالمُواساةُ وَضِدَّها المَنْعَ، وَالمَوَدَّةُ وَضِدَّها العَداوَةَ، وَالوَفاءُ وَضِدَّهُ الغَدْرَ، وَالطّاعَةُ وَضِدَّها المَعْصِيَةَ، وَالخُضُوعُ وَضِدَّهُ التَّطاوُلَ، وَالسَّلامَةُ وَضِدَّها البَلاءَ، وَالحُبُّ وَضِدَّهُ البُغْضَ، وَالصِّدْقُ وَضِدَّهُ الكِذْبَ، وَالحَقُّ وَضِدَّهُ الباطِلَ، وَالأمانَةُ وَضِدَّها الخِيانَةَ، وَالإخْلاصُ وَضِدَّهُ الشَّوْبَ، وَالشَّهامَةُ وَضِدَّها البَلادَةَ، وَالفَهْمُ وَضِدَّهُ الغَباوَةَ، وَالمَعْرِفَةُ وَضِدَّها الإنْكارَ، وَالمُداراةُ

وَضِدَّهَا الْمُكَاشَفَةَ، وَسَلَامَةُ الغَيْبِ وَضِدَّهَا الْمُمَاكَرَةَ، وَالكِتْمَانُ وَضِدَّهُ الافْشَاءَ، وَالصَّلاةُ وَضِدَّهَا الاِضَاعَةَ، وَالصَّوْمُ وَضِدَّهُ الافْطَارَ، وَالجِهَادُ وَضِدَّهُ النُّكُولَ، وَالحَجُّ وَضِدَّهُ نَبْذَ المِيثَاقِ، وَصَوْنُ الحَدِيثِ وَضِدَّهُ النَّمِيمَةَ، وَبِرُّ الوالِدَيْنِ وَضِدَّهُ العُقُوقَ، وَالحَقِيقَةُ وَضِدَّهَا الرِّيَاءَ، وَالمَعْرُوفُ وَضِدَّهُ المُنْكَرَ، وَالسِّتْرُ وَضِدَّهُ التَّبَرُّجَ، وَالتَّقِيَّةُ وَضِدَّهَا الاِذَاعَةَ، وَالانْصَافُ وَضِدَّهُ الحَمِيَّةَ، وَالتَّهْيِئَةُ وَضِدَّهَا البَغْيَ، وَالنَّظَافَةُ وَضِدَّهَا القَذَرَ، وَالحَيَاءُ وَضِدَّهَا الخَلْعَ، وَالقَصْدُ وَضِدَّهُ العُدْوَانَ، وَالرَّاحَةُ وَضِدَّهَا التَّعَبَ، وَالسُّهُولَةُ وَضِدَّهَا الصُّعُوبَةَ، وَالبَرَكَةُ وَضِدَّهَا المَحْقَ، وَالعَافِيَةُ وَضِدَّهَا البَلاءَ، وَالقَوامُ وَضِدَّهُ المُكَاثَرَةَ، وَالحِكْمَةُ وَضِدَّهَا الهَوىٰ، وَالوَقَارُ وَضِدَّهُ الخِفَّةَ، وَالسَّعَادَةُ وَضِدَّهَا الشَّقَاوَةَ، وَالتَّوْبَةُ وَضِدَّهَا الاِصْرَارَ، وَالاِسْتِغْفَارُ وَضِدَّهُ الاِغْتِرَارَ، وَالمُحَافَظَةُ وَضِدَّهَا التَّهَاوُنَ، وَالدُّعَاءُ وَضِدَّهُ الاِسْتِنْكَافَ، وَالنَّشَاطُ وَضِدَّهُ الكَسَلَ، وَالفَرَحُ وَضِدَّهُ الحُزْنَ، وَالأُلْفَةُ وَضِدَّهَا الفُرْقَةَ، وَالسَّخَاءُ وَضِدَّهُ البُخْلَ.

وَلاَ تَجْتَمِعُ هٰذِهِ الخِصَالُ كُلُّهَا مِنْ أَجْنَادِ العَقْلِ اِلاّ فِي نَبِيٍّ أَوْ وَصِيِّ نَبِيٍّ أَوْ مُؤْمِنٍ امْتَحَنَ اللهُ قَلْبَهُ لِلايْمَانِ، وَأَمَّا سَائِرُ ذٰلِكَ مِنْ مَوالِينَا، فَاِنَّ أَحَدَهُمْ لاَ يَخْلُو مِنْ أَنْ يَكُونَ فِيهِ بَعْضُ هٰذِهِ الجُنُودِ حَتّىٰ يَسْتَكْمِلَ وَيَنْقىٰ مِنْ جُنُودِ الجَهْلِ، فَعِنْدَ ذٰلِكَ يَكُونُ فِي الدَّرَجَةِ العُلْيَا مَعَ الأَنْبِيَاءِ وَالأَوْصِيَاءِ، وَاِنَّمَا يُدْرَكُ ذٰلِكَ بِمَعْرِفَةِ العَقْلِ وَجُنُودِهِ، وَمُجَانَبَةِ الجَهْلِ وَجُنُودِهِ، وَفَّقَنَا اللهُ وَاِيَّاكُمْ لِطَاعَتِهِ وَمَرْضَاتِهِ.[1]

نکتہ: یہاں حدیث کے اس حصے کا ترجمہ پیش کیا جارہا ہے جو مناسب حال ہے، یعنی لشکروں کی تعداد کے بارے میں ہے۔

ترجمہ: سماعہ بن مہران کہتا ہے کہ میں ابوعبداللہ جعفر بن محمد (علیہما السلام) کی خدمت میں حاضر تھا، جبکہ آپ کے پاس دوستداروں کی ایک جماعت موجود تھی۔ وہاں عقل اور جہل کی بحث چھڑ گئی۔ امام صادقؑ نے فرمایا: عقل اور اس کے لشکر کو نیز جہل اور اس کے لشکروں کو پہچانو تاکہ تم ہدایت حاصل کرو۔ سماعہ کہتا ہے، میں نے کہا: قربان جاؤں! ہم نہیں جانتے مگر وہ چیز جو آپ ہمیں سمجھائیں۔ امامؑ نے فرمایا: بتحقیق اللہ نے

۱۔ الکافی، ج ۱ ص ۲۰، کتاب العقل والجہل، باب ۱، حدیث ۱۴۔

اپنے نور سے عرش کی دائیں جانب عقل کو خلق کیا اور وہ عالم ارواح کی پہلی مخلوق ہے۔ پھر اللہ نے اس سے فرمایا: پیچھے مڑ جاو۔ سو وہ پیچھے مڑ گئی۔ پھر فرمایا: سامنے آ ؤ۔ سو وہ سامنے آ گئی۔ پس اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں نے تجھے عظیم خلقت سے نوازا اور تجھے اپنی تمام مخلوقات پر فوقیت دی۔ اس کے بعد امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: پھر اللہ نے جہل کو خلق کیا نمکین، تلخ اور تاریک سمندر سے۔ پھر اس سے فرمایا: پیچھے مڑ جا۔ سو وہ پیچھے مڑا۔ پھر اس سے فرمایا: سامنے مڑ جا، لیکن وہ سامنے نہیں گیا۔ تب اس سے فرمایا: تو نے نافرمانی کی۔ پھر اسے اپنی رحمت سے دور کر دیا۔ اس کے بعد عقل کو پچھتر لشکر عطا کئے۔ جب جہل نے مشاہدہ کیا کہ اللہ نے عقل کو شرف بخشا ہے، نیز اللہ نے اسے عطا کیا ہے تو اس نے عقل کی عداوت کو اپنے دل میں جاگزین کیا۔ پس جہل نے عرض کیا: اے پروردگار! یہ عقل میری طرح کی ایک مخلوق ہے تو نے اسے خلق فرمایا اور اسے عزت وقوت دی۔ میں اس کی ضد ہوں لیکن میں اس کے مقابلے میں کمزور ہوں، پس مجھے بھی اس کے برابر لشکر عطا فرما۔ فرمایا: ٹھیک ہے، لیکن اگر اس کے بعد تو نے نافرمانی کی تو میں تجھے اور تیرے لشکر کو اپنی رحمت سے دور کر دوں گا۔ اس نے عرض کیا: مجھے قبول ہے۔ پس اللہ نے جہل کو بھی پچھتر لشکر عطا کئے۔ اس کے بعد امام جعفر صادقؑ نے عقل اور جہل کے لشکروں کو گننا شروع کیا جن کا تفصیلی ذکر انشاءاللہ آیندہ صفحات میں ہوگا۔

ہم نے اس کتاب کی ابتدا میں وعدہ کیا تھا کہ ہم علمی نکات کو نہیں چھیڑیں گے لیکن اس وعدے کے باوجود ہم مجبور ہیں کہ یہاں اس حدیث کے ابتدائی حصے سے متعلق بعض ذیلی نکات کی طرف اختصار کے ساتھ اشارہ کریں گے کیونکہ اس کے علاوہ چارہ نہیں ہے۔

مقالہ / ۲

عقل وجہل کی حقیقت کا مختصر بیان
اور
حدیث شریف کے مقصد کی وضاحت

امام صادقؑ کے چاہنے والوں کی محفل میں عقل اور جہل کی جو بحث چھڑ گئی تھی اس سے مراد بظاہر وہی عقل اور جہل ہے جو انسانوں کے اندر پائی جاتی ہے اور جسے قوت عاقلہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ایک روحانی قوت سے عبارت ہے جو ذات کے لحاظ سے مجرد اور فطری لحاظ سے اچھائی اور کمال کی طرف مائل ہے، اس کے علاوہ عدل اور احسان کی داعی بھی ہے۔

اس قوت عاقلہ کی ضد قوت واہمہ ہے جو ذاتی طور پر دنیا کی طرف مائل ہوتی ہے مگر یہ کہ وہ عقل کی تابع ہو جائے اور نفس مجردہ کے زیر نگین آ جائے۔ یاد رہے کہ دنیا وہی شجرۂ خبیثہ اور تمام برائیوں کی اصل جڑ ہے۔ انشاء اللہ عنقریب ان دونوں پر بحث ہوگی۔

حدیث میں عقل کی بعض خصوصیات کا ذکر ہوا ہے، مثلاً یہ کہ وہ ذی روح اشیاء میں سب سے پہلی مخلوق ہے۔ اس بات کی روشنی میں امام صادقؑ نے جس عقل کا ذکر فرمایا ہے اس سے مراد عالم کبیر کی عقل کل ہے جو فردی اور جزئی عقول کیلئے باطن، سر اور حقیقت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس حقیقت کے ادراک کی صورت میں ان کا مطمح نظر بھی معلوم ہو جائے گا۔ یہ ایک نورانی جوہر ہے جو جسمانی علائق سے مبرا ہے اور سب سے پہلی ذی روح مخلوق ہے۔ یہ فیض خداوندی اور مشیت مطلقہ الٰہیہ کا پہلا جلوہ ہے اور پانی کی میٹھی خلقت[۱] کا

۱۔ یہ الفاظ امام باقر علیہ السلام کی حدیث سے ماخوذ ہیں۔ آپ نے فرمایا: ﴿لَوْ عَلِمَ النَّاسُ كَيْفَ ابْتِداءُ الخَلْقِ مَا اخْتَلَفَ اثْنانِ، اِنَّ اللهَ عَزَّوَجَلَّ قَبْلَ أنْ يَخْلُقَ الخَلْقَ قالَ: كُنْ مَاءً عَذْباً أخْلُقْ مِنْكَ جَنَّتِي وَأَهْلَ طاعَتِي... -->

پہلا شاخسانہ ہے، نیز ختمی مرتبتؐ کے نور سے عبارت ہے۔

اس حقیقت کا انکار دین وعقل کے یہاں مسلّمہ حقائق میں سے بہت سی حقائق کے انکار سے عبارت ہے۔ مثال کے طور پر کائنات میں ذات واجب الوجود سے بہتر چیز کا تصور یا خداوند واجب الوجود کی محدودیت اور جسمانیت کا تصور نیز اللہ کے بارے میں ناتوانی، بخل اور اس طرح کی دیگر صفات کا تصور جن کو شمار کرنا بھی موجب تطویل ہے، چہ جائیکہ ان پر تحقیقی بحث کی جائے۔ البتہ بزرگ محدّثین میں سے جو حضرات[۱] اس حققیت کے منکر ہیں وہ اس انکار کے غلط نتائج اور باطل لوازمات سے غافل تھے، کیونکہ یہ ان باریک اور پوشیدہ لوازم میں سے ہیں جو توحید وتجرید کے حقیقی علوم میں مسلسل تحقیق سے معلوم ہوتے ہیں۔

اہل حدیث اور اہل ظاہر (جو احادیث کے ظاہری الفاظ سے چمٹے رہتے ہیں اور دلائل عقلی کا انکار کرتے ہیں) اس حقیقت سے غافل رہے ہیں۔ اس لئے ان کی پاک دامنی پر کوئی دھبہ نہیں لگتا، کیونکہ انہوں نے سمجھا ہے کہ عالم عقلی اور عالم تجرد کا عقیدہ عالم کے حادث ہونے کی نفی کرتا ہے، جبکہ ایک بزرگ محقق[۲] نے اس ضمن میں تحقیق کے ذریعے ثابت کیا ہے کہ کائنات زمانے کے لحاظ سے حادث ہے (قدیم نہیں) اور یہ اللہ تعالیٰ کی توحید وتنزیہ وتقدیس کے منافی بھی نہیں۔

ہم نے اللہ کے فضل وکرم سے صاحبان معرفت اور اصحاب قلوب کیلئے مناسب انداز میں غیب وشہود کے تمام عوالم کو بلحاظ زمانہ حادث (غیر قدیم) ثابت کیا ہے۔ الحمدللہ[۳] اگر اس کی تمہید کے ساتھ توضیح لکھی

<-- ترجمہ: اگر لوگ تخلیق کائنات کی ابتدا کی کیفیت کو جانتے تو کہیں بھی دو افراد میں اختلاف نہ ہوتا۔ بتحقیق اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کو خلق کرنے سے پہلے فرمایا: میٹھا پانی بن جا تا کہ میں تجھ سے اپنی جنت اور اپنے طاعت گزاروں کو خلق کروں۔ (اصول کافی، ج۲ ص۵ باب۲ حدیث۱)۔

۱۔ شاید اس سے مراد علامہ مجلسیؒ ہیں۔ دیکھئے مرآۃ العقول، ج۱، ص۲۷، ۲۶؛ نیز بحار الانوار، ج۶۱ کتاب السماء والعالم، ص۱۰۴۔

۲۔ دیکھئے الاسفار الاربعہ، ج۵، الفن الخامس، فصل ۱۳۱، ص ۲۰۵۔

۳۔ دیکھئے امام خمینیؒ کی ''تقریرات شرح منظومہ'' الفریدۃ الثانیۃ؛ نیز سید عبدالغنی موسوی اردبیلی کی تحریر ''الحدوث والقدم'' (مؤسسہ تنظیم ونشر آثار امام خمینیؒ کی طرف اس کتاب پر تحقیقی کام انجام تک پہنچ کر زیور طبع سے آراستہ ہوا)، نیز دیکھئے تعلیقات علی شرح فصوص الحکم''، ص۳۳، ۳۴۔

جائے تو ایک الگ کتاب بن جائے گی ﴿لَعَلَّ اللهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ أَمْراً﴾[۱] شاید اللہ تعالیٰ ہمیں اس بات کی توفیق دے۔ البتہ ایک بڑے محدّث[۲] نے جس نظریہ حدوث کی نسبت قوم پرستوں کی جانب دی ہے اس سے ہمارے بزرگان منزہ ومبرا ہیں اور یہ نظریہ کئی ایک باطل لوازمات کا حامل ہے جن میں سے ہر ایک توحید وتنزیہ خداوندی کی بنیادوں کو متزلزل کر دیتا ہے۔ البتہ یہ محدّث ان لوازمات سے غافل تھے۔

خلاصہ یہ کہ عقل مجرد، بلکہ عقلی عوالم کا ثبوت اہل بیت رسول ؐ[۳] کی احادیث، قرآنی آیات[۴] اور صاحبان عقل[۵] کے عقلی مسلّمات اور اہل عرفان کی ریاضتوں کے نتائج سے ہماہنگ ہے۔ مادیات سے ماوراء یہ جوہر (عقل) عالم اکبر والی عقل ہے۔ بعض حضرات[۶] نے اسے آدم اول کا نام دیا ہے۔ اس آدم سے مراد ابوالبشر آدم ؑ نہیں، بلکہ حضرت آدم ؑ کی روحانیت تو اس کی ایک جھلک ہے۔

اس نورانی حقیقت کے مقابلے میں ایک اور حقیقت بھی ہے جو ''وہم کل'' سے عبارت ہے۔ یہ ''وہم'' اپنی فطرت واصالت کے لحاظ سے بدی وخرابی کی طرف مائل ہوتا ہے اور یہ اسی بڑے شیطان کی حقیقت وماہیت سے عبارت ہے۔ دیگر شیاطین اور ابالسہ (ابلیس کی جمع) اسی بڑے شیطان کی جھلکیاں اور اس کے مظاہر ہیں۔ یہ حقیقت (وہم کل) بھی تجرد کا حامل ہے (مادیات سے ماوراء ہے)۔ البتہ برزخی اور تاریک تجرد نہ کہ عقلی اور نورانی تجرد کا جیسا کہ صاحبان معرفت اور اہل یقین کے ہاں یہ امر واضح اور روشن ہے۔

۱۔ شاید اللہ تعالیٰ اس کے بعد کوئی امر ظاہر فرمائے۔ سورۂ طلاق ۱۔

۲۔ دیکھئے علامہ محمد باقر مجلسی ؒ کی مرآۃ العقول، ج۱، ص۲۷۔

۳۔ دیکھئے علم الیقین، ج۱، المقصد الثانی فی العلم بالملائکہ، ص۲۵۵۔

۴۔ دیکھئے سورۂ اسراء آیت ۸۵، اور سورۂ حجر آیت ۲۹۔

۵۔ دیکھئے صدرالدین شیرازی کی ''الاسفار الاربعہ'' ج۷، ص۲۶۲ (تبصرۃ تفصیلیہ)۔

۶۔ دیکھئے ''الانسان الکامل'' تالیف عزیز الدین نسفی، ص۷۲۔

مقالہ ۳/

حقیقت عقل وجہل کی بعض خصوصیات
حدیث شریف کی روشنی میں

الف: حدیث میں فرمایا گیا ہے: ﴿إِنَّ اللهَ خَلَقَ العَقْلَ﴾ (خدا نے عقل کو خلق فرمایا) اس جملے میں دو نکتے پوشیدہ ہیں جو حقیقت عقلیہ کی طرف اشارہ ہو سکتے ہیں۔ پہلا نکتہ یہ ہے کہ یہاں اللہ نے عقل کی طرف خلقت کی نسبت دی ہے اور اسے مخلوق شمار کیا ہے۔ ممکن ہے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ حقیقت عقلیہ ''عالم امر'' کے مقابلے میں ہے اور عالم امر کے بعد والے مراحل میں شامل ہے، کیونکہ عالم امر عبارت ہے، اللہ کے بے پایاں فیض و کرم، لطف رحمانی، وجود مطلق، عالم برزخ، نسبت اشراقیہ اور روح محمدی وعلوی (علیہما وعلیٰ آلہما الصلاۃ والسلام) سے۔ عالم امر قید و بند اور حدود و قیود سے مبرا ہے اور اس کا کوئی مقابل نہیں۔ اس کی طرف تخلیق کی نسبت نہیں دی جا سکتی، مگر مجازاً۔ چنانچہ بعض احادیث میں اس کی طرف یہ مجازی نسبت دی گئی ہے۔[1] ارباب معرفت نے آیت قرآنی ﴿أَلا لَهُ الخَلْقُ وَالأَمْرُ﴾[2] کے بارے میں یہ

ا۔ گویا یہاں امام صادقؑ کی اس حدیث کی طرف اشارہ ہے: ﴿إِنَّ اللهَ كانَ إِذْ لا كانَ، فَخَلَقَ الكانَ وَالمَكانَ، وَخَلَقَ نُورَ الأنوارِ الَّذي نُوِّرَتْ مِنْهُ الأنْوارُ، وَأَجْرىٰ فِيهِ مِنْ نُورِهِ الَّذِي نُوِّرَتْ مِنْهُ الأنْوارُ وَهُوَ النُّورُ الَّذي خَلَقَ مِنْهُ مُحَمَّداً وَعَلِيّاً﴾۔

ترجمہ: اللہ اس وقت بھی تھا جب کان (تھا) بھی نہ تھا۔ پھر اس نے کان (زمانہ) کو خلق کیا اور مکان (جگہ) کو خلق کیا۔ پھر اس نے نور الانوار کو خلق فرمایا جس سے دوسرے نور منور ہوئے اور اپنے نور کو اس میں داخل فرمایا جس سے دیگر انوار منور ہوئے۔ یہ وہ نور ہے جس سے محمدؐ و علیؑ کو خلق فرمایا۔ (دیکھئے اصول کافی، ج۱، ص ۳۶۷، کتاب الحجۃ، باب ۱۱۱، ح ۹)۔

۲۔ آگاہ رہو کہ تخلیق اور امر دونوں اللہ کیلئے ہی ہیں۔ سورۂ اعراف ۳۵۔

احتمال دیا ہے کہ اس آیت سے مراد شاید فیض اشراقی مطلق ہو۔ ۱ جیسا کہ آیت ﴿اللّٰهُ نُورُ السَّمٰواتِ وَالأَرْض﴾ ۲ بھی شاید اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہو۔ اس آیت شریفہ میں دیگر عجیب وغریب اور لطیف اسرار کی طرف بھی اشارہ ہوا ہے۔

بنابرایں عقل (جو سب سے پہلی ذی روح مخلوق ہے) اللہ تعالیٰ کے فیض مطلق کے نور کا سب سے پہلا ظہور اور مرحلہ ہے۔ اس تحقیقی نکتے کی روشنی میں عقل کی ایک اور صفت بھی ظاہر ہوتی ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے عقل کو متصف قرار دیا ہے اور وہ یہ کہ اللہ نے اس حقیقت کو اپنے نور سے خلق فرمایا ہے، یعنی اپنے فیض مطلق اور نور اشراقی سے پیدا کیا ہے، کیونکہ یہ ظہور مطلق کی بدولت وجود پذیر اور ظہور پذیر ہوئی ہے اس نکتے کی طرف واضح اشارہ ہے یہ حدیث جو کافی شریف کے باب صفات فعل میں امام صادقؑ سے مروی ہے، آپؑ فرماتے ہیں: ﴿خَلَقَ اللّٰهُ الْمَشِيْئَةَ بِنَفْسِهَا ثُمَّ خَلَقَ الأَشْيَاءَ بِالْمَشِيْئَةِ﴾ ۳ یعنی اللہ نے پہلے اپنی مشیت کو براہ راست خلق کیا پھر اس مشیت کے ذریعے دیگر اشیاء کو خلق فرمایا۔

اس حدیث شریف میں ''مشیت'' سے مراد شاید وہی فیض اشراقی مطلق ہو جو آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ ''بنفسھا'' سے مراد اللہ تعالیٰ کی براہ راست اور ذاتی تجلی ہے، کیونکہ حقائق مقیدہ خواہ وہ عقلی ہوں یا غیر عقلی، اللہ تعالیٰ کی ذات سے جو ہر قسم کے حدود وقیود سے منزہ ہے، مربوط نہیں ہوسکتیں، کیونکہ یہ ذاتی رابطہ جو مخلوقیت کی بنیادی شرط ہے اگر مقید اور محدود ومعین ہو تو اس کا لازمہ خود متجلی، یعنی خالق کی محدودیت اور اس کا تعین ہے، جبکہ اللہ اس (محدودیت) سے منزہ ہے۔

پس ذات حق کی ذاتی تجلی اور جمیل مطلق کے جمال کا ظہوری نور اسی فیض مطلق اور مشیت اشراقیہ سے عبارت ہے اور یہ غالباً وہی نور ہے جس کا ذکر اس حدیث میں ان الفاظ میں ہوا ہے: ﴿إِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ الْعَقْلَ وَهُوَ أَوَّلُ خَلْقٍ مِنَ الرُّوْحَانِيِّينَ عَنْ يَمِينِ الْعَرْشِ مِنْ نُورِهِ﴾ (بے شک اللہ نے اپنے نور سے عرش کی دائیں جانب سے ذی روح اشیاء میں سب سے پہلے عقل کو خلق کیا) یعنی اپنے اشراقی نور اور فیض مطلق

۱۔ دیکھئے ملا عبداللہ مدرس زینوزی کی انوار جلیہ، ص ۱۳۱۔

۲۔ اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ سورۂ نور ۳۵۔

۳۔ دیکھئے اصول کافی، ج ۱ ص ۸۵، کتاب التوحید، باب ۱۴، ح ۴۔

سے۔اس بیان کی روشنی میں حدیث شریف کے الفاظ ﴿خَلَقَ اللهُ الْمَشِيئَةَ بِنَفْسِهَا﴾ (اللہ نے مشیت کو خود اس سے خلق کیا) پر ہونے والے اعتراض کا ازالہ ہوتا ہے۔یوں ہمیں عظیم محقق میر داماد [۱] (اللہ ان کے چہرے کو روشن وشاداب کرے) کی کمزور توجیہ کی ضرورت نہیں رہتی اور نہ اس ضعیف تاویل [۲] کی جو بزرگ محقق فیض کاشانی [۳] نے پیش کی ہے اور نہ ہی اس عجیب تاویل [۴] کی جو محدّث خبیر مجلسی [۵] نے پیش کی ہے۔

تعجب کا مقام ہے کہ عظیم مسلمان فلسفی صدر المتالہین (قدس سرہ) [۶] نے بھی اس حدیث کے بارے

۱۔ میر محمد باقر بن شمس الدین استر آبادی المعروف ''میر داماد'' عظیم اسلامی فلاسفہ وحکماء میں سے ہیں۔وہ جیّد فقیہ محقق کرکی کے نواسے ہیں۔استر آباد میں پیدا ہوئے اور اصفہان میں ساکن ہوئے۔فلسفہ وحکمت میں ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ فقہ وحدیث کی مشکلات کو حل کرنے میں بھی بے نظیر تھے۔وہ علمی عظمت کے ساتھ ساتھ زہد وتقویٰ، عبادت، تہذیب نفس اور احکام دینی کی پابندی میں نابغۂ روزگار تھے۔ان کی کئی گرانقدر تصنیفات ہیں جن میں سے القبسات، الایقاضات، الرواشح السماویہ، حاشیہ اصول کافی اور الافق المبین زیادہ مشہور ہیں۔وہ ۱۰۴۰ھ میں کربلا ونجف کے درمیان وفات پا گئے اور نجف میں مدفون ہیں۔ (ریحانۃ الادب، ج۶ ص ۶۵)۔

۲۔ دیکھئے الوافی، ج۱ ص ۴۵۸، باب ۴۴، صفات افعال، حدیث ۳۷۱۔

۳۔ ملا محمد محسن بن شاہ مرتضیٰ المعروف ''ملا محسن فیض کاشانی'' جیّد عالم، محقق، محدّث، حکیم ربانی، عارف کامل اور عظیم شیعہ دانشمند تھے۔ان کی بہت ساری تالیفات ہیں۔مرحوم فیض کاشانی ملا صدرا شیرازی کے گرانقدر شاگرد اور داماد تھے۔۱۰۹۱ھ میں کاشان میں وفات پا گئے اور وہیں مدفون ہیں۔ان کی معروف ترین تالیفات یہ ہیں: الوافی، علم الیقین، عین الیقین، المحجۃ البیضاء، الحقائق، خلاصۃ الاذکار اور کلمات مکنونہ۔ (دیکھئے الکنیٰ والالقاب، ج۳ ص ۳۹)۔

۴۔ دیکھئے علامہ مجلسیؒ کی مرآۃ العقول، ج۲ ص ۱۸۔

۵۔ ملا محمد باقر بن ملا محمد تقی مجلسی المعروف ''مجلسی'' اپنے دور کے شیخ الاسلام اور عظیم شیعہ عالم ومحدّث تھے۔علم وتحقیق، احیائے دین، ترویج اسلام اور ائمہؑ کی احادیث کی نشر واشاعت اور علمی تالیفات وتصنیفات میں بہت کم ہی لوگ ان کی برابری کر سکتے ہیں۔امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں وہ سخت گیر تھے۔صاحب جود وسخا تھے۔۱۰۳۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۱۱۱ھ میں وفات پا گئے۔علامہ مجلسیؒ اصفہان کی عظیم جامع مسجد میں مدفون ہوئے۔ (الکنیٰ والالقاب، ج۳ ص ۱۴۷)۔

۶۔ صدر المتألہین محمد بن ابراہیم بن یحییٰ ''ملا صدرا'' کے نام سے معروف ہوئے۔ان کا شمار عظیم اسلامی فلاسفہ وحکماء میں ہوتا ہے۔علم فلسفہ، کلام، حدیث، عرفان اور تفسیر میں ماہر تھے۔وہ میر داماد، شیخ بہائی اور میر فندرسکی کے گرانقدر شاگردوں میں سے تھے۔ان کی تصنیفات علمی تخلیقات، جدید تحقیقات اور مہارت سے لبریز ہیں۔ان کی بہت ساری کتابوں میں -->

میں صاحبان معرفت اور اصحاب قلوب کی تحقیق سے چشم پوشی کرتے ہوئے اس کی ایک اور طریقے سے تأویل کی ہے، جبکہ یہ حدیث اس مشرب ومسلک کی بہت بڑی دلیل ہے۔[۱] ہم نے مصباح الهدایۃ[۲] نامی کتاب میں عظیم عرفاء اور معروف فلاسفہ کے نظریات کا تجزیہ کرتے ہوئے ''اول ماصدر'' کی بحث میں اس نکتے پر کافی وشافی تحقیق کی ہے۔[۳] خواہشمند حضرات اس کتاب کی طرف رجوع کریں تاکہ حقیقت واضح اور روشن ہو جائے۔

دوسرا نکتہ: ﴿اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ العَقْلَ﴾ میں عقل کی تخلیق کے عمل کو اسم اعظم، یعنی خدا کے مخصوص نام ''اللہ'' کی طرف نسبت دی ہے۔ شاید یہ اس بات کا اشارہ ہو کہ عقل اول کے آئینے میں ہونے والی تجلی ایک جامع تجلی ہے جس میں تمام صورتیں شامل ہیں، نیز حقیقت عقل تعینات خلقیہ کے مختلف مراحل میں مکمّل، کلی اور کامل ظہور سے عبارت ہے۔ حدیث کے مذکورہ جملے کا خلاصہ یوں ہے (اگرچہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے) کہ مقدس فیض مطلق اور اس کی وسطیت پر ظہور کے مرحلے میں اسم اعظم اور مقام احدیت پر تجلی کے لحاظ سے اللہ کی مقدس ذات نے تمام امور واحوال پر جامعیت کے ساتھ تجلی فرمایا۔ اسی لئے اس پہلی مخلوق کو نبی ختمی مرتبت ؐ (جو اسم اعظم کے ظہور کا مرکز، نیز جمع اور جمع الجمع کے مقام کی تجلی کا آئینہ ہیں) کے نور سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ حدیث نبوی ؐ ہے: سب سے پہلے میرا نور خلق ہوا[۴] ایک اور حدیث میں فرمایا: اللہ نے سب سے پہلے میری روح کو خلق کیا۔[۵]

<-- سے یہ کتابیں زیادہ مشہور ہیں: الاسفار الاربعہ، شواہد الربوبیہ، شرح اصول کافی تفسیر القرآن الکریم اور شرح الٰہیات شفا۔ ملاصدرا نے سات بار پیدل حج کا شرف حاصل کیا۔ آخر کار ساتویں سفر کے دوران ۱۰۵۰ھ میں بصرہ میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔ (ریحانۃ الادب، ج ۳، ص ۴۲۰)۔

۱۔ دیکھئے صدر المتألہین شیرازی کی شرح اصول کافی، ج ۳، ص ۲۲۷۔

۲۔ ''مصباح الہدایۃ الی الخلافۃ والولایۃ'' امام خمینی ؒ کی گرانقدر عرفانی کتاب ہے۔ اس کتاب کا موضوع انسان کامل اور نبوت وولایت ہے۔ یہ گرانقدر کتاب مؤسسہ تنظیم ونشر آثار امام خمینی ؒ کی جانب سے سید جلال الدین آشتیانی کے مقدمہ کے ساتھ چھپ چکی ہے۔

۳۔ دیکھئے مصباح الہدایۃ الی الخلافۃ والولایۃ، ص ۶۴۔

۴۔ ﴿أوّلُ ما خلَقَ اللّٰہُ نُورِي﴾ دیکھئے عوالی اللآلی، ج ۴، ص ۹۹، ح ۱۴۰؛ نیز بحار الانوار، ج ۱۵ اص ۲۴، ص ۴۴۔

۵۔ ﴿أوّلُ ما خلَقَ اللّٰہُ رُوحِي﴾ دیکھئے بحار الانوار، ج ۵۴، ص ۳۰۹، س ۴۔

عقل کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ ذی روح اشیاء میں سب سے پہلی مخلوق ہے۔ بنابرایں ذی روح اشیاء میں جوسب سے پہلی مخلوق ہے وہی تمام مخلوقات میں بھی سب سے پہلی مخلوق ہے، کیونکہ غیر ذی روح اشیاء کی تخلیق ذی روح اشیاء کے بعد عمل میں آئی ہے۔

یہاں ذی روح اشیاء سے مراد یا تو عالم عقل اور تمام طولی وعرضی مجرد عقول ہیں، اس صورت میں انہیں یائے نسبتی کے ساتھ ''روحانی'' (روح والی) کہنا از راہ تجرید ہے، یعنی مادیت سے ماوراء قرار دینے کیلئے ہے یا اس سے مراد تمام غیر مادی عوالم ہیں، پس ان کو روحانی کہنے کی وجہ یا تو از راہ تجرید ہے یا از راہ تغلیب۔ رہا اس بات کا بیان کہ ذی روح اشیاء دیگر موجودات پر مقدس ہیں، نیز عقل اعظم کو ہر چیز پر برتری حاصل ہے تو اس بحث کو ہم کتب عقلیہ کے متعلقہ مباحث پر اٹھا رکھتے ہیں۔[1]

عقل کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ عرش کی داہنی جانب سے خلق ہوئی ہے ﴿عَنْ يَـمِيْنِ العَرْش﴾

یہاں اس حرف جر (عن) کے بارے میں چند احتمالات موجود ہیں۔

پہلا احتمال یہ کہ ''عن''، ''خلق العقل'' میں مذکور لفظ ''خلق'' سے مربوط ہو۔ اس صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ خدا نے عقل کو عرش کی دائیں جانب سے خلق کیا۔ بنابریں جملہ حالیہ، یعنی ﴿وَهُـوَ أوّلُ خلْق﴾ متعلِق اور متعلّق کے درمیان جملہ معترضہ شمار کیا جائے گا۔ راقم کی نظر میں یہ توجیہ زیادہ درست ہے جس کی وجہ بعد ازیں معلوم ہوگی۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ ''عن'' کا متعلّق ''اول خلق'' ہو اور روحانیین سے مراد تمام مجردات عقلیہ وغیرہ ہوں۔ اس صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ عقل عرش کی دائیں جانب کی پہلی مخلوق ہے۔

تیسرا احتمال یہ ہے کہ ''عن'' کا متعلّق ''روحانیین'' ہو، یعنی عقل ذی روح اشیاء (جو سب کی سب عرش کی دائیں جانب ہیں) میں سب سے پہلی مخلوق ہے۔ اس صورت میں روحانیین سے مراد عقل کی دنیا ہے۔

ان دو احتمالات کا ذکر بعض بزرگ علماء نے کیا ہے۔[2]

یاد رہے کہ عرش کے کئی ایک مفاہیم اور مصادیق ہیں جن میں سے بعض کی طرف احادیث میں اشارہ

۱۔ الاسفار الاربعۃ، ج ۷، ص ۲۶۲، موقف ۹، فصل ۷۔

۲۔ دیکھئے صدر المتألہین شیرازیؒ کی شرح اصول کافی، ج ۱، ص ۴۰۰۔

ہوا ہے۱ اور بعض کا ذکر صاحبان معرفت کے کلام میں پایا جاتا ہے، مثلاً یہ کہ عرش سے مراد ہر چیز پر محیط جسم کل ہے۲ یا پورا عالم۳ یا علم۴ وہ علم جو اللہ نے انبیاء ورسل اور اولیاء کو عطا کیا ہے۵ عرش کے معانی سے ایک (جو قول خداوندی: ﴿الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾۶ سے مناسبت رکھتا ہے) وہی فیض مطلق ہے جو سلطنت الٰہیہ کی تجلی گاہ اور جائے استواء ہے۔ اس معنی کی رو سے معلوم ہوتا ہے کہ عقل عرش کی دائیں جانب سے خلق ہوئی ہے اور یہ پہلا وجود ہے جو حق سے قریب تر ہے اور یہ وہ جلوہ ہے جسے حق کے تمام جلووں پر تقدم حاصل ہے، نیز اسے دائیں بازو کی حیثیت بھی حاصل ہے ﴿يَدُ اللهِ﴾ بھی ایک لحاظ سے یہی فیض ہے جو کثرت کے زاویہ نگاہ سے دائیں اور بائیں کا مفہوم رکھتا ہے لیکن وحدت کے نقطہ نظر سے اس کے دونوں ہاتھ داہنے ہیں ﴿كِلْتَا يَدَيْهِ يَمِيْنٌ﴾۷ عرش کے اس مفہوم کی رو سے امامؑ کے کلام میں ﴿مِنْ نُوْرِهٖ﴾ سے مراد عرش کا بیان ہے، بشرطیکہ ہم نور سے مراد عملی تجلی وظہور لیں۔ لیکن اگر ہم نور سے مراد ذاتی تجلی لیں تو ﴿مِنْ نُوْرِهٖ﴾ نظریہ توحید وتجرید کی طرف اشارہ ہے جس کی تشریح وتوضیح بس سے باہر ہے۔ اس صورت میں یہ حدیث ان مشکل ترین احادیث میں سے ایک ہے جس کا اظہار افشائے راز کے مترادف ہے اور یہ عقل کی چوتھی خصوصیت ہے جس کی طرف حدیث شریف میں اشارہ ہوا ہے۔

عقل کی پانچویں خصوصیت وہ ہے جس کی طرف ہم نے پہلے ہی اشارہ کیا ہے اور وہ یہ کہ عقل کی تخلیق نور مطلق اور اضافہ اشراقیہ کے ذریعے ہوئی ہے۔ اگر چہ تمام موجودات اللہ کے فیض مطلق کا نتیجہ اور اس کے

۱۔ دیکھئے اصول کافی، ج۱، ص۱۰۰، کتاب التوحید، باب۲۰؛ نیز توحید صدوق، ص۳۲۱، باب۵۰۔

۲۔ دیکھئے فیض کاشانی کی تفسیر صافی، ج۲ ص۲۰۴۔

۳، ۴ اور ۵۔ یہ تینوں معانی عرش کے بارے میں امام صادقؑ کے فرمان سے ماخوذ ہیں: ﴿العَرْشُ فِي وَجْهٍ: هُوَ جُمْلَةُ الخَلْقِ... وَفِي وَجْهٍ آخَرَ: هُوَ العِلْمُ الَّذِي أَطْلَعَ اللهُ عَلَيْهِ أَنْبِياءَهُ وَرُسُلَهُ وَحُجَجَهُ...﴾ یعنی عرش سے مراد ایک لحاظ سے پورا عالم اور تمام مخلوقات ہیں اور ایک لحاظ سے اس سے مراد وہ علم ہے جو اللہ نے انبیاء ورسل اور اپنے حجج (اولیاء) کو عطا فرمایا ہے۔ (معانی الاخبار، ص۲۹، باب معنی العرش والکرسی، ح۱)۔

۶۔ خداوند رحمان نے عرش پر اقتدار قائم کیا۔ سورۂ طٰہٰ ۵۔

۷۔ اللہ کے دونوں ہاتھ داہنے ہاتھ ہیں۔ (دیکھئے اصول کافی، ج۲، ص۱۰۱، کتاب الایمان والکفر، باب الحب فی اللہ والبغض فی اللہ، باب۶۰، ح۷۔ امام خمینیؒ کے اپنے قلمی نسخے میں لفظ ''کلا'' درج ہے۔

فیض اشراقی کی تجلی ہیں لیکن اس نور مطلق اور اضافہ اشراقیہ کے ساتھ عقل اول کے اختصاص کی وجہ شاید یہ ہو کہ عالم عقل اس فیض کا جلوۂ کامل نیز اس کی اولین اور بلاواسطہ تجلی ہے، جبکہ دیگر تمام موجودات اور نور مطلق کے درمیان کئی واسطے موجود ہیں۔ اسی لئے وہ اشیاء ان واسطوں کے قرب وبعد اور کمی وبیشی کے مراتب کے لحاظ سے تاریکیوں سے مخلوط نور ہیں۔ بنابریں ان کی خلقت کو نور حق کے ساتھ براہ راست نسبت دینا درست نہیں مگر وحدت وجمع کے نقطہ نظر سے جو ماورائے تخلیق اور کثرت کے لحاظ سے ہے۔ ہم انشاء اللہ آگے چل کر عقل کی دیگر صفات وخصوصیات کا اس کتاب کی مناسبت سے ذکر کریں گے۔ عقل کی حقیقت اور اس کی صفات کے بارے میں جو کچھ بیان ہو چکا اس کی روشنی میں جہل کی حقیقت اور اس کی صفات بھی موازنے سے واضح ہو جاتی ہیں۔ قبل ازایں مقالہ دوم میں ذکر ہو چکا کہ جہل کل کے مقابلے میں عقل کل ہے اور یہ کہ جہل کل عبارت ہے وہم کل سے جو عالم کبیر والے وہم سے عبارت ہے اور ذاتی طور پر برائی، جھوٹ، دھوکے اور خرابی کی جانب مائل ہوتا ہے، نیز نچلے مراحل کے جزئی اوہام اسی باطل وجود (وہم کل) سے وجود میں آئی ہیں۔ ممکن ہے کہ رسول اکرمؐ کے فرمان ﴿إِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِي مَجْرَى الدَّمِ مِنِ ابْنِ آدَمِ﴾[۱] کا اشارہ اسی نکتے کی طرف ہو کہ وہم کل تمام جزئی اوہام پر محیط ہے یا اشارہ ہو جزئی اوہام کی طرف جو بڑے شیطان (ابلیس الابالسہ) کے کرشموں اور اثرات سے عبارت ہے۔

جہل کی صفات

اس حدیث شریف میں گاہے اشارتاً اور گاہے صریحاً جہل کے چند اوصاف کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ پہلی صفت یہ کہ جہل کی تخلیق عقل کی تخلیق کے کچھ دیر سے عمل میں آئی ہے جس کا اندازہ لفظ ''ثم'' سے ہوتا ہے۔ یہ شاید اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ یہ عقل کل اور نفس کل کے بعد خلق ہوا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے جس کی طرف قبل ازایں اشارہ کر چکا ہوں[۲] کہ حضرت صادقؑ نے عقل کل اور نفس کل کا بیان پہلے فرمایا

۱۔ بے شک شیطان خون کی طرح ابن آدم کے اندر جاری وساری رہتا ہے۔ (عوالی اللئالی، ج ۴، ص ۱۱۳، ح ۱۷۵؛ نیز موسوعۃ اطراف الحدیث النبوي الشریف، ج ۳، ص ۹۴، ۹۵)۔

۲۔ دیکھئے صفحہ ۲۹۔

اس کے بعد عقول جزئی اور جہل جزئی کا ذکر فرمایا جس کے بارے میں سائل نے سوال کیا تھا، کیونکہ اگر عقل سے مراد عقل جزئی اور جہل سے مراد جہل جزئی ہوں تو عقل کی خلقت جہل کی خلقت کے بعد قرار پاتی ہے، کیونکہ ''امکان اخس'' کے اصول کے مطابق سلسلہ ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف منتہی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ''امکان اشرف'' کا اصول ہے جس کے مطابق اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف منتہی ہوتا ہے۔ بنابریں حضرت صادقؑ نے سلسلہ نزول کی طرف اشارہ فرمایا ہے جس کی رو سے عقل کو جہل پر تقدم حاصل ہے۔

دوسری صفت یہ ہے کہ اس کا وجود سمندر سے خلق ہوا ہے۔ یہ شاید اشارہ ہو نفس کل کی طرف۔ اور نفس کل کو سمندر سے تشبیہ دینے کی وجہ یہ ہو کہ اس کا مجموعی وجود محدود ہے اور اس میں تعدد و کثرت بلکہ کثرتوں کی گنجائش ہے۔ جس طرح سمندر کئی کثرتوں اور مجموعوں کا مجموعہ ہے اور یہ جہل کے علت فاعلی ہونے کی طرف اشارہ ہے نہ کہ علت قابلی ہونے کی طرف جیسا کہ حدیث کے بڑے بڑے شارحین نے فرمایا ہے۔[۱]

تیسری اور چوتھی صفت؛ لفظ ''اجاج'' سے معلوم ہوتی ہیں، کیونکہ اجاج سے مراد نمکین، شور اور تلخ ہے۔ یہ شاید شہوت اور غضب کی دو متقابل قوتوں کی طرف اشارہ ہو جو نفس کل کے ہاں کچھ اور ہیں اور وہم کل کے ہاں کچھ اور۔ جزئی نفوس میں موجود شہوت اور غضب کی دو قوتیں ان کی رقیق اور کمزور شکل ہیں۔ ہم نے ان دونوں صفات کو جہل کے اوصاف میں شمار کیا تھا، جبکہ حدیث شریف میں ان کا شمار سمندر کے اوصاف میں کیا گیا ہے، جس کے بارے میں ہم نے کہا تھا کہ یہ نفس کل کی طرف اشارہ ہے۔ ان دونوں کا شمار جہل کے اوصاف میں کرنے کی وجہ یہ ہے کہ رقیق اشیاء میں نقص کی صفات حقائق کی بہ نسبت زیادہ کامل اور واضح ہوتی ہیں، جبکہ صفات کمال اس کی برعکس ہیں۔ بنابرایں نفوس کلی میں شہوت عبارت ہے کمال کے ساتھ عشق سے اور قوت غضب عبارت ہے نقائص کے ساتھ نفرت سے۔ اسی طرح حضرت حق کے یہاں ان دونوں کی اصل حقیقت رحمت و انتقام یا صفات جمالی وجلالی سے عبارت ہے۔ یہاں کچھ اسرار ہیں جن کے ذکر سے ہم اجتناب کریں گے۔

۱۔ شرح اصول کافی، ج۱، ص۴۰۶۔

اجاج کی ایک اور توجیہ

ممکن ہے کہ ''اجاج'' (شور اور تلخ) اشارہ ہو حقائق نفسیہ کے دو بار تنزل کی طرف جن میں سے ایک ''ماہیت'' اور دوسرا ''تعلّق'' سے مربوط ہے۔ عالم عقلی میں سرے سے اجسام کے ساتھ تعلّق نہیں ہوتا اور ان میں نورحق کی روشنیوں کے باعث ماہیت محکوم ومقہور ہوتی ہے۔ ان عوالم میں ممکن الوجود کا نقص واجب الوجود کے کمال کے باعث دور ہوتا ہے اور شاید اسی لئے اس عالم کو عالم جبروت کہتے ہیں۔

احادیث شریف کے ایک عظیم فلسفی شارح نے ''بحر اجاج'' سے مراد ''مادۃ المواد'' اور ''ہیولائے اول'' کو لیا ہے جو جہل کی علت قابلی ہے۔[۱] لیکن یہ امر اس احتمال سے ہماہنگ نہیں کہ جہل سے مراد وہم کل ہو جو عقل کی ضد ہے جیسا کہ خود انہوں نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور حدیث شریف کا اطلاق اسی پر کیا ہے۔ البتہ اگر ہم جہل سے مراد ''اوہام جزئی'' کو لیں جو ''وہم کل'' کے مظاہر میں سے ہیں تو اس صورت میں ممکن ہے کہ ''بحر اجاج'' سے مراد ''ہیولائے اول'' ہو یا پورا عالم اجسام یا ''ہیولائے ثانیہ'' اور اس کے ''اجاج'' ہونے سے مراد اس کا ناقص اور ممکن ہونا ہو۔

جہل کی پانچویں صفت: یہ اس کی تاریکی وظلمت سے عبارت ہے۔ یہ شاید شیطنت کی قوت کی طرف اشارہ ہو جو وہم کا خاصہ ہے، نیز وہم کل شیطنت کی اصل جڑ ہے اور دیگر تمام اوہام جزئیہ کی شیطنت اسی سے مأخوذ ہے اور چونکہ شیطنت اس کا خاصہ ہے اس لئے حدیث نے ظلمت کو ''اجاج'' کے برخلاف خود وہم کی صفت قرار دی ہے۔

عقل کو نور حق سے اور جہل کو بحر اجاج سے نسبت دینے کا فلسفہ

اس حدیث شریف سے ایک نکتہ ملتا ہے جو حکمت متعالیہ کا مظہر اور اسرار الٰہی کا لطیف اشارہ ہے۔ اس نکتے کو سمجھنے کیلئے عقلی ریاضتوں کے بعد ذوق سلیم اور روحانی پاکیزگی کی ضرورت ہے۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ عقل کو نورحق سے نسبت دی گئی ہے اور جہل کو شور وتلخ سمندر سے، کیونکہ عالم ملک وملکوت کے تمام کمالات، جملہ مقامات اور سارے معنوی وروحانی انوار کا سرچشمہ، نیز عالم جبروت ولاہوت کی نور افشانیوں

۱۔ دیکھئے شرح اصول کافی، ج۱، ص ۴۰۶؛ نیز فیض کاشانی کی الوافی، ج۱، ص ۶۲۔

کا مرکز اللہ جلّ جلالہ کا نور مقدس ہے۔ دیگر موجودات میں سے کوئی بھی ذاتی طور پر کسی قسم کے نور، روشنی، کمال اور عظمت کا حامل نہیں ہے مگر یہ کہ نور ازل کی روشنی اور حسن ازل کے جمال کا پرتو اس میں جلوہ گر ہو جیسا کہ آیت قرآنی ﴿اللّٰہُ نُـورُ السَّمٰـواتِ وَالأَرْضِ﴾ ۱ اسی اعلیٰ مفہوم کی طرف اشارہ ہے۔ قرآن کی آیات شریفہ اور احادیث معصومین ؑ میں اس لطیف توحیدی نکتے کے بارے میں اشارات وتصریحات موجود ہیں۔ ۲

جملہ عوالم کی نورانیت اور تمام خلقتوں کا جمال وکمال ذات حق کے نور، نیز اس ذات مقدس کے جمال وکمال کی تجلی اور ضوفشانی سے عبارت ہیں۔ اسی طرح سارے عیوب ونقائص، ہر قسم کی ظلمت وتاریکی، ہر طرح کے فقدان وعدم، ہر کثافت وغلاظت، ہر پستی وبدبختی اور ہر طرح کی ذلت ووحشت کی بازگشت عالم امکان کے نقص اور ہیولائی عالم کے بحر شور کی طرف ہوتی ہے۔ یہ شجرۂ خبیثہ تمام برائیوں کی جڑ اور ان تمام خرابیوں کا سرچشمہ ہے ﴿مٰا أَصٰابَکَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰہِ وَمٰا أَصٰابَکَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِکَ﴾ ۳ بلکہ ہر وہ نور وجمال جو حق تعالیٰ کی طرف سے وجود میں آیا ہو اور ہر وہ روشنی وحسن جو آئینہ عالم امکان میں جمیل ازلی کے جمال کا جلوہ پیش کرے اور شیطان پلید کا شیطانی ہاتھ اس کی طرف بڑھے اور عالم امکان کے نقص کے بموجب ظلم وخیانت کا شکار ہو وہ ظلمت وتاریکی، نیز فقدان وعدم اور نقص وعیب کی زد میں واقع ہوتا ہے سوائے عالم عقلی کے جو جلوہ اسمائی کے کمال اور انوار سبحانی کی عظمت کے باعث عالم امکان کے نقائص سے مبرا ہے، بلکہ یہ خالص نور اور خالص کمال کا عالم ہے۔ یہ وہ مقدس عالم ہے جو اغیار کے عمل دخل سے محفوظ ومامون ہے۔

اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ عقل کے لشکر درحقیقت خدائی لشکر ہیں اور جہل کے لشکر درحقیقت

۱۔ اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ سورۂ نور ۳۵۔

۲۔ جس طرح یہ آیت ﴿هُوَ الَّذِي فِي السَّمٰآءِ اِلٰـهٌ وَفِي الأَرْضِ اِلٰـهٌ﴾ یعنی، اللہ وہ ہے جو آسمانوں میں بھی معبود ہے اور زمین میں بھی۔ سورۂ زخرف ۸۴۔؛ نیز یہ حدیث ﴿لَوْ دُلِّيْتُمْ بِحَبْلٍ اِلَی الأَرْضِيْنَ السُّفْلیٰ لَهَبَطْتُمْ عَلَی اللّٰہِ﴾ یعنی، اگر تم کسی رسی کے ذریعے نچلی زمینوں کی طرف اترتے چلے جاؤ تو وہاں بھی خدا ہی کے ہاں اترو گے۔ (دیکھئے سنن ترمذی، ج ۵، ص ۴۰۵)۔ مزید تفصیل کیلئے دیکھئے امام خمینیؒ کی مصباح الہدایہ، ص ۹۸۔

۳۔ جو بھی بھلائی تجھے پہنچے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو برائی تجھے پہنچے وہ تیری اپنی طرف سے ہے۔ سورۂ نساء ۷۹۔

شیطانی لشکر ہیں۔ ہر نقص وعیب اور کمی ابلیس سے منسوب ہے اور ہر کمال وعظمت خدا سے مربوط ہے۔ البتہ توحید تام اور نفی کثرت کی رو سے ﴿کُلٌّ مِنْ عِنْدِ اللہ﴾[۱] کی مضبوط بنیاد سامنے آتی ہے۔

اس نکتے کو سمجھنے کیلئے ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں:

سورج کی جو کرن کسی روشندان سے کمرے میں آ رہی ہو اس کا نور سورج کی بدولت ہے، لیکن اس کی محدودیت روشندان کی وجہ سے ہے۔ دوسری طرف سے اگر سورج ہی نہ ہوتا تو نہ روشندان سے آنے والی روشنی ہوگی اور نہ ہی اس کی محدودیت۔

دوسری مثال: اگر ہم ایک آئینے کو جس کا طول وعرض ایک ہاتھ ہو سورج کی روشنی کے سامنے رکھیں تو اس آئینے کے طول وعرض کے حساب سے ایک روشنی دیوار پر پڑے گی۔ یہاں بھی روشنی سورج کی بدولت ہے، لیکن اس کی محدودیت آئینے کی وجہ سے۔ دوسری طرف سے اگر سورج ہی نہ ہوتا تو کوئی روشنی نہ ہوتی اور جب روشنی نہ ہوتی تو آئینے کی روشنی بھی نہ ہوتی۔ نتیجتاً آئینے کی روشنی کی محدودیت بھی نہ ہوتی۔

۱۔ اشارہ ہے اس آیت شریفہ کی طرف ﴿وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ یَقُولُوا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللهِ، وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَیِّئَةٌ یَقُولُوا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِکَ، قُلْ کُلٌّ مِنْ عِنْدِ اللهِ﴾ اگر انہیں کوئی بھلائی نصیب ہو تو کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر وہ کسی برائی سے دوچار ہوں تو کہتے ہیں یہ تیری طرف سے ہے، کہہ دیجئے سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے۔ سورۂ نساء ۷۸۔

مقالہ / ۴

عقل وجہل کا اقبال وادبار

عقل کل کا ادبار (پیچھے مڑنا) جسے ایک اور حدیث میں اقبال (سامنے رخ کرنا) کہا گیا ہے[۱]، عبارت ہے: غیبی پردوں کے پیچھے سے گزر کر خلقت کے آئینوں میں عقل کل کے نور کے ظہور سے۔ البتہ یکے بعد دیگرے اپنی نزولی ترتیب کے ساتھ یہاں تک کہ یہ نزولی سلسلہ مشہود مطلق تک پہنچ جائے جس کا آئینہ ''طبیعۃ الکل'' ہے۔ چنانچہ معلّم اول ارسطو[۲] نے کہا ہے: ﴿العَقْلُ نَفْسٌ ساكِنٌ وَالنَّفْسُ عَقْلٌ مُتَحَرِّكٌ﴾[۳] عقل ساکن جان ہے جان متحرک عقل ہے۔ یہ ''اقبال'' اشارہ ہے مختلف عوالم کے درمیان

۱۔ اصول کافی، ج۱ص۸، کتاب العقل والجہل، ح۱؛ نیز یہی جلد،ص۲۰، ح۲۶،اس حدیث کے الفاظ یوں ہیں: ﴿قالَ لَهُ: أقْبِلْ فَأقْبَلَ، ثُمَّ قالَ لَهُ: أدْبِرْ فَأدْبَرَ﴾۔

۲۔ ارسطو جسے ارسطا طالیس بھی کہا جاتا ہے یونان کے معروف ترین فلسفیوں میں سے ایک ہیں۔ وہ سنہ ۳۸۴ قبل از میلاد، مقدونیہ میں پیدا ہوئے اور ۳۲۲ قبل از میلاد میں وفات پا گئے۔ ان کے والد نیفو ماخس فیثا غوری اور استاد افلاطون تھے۔ ارسطو نے اس عظیم استاد کے پاس ۲۰ سال علم حاصل کیا۔ ارسطو سکندر اعظم کے استاد تھے۔ سکندر نے ۱۲ سال تک ارسطو کی شاگردی کی۔ ارسطو کی تالیفات بہت زیادہ ہیں جو اس عصر کے علوم پر مشتمل ہیں۔ ارسطو اپنے افکار و آثار کے ذریعے صدیوں تک دانشوروں کے اذہان پر چھایا رہا۔ بہت سے مسلمان مفکرین اور دانشوروں نے بھی ارسطو کے افکار سے استفادہ کیا ہے اور ان کی کاوشوں کا عربی میں ترجمہ کیا ہے۔ ارسطو کی تالیفات میں: مابعد الطبیعہ، اخلاق اور منطق شامل ہیں۔
(معجم المطبوعات العربیہ، ج۱ص۴۲۴)۔

۳۔ دیکھئے اثولوجیا (ایتھولوجی)، میمر ثانی،ص۳۴ فصل ۲۲،ص۲۰۹۔اثولوجیا کی عبارت یہ ہے: ﴿فَالنَّفْسُ تَتَحَرَّكُ عَلىٰ شَيْءٍ ساكِنٍ غَيْرِ مُتَحَرِّكٍ، وَهُوَ العَقْلُ﴾ یاد رہے کہ فلسفی حضرات کتاب ایتھولوجی کو (جو معرفت ربّ کے معنی میں ہے) ارسطو کی تالیف سمجھتے ہیں، لیکن تحقیقات کے مطابق یہ ارسطو کی کتاب نہیں، بلکہ فلوطین کی تساعیات ہے جس -->

موجود شدید ارتباط واتحاد کی طرف جسے ظاہریت، مظہریت، جلوہ، تجلی، بطون اور ظہور بھی کہا گیا ہے، اقبال وادبار کے یہ خدائی الفاظ اس کے حکم تکوینی سے عبارت ہیں۔ جس طرح اس کا قول ﴿إذا أرادَ شَيْـئـاً أنْ يَـقُـولَ لَـــهُ كُنْ فَيَكُونُ﴾ ۱ جو اللہ کے افاضۂ اشراقی اور تجلی غیبی سے عبارت ہے۔ احادیث شریف میں گاہے ادبار کی جگہ اقبال اور اقبال کی جگہ ادبار کا استعمال ہوا ہے ۲ یہ شاید اس بات کا اشارہ ہو کہ عقل کل کا اقبال عین ادبار اور اس کا ادبار عین اقبال ہو یا اس کی وجہ یہ ہو کہ عروج ونزول کی یہ حرکت دوری حرکت (Circulatory Motion) ہے اور دوری حرکت میں ابتدا و انتہا ایک ہی ہوتی ہے، اگر چہ یہ حرکت دوری جسمانی نہیں بلکہ معنوی حرکت سے عبارت ہے یا اس کی وجہ اللہ کی قیومیت کے احاطہ کو بیان کرنا ہو۔ جیسا کہ حدیث میں مذکور ہے کہ مچھلی کا شکم یونس کیلئے معراج تھا ۳ جس طرح آسمانوں کی طرف عروج حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیلئے معراج تھا۔ بنابریں غیب مطلق کی طرف اقبال (رخ کرنا) عین ادبار اور ادبار عین اقبال ہے۔

عقل کل کا اقبال عبارت ہے ''طبع کل'' کے ''مثال کل'' کی طرف، مثال کل کے نفس کل کی طرف، نفس کل کے عقل کل کی طرف اور عقل کل کے فناء کل کی طرف لوٹنے سے ﴿كَـمـا بَـدَأكُمْ تعُودُونَ﴾ ۴ یہ قیامت کبریٰ پر ختم ہوتا ہے۔

<-- کی تشریح فرفوریس صوری نے کی ہے اور عبدالمسیح بن عبداللہ بن ناعمہ حمصی نے اس کا عربی ترجمہ کیا ہے۔ (دیکھئے افلوطین عندالعرب، محقق عبدالرحمٰن بدوی)۔

۱۔ جب وہ کسی چیز (کو بنانے) کا ارادہ کر لیتا ہے تو بس اس کا امر یہ ہوتا ہے: ہو جا، پس وہ (موجود) ہو جاتی ہے۔ سورۂ یاسین ۸۲۔

۲۔ جیسا کہ ص ۴۵ میں گزر چکا۔

۳۔ فیض کہتے ہیں: معراج نبی اللہ کا عظیم ترین معجزہ تھا۔ کچھ دیگر انبیاء بھی معراج کے حامل تھے۔ یونسؑ کا معراج مچھلی کی پیٹ میں جانا تھا۔ وہ ساتویں زمین تک چلے گئے اور وہاں کے اسرار سے آگاہ ہوئے، یہ وہی معراج ہے۔ (علم الیقین، ج ۲، ص ۵۲۰)۔

۴۔ جس طرح اس نے تمہیں ابتداء میں پیدا کیا ہے اسی طرح پھر پیدا کئے جاؤ گے۔ سورۂ اعراف ۲۹۔

عقل کے ادبار واقبال کا ایک اور مفہوم

اقبال وادبار شاید اشارہ ہوں اسمائے ظاہری وباطنی کے تحت تجلی سے جو ''تجدد امثال'' کی صورت میں مسلسل طور پر واقع ہوتا ہے رہتا ہے، جیسا کہ صاحبان معرفت کہتے ہیں[۱] اور ہم نے اس کے ذریعے عالم ملک وملکوت اور ناسوت وجبروت میں رہنے والوں کے حدوث زمانی کی عرفانی توجیہ وتصحیح اس طرح کی تھی جو مقدس مقامات عقلیہ کی منافی نہ ہو۔[۲] یاد رہے کہ یہ اس بندہ ناچیز پر حق تعالیٰ کی خصوصی عنایات میں سے ایک ہے (حمد وشکر ہے اللہ کیلئے)۔ یہ حرکت صعودی ونزولی وہ نہیں جس کا ذکر محقق فلاسفہ نے کیا ہے۔[۳]

رہا جہل کا ادبار (پیچھے مڑنا) تو وہ عبارت ہے اوہام جزئیہ کے تاریک اور دھندلے آئینے میں وہم کل کے نزول سے۔

جہل کل کا سامنے مڑنا، جہل اپنی محدودیت نیز کثرت اور غیریت کے آثار کے غلبہ کی بناء پر اقبال (سامنے رخ کرنے) کی صلاحیت سے محروم ہے۔ اس کے برعکس عقل کل غیریت کے حدود وقیود سے منزہ اور عاری ہے اس لئے ماہیتوں کی ظلمت وتاریکی اس پر اثر انداز نہیں ہوسکتی۔ ادھر جمال جبروت کے نور کو خلقت کے تاریک پہلو پر غلبہ وتسلط حاصل ہوتا ہے، اسی لئے وہ غیب کل کی طرف رجوع کرتا ہے اور بارگاہ لاہوت میں فانی ہونے کیلئے حاضر ہوتا ہے، لیکن وہم کل ماہیات کی تاریکیوں اور عالم کثرت کی محدودیتوں سے مربوط ہونے، نیز فقدان ونقائص اور مختلف حدود وقیود سے مخلوط ہونے کی بناء پر درگاہ قرب ازلی اور بارگاہ سرمدی سے دور اور اس کے اندر فانی ہونے کی صلاحیت سے محروم ہے۔ بنابریں وہ اس نوری اشراق اور سرمدی فیض کو قبول کرنے کی لیاقت اور اس امر الٰہی کی بجاآوری کی صلاحیت سے عاری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ صاحبان قرب کی مقدس بارگاہ سے دور اور صاحبان معرفت کی محفل سے محروم ہوتا ہے۔

۱۔ دیکھئے داؤد قیصری کی شرح فصوص الحکم، فص شیثی، ص ۱۱۷؛ نیز فص اسماعیلی، ص ۲۱۰؛ نیز فص شعیبی، ص ۲۸۷؛ نیز فص سلیمانی، ص ۳۵۹۔

۲۔ دیکھئے ص ۳۰، حاشیہ نمبر ۳۔

۳۔ ملا صدرا کہتے ہیں: اقبال اوپر کی طرف حرکت اور ادبار نیچے کی طرف حرکت (تنزل) کی طرف اشارہ ہے۔ کامل انسان دو حرکتوں کا حامل ہے۔ یعنی ایک حرکت اقبالی (اوپر کی طرف) اور دوسری حرکت ادباری (نیچے کی طرف)۔
دیکھئے شرح اصول کافی، ج ۱، ص ۴۳۰، ۵۷۵۔

رہا عقول جزئیہ کا ادبار (پیچھے مڑنا) تو وہ عبارت ہے تکامل، روحانی قوت اور باطنی ترقی حاصل کرنے کیلئے عالم کثرت و مادہ کی طرف اس کی توجہ اور تعینات کے ساتھ اس کے سروکار سے، کیونکہ یہ مقاصد عالم کثرت میں واقع ہوئے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے۔ درحقیقت ایک لحاظ سے یہی چیز حضرت آدمؑ کی خطایا خطائے آدمؑ (علیٰ نبینا و آلہ وعلیہ السلام) کی ایک صورت ہو سکتی ہے، کیونکہ آدم علیہ السلام غیبی جذبے کے تحت باقی رہتے اور فنا و بے خبری کے اس حال میں (جو بہشت دنیا سے عبارت ہے) مگن رہتے تو پھر تعمیر عالم اور کسب کمالات کی نوبت ہی نہ آتی۔ شیطان کی کارستانی کے نتیجے میں عالم کثرت کی طرف آدمؑ کی توجہ مبذول ہوگئی اور آپؑ نے گندم کے پودے سے (جو جنت میں دنیا کی تصویر سے عبارت ہے) تناول فرمایا۔ اس توجہ کے بعد عالم کثرت کا دروازہ کھل گیا، نیز حصول کمال و تکامل، بلکہ جلا اور استجلاء، یعنی خود ظاہر ہونے اور ظاہر کرنے کی راہیں وا ہوگئیں۔ پس اگرچہ مسلک عشق و محبت میں عالم کثرت کی طرف (آدمؑ کی) یہ توجہ غلطی اور خطا تھی لیکن عقل اور قانون نظام اکمل کی رو سے یہ امر ضروری اور لازمی تھا۔ چنانچہ یہ (توجہ) تمام بھلائیوں، جملہ کمالات اور خدائے رحمان ورحیم کے خوان رحمت کی وسعت کا سبب بن گئی۔

پس ادبار (پیچھے مڑنا) عبارت ہے سات پردوں (حجابوں)[1] کے اندر چلے جانے سے۔ جب تک کوئی ان پردوں کے اندر واقع نہ ہو اس وقت تک پردوں کو چیرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی۔

رہا عقول جزئیہ کا اقبال (سامنے مڑنا) تو وہ عبارت ہے مخلوق اور خالق کے درمیان حائل سات حجابوں کو توڑ کر باہر نکلنے سے۔ یہ سات پردے بنیادی پردے ہیں اور ان عقول کی تعینات اور وجود کی محدودیتوں سے عبارت ہیں۔ کبھی ستر حجابوں اور کبھی ستر ہزار حجابوں کا بھی ذکر ہوا ہے۔ البتہ مراتب اور جزئیات کے حساب سے۔ چنانچہ حدیث میں مذکور ہے: ﴿اِنَّ لِلّٰهِ سَبْعِيْنَ اَلْفَ حِجَابٍ مِنْ نُورٍ وَسَبْعِيْنَ اَلْفَ حَجابٍ مِنْ ظُلْمَة...﴾[2]

۱۔ سات حجابوں کے بارے میں دیکھئے: محمد صالح مازندرانی کی شرح اصول کافی، ج ۹، ص ۵۷؛ نیز علامہ مجلسی کی مرآۃ العقول، ج ۹، ص ۱۷۔

۲۔ بے شک اللہ کیلئے نور کے ستر ہزار حجاب اور ظلمت کے ستر ہزار حجاب ہیں۔
دیکھئے، بحار الانوار، ج ۵۵، ص ۴۵، حدیث ۱۳؛ نیز فیض کاشانی کی الوافی، ج ۵، ص ۶۱۴؛ نیز موسوعۃ اطراف الحدیث النبوی، ج ۳، ص ۳۹۵۔

پس سالک راہ حق جب قوانین الٰہیہ کا پابند ہوتا ہے اور لباس شریعت کو زیب تن کرتا ہے نیز تزکیہ نفس، تہذیب باطن، تطہیر روح اور دل کو پاک کرنے میں لگ جاتا ہے تو اس کے دل کے آئینے میں رفتہ رفتہ اللہ کے غیبی انوار کی تجلیاں ظاہر ہوتی ہیں، نیز وہ باطنی جذبات اور فطری عشق کے ذریعے عالم غیب میں مجذوب ہوجاتا ہے۔ ان مراحل کو طے کرنے کے بعد باطنی اور غیبی امداد کے سہارے اللہ کی طرف سفر کا آغاز ہوتا ہے، نیز سالک کا دل حق کا طالب اور حق پرست بن جاتا ہے پھر اس کا دل مادیات سے جدا اور حقیقت سے منسلک ہوجاتا ہے۔ اس کے علاوہ آتش محبت اور نور ہدایت (جن میں سے ایک رفرف عشق اور دوسرا براق سفر ہے) کے ذریعے کوچہ محبوب اور جمیل ازل کے جمال کی جانب روانہ ہوتا ہے۔ یوں غیر اللہ کی طرف توجہ کا خاتمہ ہوتا ہے اور شیطانی آلودگیوں سے پاک دل کے ساتھ اپنی منزل مقصود کی طرف روانہ ہوتا ہے، کیونکہ آلودگی وگندگی ہی غیریت کی بنیاد نیز کثرت ودوئی کی اصلی جڑ ہے۔ یوں وہ ﴿وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ...﴾[1] کا نغمہ الاپنے لگتا ہے اور خلیلؑ کی طرح آفلین (ختم رغروب ہونے والوں) سے نفرت اور دوری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، کیونکہ آفلین نقائص، خرابیوں اور گندگیوں کی آماجگاہ ہیں۔ یوں کمال مطلق کی طرف توجہ اس کے دل میں نقش ہوجاتی ہے۔ پھر جب وہ مکمل طور پر کائنات اور کائنات کے اندر موجود ہر چیز (جن میں سے ایک وہ خود بھی ہے) سے فانی (منقطع) اور حق جل جلالہ کے ساتھ باقی بن جاتا ہے تو اس وقت اقبال کا مفہوم حقیقت میں بدل جاتا ہے۔

ان بیانات سے معلوم ہوا کہ جہل کیلئے ادبار (منہ پھیرنا) آسان اور حقیقت بن جاتا ہے اور یہ ادبار عبارت ہے تعمیر دنیا کی طرف توجہ، مادیت کے شجرہ خبیثہ سے مکمل لگاؤ، نیز خواہشات وشہوات کی تکمیل اور ظلمتوں میں غوطہ زن ہونے کی شدید خواہش سے۔ درحقیقت جہل اسی کا مستحق ہے۔

رہا اقبال (سامنے رخ کرنا) تو وہ جہل کل کیلئے ممکن نہیں، کیونکہ یہ دو اعلیٰ اصولوں پر مبنی ہے۔ ان میں سے ایک مکمل طور پر انانیت اور خود پرستی کو ترک کرنا ہے جس کے اندر وہ لپٹا ہوا ہے۔ جہل جس قدر مدارج جہلیہ کو طے کرے اسی قدر اس کے اندر یہ صفت (خود پرستی اور خود بینی) مزید پروان چڑھتی ہے۔ یہی وجہ

۱۔ میں نے خلوص کے ساتھ اس کی طرف رخ کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو خلق کیا۔ سورۂ انعام ۷۹۔

ہے کہ شیطان کی چار ہزار سالہ عبادت[1] کا نتیجہ اس کی انانیت، خود بینی اور تکبّر میں اضافہ کے سوا کچھ نہ نکلا اور بات یہاں تک پہنچی کہ وہ حکم خداوندی کے آگے اکڑ گیا اور کہنے لگا: ﴿خَلَقْتَنِي مِنْ نَارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِين﴾[2] یوں وہ جہل خود بینی اور خود پرستی کی شدت کی وجہ سے آدمؑ کے نور کو نہ دیکھ سکا اور اس نے غلط قیاس کیا۔

دوسرا اصول ہے کمال مطلق سے محبت جو انسان کی فطرت اور خمیر میں شامل اور داخل ہے۔ یہ صفت جمیل کے اندر مغلوب ومحکوم بلکہ کبھی مفقود و معدوم ہوتا ہے۔ جہنم میں ہمیشہ رہنا نور فطرت کی خاموشی کا نتیجہ ہے اور یہ مکمل طور پر ﴿اِخلادِ اِلَی الأرْض﴾[3] سے حاصل ہوتی ہے۔

عقل وجہل کے ادبار میں فرق کا بیان

یاد رہے کہ عقل کے ادبار اور جہل کے ادبار میں ایک واضح اور آشکار فرق موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ عقل کا ادبار عالم کثرت اور عالم طبیعت (مادہ) کی طرف رخ کرنے سے عبارت ہے۔ یہ ادبار حق کی مکمل اطاعت اور پیچھے مڑنے کے خدائی حکم کے آگے سر تسلیم خم ہونے کا دوسرا نام ہے۔ بنابریں یہ ادبار عقل کل پر اثر انداز نہیں ہوتا اور عقل کل کو اس کے مقدس مقام سے ساقط نہیں کرتا اور نہ اس کیلئے حجاب کا باعث بنتا ہے۔ چنانچہ مروی ہے کہ صاحب عقل کل نے فرمایا: ﴿مَا رَأَيْتُ شَيْئاً اِلّا وَرَأَيْتُ اللهُ قَبْلَهُ وَمَعَهُ وَبَعْدَه﴾[4]

ممکن ہے کہ اس سے مراد دنیا کی طرف توجہ اور دار طبیعت (مادی عالم) میں وارد ہونا۔ جیسا کہ ارشاد

۱۔ نہج البلاغہ میں مذکور ہے: ﴿وَكَانَ قَدْ عَبَدَ اللهَ سِتَّةَ آلافِ سَنَة﴾ یعنی، شیطان نے چھ ہزار سال تک اللہ کی عبادت کی۔ نہج البلاغہ، ص۴۲۰، خطبہ قاصعہ، ۱۹۲۔

۲۔ تو نے مجھے آگ سے خلق کیا اور آدم کو مٹی سے۔ سورۂ اعراف ۱۲۔

۳۔ یہ تعبیر سورۂ اعراف کی آیت ۱۷۶ سے ماخوذ ہے جو یہ ہے ﴿وَلٰكِنَّهُ أَخْلَدَ اِلَى الأَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوَاه﴾ لیکن وہ زمین کا ہو رہا اور اس نے نفسانی خواہش کی متابعت کی۔

۴۔ میں نے کسی چیز کو نہیں دیکھا مگر یہ کہ اس سے قبل، اس کے ساتھ اور اسکے بعد اللہ کو بھی دیکھا۔ علم الیقین، ج۱، ص۴۹۔

خداوندی ہے: ﴿وَاِنْ مِنْكُمْ اِلاَّ وَارِدُهَا﴾ ۱ کیونکہ دارطبیعت جہنم کی ظاہری شکل ہے اور جہنم مادی دنیا کا باطن ہے۔ اس بناپر صراط (جو جنت کی طرف گزرنے کا راستہ ہے) عین جہنم پر واقع ہے۔ ممکن ہے کہ آگ نے اسے گھیر رکھا ہو، یعنی صراط آگ کے درمیان سے گزرتا ہو۔ البتہ جہنم کے شعلے مؤمن کیلئے بجھ جائیں گے۔ چنانچہ حدیث میں مذکور ہے: ﴿اِنَّ النَّارَ تَقُولُ لِلْمُؤْمِنِ يَوْمَ القِيامَةِ جُزْ يا مُؤْمِنُ فَقَدْ اَطْفَأَ نُورُكَ لَهَبِي﴾ ۲ مؤمن کیلئے آتش جہنم کے بجھنے کی وجہ یہ ہے کہ مؤمن نور عقل کا حامل ہوتا ہے۔ وہ جس قدر نور عقل کا حامل ہوگا اسی حساب سے جہنم کے شعلوں پر غالب آئے گا۔ دنیا میں آتش شہوت اور آتش غضب کے شعلے جہنم کے شعلوں کے جلوے ہیں۔ چونکہ مؤمن عقل کل کا مالک نہیں ہوتا، ساتھ ساتھ وہ دنیا اور عالم طبیعت (نیچر) سے بھی مربوط رہتا ہے۔ (البتہ اس کے اعمال اور اس کی ریاضتوں کے حساب سے عقل کا نور مذکورہ شعلوں پر غالب آتا ہے) اس لئے مذکورہ الفاظ سے یاد کیا گیا ہے۔

رہے صاحبان عقل کل اور اولیاء کامل (علیہم صلوات اللہ) تو ان کے بارے میں حدیث نبوی ؐ ہے: ﴿جُزْنا وَهِيَ خامِدَةٌ﴾ ۳ کیونکہ عالم طبیعت کو نفوس کاملہ پر دسترس حاصل نہیں ہوتی اور یہ ہستیاں مادی جہنم کے شعلوں سے مکمل طور پر محفوظ ومامون ہوتی ہیں، کیونکہ وہ عالم مادہ کو بھی خدائی رنگ میں ڈھال لیتی ہیں اور ان کا شیطان ان کے ہاتھ پر ایمان لے آتا ہے۔ ۴ پس ان کی عقل کل کا جلوہ پورے عالم طبیعت پر

۱۔ تم میں سے کوئی ایسا نہیں جو جہنم پر وارد نہ ہو۔ (دیکھئے سورۂ مریم آیت ۷۱؛ نیز مجمع البیان، ج ۶، ۵، ص ۸۱۱)۔

۲۔ قیامت کے دن آگ مؤمن سے کہتی ہے: اے مؤمن گزر جا! بہ تحقیق تیرے نور نے میرے شعلوں کو بجھا دیا۔ (دیکھئے تفسیر نور الثقلین، ج ۳، ص ۳۵۴، ح ۱۳۳)۔

۳۔ ہم نے (آتش جہنم کو) عبور کیا، جبکہ وہ خاموش اور بجھی ہوئی تھی۔ (دیکھئے فیض کاشانی ؒ کی علم الیقین، ج ۲، ص ۹۷۱، باب ۹، فصل ۲، مقصد ۴)۔

۴۔ اشارہ ہے اس حدیث نبوی ؐ کی طرف ﴿ما مِنْكُمْ اِلاَّ وَلَهُ شَيْطانٌ. قالُوا: وَاَنْتَ يا رَسُولَ اللهِ؟ قالَ: وَاَنا، اِلاَّ اَنَّ اللهَ اَعانَنِي عَلَيْهِ، فَاَسْلَمَ عَلىٰ يَدَيَّ﴾ یعنی تم میں سے ہر ایک کیلئے ایک شیطان ہے۔ سامعین نے سوال کیا: اے رسول خدا! آپ کیلئے بھی؟ فرمایا: ہاں! میرے لئے بھی۔ البتہ اللہ نے اس کے مقابلے میں میری مدد کی ہے اور وہ میرے ہاتھوں مسلمان ہو چکا ہے۔ (دیکھئے عوالی اللئالی، ج ۴، ص ۹۷ حدیث ۱۳۳؛ نیز مسند احمد بن حنبل، ج ۱، ص ۲۵۷، نقل میں اختلاف کے ساتھ)۔

حکمفر ما ہے اور عالم طبیعت کی شب اپنی ابتداء سے لے کر طلوع فجر قیامت تک ان کیلئے شب قدر کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ہستیاں اس رات کی ابتدا سے انتہا تک ابلیس اور اس کی جالوں (یعنی عالم مادہ اور اس سے مربوط امور) سے محفوظ ہیں ﴿سَلامٌ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الفَجْرِ﴾ ۔[1] اسی لئے ان کے بارے میں ﴿جُزْنَا وَهِيَ خامِدَة﴾ کہا گیا ہے، جبکہ مؤمن کے معاملے میں ﴿فَقَدْ أَطْفَأ نُورُكَ لَهَبِي﴾ کہا گیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ اس عالم رنگ و بو میں عقل کا وارد ہونا ایک باحفاظت یا قریب السلامۃ وارد ہونا ہے اور اس وارد ہونے کا مقدمہ امر خداوندی کی اطاعت اور اس کا نفاذ ہے، نیز عقل کل کیلئے آئینہ تفصیل و خلقت میں حسن جمیل مطلق کی رؤیت، عالم کثرت میں توحید کے پھیلاؤ اور کثرت کو توحید کی طرف لوٹانے سے عبارت ہے۔ بنابریں مکمل فلاح کلمہ ﴿لاَ اِلٰـــهَ اِلاَّ اللهُ﴾ میں ہے[2] البتہ توحید کی حقیقتوں اور کلمہ ﴿لاَ اِلٰـــهَ اِلاَّ اللهُ﴾ کے بہت سارے مراحل و مدارج ہیں جن کی تعداد شاید تمام مخلوقات کی سانسوں کے برابر ہو۔ پس توحید مطلق (جس کی کامل ترین شکل ﴿لاَ اِلٰـــهَ اِلاَّ اللهُ﴾ ہے) ہی فلاح مطلق کی ضامن ہے جو عالم کثرت (جو شجرۂ خبیثہ کی جڑ ہے) سے نجات سے عبارت ہے۔ یوں کوئی چیز اس کلمہ پاک کی برابری نہیں کر سکتی، جیسا کہ احادیث میں مذکور ہے۔[3]

توحید کی محدود و مقید صورتیں بھی ہیں جو عام اہل ایمان اور متوسطین کی توحید ہیں۔ ان صورتوں میں فلاح بھی محدود و مقید ہے، نیز ان کی سلامتی بھی محدود ہے۔

توحید کامل کے حامل افراد اس عالم رنگ و بو سے احتراز اور گریز کرتے ہیں، جیسا کہ اولیاء خدا کے حال سے معلوم ہوتا ہے۔[4] اس کی وجہ یہ ہے کہ خلقت کے آئینوں میں جمیل مطلق کے جمال کے مشاہدے

۱۔ شب قدر سلامتی ہے طلوع فجر تک۔ سورہ قدر ۵۔

۲۔ حدیث نبوی ہے: ﴿قُولُوا لاَ اِلٰـــهَ اِلاَّ اللهُ تُفْلِحُوا﴾ کہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں تاکہ تم فلاح پاؤ۔ (دیکھئے مسند احمد بن حنبل، ج ۳، ص ۴۹۲؛ نیز سنن الکبری بیہقی، ج ۶، ص ۲۱۔

۳۔ دیکھئے توحید صدوق، باب ثواب الموحدین، ص ۱۸ حدیث ۱، ۲، ۳۔

۴۔ امیر المؤمنین مولی الموحدین علی بن ابی طالب (علیہما السلام) فرماتے ہیں: ﴿وَلَولاَ الأَجَلُ الَّذِي كَتَبَ اللهُ عَلَيْهِمْ لَمْ تَسْتَقِرَّ أَرْوَاحُهُمْ فِي أَجْسَادِهِمْ طَرْفَةَ عَيْنٍ أَبَداً﴾ یعنی، اگر اللہ نے ان کیلئے ایک خاص وقت (اجل) معین نہ فرمایا ہوتا تو ان کی ارواح ان کے ابدان میں ایک لحظہ کیلئے بھی قرار نہ پکڑتیں۔ (نہج البلاغہ، ص ۹۴، خطبۃ المتقین ۵)۔

نیز آئینوں کوتوڑ کر ظلمانی ونورانی پردوں کے پرے سے جمال مطلق کو دیکھنے میں بہت فرق ہے۔ چنانچہ اللہ کے ولی مطلق حضرت امیر المؤمنین (علیہ الصلاۃ والسلام) مناجات شعبانیہ میں اللہ کے حضور عرض کرتے ہیں: ﴿وَأَنِرْ أَبْصَارَ قُلُوبِنَا بِضِيَاءِ نَظَرِهَا إِلَيْكَ حَتَّىٰ تَخْرِقَ أَبْصَارُ الْقُلُوبِ حُجُبَ النُّورِ فَتَصِلَ إِلَىٰ مَعْدِنِ الْعَظَمَةِ﴾ ا آپ کیلئے تمام پردے نورانی ہیں، کیونکہ تاریک حجابوں کی برگشت عالم طبیعت اور اس کے لوازم کی طرف ہوتی ہے، جبکہ امیر المؤمنینؑ اور آپؑ کی معصوم ذریتؑ عالم طبیعت کی تاریکیوں اور اس کے حجابوں سے مبرا تھی، بلکہ عالم طبیعت اس کی محدودتیں اور اس کی تعینات بذات خود ان ہستیوں کیلئے نورانی پردوں کی حیثیت رکھتی ہیں، کیونکہ ان کی قلبی توجہ ہمیشہ موجودات کے خدائی وغیبی پہلو کی طرف رہی اور یہ کائنات اپنی دوئی اور غیریت کے زاویے سے ان کے ہاں فراموش شدہ چیز ہے۔ پس انہیں حضور دائمی حاصل ہے لیکن چونکہ وہ ظاہری خلقت کے لحاظ سے عالم ملک اور مادی دنیا میں واقع ہوئے ہیں اس لئے خلقت کے آئینے نورانی حجاب ہی یہاں تک کہ وہ سلوک ولایتی اور ریاضت کے ذریعے ان حجابوں کوتوڑ کر تقدس، طہارت اور پاکیزگی کے عالم میں واپس آتے ہیں۔ تقدیس، توحید، تفرید اور تجرید کی صورت میں حق ان کے باطن میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ یوں وہ ﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ﴾ ا کی حقیقت کو پالیتے ہیں اور اسی عالم میں ان کی قیامت کبریٰ واقع ہوتی ہے اور روز قیامت کا سورج ان کیلئے طلوع ہوتا ہے اور عظمت کے سرچشمے تک رسائی حاصل ہوتی ہے جو ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، نیز ان کی ارواح عزت وعظمت خداوندی کے ساتھ معلّق ہوجاتی ہیں اور حق اپنے علاوہ ہر چیز کو ان سے بھلوادیتی ہے ﴿رَزَقَنَا اللهُ وَإِيَّاكُمْ جَذْوَةً أَوْ قَبَساً مِنْ نَارِهِمْ وَنُورِهِمْ﴾۔۲

خلاصہ یہ کہ عقل کل کے ادبار سے مراد اس کا عالم کثرت وتفصیل میں حجابوں کوتوڑ کر وارد ہونا ہے، نیز عقل کے اقبال سے مراد حجابوں کوتوڑنا اور عظمت کے سرچشمے تک رسائی حاصل کرنا ہے۔ بنابریں عقل کا ادبار درحقیقت اقبال ہے جس طرح حضرت یونس (علیٰ نبینا وآلہ وعلیہ السلام) کا مچھلی کے پیٹ میں جانا درحقیقت ان کی معراج تھی۔

۱۔ اس دن حکومت کس کی ہے؟ سورہ غافر ۱۶۔

۲۔ اللہ ہمیں اور آپ کو ان کے آتش (ایمان) اور نور سے کوئی حصہ عطا فرمائے)۔

رہا جہل کا ادبار تو یہ امر خداوندی کی تعمیل اور حکم ادبار کی بجا آوری کیلئے نہ تھا، بلکہ اس کی خودسری، خودنمائی، شیطنت اور خواہشات کی تکمیل کیلئے تھا۔ بنابریں اس ادبار کی وجہ سے وہ حق کی قربت سے دور اور محروم ہو گیا اور وہ عالم طبیعت و مادہ کے تاریک کنویں میں اس طرح گر گیا کہ اس سے نکلنا اس کیلئے ہرگز ممکن نہ ہو۔ یوں مادی زمین کے ساتھ اس کی وابستگی وجود میں آئی جو درحقیقت جہنم کے ساتھ وابستگی کی ظاہری شکل ہے۔ پس اس کا سارا سفر طبیعیاتی و مادی کی طرف اور اس کی منزل مقصود بھی مادی و طبیعی ہے۔ اس کا سفر نفس سے نفس تک اور خواہشات سے خواہشات کی طرف ہے۔ اس کا تکاملی سفر بھی کمال جہل کی طرف ہے۔

پس اگرچہ جہل کل (جو وہم کل اور ابلیس اعظم سے عبارت ہے) کا تعلّق عالم غیب سے ہے اور وہ برزخی تجرد کا حامل ہے، نیز عالم مثال سے اس کا تعلّق ہے اور اشیاء پر عالم مثال والا احاطہ رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں اسی کے بارے میں کہا گیا ہے ﴿يَجْرِي مَجْرَىٰ الدَّمِ مِنِ ابْنِ آدَمَ﴾[۱] لیکن ان باتوں کے باوجود وہ ذاتی طور پر محجوب اور فطری طور پر مطرود و ملعون ہے۔ اگر وہ چار ہزار تک عبادت کرے تب بھی اس کے یہی سجدے اسے قرب خداوندی سے دور اور وصال محبوب سے محروم بنا دیں گے، کیونکہ اس کی عبادت خواہشات اور خود پرستی پر مبنی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابلیس کی کئی ہزار سالہ عبادت کا نتیجہ خود بینی اور تکبر کی صورت میں نکلا اور اس نے آخر کا حکم خداوندی کے مقابلے میں ﴿خَلَقْتَنِي مِنْ نَارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ﴾[۲] کا نعرہ لگایا۔ یوں وہ اپنی خود پسندی، خود بینی اور غرور کے باعث درگاہ قدس سے نکالا ہوا اور مقام انس سے مطرود ہوا۔ پس اس کا اقبال کہ حکم کی ہرگز اطاعت نہیں کی جیسا کہ حدیث کہتی ہے: ﴿ثُمَّ قَالَ لَهُ: أَقْبِلْ فَمَا أَقْبَلَ﴾ (پھر اس سے فرمایا: سامنے کی طرف رخ کر! لیکن وہ سامنے کی طرف نہ مڑا)۔

ایک عرفانی نکتہ اور ایمانی حقیقت

جان لو کہ آدمؑ اول عقل کل اور ابلیس اعظم جہل کل ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اس دنیا میں اپنی اپنی

۱۔ بہ تحقیق شیطان خون کی طرح انسانی رگوں میں جاری و ساری رہتا ہے۔ (دیکھئے عوالی اللئالی، ج ۴، ص ۱۱۳، حدیث ۱۷۵؛ نیز موسوعۃ اطراف الحدیث النبوي الشریف، ج ۳، ص ۹۴، ۹۵، اہل سنت کی کتب احادیث سے منقول)۔

۲۔ ملاحظہ ہو، سورۂ اعراف، آیت ۱۲ اور سورۂ ص، آیت ۷۶۔

ذرّیت اور آثار ومظاہر کے حامل ہیں، جن کی تشخیص نیز ان دو گروہوں کے درمیان امتیاز قرآن کی کسوٹی (جو سب سے بڑی کسوٹی ہے) نیز احادیث کی کسوٹی (جو چھوٹی کسوٹی ہے) کی روشنی میں ممکن ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو آدمؑ وابلیس کے واقعے کی روشنی میں قرآن مجید کے سامنے پیش کرے۔ پھر حضرت آدمؑ کی ابتدائے خلقت سے لے کر ان کی جدوجہد کی انتہا تک سے مربوط قرآنی آیات کا موازنہ اپنے آپ سے کرے۔ اسی طرح ابلیس سے مربوط آیات قرآنی (جن میں آسمانوں میں اس کی موجودگی سے لے کر اس کے راندہ درگاہ الٰہی ہونے تک کا تذکرہ ہے) کی روشنی میں اپنا جائزہ لے[1] تاکہ یہ معلوم ہو کہ وہ کس گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ موازنہ آداب قرائت میں شامل ہے اور اس کا ذکر ہم نے اپنی کتاب ''آداب نماز'' میں کیا ہے۔ اس موازنے کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ انسان اپنے اندر تبدیلی لا سکتا ہے اور ابلیسی آثار کو آدمؑ والے آثار میں بدل سکتا ہے، کیونکہ انسان جب تک اس مادی عالم (جو تغیّر وتبدّل، تجدید وجود، تصرّم اور ہیولائی اور امکانی عالم ہے) میں موجود ہے وہ اپنی انفعالی قوت کی بدولت اپنے نقائص کو کمالات میں اور اپنی صفات رذیلہ کو صفات حمیدہ میں، نیز اپنے گناہوں کو نیکیوں میں تبدیل کر سکتا ہے۔ اللہ نے اسے یہ انفعالی قوت عطا فرمائی ہے اور اسے اپنی سعادت وشقاوت اور کامیابی وناکامی کا واضح راستہ دکھایا ہے۔ یہ مشہور نظریہ درست نہیں کہ فلاں بری خصلت یا صفت رذیلہ ذات کا حصہ ہے اور قابل اصلاح نہیں[2] اس نظریے کی کوئی بنیاد نہیں اور یہ تدبر کی کمی کا نتیجہ ہے۔ ذات میں شامل امور کے عدم تغیّر وتبدّل کا اس مسئلے سے کوئی ربط نہیں، بلکہ ریاضت وکوشش کے ذریعے تمام روحانی صفات کو تبدیل کیا جا سکتا ہے یہاں تک کہ بزدلی، کنجوسی، حرص اور لالچ جیسی صفات کو بھی (بالترتیب) شجاعت، سخاوت، قناعت اور خودی میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

بنابریں سالک راہ حق اور طالب سعادت ونجات کیلئے لازم وضروری ہے کہ وہ دنیا کی اس چند روزہ

۱۔ دیکھئے سورۂ بقرہ، آیت ۳۰ تا ۳۸؛ نیز سورۂ اعراف، ۱۱ تا ۲۷ اور سورۂ ص، ۷۱ تا ۵۸۔

۲۔ دیکھئے آداب نماز، ص ۲۹۱۔

۳۔ محقق طوسیؒ نے اخلاق ناصری، ص ۱۰۲ میں، اور ملا مہدی نراقیؒ نے جامع السعادات، ج ۱، ص ۲۲ میں اس قول کو نقل کیا ہے۔

زندگی اور مہلت کے ایام میں (جو متغیّر و متبدل ہیں اور جہاں انسان اپنے ارادہ واختیار کا مالک ہے) دل لگا کر کوشش کرے اور اپنے صفحہ دل کو اللہ کی کتاب اور احادیث معصومین کی کسوٹی پر پرکھے (کیونکہ قرآن وحدیث حق و باطل اور سعادت وشقاوت میں پرکھنے کا معیار ہیں) تاکہ اولاً وہ اپنے آپ کو پہچانے اور اپنی باطنی کیفیت سے آگاہ ہو کہ اس کا تعلّق کس گروہ اور کس لشکر سے ہے۔ اور یہ جان لے کہ کیا اس کا تعلّق حزب الرحمٰن اور عقل کے لشکر سے ہے یا گروہ شیطان اور لشکر جہل سے؟ پس اگر وہ اسی حدیث شریف (جس کی شرح ہم لکھ رہے ہیں) کی روشنی میں اپنے آپ کو جانچے اور اپنے آپ کو عقل کے لشکروں میں موجود پائے، یعنی وہ دیکھ لے کہ اس کی روح پر عقل کے لشکروں کا غلبہ ہے تو وہ اللہ کا شکر بجالائے اور کوشش کرے کہ اپنے باطن سے جہل کے لشکروں کا صفایا کرے، نیز کوشش کرے کہ عقل اور اس کے لشکروں کے احکام کو اپنے باطن کی مملکت میں محکم ونافذ کرے اور اپنے کمال باطنی یا جمال باطنی کے باعث غرور میں مبتلا نہ ہو، کیونکہ غرور ابلیس کے خطرناک ترین داموں میں سے ایک دام ہے جو سالک راہ حق کو اپنے راستے سے روکتا، بلکہ اسے واپس پلٹاتا ہے۔ اسے یہ جاننا چاہئے کہ جب تک انسان اس دنیا اور اس دار الغرور میں موجود ہے اس کے زوال وسقوط کا خطرہ ہر دم موجود ہے خواہ وہ روحانی کمال و جمال کے جس مرتبے اور عدل وتقویٰ کی جس منزل پر بھی فائز ہو۔ وہ کسی وقت بھی بدل سکتا ہے اور اس کا انجام شقاوت وناکامی پر ختم ہوسکتا ہے۔

پس سالک راہ حق کو اپنے آپ سے ہرگز غافل نہیں ہونا چاہئے۔ اسے اپنے کمالات پر مغرور اور اپنے اندرونی احوال کی رعایت سے غافل نہیں ہونا چاہئے، اللہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کے الطاف خفیہ سے متمسک رہنا چاہئے۔ اسے چاہئے کہ اپنی عبادت وریاضت یا اپنے علم وتقویٰ پر ہرگز بھروسہ نہ کرے اور انہیں کافی نہ سمجھے، کیونکہ یہ امر انسان کی ہلاکت کا بہت بڑا سبب اور عظیم شیطانی وسوسہ ہے جو سالک کو اپنے آپ سے بھی غافل بنادیتا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلاَ تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ أُولٰئِكَ هُمُ الفَاسِقُونَ﴾[1] لیکن اگر اسے یہ محسوس ہو کہ اس کے باطن اور اس کی روح پر جہل کے لشکروں اور گروہ شیطانی کا غلبہ ہے تو وہ ہر طرح کی کوشش اور ریاضت کو بروئے کار لائے تاکہ وہ اپنے باطن کی دنیا کو

۱۔ ان لوگوں کی طرح نہ بنو جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے انہیں اپنے آپ سے غافل بنادیا، یہی لوگ ہی فاسق ہیں۔ سورۂ حشر ۱۹۔

شیطانی لشکروں سے پاک کرے اور وہاں ابلیس کے عمل دخل کا خاتمہ کرے۔ انشاء اللہ ہم ان اوراق میں عقل وجہل کے لشکروں کی تشریح وتفصیل، نیز تزکیہ نفوس، تطہیر قلوب اور تنزیہہ ارواح کے بارے میں اپنی عرائض ممکنہ اور مناسب طریقے سے اس مختصر کتاب کی گنجائش کے مطابق بیان کریں گے۔ البتہ یہ یاد رہے کہ ہر شخص کو اپنے قلب کا معالج اور اپنی روح کا طبیب خود ہونا چاہئے، کیونکہ بقولے: ''دایہ دلسوز تر از مادر نخواہد بود (یعنی، دائی ماں سے زیادہ مہربان نہیں ہوسکتی)'' انسان کو چاہئے کہ فرصت کے ایام اور فراغت کے اوقات کو مفت میں ضائع ہونے نہ دے تا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بے کسی، تنگی اور سختی کے وقت خواب غفلت سے بیدار ہو پھر اس کا کوئی فائدہ نہ ہو۔

عزیزو! جب تک یہ عظیم نعمت تمہارے اختیار میں ہے اور یہ زندگی موجود ہے اپنے روز ابتلا اور ایام بے کسی کیلئے کچھ کرو اور اپنے آپ کو آنے والی مشکلات، بدبختیوں اور ناکامیوں سے بچاؤ، کیونکہ آج تم تغیر وتبدل کی دنیا اور آخرت کی کھیتی میں ہو اور مذکورہ نتیجہ حاصل کرنے کی طاقت وصلاحیت کے خود مالک ہو۔

اگر خدانخواستہ شیطانی گروہ تجھ پر غالب آئے اور اسی حالت میں تیری زندگی کا خاتمہ ہو تو پھر کوئی چارہ کار نہ رہے گا اور اس دن حسرت اور افسوس کا ذرہ بھر فائدہ نہ ہوگا ﴿وَأَنذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ إِذْ قُضِيَ الْأَمْرُ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ وَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ﴾[۱] خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ حسرت وافسوس کا یہ دن کس قسم کا دن ہوگا۔ آج تو ہم اس دن کی حسرتوں کے بارے میں صرف ایک پیش گوئی سن رہے ہیں۔ بقول شاعر:

از قیامت خبری می شنوی　　　　دستی از دور بر آتش داری

(تم بہت دور سے قیامت کی خبر سن رہے ہو گویا اس آگ سے ہاتھ سینک رہے ہو جو تم سے بہت دور ہے)

وہاں حسرتوں کی کوئی انتہا نہ ہوگی اور نہ شرمندگی وندامت کی کوئی حد۔ ہاں جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے معنوی ترقی، روحانی تکامل اور حقیقی کامیابی تک رسائی کے سارے وسائل فراہم کئے ہوں۔ خواہ وہ باطنی وسائل ہوں جو عقل، خیر وشر میں فرق کی صلاحیت، مقاصد تک رسائی کی استعداد اور کمال وجمال تک رسائی سے فطری عشق سے عبارت ہیں، خواہ ظاہری وسائل ہوں جو عمر، وقت، مناسب ماحول، صحیح وسالم اعضاء

۱۔ انہیں حسرت کے دن سے ڈراؤ جب خدا کا فیصلہ آجائے گا اور وہ غفلت میں پڑے ہوئے اور ایمان سے خالی ہوں گے۔ سورۂ مریم ۳۹۔

بالخصوص راہ ہدایت، آسمانی کتابوں اور احکام خداوندی کا راستہ دکھانے والوں اور ان کی تفسیر کرنے والوں سے عبارت ہیں۔ وہ ان تمام باتوں کے باوجود اللہ کی بے پایاں نعمتوں کی ناشکری کرے، یعنی، اللہ کی امانتوں میں خیانت کرے، عقل وشرع کی مخالفت کرے اور اپنے ولی نعمت، اللہ تعالیٰ کے اتباع پر خواہشات نفسانی اور شیاطین جن وانس کی پیروی کو ترجیح دے اور پھر وہ ایسے وقت اپنے خواب گراں سے بیدار ہو جب وہ ہر موقع گنوا چکا ہو، تمام خداداد نعمتوں کو کھو چکا ہو اور ان نعمتوں کے ذریعے ابدی سعادت حاصل کرتے اور جنت میں انبیاء واولیاء کے ساتھ آرام وسکون کی زندگی حاصل کرنے کی بجائے ابدی بدبختی مول لے وہ جنوں، شیطان اور جہنمیوں کا ساتھی بنے گا۔ وہ تاریکی، تنگی، دباؤ، آگ، وزنی زنجیروں، نیز سانپوں اور بچھوؤں کے ہمراہ محشور ہو اور اس کی منزل "ہاویہ" ہو ﴿ وَمَا أَدْرَاكَ مَا هِيَهْ نَارٌ حَامِيَةٌ ﴾[1]

آپ اس قسم کے بے چارے انسان کا تصور کریں۔ اس وقت اسے کتنا افسوس ہوگا جب وہ دیکھے گا کہ اس کے ساتھی، اس کے ہم جنس اور اس کے ہموطن افراد خوش بختی اور کامیابی کی منزل کو پہنچ چکے ہیں، لیکن وہ ان کامل افراد کے قافلے سے بچھڑ کر ناقص، شقی اور بدبخت لوگوں کے قافلے سے ملحق ہو چکا ہے، نیز اب اس کے پاس ایسے نقائص کو دور کرنے کیلئے کوئی چارہ کار نہیں ہے۔

جب تک ہم اس دنیا کے مادی غلاف میں بند ہیں اس وقت تک عالم آخرت اور وہاں کے احوال واوضاع کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اس عالم کے پیچھے جو حقائق پوشیدہ ہیں جن کا بیان اللہ نے آسمانی کتابوں، انبیاء کرام اور اولیائے عظامؑ کے ذریعے کیا ہے، ان پر حقیقی یقین حاصل نہیں ہے۔ ہم ان امور پر ایمان کا ظاہری اظہار تو کرتے ہیں اور ممکن ہے کہ دلائل وبراہین اور اولیاء وعلماء کی تعالیم کے باعث عقلی طور پر ان امور کا اعتقاد بھی رکھتے ہوں، لیکن اس کے باوجود ہم ایمان قلبی (جو کمال انسانیت کی علامت ہے) سے محروم ہیں۔ ہم استدلال کی مصنوعی ٹانگوں[2] کے سہارے کوشش کرتے ہیں کہ اس پر پیچ وخم اور خطرناک راستے کو طے کریں۔ ہم ان چیزوں کے سہارے منزل مقصود کو نہیں پا سکیں گے، بلکہ ہم قافلہ عشق سے بچھڑ جائینگے۔

۱۔ اور تم کیا جانو کہ "ہاویہ" کیا ہے؟ یہ ایک نہایت گرم آگ ہے۔ سورۂ قارعہ ۱۰، ۱۱۔

۲۔ یہ مثنوی معنوی کے اس شعر کی طرف اشارہ ہے: پای استدلالیان چوبین بود پای چوبین سخت بی تمکین بود
(دیکھئے رومی کی مثنوی معنوی، دفتر اول، ص ۱۳۰، بیت ۲۱۲۸ مطبوعہ نکلسن)۔

جس حدیث شریف کی ہم شرح کررہے ہیں اس کے آخر میں ان امور میں سے بعض کی طرف اشارہ ہوا ہے جن کا ہم نے گزشتہ سطور واوراق میں ذکر کیا ہے۔امامؑ فرماتے ہیں:

﴿فَـلا تَجْتَمِعُ هٰذِهِ الخِصٰالُ كُلُّهٰا مِنْ أَجْنٰادِ العَقْلِ اِلاّٰ فِي نَبِيٍّ أَوْ وَصِيٍّ أَوْ مُؤْمِنٍ قَدِ امْتَحَنَ اللهُ قَـلْبَـهُ لِلايْمٰانِ، وَأَمّٰا سٰائِرُ ذٰلِکَ مِنْ مَوالِينٰا فَإِنَّ أَحَدَهُمْ لاٰ يَخْلُو مِنْ أَنْ يَكُونَ فِيهِ بَعْضُ هٰذِهِ الـجُنُودِ حَتّٰى يَسْتَكْمِلَ وَيَنْقىٰ مِنْ جُنُودِ الجَهْلِ، فَعِنْدَ ذٰلِکَ يَكُونُ فِي الدَّرَجَةِ العُلْيٰا مَعَ الأَنْبِيٰاءِ وَالأَوْصِيٰاء﴾

یعنی، عقل کے لشکروں کی یہ ساری صفات کسی نبی یا وصی یا امتحان شدہ مؤمن کے علاوہ کسی میں جمع نہیں ہوں گی۔رہے ہمارے دیگر پیروکار تو ان میں سے کوئی مذکورہ لشکروں میں سے کسی سے خالی نہ ہوگا یہاں تک کہ وہ کامل ہوجائے اور جہل کے لشکروں سے پاک ہوجائے۔اس وقت وہ انبیاءؑ اور اوصیاءؑ کے ساتھ اعلیٰ ترین درجہ میں ہوگا۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جن مؤمنین کے دل نور ایمان کیلئے صاف اور خالص ہوجائیں ان کے اندر یہ تمام صفات جمع ہوتی ہیں۔رہے دوسرے لوگ جن کے اندر عقل کے ایک یا چند لشکر جمع ہوں وہ علمی اور عملی ریاضت کے ذریعے اپنے آپ کو کامل کرسکتے ہیں، نیز جہل کے لشکروں سے پاک اور عقل کے لشکروں سے مزیّن ہوکر انبیاء واولیاء کے ساتھ ایمان کے اعلیٰ ترین درجہ کو حاصل کرسکتے ہیں۔

مقالہ / ۵

حدیث شریف کے بعض الفاظ کی مختصر تشریح

فرمایا: ﴿اِعْرِفُوا العَقْلَ وَجُنْدَہُ، وَالجَھْلَ وَجُنْدَہُ تَھْتَدُوا﴾ پہچانو عقل اور اس کے لشکر کو نیز جہل اور اس کے لشکر کو تا کہ تم ہدایت پاؤ۔

معلوم ہوا کہ عقل وجہل اور ان کے لشکروں کی پہچان حصول ہدایت کا پیش خیمہ ہے۔ یہاں پر ہدایت سے مراد یا تو تزکیہ نفس اور اس کی تطہیر، نیز اس کو منزل کمال تک پہنچانے کے طور طریقوں کی ہدایت ورہنمائی ہے یا اس سے مراد ہدایت مطلق ہے جس کی اہم ترین اساس معرفت خداوندی کی طرف رہنمائی ہے۔

پس یہ ہدایت عقل وجہل اور ان کے لشکروں کی شناخت کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک نفس کو ہلاکت میں ڈالنے یا اسے نجات سے ہمکنار کرنے والے عوالم کا علم نہ ہو، اس کے علاوہ ان مہلک عوامل سے چھٹکارا حاصل کرنے اور ان نجات بخش عوامل کو اپنانے کے طریقوں سے آشنائی حاصل نہ ہو اس وقت تک نفس کا تزکیہ و پاکیزگی، نیز اسے خوبیوں سے مزیّن کرنا اور منزل کمال تک پہنچانا ممکن نہیں۔ اگر نفس کو باطنی پاکیزگی حاصل نہ ہو اور وہ کمالات متوسطہ تک رسائی حاصل نہ کرے تو وہ اسماء وصفات کے جلوؤں اور حقیقی معرفت سے محروم رہے گا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تمام ظاہری اعمال اور معنوی صفات وخصائل معارف الٰہیہ کی تمہید ہیں؛ اور یہ معارف خود بھی توحید وتفرید کی تمہید ہیں۔ یاد رہے کہ توحید وتفرید انسانی کوششوں کی منزل مقصود اور عرفانی سیر وسلوک کا آخری ہدف ہے۔ پس عقل اور جہل کے لشکروں کی شناخت کے بغیر نہ ملکوت اعلیٰ کی معرفت ہو سکتی ہے نہ وہاں سے اسماء کے باطن اور اسماء کے باطن سے حضرت حق کی ایسی معرفت حاصل ہو سکتی ہے جس میں کثرت کا شائبہ نہ ہو۔

سماعہ نے عرض کیا: ﴿جُعِلْتُ فِداکَ لاٰ نَعْرِفُ اِلاّٰ ما عَرَّفْتَنا﴾ یعنی قربان جاؤں! ہمیں نہیں

معلوم مگر یہ کہ آپ ہمیں بتائیں۔

جان لو کہ عقل وجہل اور ان کے لشکروں کی شناخت اللہ کے غیبی علوم اور برحق باطنی معارف سے مختص ہے جن کے تمام پہلوؤں، تمام مدارج ومراتب اور تمام اسرار وحقائق کی پہچان ممکن اور آسان نہیں مگر صاحبان ولایت ویقین اور ارباب معارف وایمان میں سے ممتاز ترین افراد کیلئے جو نور معرفت کی بدولت بشریت کی چادر سے اپنا قدم سلوک باہر نکال چکے ہوں اور عالم ملک وملکوت کے حجابوں کو توڑ کر وجود کے سرچشموں اور غیب وشہود کے مصادر تک پہنچ چکے ہوں، نیز مشاہدۂ حضوری کے ذریعے غیبی عوالم کو پا چکے ہوں۔ یہ توفیق کامل انسانوں کے سوا کسی کو نصیب نہیں ہوسکتی۔

یاد رہے کہ مشاہدہ حضوری (جو عرفان کی حقیقت ہے) اور علوم کلیہ الٰہیہ (جن کا ایک شعبہ فلسفہ الٰہیہ اور ایک شعبہ علم عرفان ہے) کے درمیان موجود نسبت اس طرح ہے جس طرح خیالی ورؤیت کی نسبت یا وہم اور خواب کی نسبت۔ پس جس طرح بیداری کی حالت میں آنکھوں کی رؤیت اور نیند کی حالت میں خواب دیکھنا ظاہر اور باطن کی آنکھوں سے (بطریق جزئیت) انجام پاتے ہیں (وہم اور خیال کے برعکس جو کسی چیز کی تصویر کی رؤیت کی طرح ہے) اسی طرح حضوری مشاہدات (جو عرفانی حقائق واسرار سے عبارت ہیں) بھی ان جزئیات ومصادیق کے مشاہدے سے عبارت ہیں جنہیں عقل دلیل وبرہان کے ذریعے مجموعی طور پر درک کرتی ہے۔ بعبارت دیگر مشاہدہ عقل کی آنکھوں سے عالم غیب کی حقائق مجردہ کو دیکھنے کا نام ہے جس طرح رؤیت روح کی آنکھ سے ظاہری چیزوں کو دیکھنے کا نام ہے۔

جب تک عقل مفاہیم وکلیات کی قید میں بند ہے وہ شہود وحضور سے تہی دامن رہے گی۔ اگرچہ علوم مشاہدات کو جنم دینے والے بیج کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن صرف علوم پر اکتفا کرنا عین حجاب ہے۔ جب تک یہ بیج دل کی زمین میں کھل کر فانی نہ ہوجائیں اس وقت تک یہ مشاہدات کے حصول کا سرچشمہ نہیں بن سکتے، نیز جب تک وہ دل کے گودام مین اپنی الگ حیثیت کے حامل رہیں ان سے کوئی فائدہ اور نتیجہ حاصل نہیں ہوگا۔

خلاصہ یہ کہ غیبی وملکوتی عوالم خواہ وہ ملکوت اعلیٰ ہوں (جن میں عوالم عقول کلیہ بھی شامل ہیں) یا ملکوت سفلیٰ (جن میں ابلیس اور اس کے لشکر، نیز جزئی عقول بھی شامل ہیں) کا احاطہ سوائے اولیائے کامل کے (جن کے علوم وحی الٰہی کے سرچشمے اور افاضہ خداوندی کے مرکز سے حاصل شدہ ہیں) کوئی نہیں کرسکتا۔

اسی لئے سماعہ بن مہران امامؑ سے عرض کیا: ہم عقل و جہل اور ان کے لشکروں کی معرفت نہیں رکھتے مگر یہ کہ آپ ہمیں ان کے بارے میں کچھ ارشاد فرمائیں۔

پھر فرمایا: ﴿ثُمَّ جَعَلَ لِلعَقْلِ خَمْسَةً وَسَبْعِينَ جُنْداً﴾ (پھر اللہ نے عقل کیلئے پچھتر لشکر قرار دئے)

جان لو کہ عقل و جہل کو لشکر عطا کرنا خود عقل و جہل کی خلقت میں مضمر ہے اگر عقل سے مراد عقل کل اور جہل سے مراد جہل کل ہوں اگر چہ بظاہر ان لشکروں کا تعلّق عقل جزئی اور جہل جزئی سے ہے مگر یہ کہ ایک طرح کی تأویل سے کام لے کر ظاہر کو باطن کی طرف اور صورت کو معنی کی طرف موڑ دیا جائے۔ البتہ بنابریں اس قسم کی کثرت اس عالم میں نہ ہوگی سوائے مفہومی کثرتوں کے جس طرح مقام واحدیت میں اسماء وصفات کی کثرت، نیز ان کی تخلیق عقل و جہل کی تخلیق میں مضمر ہے، بشرطیکہ اس تخلیق سے مراد فطرت کے خمیر کو تیار کرنا ہو، کیونکہ اللہ کی فطرت توحید[۱] و معرفت[۲] میں کارفرما ہے اسی طرح تمام خوبیوں اور جملہ کمالات میں بھی کارفرما ہے، جیسا کہ یہ حقیقت اپنے مقام پر ثابت شدہ اور واضح ہے۔[۳]

رہا جہل اور اس کے لشکروں کی تخلیق تو یہ تخلیق ذیلی اور ضمنی ہے جس طرح کسی ماہیت کے لوازم کی تخلیق۔ یہ امر بجائے خود علم الٰہی سے مربوط موضوعات میں سے ایک ہے جو فلسفہ اور حکمت متعالیہ میں ثابت شدہ ہے[۴] اور یہاں ان مباحث کے ذکر کی گنجائش نہیں۔

لیکن اگر ان لشکروں سے مراد ان اوصاف و کمالات کی عملی شکل ہو تو کمالات عقلیہ کے مقابلے میں جہل وجود کے لوازم کی حیثیت رکھتا ہے یا یہ کہ یہ اوصاف بندے کی کوشش سے حاصل ہوتے ہیں اور ریاضت وسعی کو اس میں مکمّل طور پر عمل دخل حاصل ہوتا ہے۔ اس کے باوجود حق تعالیٰ کے ساتھ ان کی نسبت کی تفصیل کچھ یوں ہے:

۱۔ عقل کے لشکروں کی نسبت اللہ سے یوں ہے کہ تمام کمالات اور آثار وجود اللہ کی خلق کردہ ہیں۔ البتہ

۱۔ اصول کافی، ج ۲، کتاب الایمان الکفر، باب ۶، ص ۱۰، حدیث ۱، ۴؛ نیز توحید صدوق، باب ۵۳، ص ۳۲۸، ۳۳۱؛ نیز ملاحظہ ہو امام خمینیؒ کی چہل حدیث، ص ۱۸۰۔

۲۔ ملاحظہ ہو سابقہ مأخذ۔

۳۔ ملاحظہ ہو سابقہ مأخذ۔

۴۔ دیکھئے الاسفار الاربعہ، ج ۱، فصل ۱، مرحلہ ۳، ص ۳۹۹؛ نیز ج ۱، ص ۱۹۱۔

ان آثار وکمالات کو اپنانے میں بندے کی کوشش کا بھی عمل دخل ہے، جیسا کہ یہ امر عقلی علوم میں دلائل وبراہین سے ثابت شدہ ہے۔[1]

۲۔ جہل کے لشکروں کی اللہ سے نسبت کی کیفیت اس طرح ہے کہ ان لشکروں کی تخلیق تبعی، ضمنی اور عرضی ہے۔ یادرہے کہ اس حدیث میں کہا گیا ہے کہ ''جہل کے لشکر عقل کے لشکروں کے بعد عطا کئے گئے''۔ شاید یہ اشارہ ہو اسی تبعی وضمنی تخلیق کی طرف، اگر چہ اس بات کا اطلاق عام فہم سے بعید ہے۔

یادرہے کہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ، نیز انبیاء وائمہ معصومین (علیہم السلام) نے احادیث شریفہ میں عقلی حقائق کا بیان عام فہم زبان میں عام لوگوں کیلئے کیا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی اپنی شفقت ورحمت سے نوازے تاکہ ہر کوئی اپنی عقل وفہم کے مطابق حقائق سے بہرہ مند ہو۔ پس وہ عقلی وغیبی حقائق کو سہل وآسان بنا کر پیش کرتے ہیں تاکہ عام لوگ ان سے مأنوس ہوں اور انہیں محسوس کر سکیں۔ نیز یہ کہ اس درجہ کے لوگ اپنی بساط کے مطابق عالم غیب سے آشنائی حاصل کریں، لیکن ان بزرگوں کے علوم کو حاصل کرنے والوں، نیز قرآنی علوم اور احادیث اہل بیتؑ سے استفادہ کرنے والوں پر لازم ہے کہ اس عظیم نعمت کا شکر ادا کرنے کیلئے ظاہر کو باطن کی طرف، چھلکے کو مغز کی طرف اور دنیا کو آخرت کی طرف پلٹائیں، کیونکہ خطرے کی سرحدوں پر ٹھہرنا ہلاکت میں کودنے، نیز ظاہری صورتوں پر انحصار سالکان راہ حق کے قافلے سے بچھڑنے کے مترادف ہے۔ یہ حقیقت اور الطاف خداوندی جو علم التأویل سے عبارت ہے علمی فکری اور عقلی ریاضتوں کے بغیر حاصل نہیں ہوتا جن کے ساتھ عملی طور پر بھی ریاضت تزکیہ نفس، تطہیر قلوب اور تصفیۂ ارواح کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلاَّ اللّهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ﴾[2] نیز ارشاد خداوندی ہے: ﴿لاَ يَمَسُّهُ إِلاَّ الْمُطَهَّرُونَ﴾[3] اگر چہ راسخون فی العلم اور مطہرون کے کامل مصادیق ائمہ معصومینؑ ہیں[4] اور اس لحاظ سے تأویل کے سارے مدارج کا علم

۱۔ ملاحظہ ہو الاسفار الاربعہ، ج۱، فصل ۱، مرحلہ ۹، ص ۳۹۶۔

۲۔ اس کی تأویل کا علم صرف اللہ اور راسخون فی العلم کے پاس ہے۔ سورۂ آل عمران ۷۔

۳۔ اسے صرف پاک لوگ ہی چھو سکتے ہیں۔ سورۂ واقعہ ۷۹۔

۴۔ اصول کافی، ج۱، ص ۱۶۶، کتاب الحجہ، باب ۲۲ ﴿إِنَّ الرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ هُمُ الأَئِمَّةُ﴾ (تفسیر البرہان، سید ہاشم بحرانی، ج۱، ص ۲۷۰)۔

انہی ہستیوں سے مختص ہے، لیکن علمائے امت کو بھی ان کے علم اور طہارت باطنی کے حساب سے کافی حد تک تأویل کا علم عطا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا: ''میں راسخون فی العلم میں شامل ہوں'' ۔[۱]

نکتہ

عقل و جہل کے لشکروں کی تعداد کو صرف پچھتر میں محصور کرنے کا مقصد یہ نہیں کہ ان لشکروں کی تفصیلی اور مکمل تعداد صرف اتنی ہے، بلکہ یہ تعداد تو اہم ترین، بنیادی ترین اور کلی لشکروں کی ہے۔ اسی لئے تفصیلی تعداد بیان کرتے وقت پچھتر سے زیادہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اگر چہ بعض لشکروں کو بعض دوسرے لشکروں میں ضم کیا جا سکتا ہے تا کہ مجموعی تعداد پچھتر ہو جائے، لیکن سابقہ عرایض کی روشنی میں ہمیں اس زحمت اور تأویل کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ خیر (جو عقل کا وزیر ہے) اور شرّ (جو جہل کا وزیر ہے) دونوں ہی صفات حمیدہ و صفات رذیلہ میں سے اہم ترین صفات ہیں اور دیگر تمام صفات و خصائل کی بر گشت انہی دونوں کی طرف ہوتی ہے، اس کے باوجود اس حدیث شریف میں ان کا شمار ''جنود (لشکروں)'' میں ہوا ہے۔ اسی طرح عدل اور ظلم کو بھی جنود میں شمار کیا گیا ہے، جبکہ یہ دونوں بنیادی حیثیت کے حامل ہیں اور دیگر بہت سارے لشکر، ان دو خصائل کے تحت واقع ہوتے ہیں، نیز بہت سے لشکروں کو شمار ہی نہیں کیا گیا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انبیاء و اولیاء اور قرآن مجید کا انداز بیان دیگر مصنّفین و مؤلفین کی طرح نہیں جو کلی مفاہیم کے بارے میں تحقیق و جانچنا اور بحث و جدال، نیز ان کی مختلف شقیں، صورتیں اور تعداد بیان کرنے کے درپے ہوتے ہیں، جبکہ یہی امور سیر و سلوک کے راستے میں حائل دبیز پردوں کی حیثیت رکھتے ہیں جو مسافر کو اپنے سفر سے باز رکھتے ہیں ۔[۲]

بنابریں قرآن مجید اگر چہ تمام علوم و معارف اور اسماء وصفات کی جملہ حقائق پر محیط ہے، نیز کسی دیگر آسمانی یا غیر آسمانی کتاب نے قرآن کی طرح اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات پر روشنی نہیں ڈالی ہے، علاوہ ازیں

۱۔ دیکھئے طبرسی کی مجمع البیان، ج ۱، ۲، ص ۴۱۰۔

۲۔ خواب نوشین بامداد رحیل — باز دارد پیادہ راز سبیل (دیکھئے کلیات سعدی، ص ۷۱)۔

قرآن اخلاقی تعالیم کا کامل مجموعہ، نیز مبدأومعاد، زہد، ترک دنیا، مادہ پرستی کی مخالفت اور حقیقت کی منزل کی طرف بڑھنے کی دعوت پر مشتمل ایسی جامع کتاب ہے جس کی نظیر کتاب کا تصور بھی نہیں ہو سکتا، لیکن ان باتوں کے باوجود قرآن دیگر کتابوں کی طرح ابواب وفصول، پیش لفظ اور خاتمہ وغیرہ پر مشتمل نہیں ہے۔ یہ اس کتاب کے اتارنے والے کی قدرت کاملہ کی دلیل ہے کہ وہ اپنے مقاصد کو بیان کرنے میں ان وسائل وذرائع کا محتاج نہیں ہے۔

اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ کبھی وہ دلیل وبرہان جسے فلاسفہ متعدد تمہیدات کے بعد بیان کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اسے قرآن نصف سطر میں بیان کر دیتا ہے، جبکہ اس کی برہانی شکل وصورت بھی نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر یہ آیت ﴿لو کانَ فِیهِما آلِهَةٌ اِلاّ اللهُ لَفَسَدَتا﴾۱ نیز یہ فرمان ﴿لَذَهَبَ کُلُّ اِلـهٍ بِما خَلقَ وَلَعَلا بَعْضُهُمْ عَلیٰ بَعْض﴾۲ ملاحظہ کیجئے کہ یہ دونوں توحید پر بہترین دلیل وبرہان ہیں اور ان دونوں دلائل میں سے ہر ایک کئی صفحات پر مشتمل تحریر کی محتاج ہے جو صاحبان بصیرت کیلئے واضح ہے اور نا اہلوں کو اس میں تصرف کا حق نہیں۔ چونکہ یہ ایک جامع کلام ہے اس لئے ہر کوئی اپنے فہم وادراک کے مطابق ان آیات سے ایک مفہوم اخذ کرتا ہے۔

اسی قسم کی ایک آیت یہ بھی ہے ﴿اَلا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِیفُ الخَبِیرُ﴾۳ نیز یہ کلام ﴿وَهُوَ مَعَکُمْ أیْنَ ما کُنتُمْ﴾۴ نیز یہ فرمان ﴿فَأیْنَما تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللهِ﴾۵ نیز یہ ارشاد ﴿وَهُوَ الَّذِي فِي السَّماءِ اِلـهٌ وَفِي الأرْضِ اِلـه﴾۶ نیز یہ قول ﴿هُوَ الأوَّلُ وَالآخِرُ وَالظّاهِرُ وَالباطِن﴾۷ ان میں سے ہر جملہ ماوراء الطبیعی حکمت عالیہ اور فلسفہ متعالیہ کی طرف عرفانی اشارہ ہے۔ جو شخص اہل بیت معصومینؑ

۱۔ اگر زمین وآسمان میں اللہ کے علاوہ اور بھی خدا ہوتے تو ان دونوں کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ سورہ انبیاء ۲۲۔

۲۔ ہر معبود اپنی مخلوقات کو لے کر الگ ہو جاتا اور ایک دوسرے پر چڑھائی کر دیتا۔ سورۂ مومنون ۹۱۔

۳۔ کیا جس نے خلق کیا ہے اسے علم نہیں؟ حالانکہ وہ باریک بین اور آگاہ ہے۔ سورۂ ملک ۱۴۔

۴۔ تم جہاں کہیں بھی ہوں وہ تمہارے ساتھ ہے۔ سورۂ حدید ۴۔

۵۔ تم جدھر بھی رخ کرو وہاں اللہ موجود ہے۔ سورۂ بقرہ ۱۱۵۔

۶۔ وہ آسمان میں بھی خدا ہے اور زمین میں بھی خدا ہے۔ سورۂ زخرف ۸۴۔

۷۔ وہ اول بھی ہے آخر بھی اور ظاہر بھی ہے باطن بھی۔ سورۂ حدید ۳۔

کی احادیث کی طرف رجوع کرے خاص کر اصول کافی، توحید صدوق ۱ نہج البلاغہ ۲ اور ان بزرگ ہستیوں سے مروی دعاؤں (خاص کر صحیفہ سجادیہ ۳) کی طرف اور ان میں غور وفکر کرے تو وہ جان لے گا کہ یہ علوم الٰہی، معارف ربانی اور علم اسماء وصفات خداوندی سے بھرے ہوئے ہیں، نیز یہ اصطلاحات کے پردوں اور مفاہیم کی زنجیروں سے آزاد ہیں، کیونکہ یہ چیزیں خود حجاب ہیں۔

آگے چل کر حدیث کہتی ہے: ﴿فَلَمّا رَایٰ الجَهلُ ما أكرَمَ اللهُ بِهِ العَقلَ وَما أعطاهُ، أضمَرَ لَهُ العِداوَةَ﴾ ترجمہ: جب جہل نے اللہ کی طرف سے عقل کی عزت افزائی اور عقل پر نوازش دیکھی تو عقل کی عداوت دل میں بٹھالی۔

تشریح: اگر یہاں جہل سے مراد ابلیسیت اور شیطانیت ہو (عالم امر میں) تو جہل کا عقل کے لشکروں کو دیکھنا لازمی طور پر یا تو ناقص میں کامل کے انعکاس کے ذریعے ہے یا کمال کے ساتھ نقص کے موازنے یا مقایسہ اضداد کی صورت میں، کیونکہ عقل کے لشکر عقل کے ساتھ مخلوط اور مدغم ہیں اور ان لشکروں کی رؤیت عقل کی رؤیت کے بغیر ممکن نہیں۔ جہل کیلئے ان کا مکمّل مشاہدہ میسّر نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ عقل کی عداوت کو دل میں جگہ دینا ان دو ماہیتوں کے درمیاں تضاد اور تنافر سے عبارت ہے۔ یہ دونوں باتیں اگر چہ

۱۔ توحید صدوق حدیث کی ایک نہایت گرانقدر کتاب ہے۔ اس کے مؤلف شیخ المحدّثین محمد بن علی بن حسین قمیؒ ہیں۔ مؤلف نے اس کتاب میں توحید اور اسماء وصفات خداوندی سے مربوط احادیث کو جمع کیا ہے۔ بہت سے علمائے امامیہ نے اس گرانقیمت کتاب پر توجہ دی ہے اور اس کی شرحیں لکھی ہیں۔ (دیکھئے شیخ آقا بزرگ تہرانیؒ کی کتاب الذریعہ، ج ۴، ص ۴۸۲)۔

۲۔ نہج البلاغہ، امیر المؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کے کلام کا ایک مجموعہ ہے جسے محمد بن حسین بن موسیٰ المعروف ''سید شریف رضیؒ'' (متولد ۳۵۹ متوفی ۴۰۶) نے جمع کیا تھا۔ رجب ۴۰۰ ہجری میں یہ کام مکمّل ہوا۔ یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ، خطبات پر دوسرا، خطوط پر اور تیسرا حصہ، آپؑ کے مختصر فرمودات پر۔ نہج البلاغہ کی بہت سی شرحیں لکھی گئی ہیں جن میں سب سے معروف ابن ابی الحدید معتزلی کی شرح اور کمال الدین ابن میثم بحرانی کی شرح ہیں۔

(ملاحظہ ہو الذریعہ، ج ۲۴، ص ۴۱۳؛ ج ۴، ص ۱۴۴، ج ۶، ص ۲۲۸)۔

۳۔ صحیفہ سجادیہ امام چہارم حضرت علی بن الحسین زین العابدین علیہ السلام سے مروی دعاؤں کا مجموعہ ہے۔ اسے صحیفہ کاملہ اور زبور آل محمدؑ بھی کہتے ہیں۔ اس زندہ جاوید کتاب کی مختلف شرحیں لکھی گئی ہیں جن میں سب سے تفصیلی شرح عالم محقق سید علی خان مدنی شیرازی کی شرح ہے جو ریاض السالکین کے نام سے معروف ہے۔ (دیکھئے الذریعہ، ج ۱۵، ص ۱۸)۔

حدیث کے ظاہری مفہوم سے ہماہنگ نہیں ہیں لیکن ظاہر کو باطن کی طرف لوٹانے کی صورت میں ان کی گنجائش موجود ہے۔ لیکن اگر یہاں جہل سے مراد ابلیس کے مظاہر و آثار اور اصحاب جہل کی جہالتیں ہوں (جو انسان کی قوت وہمیّہ سے عبارت ہیں) تو اس سے مراد درج ذیل دو چیزیں ہوسکتی ہیں:

الف: یہ کہ یہ اس قوت وہمیّہ اور قوت عقلیّہ کے مابین تضاد کی طرف اشارہ ہو جو ہر انسان کے اندر موجود ہیں، نیز عقل اور اس کے لشکروں کی تخلیق کا جہل اور اس کے لشکروں کی تخلیق پر مقدم ہونا اسی طرح بعض کا مؤخر ہونا بجائے خود اشارہ ہے ملکوت اسفل پر ملکوت اعلیٰ کے تقدم ذاتی نیز صفات وملکات پر ذوات کے تقدم کی طرف۔ بنابریں ہر فرد بشر کے اندر جہل وعقل کے تمام لشکر فطری اور طبعی طور پر موجود ہوتے ہیں۔ البتہ عقل کے لشکروں کی موجودگی ذاتی واصلی ہے جبکہ جہل کے لشکروں کی موجودگی فرعی اور ذیلی ہے۔ جہل کا عقل اور اس کے لشکروں کو دیکھنا بھی مذکورہ دو صورتوں میں سے ایک پر محمول ہوگا۔

ب: یہ کہ یہاں لوگوں کے دو گروہوں کی طرف اشارہ ہو جن میں سے ایک خوشبخت اور کمالات کے حامل لوگوں کا گروہ ہے اور دوسرا بدبخت اور نقائص کے حامل افراد کا گروہ۔ ان دونوں گروہوں کے درمیان موجود تضاد بھی ذاتی ہے جو مشہود وعیاں ہے۔ یہاں رؤیت بھی اس کے عام معنوں میں آثار کے مشاہدے سے حاصل ہوتی ہے، واللہ العالم۔

پھر فرمایا: ﴿فَقَالَ الجَهلُ: يَـا رَبِّ! هٰذا خَلقٌ مِثلِي﴾ ترجمہ: پس جہل نے کہا: اے میرے ربّ! یہ میری طرح کی مخلوق ہے۔

تشریح: جہل کا عقل کے ساتھ مماثلت کا دعویٰ اسی طرح ہے جس طرح ابلیس نے آدم علیہ السلام سے برتر ہونے کا دعویٰ کیا اور کہا: ﴿خَلَقْتَنِي مِنْ نارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِيْنٍ﴾[1] یہ دعویٰ نتیجہ تھا مقام عقل کو نہ پہچاننے کا، نیز ابلیس کی خود بینی، خود پرستی، اور تکبّر کا۔ ظاہر ہے کہ خود بینی اور تکبّر کا حجاب ایسا دبیز حجاب ہے جو اس میں مبتلا ہونے والوں کو جملہ حقائق کے علاوہ دوسروں کی تمام خوبیوں اور کمالات نیز اپنے عیوب ونقائص کے ادراک سے عاجز بنا دیتا ہے۔ یہ حجاب ابلیس کی میراث ہے۔ جس کسی کے اندر یہ حجاب قوت پکڑے وہ ابلیس کی ذریت میں شامل ہو جائے گا، اگرچہ وہ ظاہری طور پر انسان کی اولاد ہو، کیونکہ عالم انسانیت اور عالم

۱۔ دیکھئے سورۂ اعراف ۱۲؛ نیز سورۂ ص ۷۶۔

ملکوت (جو تمام اشیاء کی حیثیت کو معین کرتے ہیں) کے اندر معیار اور میزان ملکوتی ولادت ہے۔ چنانچہ ملکوتی ولادت کے حامل انسان حضرت عیسی مسیح ؑ فرماتے ہیں: ﴿لَنْ يَلِجَ مَلَكُوتَ السَّمَآءِ مَنْ لَمْ يُولَدْ مَرَّتَيْنِ﴾[۱] یہ دوسری ولادت ملکوت اعلیٰ میں وارد ہونے کی ابتدائے ہے۔ ملکوت اعلیٰ کو یہاں ملکوت السماء کہا گیا ہے۔ یہ ولادت اس بات پر موقوف ہے کہ انسان ان حجابوں سے جو ابلیس کی میراث ہیں خارج ہو اور حقائق اسماء (جو آدم ؑ کی میراث ہیں) سے ہمکنار ہو جائے۔ عقل کے لشکروں کی حقیقتوں سے ہمکنار ہونا تمہید ہے اسماء کی حقیقتوں سے ہمکنار ہونے کی۔

پھر فرمایا: ﴿خَلَقْتَهُ وَكَرَّمْتَهُ وَقَوَّيْتَهُ وَأَنَا ضِدُّهُ وَلاَ قُوَّةَ لِي بِهِ، فَأَعْطِنِي مِنَ الجُنْدِ مِثْلَ مَا أَعْطَيْتَه﴾۔

محققین کہتے ہیں کہ جہل کی یہ گفتگو اور عقل کے مقابلے کیلئے لشکروں کی درخواست الفاظ کی زبان میں نہیں ہوئی، بلکہ یہ گفتگو استعداد و صلاحیت کی زبان سے انجام پائی ہے۔[۲]

یاد رہے کہ یہ بات ہماری سابقہ گفتگو سے ہماہنگ نہیں[۳] کہ عقل اور اس کے لشکروں کی تشکیل پھر فاصلے سے جہل اور اس کے لشکروں کی تشکیل الگ الگ طور پر انجام نہیں پائیں۔ بالفاظ دیگر ایسا نہیں کہ پہلے عقل کو اس کے لشکروں کے بغیر خلق فرمایا ہو اور بعد میں اس کے لشکروں کو۔ اسی طرح جہل کو بھی، بلکہ عقل کی تخلیق اس کی جملہ ذاتی خصوصیات کی تخلیق سے عبارت ہے، جیسا کہ عقلی علوم میں یہ بات ثابت شدہ ہے[۴] کہ جو کچھ امکان عام کی صورت میں عقل کیلئے ممکن ہے وہ اس کیلئے اسی پہلی خلقت میں لازم ہے اور یہ ممکن نہیں کہ عالم عقلی خالی امکان، انتظار، استعداد اور صلاحیت کا ہی حاصل ہو۔ بنابریں استعداد کی زبان سے تعبیر کرنا ایک حد تک تحقیق سے دور ہے مگر یہ کہ اس سے مراد زبان حال ہو۔

پھر فرمایا: ﴿فَقَالَ: نَعَمْ! فَإِنْ عَصَيْتَ بَعْدَ ذٰلِكَ أَخْرَجْتُكَ وَجُنْدَكَ مِنْ رَحْمَتِي. قَالَ: قَدْ رَضِيتُ﴾

۱۔ جو شخص دو بار متولد نہ ہو وہ ملکوت آسمان میں سیر نہیں کرتا۔ (شرح اصول کافی، از صدر المتألہین شیرازی ؒ، ج ۱، ص ۳۶۱، ۴۱۷)۔

۲۔ شرح اصول کافی، ج ۱، ص ۴۱۱۔ ۳۔ دیکھئے کتاب ہذا کا صفحہ نمبر ۴۳۔

۴۔ دیکھئے الاسفار الاربعہ، ج ۱، ص ۳۹۴، فصل ۱۴، مرحلہ ۲۔

ترجمہ: پس کہا: ٹھیک ہے، لیکن اگر اس کے بعد تو نے نافرمانی کی تو میں تجھے اور تیرے لشکر کو اپنی رحمت سے خارج کروں گا۔ جواب دیا: میں راضی ہوں۔

یاد رہے کہ نافرمانی اور رحمت سے خارج کرنا جہل کل کے معاملے میں ایک الگ مفہوم کا حامل ہے اور وہ ہے ذاتی نقص وعیب اور بارگاہ کبریا سے فطری خروج، جیسا کہ پہلے بھی اس طرف اشارہ ہو چکا ہے، لیکن جہل جزئی میں (فطری لشکروں سے نوازنے کے بعد) اس نافرمانی سے مراد ہے نقص وعیب کے نیز عقل کے لشکروں کی اضداد کے ذریعے سے استعداد وقوت سے فعلیت میں تبدیل ہونا، یعنی یہ نقص وعیب کا امکان سے وجود میں بدلنا۔ فعلیت اور وجود میں تبدیل ہونے کے بعد جہل بدبختی وشقاوت کی انتہا کو پہنچے گا اور قرب ورحمت خداوندی سے دور ہوگا، نیز شیطان اور نافرمانوں کے ساتھ ملحق ہوگا۔

متن حدیث: ﴿فَأَعْطَاهُ خَمْسَةً وَسَبْعِينَ جُنْداً﴾ (پس اللہ نے اسے پچھتر لشکر عطا کئے)۔

جان لو کہ جہل کو ان لشکروں سے نوازنا جو عقل اور اس کے لشکروں کے ساتھ مخالفت کی تقویت کا باعث ہے اس بات کے منافی نہیں ہے کہ اللہ ان کو عذاب دے اور اپنی رحمت سے دور کر دے، کیونکہ جیسا کہ آپ جان چکے ہیں جہل کے یہ لشکر، عقل کے لشکروں کا لازمہ ہیں۔ طبیعی ومادی عالم کی خلقت کا لازمہ ہی تضاد اور معاندت ہے، لیکن یہ کسی طرح بھی سلب اختیار کا باعث نہیں ہے، بلکہ اگر کمالات اور عقلی لشکروں کے مقابلے میں موجود قوتیں عقل کے اختیار وارادہ سے خارج ہوں تو ان میں سے اکثر کا کمال ہی سلب ہو جائے گا۔ مثلاً عدل صفت کمال ہے جسے انسان اپنے ارادہ واختیار سے اپناتا ہے۔ اگر ظالم کو ظلم نہ کرنے دیا جائے اور اسے ظلم سے روکا جائے اور عادل مجبوراً عدل قائم کرے تو وہ عادل نہیں کہلائے گا۔ چونکہ صفات کمالیہ میں سے ہر صفت اپنے ضد کے ساتھ انسان کی طینت میں بالذات اور بالعرض شامل ہے اور انسان ان میں سے ہر ایک پر عملدر آمد میں ارادہ واختیار کا مالک ہے، اس لئے ان دونوں متضاد امور میں سے ہر ایک پر عمل کرنا، سعادت یا شقاوت کا باعث ہے، یعنی یا حزب الرحمٰن اور عقل کے لشکروں میں یا حزب الشیطان اور جہل کے لشکروں میں شامل ہونے کا موجب ہے۔ اسی لئے اس حدیث میں (جہل سے) فرمایا: ''اگر ان لشکروں کے ملنے کے بعد تو نے نافرمانی کی تو تجھے اور تیرے لشکروں کو اپنی رحمت (کے دائرے) سے خارج کر دوں گا''۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر نافرمانی صفات رذیلہ کے عملی اظہار کا موجب نہ بنے تو عاصی اللہ کی رحمت اور بارگاہ سے مکمل طور پر دور نہیں ہوگا۔ لیکن اگر نافرمانی کے باعث فطری رذائل عملاً ظاہر ہوں

اور انسان کی باطنی کیفیت جہل کے لشکروں کی شکل میں تبدیل اور ظاہر ہو جائے تو وہ بارگاہ رحمت سے دور ہوگا، بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ فطرت الٰہی کا نور ہمیشہ کیلئے بجھ جائے۔ اس صورت میں ایسا انسان شیطان کا ساتھی، اللہ کی رحمت سے دور اور جہنم میں ہمیشہ رہنے کا مستحق ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ تزکیہ نفس اور تہذیب اخلاق کی کوشش (جو درحقیقت ابلیس کے تسلّط سے رہائی کا باعث ہے) عقل کے نزدیک عظیم ترین ذمہ داریوں اور اہم ترین واجبات میں سے ایک ہے۔

یہ بات اپنی جگہ ثابت شدہ ہے کہ حیات کے تین ادوار ایک ہی حقیقت قدسیہ کی مختلف تجلیاں اور ایک ہی خدائی جلوے کے مختلف مراحل ہیں۔ یہ تین مراحل حیات کچھ یوں ہیں:

۱۔ نشأۃ ملک، یعنی دنیوی زندگی جو ظاہری عبادات کی آماجگاہ ہے۔

۲۔ نشأۃ ملکوت، یعنی برزخی زندگی۔ یہ قلبی عبادات اور باطنی تزکیہ وتصفیہ کا مرحلہ ہے۔

۳۔ نشأۃ جبروت، یعنی اخروی زندگی جو روحانی عبادات اور تجرید وتفرید وتوحید کی مظہر ہے۔

نفس کے غیبی وجود اس کے غیبی اور برزخی وجود سے نسبت ظاہریت ومظہریت والی نسبت بھی نہیں، بلکہ ان کی باہمی نسبت ایک ہی چیز کے ظاہر وباطن کے درمیان موجود نسبت سے عبارت ہے۔

پس زندگی کے ان تین مراحل میں سے ہر مرحلہ دوسرے مرحلے پر اس مرحلے کی مناسبت سے اثر انداز ہوتا ہے۔ بطور مثال ظاہری عبادات شرعیہ اگر اپنے ظاہری وباطنی آداب کے مطابق ہوں تو یہ باطنی تزکیہ وتہذیب کا موجب بنیں گی، بلکہ روح کے اندر توحید وتجرید کے بیج بوئیں گی۔ اسی طرح باطن کا تزکیہ وتصفیہ بندگی کی قوت میں اضافہ کرتا ہے اور انسان کو توحید وتجرید کی حقیقتوں تک پہنچا دیتا ہے۔ اسی طرح روح توحید باطن کو صاف اور عبودیت کو کامل بنا دیتی ہے۔ اس لئے سالک راہ حق کو چاہئے کہ وہ زندگی کے تینوں مراحل میں استقامت دکھائے اور کسی مرحلے میں بھی غفلت کا مظاہرہ نہ کرے۔

عین ممکن ہے کہ کسی نامحرم کی طرف ایک غلط نظر یا زبان کی معمولی سی غلطی انسان کو مدتوں تک توحید کے اسرار وحقائق سے محروم رکھے، نیز اسے محبوب کے جلوؤں اور مطلوب کے ساتھ خلوت (جو اہل معرفت کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے) سے دور رکھے۔ پس کسی بھی مرحلے میں توقف کرنا اور کسی بھی مرحلہ حیات سے لاپروائی برتنا سعادت وخوشبختی سے محرومی کا سبب اور شیطان کے داموں میں سے ایک دام ہے۔ مثلاً جو لوگ ظاہری عبادات ومناسک سے آشنا ہیں اور ان کو سخت اہمیت دیتے ہیں، شیطان ان ظاہری عبادات کو ان کی

نظروں میں مزّین کر کے پیش کرتا ہے اور ان کی نظر میں انہی ظاہری عبادات ومناسک کوتمام خوبیوں اور کمالات کا محور بنا کر پیش کرتا ہے اور دیگر کمالات ومعارف اور خوبیوں کی اہمیت کو ان کی آنکھوں سے گرا دیتا ہے، بلکہ انہیں ان خوبیوں اور کمالات نیز ان کے حامل افراد سے بدگمان بنا دیتا ہے۔ شیطان ان کی نظر میں اہل معرفت کو کفروزندقہ کا مجرم ٹھہراتا ہے، نیز صاحبان اخلاق اور اہل ریاضت کو تصوف کا ملزم گردانتا ہے۔ اس طرح شیطان ان سادہ لوح اور بے چارے عبادت گزاروں کو سالہا سال تک عبادت کے ظاہری خول میں قید رکھتا ہے، نیز اپنے مکروفریب اور وسوسوں کی زنجیر میں ان کو باندھ کر رکھ دیتا ہے۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ اس قسم کے بعض لوگوں پر عبادت کا الٹا اثر ہوتا ہے۔ چنانچہ بعض لوگوں کے اندر نماز کا اثر عجب، تکبر، خود بینی اور خود پسندی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، حالانکہ یہی نماز تواضع اور خشوع سے عبادت ہے، نیز ترک تکبر اور اللہ کی طرف سفر اس کی روح ہے اور یہ معراج مؤمن ہے۔[1]

اسی طرح شیطان بعض ایسے لوگوں کو بھی اپنے دام میں پھنسا لیتا ہے جو تہذیب نفس اور تزکیہ اخلاق میں مشغول ہوتے ہیں۔ شیطان ان کو یہ تاثر دیتا ہے کہ ظاہری عبادات، رائج علوم اور معارف الٰہیہ کی کوئی حیثیت نہیں ہے، بلکہ تمام خوبیوں، جملہ کمالات اور کامیابیوں کا دارومدار صرف سیر وسلوک، ریاضت نفسانی اور تزکیہ نفس پر ہے۔ یوں شیطان ان لوگوں کو مذکورہ عبادات وعلوم ومعارف اور ان کے حامل افراد سے بدگمان بنا دیتا ہے یہاں تک کہ سیر وسلوک اور تزکیہ نفس کے یہ دعویدار علمائے شریعت اور ارکان دین، حکمائے ربانی اور فقہائے کرام (رضوان اللہ علیہم) کے خلاف طعن تشنیع اور گستاخانہ لب کشائی کی جرأت کرتے ہیں، جبکہ اپنے آپ کو باطنی پاکیزگی اور اخلاق حمیدہ کا پیکر، نیز اللہ کے خاص بندوں میں شامل قرار دیتے ہیں۔

خود پسندی (جو اکثر صفات رذیلہ کا سرچشمہ ہے) تکبر اور اللہ کے بندوں سے بدگمانی (جو شیطان کی میراث ہیں) ان لوگوں کے دلوں میں اس قدر راسخ ہوتی ہیں کہ وہ اپنے اور اپنے جیسے مٹھی بھر قلندروں (جنہیں وہ اہل اللہ کے نام سے یاد کرتے ہیں) کے سوا دوسروں کو پائی برابر بھی اہمیت نہیں دیتے، حالانکہ ان نام نہاد قلندروں کو شریعت کے باطن کی تو در کنار شریعت کے ظاہری احکام کی بھی ذرّہ

۱۔ حدیث نبویؐ: ﴿الصَّلاۃُ مِعْراجُ المُؤمِن﴾ کی طرف اشارہ ہے۔ (دیکھئے علامہ مجلسیؒ کی الاعتقادات، ص ۲۹؛ نیز بحار الانوار، ج ۷۹، ص ۲۴۸)۔

برابر خبر نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ وہ زندگی کے ایک ہی مرحلے اور درجے میں مقید رہنے کی وجہ سے دیگر مدارج سے محروم رہتے ہیں یہاں تک کہ اس شعبے میں بھی ناکام رہتے ہیں جس میں مہارت کا وہ دعویٰ کرتے ہیں اور اپنے آپ کو اس سے وابستہ سمجھتے ہیں۔

اسی طرح اگر کوئی فلسفی یا عارف بھی شیطان کے دام میں گرفتار ہو جائے اور عقلی علوم کے دائرے میں محبوس و مقید ہو کر رہ جائے تو وہ دوسروں کی طرف ذلت آمیز نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ دوسروں کی بات تو درکنا علمائے شریعت کو بھی ظاہر پرست اور فقہائے دین کو عام لوگ سمجھنے لگتا ہے۔ وہ اپنے اور اپنے ساتھیوں (جو کچھ علمی مفاہیم اور چند اصطلاحات کے گودام کے چوکیدار ہیں) کے علاوہ کسی اور کو انسان ہی شمار نہیں کرتے۔ اس آفت کی واحد وجہ بھی یہی ہے کہ وہ ایک ہی خول میں بند رہتے ہیں اور ان پر ابلیس کا تسلّط ہوتا ہے۔

اگر یہ لوگ مختلف مراحل شہود کے محافظ ہوتے اور مدارج حیات میں گردش کرتے یا کم از کم علم و برہان کی روشنی میں نفس کے مراحل غیب و شہود اور مدارج ظاہر و باطن کو جان لیتے، ارتباط مراتب سے آگاہ ہوتے، نیز سیر الی اللہ کی کیفیت اور نفس و مادیت کے قید خانے سے نکلنے کے گر سے واقف ہوتے تو وہ شیطان کے اس بڑے دام اور ابلیس کے تاریک قید خانے میں پھنس نہ جاتے، نیز ان میں سے ہر کوئی دوسرے سے بیزاری اختیار نہ کرتا، بلکہ وہ ایک دوسرے سے حسن ظن رکھتے اور ان کے درمیان اخوت ایمانی[1] اور محبت دینی (جو تصفیہ باطن اور تطہیر و تزکیہ نفس کی بنیادی شرط ہے) کو فروغ و استحکام حاصل ہوتا۔ علاوہ ازیں خود پرستی، خود بینی اور عجب و تکبر (جو اہم ترین صفات رذیلہ اور شیطانی داموں میں سے ہیں) کا نام و نشان ہی ان کے دلوں سے مٹ جاتا۔

انشاء اللہ اب ہم اس ربّ العزت کی تائیدات اور توفیقات کے سہارے اپنے اصلی مقصد کا آغاز کریں گے جو اس حدیث شریف کی شرح سے عبارت ہے۔

۱۔ آیۂ قرآنی ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ﴾ کی طرف اشارہ ہے۔ (مؤمنین تو بس آپس میں بھائی بھائی ہیں)۔ سورۂ حجرات ۱۰۔

مقالہ / ٦

عقل وجهل کے لشکروں کا بیان

اور

چند زاویوں سے ان کی تشریح

اس کتاب کا بنیاد مقصد یهی زاوئے هیں نه که سارے زاوئے

یه مقاله چند مقاصد پر مشتمل هے:

مقصد / ۱

خیر وشرّ کا بیان

تشریح: امام صادق علیہ السلام سے مروی "حدیث جنود عقل وجہل" کے اس حصے کی: ﴿فَكانَ مِمّا أعْطَى العَقْلَ مِنَ الخَمْسَةِ وَالسَّبْعِينَ الجُنْدِ: الخَيْرُ وَهُوَ وَزِيرُ العَقْلِ، وَجَعَلَ ضِدَّهُ الشَّرَّ، وَهُوَ وَزِيرُ الجَهْلِ﴾

یہ مقصد چند فصول پر مشتمل ہے:

فصل اول
خیر وشر سے کیا مراد ہے؟

جان لو کہ خیر وشر کی ماہیت کے بارے میں گفتگو ہمارے موضوع بحث سے خارج ہے۔ فلسفہ وحکمت کی کتابوں میں ان دونوں کی جو تعریفیں کی گئی ہیں وہ ان کے لوازم، ملزومات، لواحق اور عوارض کے ذریعے کی گئی ہیں [۱]۔ چونکہ یہ دونوں اپنے مفہوم اور ماہیت کے لحاظ سے واضحات وبدیہیات میں شامل ہیں، لہذا اس امر کو ضمیر وفطرت پر چھوڑ دینا ہی بہتر اور مقصد سے نزدیک تر ہے۔ البتہ یہاں اس بات کا بیان اہمیت کا حامل ہے کہ خیر وشر سے کیا مراد ہے؟ کیونکہ اس حدیث میں خیر کو عقل کا وزیر اور شر کو جہل کا وزیر قرار دیا گیا ہے۔

پس یہ جاننا ضروری ہے کہ یہاں ان دونوں سے مراد خود خیر وشر نہیں جیسا کہ عام لوگ مراد لیتے ہیں، بلکہ مراد کچھ اور ہے جس کی طرف اشارہ کیا جائے گا، کیونکہ یہ نہ عقل کی وزارت سے مناسبت رکھتا ہے نہ اس

۱۔ دیکھئے صدر المتألہین شیرازی رحمہ اللہ کی الاسفار الاربعہ، ج ۴، ص ۵۷؛ نیز مذکورہ مصنف کی شرح اصول کافی، ج ۱، ص ۳۸۶؛ نیز مرآۃ العقول (مجلسی رحمہ اللہ)، ج ۱، ص ۶۷ اور ملا صالح مازندرانی کی شرح اصول کافی، ج ۱، ص ۲۷۵۔

کا لشکر ہونے سے۔ پس ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان دونوں سے مراد یہاں ''حقیقت فطرت'' ہے جس کی طرف اس قرآنی آیت میں اشارہ ہوا ہے: ﴿فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا﴾ ۱۔

خلاصہ یہ کہ ''خیر'' عبارت ہے ''فطرت مخمورہ'' سے اور ''شر'' عبارت ہے ''فطرت محجوبہ'' سے۔ اس اختصار کی تفصیل یہ ہے کہ: جب اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت وعنایت کے ذریعے اپنے دست قدرت سے آدمؑ کی مٹی گوندھی ۲ تو اس وقت اس کی فطرت وجبلت میں دو چیزیں ودیعت فرمائیں جن میں سے ایک کی حیثیت اصلی ہے اور دوسرے کی فرعی وضمنی اور ثانوی۔ یہ دونوں فطری قوتیں تیز رفتار اور سریع السیر ہیں اور برق رفتاری سے اپنے اصلی مقصود ومطلوب کی طرف سفر کرتی ہیں۔ یہ دونوں فطری قوتیں ان تمام فطری قوتوں کی جڑ اور بنیاد ہیں جو انسان کے خمیر میں شامل ہیں۔ باقی فطری امور ان دونوں کی شاخیں اور ان کے پتے ہیں۔

ان دونوں فطری قوتوں میں سے ایک اصلی اور بنیادی حیثیت کی حامل ہے اور وہ ہے کمال مطلق، خیر مطلق اور سعادت مطلقہ سے عشق کا فطری جذبہ۔ یہ جذبہ تمام افراد بشر کی خمیر، فطرت اور طبیعت میں شامل ہے خواہ وہ سعید ہوں یا شقی، عالم ہوں یا جاہل، نیز بلند مرتبہ ہو یا پست۔ اگر کوئی انسان اٹھے اور تمام افراد بشر کے درمیان تحقیق وتفحص کرے نیز مختلف اقوام وملل عالم کے درمیان کھوج لگائے تو اسے ایک فرد بھی ایسا نہیں ملے گا جو اپنی فطرت وجبلت کی بنیاد پر کمال کا طالب، خیر کا عاشق اور سعادت وخوشبختی کی طرف متوجہ نہ ہو۔ فطری امور سے مراد اسی طرح کے امور ہیں۔ اسی لئے فطریات کا تعلق بدیہی ترین اور واضح ترین امور سے ہوتا ہے۔ اگر کوئی امر خصوصیت کا حامل نہ ہو تو وہ فطری نہ ہوگا۔

ان دو فطری جذبوں میں سے دوسرا جذبہ فرعی، ثانوی، طفیلی اور ذیلی حیثیت کا حامل ہے اور وہ ہے نقائص، شر، اور شقاوت اور ناکامی سے نفرت کا جذبہ۔ یاد رہے کہ یہ جذبہ ثانوی عرضی اور فرعی حیثیت کا حامل ہے۔ کمال اور خیر سے عشق کے فطری اور اصلی جذبے کے ضمن میں نقائص سے نفرت کا جذبہ بھی انسان کی

۱۔ اللہ کی فطرت سے مراد وہی ہے جس پر اللہ نے انسان کو خلق فرمایا۔ سورۂ روم ۳۰۔

۲۔ یہ حدیث قدسی کے الفاظ: ﴿خَمَّرْتُ طِينَةَ آدَمَ بِيَدِي أَرْبَعِينَ صَبَاحاً﴾ یعنی، میں نے آدم کے گارے کو اپنے ہاتھوں سے چالیس دنوں تک گوندھا۔ (عوالی اللئالی، ج ۴، ص ۹۸، حدیث ۱۳۸)۔

فطرت اور خمیر میں شامل ہے (ہم آیندہ صفحات میں اس امر کی تشریح کریں گے)۔

یہ دونوں فطرتیں جن کا ذکر ہوا انسان کے خمیر میں داخل ہیں اور غیر مجوبہ ہیں۔ یہ عالم مادہ وطبیعت کے اثرات سے متاثر نہیں ہوئیں اور ان کی نورانیت وروحانیت باقی ہیں۔ اگر فطرت عالم مادہ وطبیعت کی طرف مائل اور اس کی تابع ہوجائے نیز روحانیت ومعنویت اور اپنے حقیقی عالم سے محجوب ہوجائے تو وہ تمام برائیوں کا سرچشمہ اور جملہ بدبختیوں کا محور قرار پائے گی جس کا بیان آگے آئے گا۔

پس ''خیر'' (جو عقل کا وزیر ہے اور عقل کے تمام لشکر اس کے زیرنگین ہیں) سے مراد فطرت مخمورہ ہے جو روحانیت ومعنویت اور اپنے حقیقی واصلی مقام کی طرف متوجہ ہو اور ''شر'' (جو جہل کا وزیر ہے اور جہل کے سارے لشکر اس کے مرہون منّت ہیں) سے مراد وہ فطرت ہے جو عالم مادہ وطبیعت کی تابع ہو اور اس کے آثار وخواص کی وجہ سے محجوب ہو۔

دوسری فصل

اس موضوع کی توضیح وتشریح

جان لو کہ دل (جو فطرت کا مرکز ہے) کے دو پہلو ہیں: ایک اس کا غیبی اور روحانی پہلو ہے اور دوسرا پہلو عالم شہود وطبیعت کا ہے۔

انسان عالم رنگ وبو، یعنی اس مادی، دنیوی اور طبیعیاتی عالم کا فرزند ہے (جیسا کہ قرآنی آیت ﴿اُمُّهُ هَاوِيَةٌ﴾[1] کا اشارہ بھی اسی امر کی طرف ہوسکتا ہے) بنابریں اپنی خلقت کی ابتداء سے ہی وہ مادیات اور طبیعیات کے خول میں پروان چڑھتا ہے، نیز اس کی روحانیت اور فطرت طبیعیات کے پردے میں ہی واقع ہوتی ہے، یوں مادی اور طبیعیاتی عالم کے اثرات اس پر غالب اور محیط ہوجاتے ہیں۔ پس وہ جس قدر اس طبیعیاتی عالم میں پروان چڑھتا رہے اسی قدر اس عالم کے اثرات اس پر زیادہ مرتب ہوتے جاتے ہیں اور جب وہ طفولیت کے مرحلے میں پہنچتا ہے تو وہ تین قوتوں کا حامل ہوتا ہے جو عبارت ہیں: شیطنت کی قوت (جو قوۂ واہمہ کی پیداوار ہے)، غضب کی قوت اور شہوت کی قوت۔ پھر وہ جس قدر جسمانی حیاتیاتی

۱۔ (جس شخص کے اعمال کا وزن ہلکا ہو) اس کی جگہ جہنم ہے۔ سورۂ قارعہ ۹۔

اور حیوانی رشد حاصل کرتا جائے اسی قدر یہ تین قوتیں اس کے اندر کامل تر ہوتی جاتی ہیں۔ یوں طبیعیات اور حیوانیت اس پر غالب آتی ہیں۔ شاید قرآنی آیت ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيم ☆ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِين﴾[۱] اشارہ ہو۔ فطرت کے اصلی نور کی طرف جو ید قدرت نے انسان کی خمیر میں داخل کیا اور یہی ''احسن تقویم'' ہے، کیونکہ یہ کمال مطلق اور جمال کامل کی تخلیق ہے۔ ''اسفل سافلین'' کی طرف لوٹانا اشارہ ہے اس دنیوی اور مادی پردوں کی طرف، کیونکہ یہ مادی دنیا ''اسفل سافلین'' ہے۔ روح انسانی پر حجابوں، تاریکیوں اور کدورتوں کا غلبہ ہوتا ہے اور ایسا اتفاق بہت کم ہوتا ہے کہ کوئی شخص ان حجابوں سے خود بخود باہر نکل آئے اور اصلی فطرت کے ساتھ اپنے حقیقی عالم میں محو سفر ہو کر کمال مطلق، نور مطلق اور جمال وجلال مطلق تک پہنچ جائے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی عنایت ازلی اور رحمت واسعہ سے انبیائے عظام علیہم السلام کو انسانی تربیت کی خاطر بھیجا، نیز آسمانی کتابوں کو نازل کیا تاکہ وہ باہر سے اندرونی فطرت کی مدد کریں اور روح کو اس مضبوط غلاف سے نجات دیں۔

یہی وجہ ہے کہ فطرت وجبلّت کے تقاضوں کے مطابق احکام خداندی آیات الٰہی اور فرامین انبیاء واولیاء کی بنیادیں رکھی گئی ہیں۔ بنیادی طور پر تمام احکام خداوندی کے دو مقاصد ہیں جن میں سے ایک کو اصلی اور ذاتی حیثیت حاصل ہے جبکہ دوسرے کو فرعی اور ضمنی۔ جملہ احکام الٰہی بالواسطہ یا بلا واسطہ ان دو مقاصد کی طرف لوٹتے ہیں۔

پہلا مقصد: جو اصلی ذاتی اور خودمختار حیثیت کا حامل ہے یہ ہے کہ فطرت کو کمال مطلق کی طرف راغب کیا جائے۔ کمال مطلق سے مراد اللہ تعالیٰ، نیز اس کی ذات وصفات اور افعال کے کمالات ہیں۔ تخلیق کائنات، آخرت، توحید، آسمانی کتب، انبیاء، ملائکہ اور یوم آخرت پر ایمان سے مربوط مباحث، روحانی سیر وسلوک کے اہم مراحل نیز نماز وحج جیسے بہت سارے فروعی احکام بالواسطہ یا بلا واسطہ اسی مقصد سے مربوط ہیں۔

دوسرا مقصد: جو فرعی اور ضمنی نوعیت کا ہے یہ ہے کہ فطرت کو عالم مادہ اور دنیا کے شجرہ خبیثہ (جو خرابیوں کی جڑ اور ام الامراض ہے) سے نفرت دلائی جائے۔ ربوبیت سے مربوط بہت سارے مسائل، اہم قرآنی

۱۔ بے شک ہم نے انسان کو بہترین اعتدال میں پیدا کیا پھر ہم نے اسے پست ترین حالت کیطرف پلٹا دیا۔ تین ۴/ ،۵۔

تعلیمات، اللہ، رسول اور اولیاء کے اہم فرامین، ریاضت اور سیر وسلوک کے اہم ابواب نیز بہت سارے شرعی احکام (مثلاً روزہ، واجب صدقات، مستحب صدقات، تقویٰ اور ترک گناہ وغیرہ) کی برگشت اسی مقصد کی طرف ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ یہ دونوں مقاصد فطرت کے تقاضوں سے ہماہنگ ہیں، جیسا کہ آپ نے جان لیا کہ انسان کے اندر دو فطری جذبے موجود ہیں۔ ان میں سے ایک کمال سے عشق کا جذبہ ہے اور دوسرا نقائص سے نفرت کا جذبہ۔ پس تمام شریعتوں کے جملہ احکام فطرت سے مربوط اور ہماہنگ ہیں اور ان احکام کا مقصد فطرت کو اس مادی عالم کے تاریک پردوں سے رہائی بخشنا ہے۔

تیسری فصل

بے حجاب فطرت مخمورہ اور فطرت محجوبہ کا بیان

یاد رہے کہ کمال مطلق سے عشق تمام بنی نوع انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ علم مطلق، قوت مطلق، حیات مطلق اور ارادۂ مطلقہ سے عشق، نیز دیگر اوصاف جمال وجلال سے عشق کا سرچشمہ وہی کمال مطلق سے عشق ہے۔ کمال مطلق سے عشق کا فطری جذبہ رکھنے میں سب لوگ مساوی ہیں اور کوئی گروہ دوسرے سے ممتاز نہیں، اگرچہ وہ اس کے مدارج ومراتب میں فرق رکھتے ہوں، لیکن عالم طبیعیات کے پردوں، ان پردوں کی قلت وکثرت، عالم کثرت کے ساتھ وابستگی میں کمی وزیادتی، نیز دنیا اور اس کے بہت ساری شعبوں کے ساتھ دل بستگی کے باعث لوگ کمال مطلق کی تشخیص کے بارے میں اختلاف وافتراق کا شکار ہیں۔

ماحول، رسوم، مذاہب اور عقائد وغیرہ کے اختلافات نے انسان کی مذکورہ فطرت کو تو تبدیل نہیں کیا۔ البتہ اس فطرت کو مطلوب کمال مطلق کی تشخیص پر یہ اختلافات اثر انداز ہوئے ہیں اور اس کے نتیجے میں بہت سے اور بڑے بڑے اختلافات رونما ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ عظیم فلسفی جو فلسفی موضوعات سے عشق رکھتا ہے اور اپنی پوری زندگی مختلف فلسفی علوم وموضوعات کی تحقیق میں گزار دیتا ہے، اسی طرح وہ بادشاہ جو اپنی سلطنت کی حدود میں توسیع کیلئے کوشاں ہوتا ہے، اس مقصد کیلئے تکالیف اٹھاتا ہے اور اپنی حکومت وسلطنت کی تقویت سے والہانہ محبت رکھتا ہے، نیز وہ تاجر جو مال ودولت کی جمع آوری سے شغف رکھتا ہے یہ

سب کمال مطلق کی شدید آرزو رکھنے میں یکساں ہیں۔ البتہ ان میں سے ہر ایک کمال کی تشخیص میں اختلاف رکھتے ہیں اور ہر کوئی اپنی منظور نظر چیز کو ہی کمال مطلق کا مصداق سمجھتا ہے۔

یاد رہے کہ تشخیص کمال میں یہ اختلاف فطرت پر عارض ہونے والے پردوں کے باعث ہے، کیونکہ یہ اختلاف مطلوب کی تشخیص میں غلطی سے عبارت ہے۔ یہ غلطی آداب و رسوم، عقائد اور تربیت کے طور طریقوں میں اختلاف کا شاخسانہ ہے۔ ان میں سے ہر ایک اپنے حجاب کے حساب سے اپنے مطلوب ومحبوب مطلق سے محجوب و پوشیدہ ہے۔

مذکورہ چیزوں میں سے کوئی چیز بھی ان کا مطلوب حقیقی نہیں ہے، اگر چہ وہ ان کے دلباختہ وتلاش میں ہیں اور اپنی زندگیاں ان کی خاطر داؤ پر لگاتے ہیں، کیونکہ مذکورہ چیزوں میں سے ہر ایک محدود اور ناقص ہے جبکہ فطرت کا مطلوب ومحبوب مطلق وکامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے مطلوب تک رسائی کے بعد بھی مطمئن نہیں ہوتے۔ مثلاً اگر آپ حکومت کے دلدادہ شخص کو (جو حصول حکومت کو اپنا آخری اور واحد منزل مقصود قرار دیتا ہے) کسی ملک کی حکومت دے دیں تو وہ شخص اپنے خیالی اور مجازی مطلوب تک رسائی کے باوجود ایک اور حکومت وسلطنت کا طالب نظر آئے گا۔ نیز وہ کسی اور ملک کا طالب نظر آئے گا۔ اگر اسے وہ حکومت بھی مل جائے تو مزید حکومتوں کا طالب بن جائے گا۔ پھر اگر اس کرہ ارض پر اس کا مکمل قبضہ ہو جائے اور اسے یہ بھی معلوم ہو جائے کہ دیگر کرات میں یہاں سے زیادہ وسیع اور بہتر ممالک موجود ہیں تو وہ ان تک رسائی کا بھی طلبگار ہوگا۔ اگر وہ اس پورے مادی عالم پر قابض ہو جائے پھر اسے عالم ملکوت کی بھنک پڑ جائے (اگر چہ وہ اس کا مقصد نہ ہو) تو وہ تمنا کرے گا کہ کاش یہ باتیں درست ہوں، یہ حکومتیں حقیقت ہوں اور اسے ان پر دسترسی حاصل ہو جائے۔

معلوم ہوا کہ انسان کا حقیقی مطلوب ومعشوق یہ محدود حکومت وسلطنت نہیں ہے، بلکہ انسان کی فطرت ایک بے پایاں اور مطلق سلطنت کی طالب وعاشق ہے۔ فطرت محدودیت سے متنفر اور گریزاں ہوتی ہے لیکن انسان اس سے غافل ہوتا ہے۔

واضح ہے کہ مطلق اور بے پایاں سلطنت اسی دنیا کی مجازی حکومتوں سے مختلف ہے، بلکہ آخرت کی محدود سلطنت سے بھی مختلف ہے، بلکہ سلطنت الٰہیہ ہی سلطنت مطلقہ ہے۔ انسان اللہ کی بے پایاں سلطنت

اور قوت کا طالب ہے۔ وہ اپنے خالق کا طلبگار ہے۔[1] وہ جس ذرے کا دل چیر کر دیکھے اس میں جمال حقیقت کے آفتاب کا نظارہ کرے گا۔[2]

پس اس عالم میں انسان سے صادر ہونے والی تمام برائیاں فطرت کے حجاب بلکہ فطرت محجوبہ کا شاخسانہ ہے۔ ان حجابوں سے مربوط ہونے کے باعث عرضی طور پر خود فطرت کے اندر خرابی اور برائی پیدا ہوتی ہے، یوں وہ بری اور خراب ہو جاتی ہے جبکہ وہ بنیادی طور پر اچھی بلکہ بہتری سے عبارت ہوتی ہے۔

اگر فطرت کے چہرے سے یہ ظلمانی پردے (بلکہ نورانی پردے بھی) ہٹ جائیں اور اللہ کی عطا کردہ فطرت اپنی روحانیت سے اسی طرح مزین ہو جائے جس طرح اللہ نے اسے خلق کیا تھا تو اس وقت کمال مطلق کے ساتھ عشق کے پردے ہٹ جائیں گے اور اشتباہ کے بادل چھٹ جائیں گے، تب انسان اپنے مجازی محبوبوں اور بت خانہ قلب کے اصنام کا صفایا کر دے گا، نیز وہ خود پرستی اور خود بینی وغیرہ کو جڑ سے اکھاڑ دے گا۔ یوں وہ ایک ایسے محبوب کا گرویدہ نظر آئے گا جو خواہ ناخواہ سارے دلوں کا قبلہ توجہ ہے اور تمام فطرتیں (دانستہ یا نادانستہ طور پر) اس کی طالب ہیں۔ اس قسم کی فطرت کا حامل انسان جو کچھ کرے گا حق اور حقیقت کی خاطر کرے گا۔ اس کی ہر حرکت خیر مطلق تک رسائی اور جمیل مطلق کے جمال تک پہنچنے کی تمہید ہوگی۔ یہ فطرت بجائے خود اچھائیوں اور خوش بختیوں کا سرچشمہ ہے۔ وہ اچھائیوں کا حامل، بلکہ خود اچھائی کا پیکر ہے۔ والحمدللہ تعالیٰ

چوتھی فصل

اصلاح نفس کی ضرورت

گزشتہ ابحاث سے معلوم ہوا کہ تمام خوبیوں کا سرچشمہ فطرت خداوندی ہے بشرطیکہ وہ طبیعیات کے پردوں سے پوشیدہ نہ ہو، نیز نفس امارہ اور ابلیس کے پیچیدہ پھندوں میں نہ پھنس جائے۔ یہی فطرت شریفہ

۱۔ یہ حکیم نظامی گنجوی کے اس شعر کی طرف اشارہ ہے: همه هستند سرگردان چو پرگار　　پدید آرندهٔ خود را طلبکار
(دیکھئے خمسہ نظامی گنجوی، خسرو شیرین، تصحیح بہروز ثروتیان، ج۲، ص۷۳)۔

۲۔ اشارہ ہے ہاتف اصفہانی کے اس شعر کی طرف: دل ہر ذرّہ را کہ بشکافی　　آفتابیش در میان بینی
(دیوان ہاتف اصفہانی، ص۲۸)۔

ہی انسان کیلئے لامحدود خوشبختی کی ضامن ہے۔ ہم یہ بھی جان چکے کہ تمام برائیوں کا سرچشمہ طبیعیات کی ظلمتوں سے پوشیدہ تاریک فطرت ہے، نیز تمام دنیوی واخروی بدبختیوں کی جڑ یہی حجابات ہیں۔

یاد رہے کہ اگر انسان اپنے آپ سے غافل ہوا اور تزکیہ واصلاح نفس کی کوشس نہ کرے بلکہ نفس کو بے لگام چھوڑ دے تو روز بروز، بلکہ ہر ساعت نفس کے حجابوں میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ ہر حجاب کے بعد ایک اور حجاب بلکہ کئی حجاب ظاہر ہوں گے یہاں تک فطرت کا نور مکمل طور پر دم توڑ دے اور اس میں محبت الٰہیہ کا شائبہ بھی باقی نہ رہے، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ سے مربوط امور مثلاً قرآن، ملائکہ، انبیائے عظام، اولیاء کرام (علیہم السلام)، دین حق اور دیگر تمام خوبیوں سے متنفر اور بیزار ہوتا ہے، پھر اللہ اور اللہ کی مقرب ہستیوں سے نفرت کی جڑیں اس کے دل میں محکم ہوجاتی ہیں اور نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ کامیابی کے سارے دروازے بند ہوجاتے ہیں، نیز اللہ تعالیٰ اور شفیع ہستیوں (جن پر درود وسلام ہو) کے ساتھ اس کے اچھے روابط کا راستہ مسدود ہوجاتا ہے، پھر وہ ہمیشہ کیلئے اس مادی دنیا کا اسیر ہوکر رہ جاتا ہے جس کا باطن کسی دوسرے عالم میں جلوہ گر ہوتا ہے اور وہ ابدی عذاب جہنم سے عبارت ہے۔

ان حجابوں میں اضافے کا طبیعی سبب یہ ہے کہ انسان کے اندر تین قوتیں موجود ہیں، یعنی قوۂ شیطنت (جس کے آثار خود بینی، تکبّر، حبّ جاہ، مکروفریب، نفاق، جھوٹ وغیرہ ہیں)؛ قوۂ غضبیہ (جس کے آثار خودسری، استبداد، خود پسندی، سرکشی، قتل وغارت، فحاشی اور مردم آزاری وغیرہ ہیں) اور قوۂ شہویہ (جس کے مظاہر میں حرص، لالچ، بخل وغیرہ شامل ہیں)۔ یہ تینوں قوتیں کسی حد کی پابند نہیں ہیں۔ یعنی اگر انسان شیطنت کی قوت کو بے گام چھوڑ دے تو یہ کسی حد کی پابند نہیں رہتی اور کسی حاصل مرحلے پر اکتفا نہیں کرتی، بلکہ اپنے مقاصد کے حصول کیلئے وہ تمام الٰہی اصولوں اور برحق شرعی قوانین کی مخالفت اور ان سے عداوت کیلئے تیار ہوتی ہے۔ وہ معمولی سا اقتدار حاصل کرنے کیلئے اس بات پر تیار ہوتی ہے کہ انبیاء، اولیاء، صالحین اور علمائے ربانی کی بڑی تعداد کو قتل کردے۔ اسی طرح غضب اور شہوت کی طاقتیں بھی اگر بے لگام ہوجائیں تو ہر قسم کی حدود کو پھلانگ جاتی ہیں۔

ظاہر ہے کہ ان تینوں قوتوں سے مربوط ہر مرحلہ (جو انسان کو حاصل ہو) اپنے تناسب سے انسان کو دنیا کا دلدادہ بنا دیتا، نیز اسے حق وحقیقت اور روحانیت سے غافل کردیتا ہے۔ مثال کے طور پر قوت ذائقہ کے ذریعے حاصل ہونے والی ہر دنیوی لذت اگر خدائی حدود وقیود کی پابند نہ رہے تو انسان کو دنیا کا دلدادہ بنا

دیتی ہے۔اسی حساب سے روحانیت اور حق کے ساتھ اس کا دلی لگاؤ کم ہوتا ہے اور اللہ سے محبت زائل ہوتی ہے۔ چونکہ ہر لذت کے بعد نفس ایک اور لذت، بلکہ مزید لذتوں کا طالب ہوتا ہے اور نفس امارہ حصول لذت سے مربوط حواس کو ان کے حصول کی ترغیب دیتا ہے، لہذا ہر حجاب کے پیچھے انسان کیلئے مزید کئی ظلمانی حجاب وجود میں آتے ہیں، نیز ان حیاتی راہوں (جن کے ذریعے ہی نفس کی کرنیں دنیا اور عالم طبیعیات میں جلوہ گر ہوتی ہیں) میں سے ہر ایک جس کی وساطت سے قلب وروح کے اوپر مسلسل پردے اور حجاب کھنچتے چلے جاتے ہیں۔ یہ امر انسان کو اللہ کی طرف بڑھنے اور حق جل جلالہ کی طلب سے باز رکھتا ہے۔

خسارہ، نقصان، افسوس اور حیرت وتعجب کا مقام یہ ہے کہ وہی فطرت جو اولیاء اللہ کیلئے معراج قربت الہیہ کی خاطر براق کی حیثیت رکھتی ہے اور کمال مطلق تک رسائی کا واحد ذریعہ ہے کبھی اس خودسر انسان کو شقاوت وبدبختی اور اللہ کی بارگاہ سے دوری کی انتہا تک پہنچا دیتی ہے۔ یقیناً سب سے بڑا خسارہ یہی خسارہ ہے جیسا کہ ارشاد باری ہے: ﴿وَالعَصرِ ☆ اِنَّ الاِنسَانَ لَفِي خُسر﴾ ۱

اس سے بڑا خسارہ کیا ہوگا کہ انسان ابدی کامیابی کا سرمایہ دائمی بدبختی وناکامی کی راہ میں خرچ کر ڈالے نیز جو چیز اللہ نے اسے اوج کمال تک پہنچنے کیلئے عطا کی ہے وہی چیز اسے پستی کے گڑھے میں گرا دے؟

اے بے چارے انسان! اس دن تجھے کتنا افسوس ہوگا جب تیری آنکھوں سے مادی پردہ ہٹ جائے گا اور تجھے معلوم ہوگا کہ تو نے دنیا میں جتنی سعی وکوشش کی تھی وہ سب تو نے اپنے لئے بدبختی، ناکامی اور بے چارگی مول لینے کیلئے کی تھی، نیز تجھے معلوم ہوگا کہ اب کوئی چارہ کار اور راہ علاج باقی نہیں اور تم کچھ نہیں کر سکتے۔ نہ اللہ کی قدرت قاہرہ سے کوئی راہ فرار ہے ﴿یَا مَعشَرَ الجِنِّ وَالاِنسِ اِنِ استَطَعتُم أَن تَنفُذُوا مِن أَقطَارِ السَّمٰوَاتِ وَالأَرضِ فَانفُذُوا﴾ ۲ نہ گزشتہ غلطیوں اور نقائص کی تلافی کا کوئی چارہ اور نہ اللہ کی نافرمانی پر عذر خواہی کی کوئی گنجائش ﴿آلآنَ وَقَد عَصَیتَ قَبلُ﴾ ۳

۱۔ زمانے کی قسم بے شک انسان خسارے میں ہے۔ سورۂ والعصر ۱،۲۔

۲۔ اے گروہ جن وانس اگر تم آسمانوں اور زمین کے کناروں سے باہر نکل سکتے ہو تو نکل جاؤ۔ سورۂ رحمٰن ۳۳۔

۳۔ کیا اب؟ جبکہ تو پہلے نافرمانی کر چکے ہو۔ سورۂ یونس ۸۱۔

عزیزو! آج ذرا کمر ہمت باندھ لو اور اپنی کامیابی کی کوئی سبیل نکال لو قبل اس کے کہ مادیت کے غلیظ پردے نور فطرت کو مکمّل طور پر ڈھانپ لیں اور گناہوں کا گدلا پن باطنی پاکیزگی کا پورا صفایا کر دے، نیز یہ دنیا (جو آخرت کی کھیتی ہے[1] اور جہاں انسان تمام نقائص کوتاہیوں اور گناہوں کی تلافی کر سکتا ہے) تیرے ہاتھ سے نکل جائے۔

جان لے کہ اگر تو نے فلاح وسعادت کی راہ میں کوئی قدم اٹھایا اور اللہ تعالیٰ سے اپنا رابطہ ٹھیک رکھا نیز گزشتہ غلطیوں کی معافی طلب کر لی تو کامیابی وخوشبختی کے دروازے تیرے لئے کھل جائیں گے، عالم غیب سے تیری دستگیری ہوگی، مادیت کے پردے یکے بعد دیگرے چھٹ جائیں گے، فطرت کا نور ان ظلمتوں پر غالب آئے گا جنہیں تو نے کمایا ہے، دل کی پاکیزگی اور باطن کی روشنی ظاہر ہوگی، تیرے لئے اللہ کی رحمت کے دروازے کھل جائیں گے، خدائی قوت جاذبہ تجھے روحانی عالم کی طرف کھینچ لے گا اور حق کی محبت رفتہ رفتہ تیرے دل میں جلوہ گر ہو کر دیگر محبتوں کو جلا ڈالے گی۔ اگر اللہ تعالیٰ تیرے اندر اخلاص وصداقت کا مشاہدہ کرے تو وہ تجھے حقیقی راہ سلوک دکھا دے گا وہ تیری آنکھ کو آہستہ آہستہ اس عالم سے غافل اور اپنی روشنی سے منور کرے گا، نیز وہ تیرے دل کو اپنے علاوہ دوسروں سے خالی کر کے اپنے ساتھ وابستہ بنا لے گا۔

خدایا! کیا اس تاریک دل اور اس بے راہ قلب کی اصلاح ہو سکے گی؟ کیا تو مادیت کی تاریکیوں میں غرق اس غافل کو نور کی دنیا میں نہ لوٹائے گا؟ کیا تو صنم خانہ دل کے بتوں کو اپنے دست قدرت سے پاش پاش نہ کرے گا؟ اور کیا تو ہماری آنکھوں سے جسمانی غبار کا صفایا نہ کرے گا؟

خدایا! ہم نے تیری امانت میں خیانت کی۔ ہم نے تیری فطرت کو شیطان پلید کے حوالے کر دیا۔ ہماری خدادادفطرت پر پردے پڑ گئے۔ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں ہم اس مادی اور شیطانی روش کے باعث آہستہ آہستہ اس فطرت الٰہیہ کے دائرے سے مکمل طور پر خارج نہ ہو جائیں اور کہیں خانہ دل کو پورے طور پر شیطان اور شیطانی لشکروں، نیز جہل اور اس کے لشکروں کے حوالے نہ کر بیٹھیں۔

خدایا! تو خود ہماری دستگیری فرما۔ ہمارے پاس مقابلے کی طاقت نہیں مگر یہ کہ تیرا لطف وکرم شامل حال ہو۔ ﴿اِنَّکَ ذُو الفَضلِ العَظِیم﴾۔

۱۔ اشارہ ہے حدیث نبوی ﴿الدُّنیا مَزرَعَةُ الآخِرَة﴾ کی طرف۔ (دیکھئے عوالی اللئالی، ج۱، ص۲۶۷، ح۶۶)

مقصد / ۲

ایمان وکفر کا بیان

یہ مقصد چند فصلوں پر مشتمل ہے:

پہلی فصل

ایمان سے مراد کیا ہے؟

جان لو کہ ایمان اور علم دو مختلف چیزیں ہیں، کیونکہ علم وادراک کا تعلّق عقل سے ہے لیکن ایمان کا تعلّق دل سے ہے۔

خدا، ملائکہ، انبیاء اور روز قیامت کا صرف علم حاصل کرنے سے کوئی شخص مؤمن نہیں کہلاتا، چنانچہ ابلیس ان تمام حقیقتوں کا عالم تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے کافر قرار دیا۔[1]

عین ممکن ہے کہ کوئی فلسفی ایسا ہو جو فلسفی دلائل وبراہین کے ذریعے توحید کی اقسام ومراتب کو واضح وآشکار اور ثابت کرے لیکن وہ خود اللہ پر ایمان سے محروم ہو، یعنی اس کا علم، عقل، کلیت اور تعقّل کے دائرے سے نکل کر دل، جزئیت، تشخص اور شہود کے مرحلے میں داخل نہ ہوا ہو۔

اس نکتے کو ذہن نشین کرنے کیلئے ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں:

ہم سب عقلی برہان وادراک کے لحاظ سے اس بات کا علم رکھتے ہیں کہ مردہ انسان زندہ انسانوں کو کوئی تکلیف نہیں پہنچا سکتے اور دنیا کے سارے مردے ایک مکھی کے برابر بھی حرکت نہیں کر سکتے۔ ہم یہ بھی علم

۱۔ اشارہ ہے اس آیت شریفہ کی طرف ﴿ابیٰ وَاستَکبَرَ وَکانَ مِنَ الکافِرِین﴾ یعنی، ابلیس نے سجدہ کرنے سے انکار کیا اور تکبّر کا مظاہرہ کیا اور وہ کافروں میں سے تھا۔ سورۂ بقرہ ۳۴۔

رکھتے ہیں کہ مردے تاریکی میں زندہ نہیں ہوتے اس باوجود ہم شب تاریک میں مردوں سے خوف کھاتے ہیں اور ہمارا وہم ہماری عقل پر غالب آجاتا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اس عقلی حقیقت پر دل کا ایمان نہیں ہوتا یعنی یہ ادراک عقل سے گزر کر دل میں داخل نہیں ہو چکا ہوتا۔لیکن جو لوگ مسلسل تجربے، کثرت ریاضت اور تاریک راتوں میں قبرستانوں میں بار بار آمد ورفت کے ذریعے مذکورہ علمی ادراک کو اپنے دل میں اتار لیتے ہیں وہ مردوں سے خوف نہیں کھاتے، بلکہ وہ قبرستانوں میں بسیرا کرتے ہیں اور وادی خموشاں سے انس پیدا کرتے ہیں۔

یہ دونوں گروہ اگرچہ اس حقیقت کا مساوی علم رکھتے ہیں کہ مردے کسی کو آزار نہیں پہنچا سکتے لیکن اس نکتے پر ایمان کے معاملے میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔اسی لئے پہلے گروہ کے علم نے ان کے اندر کوئی اثر نہیں دکھایا جبکہ دوسرے گروہ کے قلبی ایمان نے انہیں موہوم خوف سے نجات دلایا۔

معلوم ہوا کہ علم اور ایمان دو مختلف چیزیں ہیں۔لغوی لحاظ سے بھی ایمان کا مذکورہ مفہوم درست نظر آتا ہے، کیونکہ لغوی لحاظ سے ایمان وثوق، تصدیق [1]، اطمینان [2]، اطاعت اور خضوع [3] وتسلیم سے عبارت ہے۔فارسی میں ایمان کا ترجمہ ''گرویدن'' [4] یعنی ''معتقد ہونا'' ہے اور واضح ہے کہ ''اعتقاد'' علم وادراک سے مختلف چیز ہے۔

دوسری فصل

توضیح وتکمیل

جان لو کہ معارف الٰہیہ اور برحق بنیادی عقائد پر ایمان درج ذیل امور کے بغیر وجود پذیر نہیں ہوسکتا:

الف: یہ کہ انسان ان حقائق کا ادراک غور وفکر، عقلی مشق، آیات وبینات اور عقلی دلائل وبراہین کے ذریعے کرے۔یہ مرحلہ ایمان کی تمہید کہلایا جاسکتا ہے۔جب عقل یہ مرحلہ طے کرلے تو انسان اس پر اکتفا نہ کرے، کیونکہ معرفت کے اس مرحلے کے اثرات بہت کم ہوتے ہیں اور اس سے نورانیت کا حصول قلیل ہوتا

۱۔ دیکھئے نہایۃ ابن اثیر، ج۱،ص ۶۹؛ نیز لسان العرب، ج۱، ص۲۲۳۔

۲۔ مفردات راغب اصفہانی، ص ۲۵۔

۳۔ لسان العرب، ج۱ص ۲۲۴۔ ۴۔ منتہی الادب، ج۱، ص ۴۰ ۔

ہے۔اس کے بعد سالک راہ حق کو چاہئے کہ قلبی ریاضتوں میں مشغول ہو جائے اور ہر طرح کی کوشش کے ذریعے ان حقائق کو دل میں اتارے تا کہ دل ان حقائق کا معتقد ہو جائے۔ یہاں ایمان کے مراتب مختلف ہوتے ہیں۔شاید حدیث نبویؐ ﴿العِلْمُ نُورٌ يَقْذِفُهُ اللهُ فِي قَلْبِ مَنْ يَشَاءُ﴾[1] سے مراد یہی ہو، کیونکہ اللہ کی معرفت جب تک عقل کے پاس رہے ایک نور ہے پھر قلبی ریاضتوں کے بعد اللہ تعالیٰ اسے مناسب اور پسندیدہ دلوں میں ڈال دیتا ہے اور یہ دل اس علم کے معتقد ہو جاتے ہیں۔

بطور مثال توحید معارف الٰہیہ کی اہم ترین بنیاد ہے، نیز اکثر ایمانی فروعات، دیگر معارف دینی، روحانی اوصاف کاملہ اور قلب کی نورانی صفات اسی کی شاخیں ہیں، لیکن جب تک یہ (توحید) عقلی ادراک تک محدود رہے مذکورہ فروعات اس سے حاصل نہیں ہوسکتیں اور انسان اس کے ذریعے مذکورہ حقائق میں سے کسی تک رسائی حاصل نہیں کرسکتا۔

مثلاً ایمان باللہ اور توحید کی فروعات میں سے ایک اللہ تعالیٰ پر توکل اور بھروسہ ہے، لیکن ہمارے توکل کے ارکان یا برہان تک یا اس سے مشابہ امور تک ہی محدود رہتے ہیں جبکہ ہم توکل کی حقیقت سے محروم رہتے ہیں۔

ہم سب جانتے ہیں کہ اللہ کی سلطنت میں کوئی طاقت اس کی اجازت قیومی اور اشارہ اشراقی کے بغیر کسی قسم کا تصرف نہیں کرسکتی اور کسی کا ارادہ اس ذات قیوم کے ارادے پر غالب نہیں آسکتا لیکن اس کے باوجود ہم دنیا والوں اور ارباب جاہ و مال سے اپنی حاجات طلب کرتے ہیں اور اللہ سے غفلت برتتے ہیں۔

ہم مادی امور اور طبیعیات پر اللہ کے مقابلے میں کئی سوگنا زیادہ بھروسہ کرتے ہیں۔اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ''توحید افعالی'' کی حقیقت سے ہمارے قلوب کو آشنائی حاصل نہیں ہوئی۔فلسفہ توحید کا ماہر فلسفی ﴿لا مُؤَثِّرَ فِي الوُجُودِ إِلاَّ اللهُ﴾[2] کا نعرہ تو لگاتا ہے لیکن وہ خود غیر اللہ کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے۔اسی طرح ظاہری عبادات کا پابند عابد ﴿لا حَولَ وَلا قُوَّةَ إِلاَّ بِاللهِ﴾ اور ﴿لا إِلـهَ إِلاَّ اللهُ﴾ کا ورد تو

۱۔ علم ایک نور ہے، اللہ جسے چاہے اس کے دل میں یہ نور ڈال دیتا ہے۔ (موسوعة اطراف الحدیث النبویؐ، ج۵ ص ۵۱۸۔

۲۔ اللہ کے علاوہ اس کائنات میں کوئی شئے موثر نہیں ہے۔ (مزید آشنائی کیلئے ملاحظہ ہو، الاسفار الاربعہ، ج ۲ ص ۲۱۶، فصل ۱۵ مرحلہ ۶۔

کرتا ہے لیکن وہ دوسروں کا دست نگر ہوتا ہے۔اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ کے دلائل و براہین عقل وادراک کی دیواروں کے اندر مقید ہوکر رہ جاتے ہیں اور دل کی حدود میں داخل نہیں ہوجاتے۔ایسے شخص کا ذکر وورد زبان تک محدود رہتا ہے اور قلبی لذتوں سے تہی دامن ہوتا ہے۔

ہم سب توحید کا نعرہ لگاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو ﴿مُقَلِّبَ القُلُوبِ وَالأبْصَار﴾ کہتے ہیں، نیز ﴿الخَيرُ كُلُّهُ بِيَدِه﴾ اور ﴿الشَّرُّ لَيسَ اِلَيه﴾[۱] کا ورد کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود بندوں کو خوش کرنے میں لگے رہتے ہیں اور ہمیشہ غیر اللہ سے بھلائیوں کی توقع رکھتے ہیں۔ان کی وجہ بھی بس یہی ہے کہ مذکورہ دعوے یا تو ایسے عقلی حقائق ہیں جن کی خبر دل کو نہیں یا زبانی جمع خرچ ہیں جو ذکر حقیقی کے مرتبے کو نہیں پہنچے۔اسی طرح ہم سب جانتے ہیں کہ قرآن مجید سرچشمہ وحی الٰہی سے نازل ہوا ہے تاکہ انسانیت کی تکمیل ہو، نیز بنی نوع انسان مادیت اور دنیا کے تاریک زندان سے آزاد ہو۔ہم جانتے ہیں کہ تمام قرآنی وعدے سو فیصد برحق اور حقیقت ہیں اور اس کے تمام مندرجات میں کسی شک کی گنجائش نہیں، اس کے باوجود اس عظیم کتاب الٰہی کا ہمارے سخت دلوں پر اتنا بھی اثر نہیں ہوتا جتنا قصے کہانیوں کی کسی کتاب کا۔ہمیں نہ اخروی نعمتوں کے بارے میں اس کے وعدوں سے کوئی دلچسپی ہے تاکہ اس پست اور فانی دنیا سے اپنے دلوں کا رشتہ توڑلیں اور حیات ابدی سے لولگائیں اور نہ ہمیں عذاب کے قرآنی وعدوں سے کوئی خوف لاحق ہوتا ہے تاکہ اللہ کی نافرمانی اور اپنے ولی نعمت کی مخالفت سے اجتناب کریں۔اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ قرآن کی حقیقت اور حقانیت ہمارے دلوں میں نہیں اتر پائی ہے اور ہمارے قلوب اس کے معتقد نہیں ہوئے۔رہا عقلی ادراک اور ذہنی علم تو اس کا اثر بہت ہی قلیل ہوتا ہے۔ بنابریں ہمارے جملہ نقائص، ہماری ہر نافرمانی ومخالفت، نیز جملہ معارف واسرار سے ہماری محرومی کی وجہ یہی نکتہ ہے۔(تو خود حدیث مفصل بخوان ازین مجمل)۔

تیسری فصل

مذکورہ نکتے کے اثبات میں دلیل نقلی کا بیان

اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن مجید میں مؤمنین کے بعض اوصاف کا ذکر فرمایا ہے اسی طرح احادیث

۱۔ ہر بھلائی اس کے ہاتھ میں ہے اور برائی اس سے منسوب نہیں۔

شریفہ میں بھی اہل بیت معصومین (علیہم السلام) سے مؤمنین کے کچھ اوصاف نقل ہوئے ہیں جن میں سے کوئی صفت ہمارے اندر موجود نہیں جبکہ ہم خود جانتے ہیں کہ ہم سب دلائل وبراہین وغیرہ کی روشنی میں اللہ تبارک وتعالیٰ پر، اس کی توحید ذاتی پر اور دیگر اصول ایمانی پر اعتقاد وایمان رکھتے ہیں اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ایمان اور عقلی ادراک دو مختلف چیزیں ہیں جیسا کہ ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سورۂ انفال کی دوسری آیت میں ارشاد فرماتا ہے: ﴿اِنَّما المُؤمِنُونَ الَّذِينَ اِذا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَاِذا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آياتُهُ زادَتْهُمْ اِيماناً وَعَلىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُون﴾[1] آگے چل کر فرماتا ہے: ﴿اُولٰئِكَ هُمُ المُؤمِنُونَ حَقّاً﴾[2] یہاں مؤمنین کے دائرے کو محدود کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ مؤمن وہی ہیں جو ان مذکورہ صفات کے حامل ہوں۔ ان کے علاوہ دوسرے لوگ مؤمن نہیں ہیں۔ آخر میں فرماتا ہے: ''یہی لوگ ہی حقیقی مؤمن ہیں''۔

یہاں مؤمنین کی جن صفات کا ذکر ہوا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب اللہ کا ذکر ہوتا ہے تو ان کے دلوں پر خوف طاری ہو جاتا ہے، نیز یہ کہ جب انہیں اللہ کی آیات سنائی جاتی ہیں تو یہ آیات ان کے ایمان میں اضافہ کرتی ہیں۔ پھر یہ بھی فرمایا کہ وہ اپنے پروردگار پر بھروسہ کرتے ہیں۔

اب آپ جو ایمان کے دعویدار ہیں اور ایمان کے جملہ ارکان کا عقلی طور پر علم رکھتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک پر دلیل وبرہان بھی رکھتے ہیں یا آپ نے کوئی برہان ودلیل گھڑ رکھی ہے، ذرا اپنی حالت پر نگاہ کیجئے۔ دیکھئے کہ مذکورہ صفات میں سے کون سی صفت آپ کے دل میں موجود ہے۔ آپ کس قدر اللہ کا ذکر کرتے ہیں یا سنتے ہیں، پھر وہ خوف کہاں ہے جو مؤمن کی علامت ہے؟ بے شک وہ دل جس نے اللہ کی عظمت وجلال کو محسوس نہ کیا ہو، نیز اللہ کی کبریائی اور برتری کا جس دل میں نزول نہ ہوا ہو اس دل پر ذکر حق سن کر خوف طاری نہیں ہوتا۔ مؤمن وہ ہے جس کا دل اللہ کی ہر جگہ موجودگی اور اس کی قیومیت کو پا چکا ہو اور اس کی عظمت وجلالت میں کسی قسم کا شک نہ رکھتا ہو۔

۱۔ مؤمن وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل خوفزدہ ہو جاتے ہیں اور جب انہیں آیات خداوندی سنائی جاتی ہیں تو ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے... اور وہ اپنے ربّ پر بھروسہ کرتے ہیں۔ سورۂ انفال ۲۔

۲۔ بے شک یہی لوگ ہی ایمان والے ہیں۔ سورۂ انفال ۴۔

یہ ایک فطری بات ہے کہ انسان ایک عظیم بادشاہ کے سامنے اپنے آپ کو چھوٹا سمجھتا ہے اور اس سے خوفزدہ ہوتا ہے اگر چہ وہ اپنے آپ کو بے قصور اور بادشاہ کا خدمت گار پاتا ہو۔ پھر جب تمام مخلوقات اللہ کی معرفت اور عبادت کا حق ادا کرنے سے قاصر ہیں تو کیونکر اسے اللہ کا خوف نہ ہو؟ جبکہ اشرف الخلائق، اعرف المخلوقات اور اللہ کی قریب ترین ہستی حضرت ختمی مرتبت ﷺ، یہ اعلان فرمارہے ہیں: ﴿مَا عَبَدْنَاکَ حَقَّ عِبَادَتِکَ، وَمَا عَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ﴾[1] بقول شاعر:

آنجا کہ عقاب پر بریزد   از پشۂ لاغری چہ خیزد[2]

خلاصہ یہ کہ مؤمن کی یہ علامت ہمارے اندر نہیں پائی گئی۔

اسی طرح مؤمن کی دوسری علامت یہ ہے کہ تلاوت آیات سے اس کے ایمان میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ اب ہمیں دیکھئے کہ اس قدر تشریعی اور تکوینی آیات اور نشانیاں ہمیں سنائی اور دکھائی جاتی ہیں لیکن ہمارے ایمان میں اضافے کی بجائے ہمارے عقل ودل کے پردوں میں اضافہ ہوتا ہے!!

ہم اپنی زندگی میں قرآن مجید (جو اللہ کی سب سے بڑی نشانیوں اور آیات میں سے ایک ہے) کو کتنی بار پڑھتے ہیں اور دوسروں سے سنتے ہیں لیکن اس سے ہمارے دلوں میں ایمان کا نور پیدا نہیں ہوتا اور نہ ہی ہم خواب غفلت سے بیدار ہوتے ہیں!!

اب ذرا سورۂ مبارکہ فصّلت کی آیت ۴۴، [3] پر خوب غور کرو اور دیکھو کہ اس آیت کے ابتدائی اور آخری حصے کا اطلاق ہمارے اوپر ہوتا ہے یا نہیں؟ آیت کہتی ہے: ﴿قُلْ هُوَ لِلَّذِينَ آمَنُوا هُدًى وَشِفَآءٌ وَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ فِي آذَانِهِمْ وَقْرٌ وَهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى أُولٰئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَكَانٍ بَعِيدٍ﴾[4]

کہاں ہے وہ ہدایت اور باطنی امراض کی شفایابی جو مؤمنین کو قرآن سے حاصل ہوتی ہے؟ کیا وجہ ہے

۱۔ ہم نے تیری عبادت اس طرح نہ کی جس طرح اس کا حق تھا اور نہ ہی تیری معرفت کا حق ادا کیا۔ (بحار الانوار، ج ۶۸ ص ۲۳، حدیث ۱)۔

۲۔ دیکھئے علی اکبر دہخدا کی ''امثال وحکم''، ج ۲، ص ۵۷۹ (شاعر کا ذکر کئے بغیر)۔

۳۔ اصل نسخہ میں ۶۴ درج ہے؛ مقدمہ ملاحظہ ہو۔

۴۔ کہدو کہ یہ قرآن مؤمنوں کیلئے ہدایت وشفا ہے اور ایمان نہ لانے والوں کے کانوں پر بوجھ ہے اور ان کی آنکھیں اندھی ہیں۔ وہ اس طرح ہیں گویا انہیں دور سے پکارا جارہا ہو۔

کہ یہ آیات شریفہ ہماری سماعت کے راستے پر اثر انداز نہیں ہوتیں، بلکہ الٹا ہمارے لئے حجاب اندر حجاب کا باعث بنتی ہیں؟ اس کی وجہ یہی ہے کہ ایمان کا نور ہمارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے اور ہمارا علم عقل و ذہن کے اندر ہی محدود ہے اور ابھی دل کے اندر وارد نہیں ہوا۔ اس سلسلے میں قرآن کے اندر بہت ساری آیات موجود ہیں[۱] اگر ہم اپنا موازنہ ان آیات سے کریں اور اپنی صفات کو ان کی روشنی میں پرکھیں تو ہمارا حال بخوبی واضح ہوگا۔

مؤمن کی تیسری خصوصیت یہ بیان ہوئی کہ وہ اللہ پر توکل کرتے ہیں ﴿وَعَلٰی رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ﴾۔ توکل کا مطلب ہے اپنے تمام امور کو وکیل کے حوالے کر دینا، اس کی وکالت پر اعتماد کرنا اور دوسروں سے امید نہ رکھنا۔ یہ عمل درج ذیل چار چیزوں پر موقوف ہے جو توکل کے ارکان ہیں:

الف: اس بات کا علم کہ وکیل کو موکل کی حاجت کا علم ہے۔

ب: اس بات کا علم کہ وکیل حاجت روائی کی طاقت رکھتا ہے۔

ج: اس بات کا یقین کہ وکیل موکل سے محبت وشفقت رکھتا ہے۔

د: یہ کہ وکیل بخل اور کنجوسی سے دور ہو۔

اب آیئے اپنا جائزہ لیں! اللہ تعالیٰ کے بارے میں ہمیں مذکورہ چار چیزوں کا علم حاصل ہے۔ ہم سب اسے کائنات کے ہر ہر ذرے کا عالم سمجھتے ہیں اور اس کے علم کو تمام موجودات پر محیط جانتے ہیں۔ ہم زمینوں اور آسمانوں کے اندر اس کی طاقت اور قدرت کاملہ کو جاری وساری جانتے ہیں۔ ہم اس کی ہمہ گیر رحمت کے بھی معترف ہیں۔ ہم اسے تمام نقائص اور عیوب سے منزہ سمجھتے ہیں جن میں سے ایک بخل ہے۔ یوں علمی طور پر توکل کے سارے ارکان ہمارے اندر موجود ہیں اور ہمیں ان ارکان اربعہ کے بارے میں کسی قسم کا شک نہیں ہے، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ہمارے اندر توکل کے آثار نظر نہیں آتے!!

ہم خالق سے زیادہ مخلوقات پر بھروسہ کرتے ہیں اور اللہ سے زیادہ لوگوں سے امید رکھتے ہیں۔ ہم ضعیف مخلوقات سے اپنی حاجتیں طلب کرتے ہیں اور ہمیشہ لوگوں کی رضامندی حاصل کرنے کے درپے

۱۔ دیکھیے سورۂ انفال ۲، ۴؛ سورۂ مؤمنون ۱، ۱۱؛ سورۂ بقرہ ۱۶۵؛ سورۂ شوریٰ ۳۶، ۴۳ اور دیگر آیات جو مؤمنین کی توصیف بیان کرتی ہیں۔

رہتے ہیں جبکہ ہم اللہ کو مقلب القلوب سمجھتے ہیں۔ان باتوں کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں (جیسا کہ ہم بارہا عرض کر چکے ہیں) کہ توکل کے ارکان کا علم اور ایمان ایک ہی چیز کے دو نام نہیں، بلکہ یہ دونوں جدا ہیں۔چونکہ ہمارے دل ان علوم سے ناآشنا ہیں اور ہم نے ان حقائق کو دل کے اندر جگہ نہیں دی اس لئے ہم اپنی ذہنی معلومات سے کوئی نتیجہ حاصل نہیں کر سکتے۔یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے کیا خوب کہا تھا:

پای استدلالیان چوبین بود　　　　پای چوبین سخت بے تمکین بود[۱]

ہم نے بذات خود دلائل و براہین قطعیہ کے ذریعے ارکان توکل کا علم حاصل کیا اور ان ارکان کے بارے میں ہمارے اندر کسی قسم کے شک وشبہہ کا شائبہ تک نہیں لیکن اس کے باوجود ہمارے دل میں توکل کے نور کا کوئی پرتو نظر نہیں آتا۔مخلوقات سے قطع امید اور ذات حق پر اعتماد کامل کا کوئی اثر ہمارے اندر پایا نہیں جاتا۔خلاصہ یہ کہ یہ ایمانی خصوصیت بھی ہمارے اندر مفقود ہے۔واضح ہے کہ اگر ایمان کی علامات وآثار موجود نہ ہوں تو یہ خود ایمان کے مفقود ہونے کی دلیل ہے۔قرآن کی جو آیات اس نکتے کی تائید کرتی ہیں وہ اس قدر زیادہ ہیں کہ اس مختصر سی کتاب میں ان سب کے ذکر کی گنجائش نہیں[۲] یہ کچھ نمونے تھے جن سے دیگر آیات کا بھی علم ہو جاتا ہے۔

اس سلسلے میں مروی احادیث بھی بہت زیادہ ہیں۔ہم یہاں ان میں سے بعض احادیث کے ذکر سے ان اوراق کو مزیّن کریں گے۔شاید کہ اللہ کی عظیم کتاب کی برکت سے، نیز اولیائے پاک (علیہم الصلاۃ والسلام) کے طفیل ہمارے تاریک اور سخت دلوں کو کوئی نور حاصل ہو اور مادیت کے ان تاریک پردوں سے رہائی کی کوئی سبیل پیدا ہو۔

اصول کافی شریف میں اس بارے میں کہ اسلام ایمان کی شرط ہے لیکن ایمان اسلام کی شرط نہیں[۳] ایک حدیث موجود ہے جس کی سند "سماعہ" تک پہنچتی ہے۔

۱۔ دیکھئے جلال الدین رومی کی مثنوی معنوی، دفتر اول، ص ۱۳۰، بیت نمبر ۲۱۲۸، مطبوعہ نکلسن۔

۲۔ بطور نمونہ دیکھئے سورۂ ابراہیم ۱۱؛ سورۂ مجادلہ ۱۰ اور سورۂ طلاق ۳۔

۳۔ یعنی کوئی شخص مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک وہ مسلمان نہ ہو لیکن اس بات کا امکان ہے کہ کوئی شخص مسلمان تو ہو لیکن مؤمن نہ ہو۔ مترجم۔

سماعہ کہتا ہے میں نے امام صادق علیہ السلام سے عرض کیا:

﴿أخبِرْني عَنِ الاِسْلامِ وَالایمانِ، أهُما مُختَلِفانِ؟ (الیٰ أنْ قالَ:) فَقالَ ع: الاِسْلامُ، شَهادَةُ أنْ لا اِلٰهَ اِلّا اللّٰهُ وَالتَّصْدِيقُ بِرَسُولِ اللّٰهِ، بِهِ حُقِنَتِ الدِّماءُ، وَعَلَيْهِ جَرَتِ المَناكِحُ وَالمَوارِيثُ، وَعَلىٰ ظاهِرِهِ جَماعَةُ النّاسِ. وَالايمانُ، الهُدىٰ وَما يَثْبُتُ فِي القُلُوبِ مِنْ صِفَةِ الاِسْلامِ وَما ظَهَرَ مِنَ العَمَلِ بِهِ﴾[۱] الحدیث۔

اس حدیث شریف سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ کی وحدانیت کی شہادت اور رسالت پر اعتقاد اسلام ہے، لیکن ایمان ہدایت کا نور ہے جو دلوں میں جلوہ گر ہوتا ہے۔

اسلام جب دل میں براجمان ہو جائے تو ایمان بن جاتا ہے۔ ایمان کا لازمہ عمل ہے۔ بہت سی احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ عمل بالارکان ایمان کا حصہ ہے۔[۲] اس کا مطلب یہ نہیں کہ عمل بالارکان ایمان کے مفہوم میں شامل ہو، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ ایمان کا لازمہ عمل بالارکان ہے، جیسا کہ قبل ازیں ذکر ہو چکا ہے۔

کافی شریف کی حدیث ہے:

﴿فَاِذا أتىَ العَبْدُ كَبِيرَةً مِنْ كِبارِ المَعاصِي أوْ صَغِيرَةً مِنْ صِغارِ المَعاصِي الَّتِي نَهَى اللّٰهُ - عَزَّوَجَلَّ - عَنْها كانَ خارِجاً مِنَ الايمانِ، ساقِطاً عَنْهُ اسْمُ الايمانِ، وَثابِتاً عَلَيْهِ اسْمُ الاِسْلامِ، فَاِنْ تابَ وَاسْتَغْفَرَ عادَ اِلىٰ دارِ الايمانِ﴾[۳]

۱۔ مجھے اسلام اور ایمان کے بارے میں بتایئے۔ کیا یہ دونوں مختلف ہیں؟... آگے چل کر راوی کہتا ہے کہ امامؑ نے فرمایا: اسلام وحدانیت خداوندی کی شہادت اور تصدیق رسول سے عبارت ہے جس سے لوگوں کا خون محفوظ ہوتا ہے، نکاح اور ارث کی بنیاد یہی ہے اور اسی کا ظاہر لوگوں میں ربط باہمی کا باعث ہے۔ لیکن ایمان، ہدایت ہے اور جو صفت اسلام دل میں راسخ ہو جائے، منشأ عمل قرار پائے گی۔ (دیکھئے اصول کافی، ج ۲، ص ۲۱ کتاب الایمان والکفر، باب ۱۵، ح ۱)۔

۲۔ امام صادقؑ سے مروی ہے: ﴿الايمانُ هُوَ الاِقْرارُ بِاللِّسانِ وَعَقْدٌ فِي القَلْبِ وَعَمَلٌ بِالأرْكانِ...﴾ یعنی، ایمان عبارت ہے زبان کے اقرار، دل کے اعتقاد اور عمل بہ ارکان سے۔ ملاحظہ ہو اصول کافی، ج ۲، ص ۲۳، کتاب الایمان والکفر، باب ۱۶، ح ۱؛ نیز دیکھئے اسی باب میں خصال المؤمن ص ۳۹، ح ۲؛ نیز باب المکارم ص ۴۷، ح ۵۔

۳۔ جب بندہ کوئی گناہ کبیرہ یا گناہ صغیرہ جن سے اللہ نے منع کیا ہو انجام دیتا ہے تو وہ دائرۂ ایمان سے خارج ہوتا ہے -->

کافی شریف کے باب ''وجوب جمع بین خوف ورجاء'' میں ایک حدیث امام صادقؑ سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا: ﴿كَانَ أَبِي يَقُولُ: إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ عَبْدٍ مُؤْمِنٍ إِلَّا [وَ] فِي قَلْبِهِ نُورَانِ: نُورُ خِيفَةٍ وَنُورُ رَجَاءٍ؛ لَوْ وُزِنَ هٰذَا لَمْ يَزِدْ عَلىٰ ذَا، وَلَوْ وُزِنَ هٰذَا لَمْ يَزِدْ عَلىٰ هٰذَا﴾۔[۱]

ایک اور حدیث میں مذکور ہے: مؤمن اس وقت تک مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک اس میں خوف ورجاء نہ ہو اور وہ اس وقت تک خائف اور پر امید نہیں ہوسکتا جب تک اس چیز پر عمل نہ کرے جس سے وہ خائف ہے یا جس کی اسے امید ہے۔[۲]

احادیث شریفہ میں مومنین کی صفات کو شمار کیا ہے اور انہیں بعض صفات کا حامل قرار دیا گیا ہے مثال کے طور پر توکل، تسلیم ورضا، اور خوف ورجاء وغیرہ[۳] جو کوئی ان صفات کا حامل نہ ہو وہ صاحب ایمان نہ ہو سکے گا۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ جو علم وادراک ہمارے اذہان میں موجود ہے وہ ایمان سے عبارت نہیں وگرنہ ہم مذکورہ صفات اور اعمال صالحہ کے حامل ہوتے۔ ﴿واللهُ العالم﴾۔

چوتھی فصل

ایمان فطری ہے اور کفر غیر فطری

گزشتہ فصل میں ذکر ہو چکا کہ فطری امور وہ ہیں جن پر تمام بنی نوع انسان کا اتفاق ہو اور کوئی عبادت، مذہب، ماحول اور باطنی عادت اور پر اثر انداز نہ ہو۔ انسان کا متمدن ہونا یا نہ ہونا، شہری ہونا یا دیہاتی ہونا،

<-- اور ایمان کا نام اس سے سلب ہو جاتا ہے لیکن اسلام کا نام (اب بھی) اس کیلئے برقرار رہتا ہے۔ پھر اگر وہ توبہ واستغفار کرے تو وہ دوبارہ دائرہ ایمان میں داخل ہو جاتا ہے۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۲۳، کتاب الایمان والکفر، باب ۱۶، حدیث ۱

۱۔ میرے والد کہا کرتے تھے: کوئی بندہ مؤمن ایسا نہیں جس کے دل میں دو نور نہ ہوں: ایک نور خوف کا اور دوسرا نور امید کا۔ اگر ان میں سے ایک کو تولا جائے تو دوسرے سے زیادہ وزنی نہیں ہوگا اور اگر دوسرے کو تولا جائے تو پہلے سے زیادہ وزنی نہیں ہوگا۔ (اصول کافی، ج ۲، ص ۵۵ و ۵۷، کتاب الایمان والکفر، باب ۳۳، حدیث ۱ و ۱۳)۔

۲۔ عن أبي عبد الله (ع) يقول: لا يَكُونُ المُؤْمِنُ مُؤْمِناً حَتّٰى يَكُونَ خائِفاً راجِياً، وَلا يَكُونُ خائِفاً راجِياً حَتّٰى يَكُونَ عامِلاً لِما يَخافُ وَيَرْجُو۔ (اصول کافی، ج ۲، ص ۵۷، کتاب الایمان والکفر، باب ۳۳، حدیث ۱۱)۔

۳۔ اصول کافی، ج ۲ ص ۵۵، کتاب الایمان والکفر، باب ۳۳؛ نیز باب ۲۳، ص ۳۹ و ۴۰ اور باب ۲۵، ۴۲۔

عالم ہونا یا جاہل ہونا، کافر ہونا یا مسلمان ہونا نیز اس طرح کی انسانی طبقہ بندیاں فطری امور کو تبدیل نہیں کر سکتیں۔ انسانوں کے درمیان اصل فطرت میں کوئی اختلاف نہیں۔ البتہ فطرت کے مصادیق میں اشتباہ اور اختلافات موجود ہیں۔

بنابریں ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ایمان کے بنیادی ارکان واصول جو اللہ کی معرفت، توحید ولایت (یعنی انبیاء پر ایمان) نیز روز قیامت، فرشتوں اور آسمانی کتابوں پر ایمان سے عبارت ہیں کا تعلّق فطریات سے ہے۔ البتہ ان میں سے بعض کا تعلّق بنیادی واصلی فطریات سے ہے، مثلاً معرفت وتوحید وغیرہ اور بعض کا تعلّق فطرت کے فروعات سے ہے۔ اس نکتے کی مکمّل تفصیل کا بیان اس کتاب کے ہدف سے خارج ہے۔ یہ ان علمی مباحث میں سے ایک ہے جو طولانی تمہیدات کے محتاج ہیں۔ ان اوراق میں ہم ان مباحث سے احتراز کریں گے۔ البتہ اجمالی اور سرسری اشارہ کے بغیر چارہ نہیں۔

یاد رہے کہ ہم قبل ازیں کمال مطلق سے عشق اور اس کی طرف توجہ کے بارے میں پہلے عرض کر چکے ہیں کہ یہ ایک فطری جذبہ ہے۔ اب ہم یہ عرض کرتے چلیں کہ یہ کمال مطلق اور جمال مطلق (جس کے عشق میں تمام بنی نوع انسان مبتلا ہیں) اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات سے عبارت ہے، کیونکہ یہ دلائل وبراہین عقلیہ کے ذریعے ثابت شدہ حقیقت ہے کہ اللہ کی ذات بسیط محض ہے[1] اور جس کی ذات بسیط مطلق ہو اسے کمال مطلق اور جمال مطلق ہونا چاہئے۔ دیگر موجودات افعال خداوندی کے جلوؤں میں سے ایک جلوہ اور فیض خداوندی کے مظاہر میں سے ایک مظہر ہے۔ ان میں سے ہر چیز کسی نہ کسی محدودیت اور تقیّد وتعیّن کا شکار ہے جو کمال مطلق کا حامل نہ ہونے کی دلیل ہے۔ یہی معشوق حقیقی، یعنی اللہ کی مقدس ذات ہی واحد مطلق ہے وگرنہ وہ نہ ذات وحقیقت کے لحاظ سے بسیط ہوگا اور نہ کمال مطلق ہوگا۔ علاوہ ازیں یہ ذات جو فطرت اصلی کی رو سے بنی نوع انسان کی اصلی معشوق ہے بے پایاں خوبیوں اور کمالات کی حامل ہے وگرنہ وہ کمال مطلق نہ ہو سکے گی اور کمال مطلق ہی معشوق انسانی ہے۔

سورۂ توحید ہی اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات کو بیان کرتے ہوئے[2] اسی دلیل یعنی ''ہویت مطلقہ'' (وجود

۱۔ دیکھئے الاسفار الاربعہ، ج ۶، ص ۱۰۰۔۱۰۵، فصل ۹، موقف ۱۔

۲۔ اشارہ ہے امام صادقؑ کی حدیث کی طرف جس میں آپؑ نے فرمایا: ﴿إنَّ اليهُودَ سَألُوا رَسُولَ اللهِ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم، -->

مطلق) کے ذریعے اپنی احدیت، جامعیت، اور نقائص سے منزہ ہونے کو لطیف انداز میں ثابت فرمایا ہے جسے گہری نظر رکھنے والے سمجھ سکتے ہیں۔

اہل معرفت جانتے ہیں کہ ولایت فیض مطلق سے عبارت ہے۔[۱] فیض مطلق ہر قسم کے حدود و قیود سے آزاد ہے۔ اسے وجود مطلق بھی کہا جاتا ہے۔ فطرت اسی حقیقت سے مربوط ہے۔ البتہ یہ ربط ضمنی و تبعی ربط ہے۔ جیسا کہ یہ بذات خود ایک ثانوی اور ظلّی حقیقت ہے جسے ''ظلّ اللہ'' کہتے ہیں، نیز اسے ''مشیّت مطلقہ'' اور ''حقیقت محمدیہ وعلویہ'' بھی کہا جاتا ہے۔[۲]

فطرت کمال مطلق کے اندر فنا ہونے کی خواہاں ہوتی ہے۔ بنابریں اس حقیقت (یعنی حقیقت ولایت) کا حصول کمال مطلق اور اندر فنا ہونے سے عبارت ہے۔ بنابریں ولایت بھی ایک فطری امر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنی آیت: ﴿فِطْرَةَ اللهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا﴾[۳] کی تعبیر کبھی احادیث میں ''فطرت معرفت''[۴] سے، کبھی ''فطرت توحید''[۵] سے، کبھی ''فطرت ولایت''[۶] سے اور کبھی ''فطرت اسلام''[۷] سے کی گئی ہے۔

امام باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ ؑ نے فرمایا: ﴿فِطْرَةَ اللهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا﴾ سے مراد ﴿لا اِلٰـه اِلاّ اللهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللهِ عَلِيٌّ وَلِيُّ اللهِ﴾ ہے۔[۸] یہاں تک توحید ہے۔

یہ حدیث شریف ہمارے اس قول کی تائید کرتی ہے کہ ولایت توحید کی ایک شاخ ہے، کیونکہ ولایت فیض مطلق سے عبارت ہے اور فیض مطلق ظلّ وحدیت مطلقہ ہے جبکہ فطرت ذاتی طور پر کمال اصلی کی طرف

<-- فَقالُوا: انْسِبْ لَنا رَبَّکَ، فَلَبِثَ ثَلاثاً لا يُجِيبُهُمْ، ثُمَّ نَزَلَتْ ﴿قُلْ هُوَ اللهُ أَحَد...﴾ اِلىٰ آخِرِهَا﴾ ۔یعنی، یہودیوں نے رسول اللہ ؐ سے پوچھا: ہمارے لئے اپنے ربّ کی صفات بیان کریں۔ رسول اللہ ؐ نے تین دن تک انہیں کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر سورۂ ﴿قُلْ هُوَ اللهُ أَحَد...﴾ نازل ہوئی۔ (اصول کافی، ج۱، کتاب التوحید، باب ۷، حدیث ۱)۔

۱۔ دیکھئے محمد علی شاہ آبادی ؒ کی ''رشحات البحار'' ص ۱۴، ۳۹ اور ۴۱۔

۲۔ رشحات البحار، ص ۱۹۵۔

۳۔ یہ فطرت ہے جس پر اللہ نے سب لوگوں کو خلق کیا ہے۔ سورۂ روم ۳۰۔

۴۔ توحید صدوق، ص ۳۳۰، باب ۵۳، ح ۹۔

۵۔ ایضاً ص ۳۲۸، باب ۵۳، ح ۱ و ۲ و ۳ و ۵۔

۶۔ تأویل الآیات الظاہرۃ، ص ۴۲۷؛ نیز تفسیر البرہان، ج ۳، ص ۲۶۲، ح ۲۳۔

۷۔ توحید صدوق، ص ۳۲۹، باب ۵۳، ح ۳۔

۸۔ تفسیر البرہان، ج ۳، ص ۲۶۲، ح ۱۹۔

اور فرعی و تبعی طور پر کمال ثانوی کی طرف راغب ہوتا ہے۔اس نکتے کی وضاحت کیلئے مزید گفتگو کی ضرورت ہے جس سے ہم مجبوراً اجتناب کرتے ہیں۔

پس معلوم ہوا کہ معرفت، توحید اور ولایت فطری امور میں سے ہیں۔اسی طرح تمام بنی نوع بشر کی فطرت میں بقائے ابدی کی شدید خواہش بھی موجود ہے۔البتہ جن لوگوں کی فطرت اصلی پر پردہ پڑچکا ہے وہ اطلاق میں غلطی کا شکار ہوتے ہیں۔اور بقائے ابدی سے اس کی محبت، حبّ دنیا اور موت سے نفرت کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔

موت سے نفرت کی اصل وجہ یہ ہے کہ جن لوگوں کی فطرت پر پردہ پڑچکا ہو ان کے دلوں میں حیات بعد الموت اور عالم آخرت کی ابدی زندگی پر ایمان داخل نہیں ہو چکا ہوتا، چنانچہ وہ موت کو فنا سمجھتے ہیں، چونکہ فطرت کو فنا سے نفرت اور بقاء سے عشق ہے اس لئے فطرت محجوبہ والوں کے قلب و ذہن میں موت سے نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔اس کے برعکس اصلی فطرت کو بقائے ابدی سے جو عشق ہوتا ہے وہ معاد اور حیات بعد الموت سے محبت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، کیونکہ دنیا کی یہ محدود زندگی ابدی نہیں ہو سکتی، چونکہ دنیوی زندگی ختم ہونے والی ہے اس لئے فطرت اصلیہ کو اس سے نفرت ہوتی ہے۔فطرت کو حیات بعد الممات (جو اس وقت نظروں سے پوشیدہ ہے اور ابدی ہے) سے عشق و محبت ہوتی ہے۔بنابریں یوم آخرت یعنی دنیا کے بعد والی زندگی پر ایمان فطرت کا ایک حصہ ہے۔

اسی طرح سکون ولذت اور آزادی سے محبت بھی تمام انسانوں کی فطرت میں شامل ہے۔آزادی سے مراد آزادی مطلق ہے جس کا ایک خاصہ ارادے کا نفاذ ہے۔ظاہر ہے کہ اس محدود دنیوی زندگی میں ان دونوں باتوں کا امکان نہیں، کیونکہ یہاں سکون وراحت مطلق کا حصول کسی طرح نہیں ہو سکتا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی ہر راحت رنج و تعب سے مخلوط ہے خواہ اس کے حصول کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات کے لحاظ سے ہو یا اس کے حصول کے دوران درپیش مشکلات سے یا اس کے حصول کے بعد والے مراحل سے۔

مثال کے طور پر جسمانی لذات میں سے ایک قوت ذائقہ سے حاصل ہونے والی لذت ہے۔نفس انسانی اس کی طرف راغب ہوتا ہے اور اسے تسکین وراحت کا ایک طریقہ سمجھتا ہے۔یہ لذت کھانے پینے کی لذت سے عبارت ہے۔ہم جیسے دنیا والے اور فطرت محجوبہ کے حامل افراد اسی کو اہمیّت دیتے ہیں، اب اگر غور کیا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ ایک لذیذ دنیوی کھانے کے حصول کی خاطر انسان کس قدر تکالیف اٹھاتا

ہے۔ اگر ہم اس کے اسباب بعیدہ کو مدنظر رکھیں تو زبردست تکالیف کا مشاہدہ کریں گے جو اس کے حصول کیلئے ضروری ہے۔ ان تمام تکالیف ومشکلات کے بعد اسے ٹھیک طرح سے پکانے میں پھر بہت ساری زحمتوں کا سامنا کرنا ہوتا ہے یہاں تک کہ ان کو کھاتے وقت بھی چند کاموں کی ضرورت ہوتی ہے جو تکلیف وزحمت سے خالی نہیں۔ البتہ چونکہ انسان ان تکالیف کا خوگر ہوتا ہے اس لئے اسے ان کا احساس نہیں ہوتا۔ کھانے کے بعد بھی اسے ہضم کرنے اور بول وبراز کی شکل میں اسے خارج کرنے کا عمل بجائے خود ایک مصیبت ہے۔ اگر یہ عمل عام نہ ہوتا اور انسان اس کا خوگر نہ ہوتا تو انسان ان میں سے کسی کام پر آمادہ نہ ہوتا۔ یہ ہے اس دنیا کی لذتوں کا حال۔

اب ذرا توجہ کرو اس دنیا کی تکالیف، مصیبتوں اور ہموم وغموم وغیرہ کی طرف جن سے انسان کا ہر روز سروکار رہتا ہے۔ پس انسان جس چیز کا عاشق ودلدادہ ہے (یعنی مکمل آرام وراحت کا) وہ اس دنیا میں میسّر نہیں ہوسکتا۔ لیکن عالم ملکوت یعنی آخرت میں یہ مکمل آرام وسکون موجود ہے، جیسا کہ صاحبان شرائع نے اس کی خبر دی ہے۔[۱] خلاصہ یہ کہ انسان فطری طور پر ایک ایسے عالم کی طرف راغب ہے جہاں تکالیف سے خالی آرام وسکون، نیز مشکلات اور تکالیف سے پاک لذتیں میسّر ہوں۔

اسی طرح فطری طور پر آزادی وحریت کا دلدادہ ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ جو چاہے کرسکے یہاں تک کہ اس کا ارادہ بھی کارگر ہو اور اس کی طاقت وحکومت کے سامنے کوئی رکاوٹ اور مانع نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ اس دنیا میں اس قسم کی طاقت اور ارادے کی تاثیر ممکن نہیں۔ کم از کم یہ ایک حقیقت ہے کہ اس دنیا کا نظام انسانی ارادوں کی متابعت پر تیار نہیں جیسا کہ یہ بات واضح اور ظاہر ہے۔ اس قسم کی طاقت، حکومت اور آزادی صرف مابعد الطبیعیاتی عالم (یعنی اطاعت گزاروں کی بہشت) میں ہی میسّر ہوگی۔ پس انسان فطرت کی رو سے حیات غیبی (اخروی زندگی جو اس وقت مشہود نہیں) کا معتقد اور خواہاں ہے۔

یہ ایک واضح امر ہے کہ کسی موجودہ عشق اور موجودہ عاشق کیلئے ایک موجودہ معشوق کا ہونا ضروری ہے، کیونکہ (علم منطق کی رو سے) متضایفین امکان اور وجود دونوں کے لحاظ سے مساوی ہوتے ہیں۔ پس فطرت کے معشوقوں کا عملاً موجود ہونا ضروری ہے تاکہ فطرت کا ان کی طرف راغب ہونا معقول ہوسکے۔

۱۔ ملاحظہ ہو بحار الانوار، ج۸، ص۷۱، باب الجنۃ ونعیمھا، (۲۳)۔

کوئی یہ گمان نہ کرے کہ شاید انسان غلط فہمی کا شکار ہو اور اس کا نفس بے بنیاد موہوم اور خیالی چیزوں کا خواہاں ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خیالی اور موہوم تصورات بذات خود نفس کیلئے معشوق ومحبوب نہیں ہو سکتے، کیونکہ یہ تمام خیالی صورتیں محدود ہیں جبکہ نفس کسی غیر محدود چیز کا عاشق و دلدادہ ہے۔ علاوہ ازیں چونکہ یہ فطرت وجود کا لازمہ ہے اس لئے اس میں غلطی وخطا کی گنجائش نہیں، جیسا کہ علوم عالیہ میں برہان لمّی کے ذریعے یہ بات ثابت ہو چکی ہے۔[1] یہاں ان براہین کو ذکر کرنے کی گنجائش نہیں، بلکہ جتنا ذکر ہو چکا وہ بھی وعدے سے زیادہ بیان ہو چکا ہے۔ بنابریں ہم دیگر فطرتوں کے ذکر سے بھی اجتناب کرتے ہیں۔

مذکورہ بیانات سے معلوم ہو جاتا ہے کہ فطرت کو کفر سے نفرت ہوتی ہے۔ اس کا تعلق فطرت محجوبہ سے ہے فطرت مخمورہ سے نہیں۔ ﴿وَالحَمدُ لِلّٰہِ اَوَّلاً وَآخِراً﴾۔

پانچویں فصل

حصول ایمان کا طریقہ

اب تک ہم یہ جان چکے کہ ایمان اور علم دو مختلف چیزیں ہیں، نیز یہ کہ ہمارے اندر توحید، اسماء اور صفات خداوندی سے مربوط جو معارف وحقائق موجود ہیں وہ علم کی حد تک ہیں اور ہمارے قلوب ان سے آشنا نہیں۔ علاوہ ازیں یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ جب تک یہ امور دل کے اندر نہ اتر جائیں اور دل ان کا معتقد نہ ہو جائے ان کا خاطر خواہ اثر نہیں نکلے گا۔ لہذا انسان کو چاہئے کہ حصول ایمان کی کوشش کرے، کیونکہ اگر خدانخواستہ ہم اس دنیا سے (جو تغیر وتبدل کی دنیا ہے اور اس میں ہم اپنے تمام قلبی احوال، اوصاف اور عادات کو تبدیل کر سکتے ہیں) چلے جائیں اور ہمارے ہاتھ ایمان سے خالی ہوں تو ہمیں عظیم اور غیر معمولی نقصان سے روبرو ہونا پڑے گا، نیز ہمیں دائمی ندامت بھی نصیب ہوگی۔ پھر اس عالم میں نفس کی کسی حالت کو بدلنا ممکن نہ رہے گا۔ اگر ہم اس دنیا میں ایمان کو نہ اپنا سکیں تو وہاں اس کا حصول ممکن نہ رہے گا۔ پس انسان کو چاہئے کہ دنیا کی اسی چند روزہ زندگی کو غنیمت سمجھے اور ہر قیمت پر حصول ایمان کی کوشش کرے اور دل کو ایمان سے آشنا کرے۔ البتہ یہ امر سیر وسلوک کے پہلے مرحلے میں حاصل نہ ہوگا۔ مگر یہ کہ آدمی ایمانی حقایق

۱۔ دیکھئے الاسفار الاربعہ، ج ۷، ص ۱۳۷، فصل ۱۵، موقف ۸۔

ومعارف کے حصول کی خاطر پہلے اپنی نیت کو خالص کرلے اور اپنے دل کو مسلسل مشق اور یاددہانی کے ذریعے اخلاص واعتقاد سے آشنا کرے یہاں تک کہ اخلاص دل کے اندر جاگزین ہوجائے، کیونکہ اگر اخلاص نہ ہوتو ابلیس کا عمل دخل شروع ہوجائے گا۔ ابلیس اور نفس کے عمل دخل کی صورت میں کسی قسم کی معرفت حاصل نہیں ہوسکے گی۔ (کیونکہ یہ تصرف خود پرستی، خود بینی اور تکبّر پر مبنی ہوتا ہے)، بلکہ خلوص سے خالی علم توحید بھی انسان کو حقیقی توحید اور حقیقی معرفت سے دور کر دیتا ہے، نیز اسے بارگاہ خداوندی سے دور کر دیتا ہے۔

ابلیس کی حالت کا ذرا جائزہ لو، چونکہ اس کے اندر خود پسندی، خودخواہی اور تکبّر کے جراثیم موجود تھے، لہذا وہ اپنے علم کو عملی جامہ نہ پہنا سکا اور نہ وہ اپنے علم کی بدولت راہ سعادت کو پا سکا۔

حقیقی ریاضت اور باطل ریاضت میں فرق کا معیار ایک لطیف اور عرفانی نکتہ ہے اور وہ یہ کہ حقیقی ریاضت کی بنیاد حق پرستی اور حق جوئی پر ہے جبکہ باطل ریاضت کی بنیاد نفس اور خود پسندی پر ہے۔ جو نماز دنیوی یا اخروی خواہشات کی خاطر پڑھی جائے وہ نہ معراج المؤمن ہوسکتی ہے اور نہ باعث تقرب[۱] یہ نماز انسان کو حور العین سے تو نزدیک کرسکتی ہے لیکن قرب خداوندی سے دور کر دیتی ہے۔

توحید کا وہ علم جو عوام یا علماء کے سامنے ظاہر کرنے کیلئے حاصل کیا جائے وہ معنویت ونورانیت سے خالی ہوتا ہے۔ یہ علم ایک ایسی غذا ہے جو شیطان کے ہاتھوں نفس امارہ کیلئے تیار کی جاتی ہے۔ توحید کا یہی علم انسان کو توحید سے دور کر کے شرک سے نزدیک کرنے کا باعث بنتا ہے۔ ہم انشاء اللہ بعد ازیں اخلاص کے باب میں اس کے مراتب وحقائق پر روشنی ڈالیں گے۔

خلاصہ یہ کہ حصول اخلاص کے بعد ہی حقیقت کی راہ کو پانا ممکن ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کے سورۂ ''صافات'' کی آیت ۱۵۹ اور ۱۶۰ میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿سُبْحَانَ اللهِ عَمَّا يَصِفُونَ ☆ اِلَّا عِبَادَ اللهِ الْمُخْلَصِينَ﴾ اللہ کے مخلص بندوں کے سوا جو شرک اور دوئیت کے تمام مراتب ومراحل سے بری ہیں، نیز عالم رنگ وبو اور مادیت کی کثافتوں سے پاک وخالص ہیں، اللہ دوسرے لوگوں کی توصیف سے منزہ ہے۔

۱۔ اشارہ ہے اس حدیث کی طرف جو امام علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام سے مروی ہے؛ فرمایا: ﴿اَلصَّلَاةُ قُرْبَانُ كُلِّ تَقِيٍّ﴾ یعنی، نماز ہر متقی کیلئے قرب خداوندی کا ذریعہ ہے۔ (وسائل الشیعہ، ج ۳، ص ۳۰، کتاب الصلاۃ، باب ۱۲، ابواب اعداد الفرائض، حدیث نمبر ۱ و ۲)۔

یاد رہے کہ مخلَصین کا مقام مخلِصین سے بلندتر ہے۔ ہم انشاء اللہ اس نکتے کا ذکر اپنے مقام پر کریں گے۔[1] بہرحال توحید وتجرید پر حقیقی ایمان کے حصول کیلئے اخلاص کی موجودگی سلوک راہ حق کیلئے بنیادی حیثیت کی حامل ہے۔ ہم اس کے حصول کی کیفیت کا ذکر متعلقہ باب میں کریں گے۔ اس کے بعد گناہوں اور نافرمانیوں پر صدق دل اور اخلاق کے ساتھ طلب مغفرت کرنا چاہئے ان شرائط کے ساتھ جن کا ذکر توبہ کے باب میں ہوگا۔

پس جب انسان کا دل کثافتوں سے پاک ہوجائے تو اب وہ ذکر خدا اور کتاب خدا کی تلاوت کیلئے آمادہ ہوجائے گا۔ جب تک مادیت اور طبیعیات کی کثافتوں کے اثرات دل کے اندر موجود ہوں تب تک ذکر خداوندی اور تلاوت قرآنی سے استفادہ ممکن نہیں، چنانچہ کتاب خداوندی میں اس نکتے کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ سورۂ واقعہ/آیت ۷۷ تا ۷۹ میں ارشاد باری ہے:

﴿اِنَّهُ لَقُرآنٌ كَرِيمٌ ☆ فِي كِتابٍ مَكْنُونٍ ☆ لاٰ يَمَسُّهُ اِلاّٰ المُطَهَّرُون﴾[2]

سورۂ مؤمن کی آیت ۱۳ میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿هُوَ الَّذِي يُرِيكُم آياتِهِ وَيُنَزِّلُ لَكُمْ مِنَ السَّماءِ رِزْقاً وَماٰ يَتَذَكَّرُ اِلاّٰ مَنْ يُنِيب﴾[3]

جب ذکر خدا اور تلاوت قرآن کیلئے دل آمادہ ہوجائے تو آیات توحید اور اذکار توحید وتنزیہہ کو حضور قلب اور طہارت کے ساتھ دل کی تلقین کیلئے پڑھنا شروع کرے۔ گویا دل ایک بچہ ہے جو بول نہیں سکتا اور اسے بولنا سکھایا جارہا ہے۔ جس طرح یہاں ایک ایک لفظ کو بار بار دہرا کر بچے کو سکھایا جاتا ہے اسی طرح کلمہ توحید کو بھی حضور قلب اور اطمینان کے ساتھ دل کو بار بار سمجھایا اور سنایا جائے یہاں تک کہ دل کی زبان کھل جائے۔ اگر اس عمل کیلئے رات کے آخرت حصوں یا طلوع فجر اور طلوع آفتاب کے درمیانی وقت کو مختص کیا جائے تو بہت بہتر ہے۔ پھر اس وقت طہارت کے ساتھ قرآن اور ذکر کا رخ دل کی طرف موڑا جائے اور

۱۔ اس نفیس شرح کی تکمیل نہ کرسکنے کے باعث شارح ؒ اپنے اس وعدے کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔

۲۔ وہ قرآن کریم ہے، ایک پوشیدہ کتاب میں، جسے پاک ہستیوں کے علاوہ کوئی نہیں چھو سکتا۔

۳۔ اللہ وہ ہے جو تمہیں اپنی آیات دکھاتا ہے اور آسمان سے تمہارے لئے رزق نازل کرتا ہے اور نصیحت حاصل نہیں کرتا مگر وہ جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے۔ سورۂ مؤمن ۱۳۔

قرآن کی وہ آیات جو تذکر اور توحید پر مشتمل ہوں دل کو بطور تلقین و تفہیم سنایا جائے۔

اگر سورۂ حشر کی آخری آیات کو ﴿یـــا أیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا اتَّقُوا اللهَ﴾ ا (جو اٹھارویں آیت ہے) سے لے کر آخر تک حضور قلب کے ساتھ پڑھا جائے اور ان میں غور وفکر کیا جائے تو انشاء اللہ امید ہے کہ اس کے اچھے نتائج برآمد ہوں، کیونکہ یہ آیات تذکر، محاسبہ نفس، مراتب توحید اور اسماء وصفات الٰہیہ پر مشتمل ہیں۔ البتہ اس کام کیلئے دنیوی مشاغل سے فارغ کوئی وقت اختیار کیا جائے، مثلاً رات کا آخری حصہ یا بین الطلوعین وغیرہ۔ اسی طرح اذکار شریفہ خاص کر کلمہ طیبہ ﴿لا اِلٰـــہ اِلاَّ اللہ﴾ (جو تمام اذکار سے افضل اور جامع ہے۔ ۲) کے ساتھ بھی یہی عمل کیا جائے۔ اگر ایسا کیا جائے تو تائید خداوندی کی امید ہے۔ البتہ سالک کو چاہیۓ کہ تمام مراحل میں اپنے نقائص اور عجز کو پیش نظر رکھے، نیز اللہ کی رحمت وطاقت سے غافل نہ ہو اور ذات پروردگار کے سامنے دست سوال دراز کرے اور اسی سے دستگیری کی دعا کرے۔ اگر اس طریقے پر ایک عرصے تک عمل کیا جائے تو امید ہے کہ انسانی روح، توحید سے آشنا ہو جائے اور توحید کا نور دل کے اندر جلوہ گر ہو۔ البتہ ذکر کی عام شرائط سے غفلت نہیں برتنی چاہیۓ۔ ہم نے تلاوت قرآن کی اکثر شرائط (جو ذکر کی بھی شرائط ہیں) کا تذکرہ "آداب نماز" نامی کتاب میں کیا ہے۔ ۳ اگرچہ خود ہم نے ان سے استفادہ نہیں کیا، کیونکہ مولائے متقیان علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ ؑ نے فرمایا: ﴿أُنظُرْ اِلیٰ مَا قالَ وَلاَ تَنظُرْ اِلیٰ مَنْ قالَ﴾ ۔ ۴

نیز اگر انسان چوبیس گھنٹوں میں سے کچھ لمحات اپنی قلبی توجہ اور آمادگی کے مطابق نور ایمان حاصل کرنے کیلئے نفس کے محاسبے پر صرف کرے اور اس سے نور ایمان کا تقاضا کرے، نیز اس میں ایمان کے آثار کی جستجو کرے تو انشاء اللہ بہت جلد نتیجہ حاصل ہوگا۔

عزیزو! ابتدا میں ان باتوں پر توجہ شاید مشکل نظر آئے، نیز شیطان اور نفسانی وسوسے بھی اس مشکل

۱۔ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو۔ سورۂ حشر ۱۸۔

۲۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۳۷۵، باب "من قال لاالہ الا اللہ" حدیث ۱ و ۲؛ نیز توحید صدوق، ص ۱۸۔

۳۔ آداب نماز، مصباح اول، باب ۴، ص ۲۵۹۔

۴۔ یعنی، یہ دیکھو کہ کیا بات کہی گئی ہے اور یہ نہ دیکھو کہ کہنے والا کون ہے۔ تصنیف غرر الحکم، ص ۵۸، نمبر ۶۱۲۔

میں اضافہ کریں اور انسان کو ان کیفیات کے حصول سے مایوس کردیں، نیز شیطان راہ آخرت اور اللہ کا تقرب حاصل کرنے کے عمل کو ایک مشکل مہم کے طور پر پیش کرے اور کہے: یہ بزرگوں کے کام ہیں ہمارے نہیں! بلکہ ممکن ہے کہ شیطان انسان کو ان کوششوں سے متنفر کردے اور ہر طریقے سے اس کو اس راہ سے روکے۔ لیکن حق کے متلاشی انسان کو چاہئے کہ شیطان پلید کے شرّ سے حقیقی پناہ مانگے اور شیطانی وسوسوں کی پروانہ کرے اور یہ خیال نہ کرے کہ راہ حق کا حصول کوئی مشکل کام ہے۔ البتہ یہ شروع میں مشکل نظر آتا ہے، لیکن اگر انسان اس کام کو شروع کرے تو خدائے تعالیٰ کامیابی کا راستہ آسان اور نزدیک بنادیتا ہے۔

مذکورہ بالا مختصر سے دستور پر عمل آسان ہے اور یہ روزمرہ کے کاموں میں مداخلت بھی نہیں کرتا، نیز اس میں کسی قسم کا نقصان بھی نہیں۔ طالب حق کو چاہئے کہ کچھ عرصہ اس پر عمل کرے۔ پھر اگر وہ دل کی طہارت ونورانیت میں اضافے کے آثار کا مشاہدہ کرے اور باطنی روشنی محسوس کرے تو اس سلسلے کو آگے بڑھائے۔ واضح ہے کہ اس طرح کے کام بتدریج انجام پاتے ہیں اور ان میں وقت لگتا ہے، چونکہ یہ عمل غیر معمولی اہمیّت کا حامل ہے لہذا انسان کو چاہئے کہ اسے معمولی نہ سمجھے۔ یہ دنیوی نقصانات کی طرح نہیں جو انسان یہ کہے کہ آج نہیں تو کل اس کا ازالہ کروں گا اور اگر ازالہ نہ ہو تو بھی کوئی حرج نہیں، بلکہ یہ ابدی کامیابی ونا کامی کا مسئلہ ہے۔ ایسی ناکامی جس کی انتہا نہیں اور جو کبھی ختم نہ ہوگی۔

بے چارہ غافل انسان! دنیا کے جلد گزر جانے والے امور کو بڑی اہمیت دیتا ہے اور ان کے حصول کیلئے سر دھڑ کی بازی لگادیتا ہے۔ وہ اس راہ میں ہر قسم کی ذلت، تکلیف اور مصیبت اٹھانے پر تیار ہوتا ہے، نیز کسی قسم کے عار وننگ سے اجتناب نہیں کرتا جبکہ وہ جانتا ہے اور ہر روز مشاہدہ کرتا ہے کہ دنیا والے ان مراحل سے گزرتے رہتے ہیں اور حسرت ویاٗس کے ساتھ چلے جاتے ہیں۔ لیکن وہ حصول ایمان میں کس قدر سستی اور لاپروائی کا مظاہرہ کرتا ہے جبکہ ایمان اس کی ابدی کامیابی کا ضامن ہے۔ انبیاء واولیا کی اس قدر نصیحتوں اور کتب آسمانی کی موجودگی کے باوجود وہ سستی اور سہل انگاری کا دامن نہیں چھوڑتا، نیز آخرت کی ذلت وخواری، مصیبت اور تکلیف والے دن کی کوئی فکر نہیں کرتا۔ اس کے سخت دل پر قرآن کے وعدے ووعید کا کوئی اثر نہیں ہوتا جبکہ یہ سنگ خارا کو نرم اور پہاڑوں کو لرزہ براندام کرنے کیلئے کافی ہے۔

ہاں! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿لَوْ أَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰى جَبَلٍ لَرَأَيْتَهُ خَاشِعًا مُتَصَدِّعًا مِنْ

خَشْیَۃِ اللہِ وَتِلْکَ الأَمْثَالُ نَضْرِبُھَا لِلنَّاسِ لَعَلَّھُمْ یَتَفَکَّرُونَ﴾۱

اے سخت دل انسان! ہوش کرو، دیکھو کہ تمہارے دل کی بیماری کیا ہے جس نے تمہارے دل کو سنگ خارا سے بھی زیادہ سخت بنا دیا ہے۔ چنانچہ وہ اللہ کی کتاب (جو عذاب وظلمت سے تیری رہائی کیلئے اتری ہے) میں موجود نصائح کا اثر قبول نہیں کرتا۔

ہاں! دنیا اور دنیا کے سیم وزر کی صورت میں شیطانی جالوں نے تمہارے قلب ونظر کو مسحور اور تمہاری سماعت وبصارت کے راستوں کو مسدود کر دیا ہے۔ ذرا اس آیت شریفہ میں غور کرو:

﴿وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَھَنَّمَ کَثِیراً مِنَ الجِنِّ وَالاِنْسِ لَھُمْ قُلُوبٌ لاَ یَفْقَھُونَ بِھَا وَلَھُمْ أَعْیُنٌ لاَیُبْصِرُونَ بِھَا وَلَھُمْ آذَانٌ لاَ یَسْمَعُونَ بِھَا أُولٰئِکَ کَالأَنْعَامِ بَلْ ھُمْ أَضَلُّ أُولٰئِکَ ھُمُ الغَافِلُونَ﴾۔۲

اہل جہنم کی نشانیوں کو ذرا دیکھو اور غور کرو کہ کہیں یہ علامات تمہارے اندر بھی تو موجود نہیں؟

وہ دل جو تدبر ور معرفت کے نور سے خالی ہو، نیز دنیا کے ظاہر کو اس کے باطن کی طرف پلٹانے سے عاجز ہو وہ کسی حیوان کے دل کی طرح گوشت کے ایک لوتھڑے سے زیادہ کچھ نہیں۔ وہ آنکھ جو اس ظاہری دنیا کے علاوہ کسی چیز کو نہ دیکھ سکے اور عبرت وحکمت کا مشاہدہ نہ کر سکے، نیز وہ کان جو اس دنیا کی آوازوں کے علاوہ کسی چیز کو نہ سن سکے، مواعظ خداوندی کو قبول نہ کرے اور حکمت ونصیحت کا اثر نہ لے وہ حیوانی آنکھوں اور حیوانی کانوں سے مختلف نہیں ہیں۔ جو لوگ ان تین بڑی انسانی صفات کے حامل نہ ہوں وہ انسان کی شکل میں چلنے پھرنے والے چار پائے ہیں، بلکہ وہ حیوانات سے بھی زیادہ گمراہ ہیں، کیونکہ انسان اللہ کے دست قدرت سے خلق شدہ نور فطرت۳ نیز قرآن، کتب آسمانی اور انبیاء کی ہدایات (جو اس سے

۱۔ اگر ہم یہ قرآن پہاڑ پر نازل کرتے تو آپ اسے اللہ کے خوف سے جھک کر پاش پاش ہوتا، ضرور دیکھتے اور ہم یہ مثالیں لوگوں کیلئے بیان کرتے ہیں کہ شاید وہ غور وفکر کریں۔ سورۂ حشر ۲۱۔

۲۔ بہ تحقیق ہم نے جن وانس کی ایک کثیر تعداد کو (گویا) جہنم ہی کیلئے پیدا کیا ہے ان کے پاس دل تو ہیں مگر وہ ان سے سوچتے نہیں، ان کی آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں، ان کے کان ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں۔ وہ جانوروں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی گئے گزرے یہی لوگ ہی (حق سے) غافل ہیں۔ سورۂ اعراف ۱۷۹۔

۳۔ دیکھئے ص ۸۷ فٹ نوٹ نمبر ۲۔

مختص ہیں) کے باوجود حیوانیت کی حدود سے باہر نکلنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔

حیوان کا منزل مقصود ہی یہی حیوانیت ہے لیکن بے چارا انسان اپنا راستہ بھول کر مقام انسانی تک رسائی حاصل نہیں کرتا اور اپنی کامیابی سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔ اس طرح وہ خسارہ ونقصان کی زندگی گزارتا ہے اور انسانیت کے راستے سے ہٹ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان حیوان سے بھی زیادہ گمراہ ہو جاتا ہے۔

نیز اگر انسان رحمان وعقل کے تصرف سے نکل کر شیطان وجہل کے زیر تصرف چلا جائے تو وہ حیوانی اوصاف میں سارے حیوانات سے آگے نکل جاتا ہے۔ انسان کی قوت غضبیہ اور قوت شہوانیہ دنیا کو آگ لگا دیتی اور اس عالم کی بنیادوں کو منہدم کردیتی۔ موجودات کو تباہ وبرباد کرتی اور تہذیب وتمدن وتدیّن کی اساس کو تہہ وبالا کردیتی ہیں۔

بسا اوقات فرد واحد کے غیظ وغضب یا اس کی جاہ پرستی کے نتیجے میں لاکھوں خاندان تباہ ہو جاتے ہیں اور ایک منظّم معاشرے کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ کسی بھی حیوان کا آتش غضب اس قدر سوزاں اور ان کا تنور شہوت اس قدر گرم نہیں ہوتا جتنا انسان کا۔ انسان ہی ہے جس کی قوت غضبیہ اور قوت شہوانیہ کی کوئی حد نہیں ہے، نیز اس کے حرص وطمع کی آتش کو کوئی چیز نہیں بجھا سکتی۔ انسان ہی ہے جو دھوکہ، شیطنت اور مکر وفریب کے ذریعے بہت سی بستیوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیتا ہے اور بہت سے خاندانوں کو ہلاکت سے دوچار کردیتا ہے۔

زمین وآسمان پر مشتمل یہ پورا عالم بھی اگر اس انسان کو مل جائے تب بھی اس کی طمع وحرص کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوگی اور دنیا کی حکومت اسے مل بھی جائے تب بھی اس کی نفسانی خواہشات میں کمی واقع نہیں ہوگی۔ اگر کبھی ان کے اندر عاقبت اندیشی اور ذخیرہ اندوزی کی حس شاذونادر کہیں موجود بھی ہو تو ان کی یہ حس محدود اور کمزور ہوتی ہے۔ چیونٹیاں اگر بہار اور گرمی کے ایام میں اپنا رزق جمع کرتی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ سردیوں میں حصول رزق کے راستے بند ہو جاتے ہیں۔ اس وقت وہ اپنے جمع کردہ ذخیرہ کو استعمال میں لاتی ہیں۔ اگر وہ سردیوں میں بھی اسی طرح اپنے گھروں سے باہر نکل کر رزق تلاش کرسکتیں جس طرح بہار میں تو شاید وہ ذخیرہ اندوزی نہ کرتیں۔

یہ انسان ہی ہے جسے معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کس مقصد کے تحت ذخیرہ اندوزی کرتا ہے۔ اگر مال جمع کرنے کا مقصد اس کو خرچ کرنا اور اس کے ذریعے زندگی گزارنا ہو تو پھر کیا وجہ ہے کہ جمع آوری کے بعد بھی

اس کا منہ بند نہیں ہوتا اور اس کے حرص میں مزید اضافہ ہوتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ خودسر انسان حیوانات سے زیادہ گمراہ اور چار پایوں سے زیادہ پست ہو جاتا ہے۔ حیوانات ایک مقصد رکھتے ہیں لیکن انسان کے سامنے کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ البتہ انسان ایک منزل مقصود رکھتا ہے لیکن وہ اس سے غافل ہو جاتا ہے۔ انسان کا گوہر مقصود ''حق'' ہے اور انسان حق طلب ہے۔ حق طلبی کا یہ خداداد جذبہ فطرت الٰہیہ کا نور ہے۔ اس کا مقصد اصلی ''اللہ'' ہے۔ لیکن انسان اس اصلی مقصد کو بھول کر بے بنیاد اور باطل مقاصد کے پیچھے دیوانہ وار گھومتا ہے اور اس کی خواہشات کی آگ بجھنے کا نام نہیں لیتی۔ ﴿ألا بِذِكْرِ اللهِ تَطْمَئِنُّ القُلُوب﴾[۱]

۱۔ جان لو کہ دلوں کو یاد خدا سے سکون میسّر آتا ہے۔ سورۂ رعد ۲۸۔

مقصد / ۳

''تصدیق'' اور اس کی ضد ''جحود'' کا بیان

یہ مقصد دو فصلوں پر مشتمل ہے:

پہلی فصل

تصدیق و جحود سے کیا مراد ہے؟

جان لو کہ یہاں تصدیق سے مراد ہے: حق کو قبول کرنا اور اس پر غیر متزلزل اعتقاد و یقین رکھنا۔ اس کے برعکس جحود سے مراد ہے: حق کا انکار اور حق کے آگے سر تسلیم خم نہ کرنا۔

یاد رہے کہ تصدیق کا شمار عقل کے لشکروں میں ہوتا ہے اور اس کا تعلّق فطرت مخمورہ سے ہے۔ اس کے برعکس جحود و انکار کا تعلّق جہل کے لشکروں اور فطرت محجوبہ سے ہے۔

اس اختصار کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ انسانی فطرت کا خمیر اس جمال و جلال مطلق ہستی کے دست قدرت سے گوندھا گیا ہے اور عالم طہارت و تقدس سے نازل ہوا ہے۔ اس لئے اپنی فطرت و خلقت اولیہ کے لحاظ سے وہ ایک نورانی اور پاکیزہ مخلوق ہے، چونکہ فطرت عالم غیب کی طرف راغب ہوتا ہے، نیز وہ حق طلب اور حق کا عاشق ہوتا ہے (جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا ہے) اس لئے وہ حقائق ایمانی اور امور حقّہ (جن کا تعلّق عالم نور عالم طہارت اور عالم قدس سے ہوتا ہے) کے ساتھ ذاتی مناسبت رکھتا ہے۔ اس کے برعکس وہ جہل، باطل امور، دھوکہ و فریب اور کذب و دروغ سے مناسبت نہیں رکھتا۔

یہ بات اپنے مقام پر ثابت شدہ ہے کہ علم، عالم اور معلوم کے درمیان تناسب ضروری ہے۔ علم عالم کی غذا ہے۔ جس طرح یہ ضروری ہے کہ غذا اپنے کھانے والے کے ساتھ متناسب ہو (تا کہ کھانے والے کے بدن کا حصہ بنے) اسی طرح روحانی غذا (علم) کو بھی اسے کھانے والے (عالم) کے ساتھ متناسب ہونا

چاہئے تا کہ اس کا حصہ بن جائے۔ یہ بات فلسفہ میں ''عالم ومعلوم'' اور ''عاقل ومعقول'' کے درمیان یگانگت کے عنوان سے دلیلوں کے ساتھ ثابت شدہ ہے۔[۱] اللہ تعالیٰ سورۂ عبس کی آیت ۲۴ میں فرماتا ہے: ﴿فَلْيَنْظُرِ الانْسانُ اِلىٰ طَعامِه﴾ یعنی، انسان کو چاہئے کہ اپنے کھانے کو دیکھے۔

اصول کافی میں امام صادقؑ سے مروی ہے کہ آپؑ نے مذکورہ آیت کی تفسیر میں فرمایا: ''انسان کو اپنے علم کے بارے میں یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ اسے کس سے اخذ کر رہا ہے''۔[۲]

شیخ مفیدؒ نے بھی امام باقرؑ سے اسی مضمون کی حدیث نقل کی ہے۔[۳]

پس انسان جب تک اپنی اصلی فطرت پر باقی ہے تب تک علوم حقیقیہ، معارف الٰہیہ، حقایق روحانیہ اور عوالم غیبیہ کے ساتھ اس کی مناسبت باقی رہتی ہے، کیونکہ اصلی فطرت کا تعلّق عالم نور وطہارت سے ہے۔ انسان کی روح ایک صاف وشفاف آئینے کی طرح ہے جو ہر قسم کے غبار وغیرہ سے پاک ہے۔ اس لئے عالم غیبت کے نقوش اس آئینے میں منقش ہوتے ہیں۔ عالم غیب کے سارے نقوش کا تعلّق علوم حقہ اور معارف سے ہے۔ یوں وہ ان نقوش کے تناسب سے انہیں اخذ کرتا ہے۔

س کے برعکس باطل، جھوٹ اور غلط قیاسات کا تعلّق شیطانی وسوسوں ظلمت، آلائشات اور غلاظات سے ہے۔ اس لئے انسان کی روح اپنی اصلی فطرت کی رو سے ان امور سے متنفر اور گریزاں ہوتی ہے اور ان سے مناسبت نہیں رکھتی۔ چنانچہ وہ ان غیر فطری امور کو قبول نہیں کرتی اور ان سے متاثر نہیں ہوتی۔ اگر یہ فطرت سلیم آخر تک محفوظ رہے اور ابلیس کے تصرف سے بچی رہے تو وہ کسی ناحق امر کو قبول نہیں کرے گی اور نہ کسی امر حق سے روگرداں ہوگی، نیز قرآن مجید، انبیاء عظام اور اولیائے کرام (علیہم السلام) کی تعلیمات اس فطرت میں اسی طرح جلوہ گر ہوں گی جس طرح وہ وحی الٰہی کے معدن اور علوم حقہ کے سرچشموں سے نازل ہوئی ہیں اور ان میں نفسانی تصرفات اور توہماتی وتخیلاتی وسوسے (جنہیں ہم عبد ومعبود کے درمیان موجود

۱۔ الاسفار الاربعہ، ج ۳ ص ۳۱۲، فصل ۷، مرحلہ ۱۰۔

۲۔ اصول کافی، ج ۱، ص ۳۹، کتاب فضل العلم، باب ۱۴، ح ۸۔ یہ حدیث کچھ یوں ہے:

﴿عَنْ زَيْدٍ الشَّحّام، عَنْ أبي جَعْفَرٍ (ع) فِي قَوْلِ اللهِ عَزَّوَجَلَّ: ﴿فَلْيَنْظُرِ الانْسانُ اِلىٰ طَعامِه﴾ قالَ: قُلْتُ ما طَعامُهُ؟ قالَ: عِلْمُهُ الَّذي يَأخُذُهُ، عَمَّنْ يَأخُذُه؟﴾۔

۳۔ الاختصاص، ص ۴۔

تاریک حجابوں سے تعبیر کر سکتے ہیں) کا شائبہ تک نہ ہوگا۔

لیکن اگر بدقسمتی سے یہی فطرت اپنی روحانیت کو کھودے اور عالم رنگ و بو سے سروکار کی بناء پر تاریک ہوجائے، نیز خواہشات نفسانی، جہل، قوت غضبیہ اور شیطانی جذبات اس پر غالب آجائیں یا وہ دنیوی لذتوں اور مادی امور کا دلدادہ ہوجائے تو روحانی اور ملکوتی عالم سے اس کی وابستگی ختم ہوجائے گی اور ان نورانی عوالم سے اس کی مناسبت منقطع ہوگی۔ پھر وہ جنوں اور شیاطین کی دنیا سے ہماہنگ اور متناسب بن جائے گی، نیز اس پر توہمات وتخیلات اور وساوس (جو انسان صغیر کا شیطان ہے) کا غلبہ ہوگا۔ اس طرح وہ خدائی معارف وحقائق، نیز وہ نور، پاکیزگی اور تقدس سے مربوط امور کو تلخ محسوس کرے گی۔ اس کے برعکس ظلمت، غلاظت، باطل عقائد، بے بنیاد اوہام اور فریب واشتباہ سے مخلوط امور اسے شیرین اور خوشگوار محسوس ہوں گے۔ وہ ایک غبار آلود اور کثیف آئینے کی طرح بن جائے گی جو روشنی اور لطیف مناظر کو منعکس نہ کرے اور اس کی کثافت وآلودگی میں اضافہ ہوتا ہے۔ یوں نفس کے اندر انکار وجحود کی کیفیت پیدا ہوگی اور دل کسی حقیقت اور امر حق یہاں تک کہ بدیہی اور فطری امور کو بھی قبول نہ کرے گا۔

ہر صاحب فطرت کی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ ہر عمدہ نظام اور پیچیدہ وعجیب ایجاد کو دیکھ کر اس نظام اور ایجاد کے خالق کا کھوج لگائے۔ وہ اس بات میں کوئی شک نہیں کرے گا کہ اس عجیب ایجاد کو موجد کی ضرورت ہے۔ بجلی، ریڈیو، ٹیلی فون، ٹیلی گراف، وائرلیس اور دیگر عجیب ایجادات کو دیکھ کر انسان فطری اور جبلّی طور پر ان کے موجدوں کی عظمت کو تسلیم کرتا ہے اور وہ خود بخود ان کی عظمت و بزرگی کا اعتراف کرے گا۔

اگر کوئی یہ کہے کہ یہ چیزیں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں اور یہ کسی موجد یا ماہر کی محتاج نہیں، نیز یہ خود بخود وجود میں آئی ہیں تو ہر سننے والا اس بات کو اس قدر ناگوار، تلخ اور غیر معقول محسوس کرے گا کہ اس کا جواب نہ دینے کو ہی بہتر خیال کرے گا۔ اب اگر ہم اس کائنات کے محیر العقول نظام اور خلقت پر نظر کریں تو معلوم ہوگا کہ بجلی اور دیگر انسانی ایجادات کائنات کے ایک معمولی کارخانے، یعنی ذہن انسانی کی پیداوار ہیں اور دنیا کے تمام بڑے فلسفیوں کے اذہان اس عظیم کائنات کی ایک چھوٹی مخلوق، یعنی انسان کے بدن کے ہر حصے کو سمجھنے میں حیران وسرگرداں ہیں۔ اگرچہ ماہرین طب وجراحت ہزاروں سال سے انسانی بدن پر تحقیق میں مصروف رہے ہیں لیکن وہ اس کی حقیقت سے صحیح معنوں میں آگاہ نہیں ہوسکے ہیں۔ اس کے باوجود ان ظلوم وجہول انسانوں کے درمیان ایسے افراد بھی موجود ہیں جن کے دل ان کے خالق وصانع کی عظمت کے آگے

سر تسلیم خم نہیں ہیں! ان کے سخت دلوں میں شکوک وشبہات کا اس قدر غلبہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی فطرت کے تقاضوں سے بھی چشم پوشی کر لیتے ہیں اور ان امور کو بھی قبول نہیں کرتے جو عقل کے سامنے بدیہی اور عیاں ہیں، ﴿قُتِلَ الانسانُ ما أکفرہ﴾ ۔۱

اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ انسان اس مادی دنیا میں مگن ہو کر، نیز قوت وہمیہ اور شیطانی وساوس سے مغلوب ہو کر اپنی فطرت کے نور کو کھو دیتا ہے۔ یوں حقائق سے اس کا رابطہ ٹوٹ جاتا ہے۔ چنانچہ سورۂ احقاف کی بیسویں آیت میں خدائے تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَیَومَ یُعرَضُ الَّذینَ کَفَرُوا عَلَی النّارِ أذهَبتُم طَیِّباتِکُم فی حَیاتِکُمُ الدُّنیا وَاستَمتَعتُم بِها فَالیَومَ تُجزَونَ عَذابَ الهُونِ بِما کُنتُم تَستَکبِرُونَ فِي الأرضِ بِغَیرِ الحَقِّ وَبِما کُنتُم تَفسُقُونَ﴾ ۔۲

جن پاکیزہ چیزوں سے کفار اس دنیوی زندگی میں لطف اندوز ہوئے اور جن کو انہوں نے برباد کر دیا ان میں سے ایک شاید یہی نور فطرت ہو جو اللہ کی طرف سے طہارت وپاکیزگی کے ساتھ نازل ہوئی۔ فطرت ایک آسمانی نعمت تھی لیکن کفار نے دنیا پرستی اور دنیوی عیش وعشرت کے باعث اس کو ضائع کر دیا۔

خلاصہ یہ کہ عقلی براہین سے ثابت ہو چکا ہے کہ کھانے والے اور کھانے کے مابین ہماہنگی ومناسبت کی موجودگی ضروری ہے۔ اس لئے فطرت سلیم (جو اپنی اصلی حالت پر باقی ہو اور اس کی نورانیت بھی محفوظ ہو) کا لازمہ یہ ہے کہ وہ حق وحقیقت کے آگے سر تسلیم خم ہوتی ہے۔ اس کے برعکس فطرت محجوبہ پر جہالت وشیطنت کا غلبہ ہوتا ہے۔ اس لئے فطرت محجوبہ کا لازمہ انکار حق ہے۔ پس تصدیق کا تعلّق عقل کے لشکروں سے اور انکار کا تعلّق جہل کے لشکروں سے ہے۔

۱۔ ہلاکت میں پڑ جائے یہ انسان یہ (حق کا) کس قدر منکر ہے۔ سورۂ عبس ۱۷۔

۲۔ جس دن کفار آگ کے سامنے لائے جائیں گے (تو ان سے کہا جائے گا) تم نے اپنی پاکیزہ نعمتوں کو دنیوی زندگی میں ہی برباد کر دیا اور ان سے لطف اندوز ہو چکے۔ پس آج تمہیں ذلت کے عذاب کی سزا اس لئے دی جائے گی کہ تم زمین میں ناحق تکبّر اور بدکرداری کرتے رہے۔

دوسری فصل

انکار وجحود کا نفسانی علاج

جان لو کہ انسان جب تک اس عالم طبیعیات (جو عالم مادہ وتغیّر ہے) میں موجود ہے انکار وجحود کی خصلت کو بدلنے پر قادر ہے۔ انکار وجحود نفس کی بدترین حالت کا نام ہے۔ یہ نفس کی بربادی اور ابدی خسارے کا سبب ہے۔ پس جب تک آدمی اس دنیا میں موجود ہے اس خصلت کو بدلنے، جہل وشیطان کے لشکر سے اپنی جان چھڑانے اور عقل ورحمان کی اطاعت کے دائرے میں داخل ہونے پر قادر ہے۔ یہ مقصد علم نافع اور عمل صالح کے ذریعے ہی انجام پا سکتا ہے۔

علم نافع سے مراد یہ ہے کہ انسان اللہ کی خلق کردہ اشیاء کے اندر موجود لطیف حکمتوں اور دقیق اسرار میں غور وفکر کرے۔ یہ طرز تفکّر متوسطین کیلئے معرفت کے کئی دروازے کھولتا ہے اگر چہ یہ کاملین کیلئے حجاب ہے۔ اگر ''ابرار'' اسے انجام دیں تو نیک ہے لیکن ''مقربین'' کیلئے یہی عمل نامناسب اور برا ہے۔[1]

اللہ کی صنعت گری میں غور وفکر کے بے شمار طریقے ہیں لیکن ہمارے لئے ان سب سے زیادہ نزدیک طریقہ خود اپنی ذات میں غور وفکر کرنا ہے۔ معرفت نفس، انسان کی جسمانی ساخت اور جسمانی افعال میں غور وفکر اللہ کی معرفت حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں، ﴿مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ [فَقَدْ] عَرَفَ رَبَّه﴾[2]

آیئے ہم اس عجیب کارخانہ تن کے نظام ہاضمہ کا ایک جائزہ لیتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جاندار اشیاء (جن میں سے ایک انسان ہے) کی جسمانی ساخت اور مزاج کے تناسب سے انکے اندر مخصوص غذاؤں کی خواہش اور اشتہا موجود ہوتی ہے۔ ہر جاندار کو ایسے غذا کی اشتہا ہوتی ہے جو ان کی جسمانی ساخت کے مطابق ہو اور ان کا بدن اس سے غذائیت حاصل کرے۔ تمام جاندار ایسے مواد سے جو ان کے بدن کا حصہ نہ بنیں یا بدن کیلئے مضر ہوں غالباً نفرت کرتے ہیں۔ اگر جانداروں کو مطلوبہ خوراک ملنے میں دیر لگ جائے تو انکے نظام ہاضمہ اور معدے میں ایک ایسی کیفیت پیدا ہوتی ہے جس میں ایک خاص قسم کی چبھن ہوتی ہے اور

۱۔ اشارہ ہے اس حدیث کی طرف: ﴿حَسَنَاتُ الأبْرارِ سَيِّئاتُ المُقَرَّبِينَ﴾ یعنی، ابرار کی نیکیاں مقربین کی برائیاں ہیں۔ بحار الانوار، ج ۲۵، ص ۲۰۵، حدیث ۱۶۔

۲۔ جس نے اپنے آپ کو پہچانا بہ تحقیق اس نے اپنے ربّ کو پہچانا۔ (تصنیف غرر الحکم، ص ۲۳۲، حدیث ۴۶۳۷؛ نیز عوالی اللئالی، ج ۴، ص ۱۰۲، حدیث ۱۴۹)۔

اسے ''بھوک'' کا نام دیا جاتا ہے۔اگر یہ طبیعی دعوت نہ ہوتی تو ممکن تھا کہ جاندار غذائیت کی کمی کے باعث مرجاتے ،لیکن کھانے کی کوشش نہ کرتے۔ چنانچہ غیر معتدل اور بیمار مزاجوں میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔

اس کے علاوہ جانداروں کی زبانوں کی بیرونی سطح میں تشخیص کا ایک ایسانظام موجود ہے جو مفید اور مضر مواد کی پہچان کا فریضہ انجام دیتا ہے۔علاوہ ازیں مفید غذاؤں کے اندر ایک قسم کی لذت ہوتی ہے جس کی پہچان کیلئے بھی زبان کی بیرونی سطح کو ایک خاص قوت عطا کی گئی ہے۔گویا یہ ایک قسم کی رشوت ہے تا کہ اس کے ذریعے جسم کی سلامتی کا سامان کیا جائے۔اگر یہ رشوت نہ ہوتی تو ممکن تھا کہ انسان بہت سی مفید غذاؤں سے بھی اجتناب کرتا۔اس طرح انسانی جسم آہستہ آہستہ کمزوری اور خرابی کا شکار ہو جاتا۔

پھر جاندار کو ایسے دانتوں سے نوازا گیا ہے جو اس کی مطلوب غذاؤں سے مناسبت رکھتے ہوں۔چنانچہ گوشت کھانے والے جانداروں (جن کیلئے گوشت زیادہ مناسب ہوتا ہے) کو تیز دانت دئے گئے ہیں جو گوشت کھانے کیلئے مناسب ہیں۔اسی طرح سبزی خوار حیوانوں (جن کی جسمانی ساکت گھاس پھونس کی زیادہ محتاج ہے) کو چوڑے دانت دئے گئے ہیں جو چرنے کیلئے مناسب ہیں۔کچھ جاندار ایسے ہیں کہ گوشت اور سبزی دونوں ان کے مزاج سے مطابقت رکھتے ہیں، مثال کے طور پر انسان؛ ان جانداروں کیلئے اللہ نے دونوں قسم کے دانت عنایت کئے ہیں۔

پھر جب منہ کے اندر دانتوں کے ذریعے کھانے کو نرم کرنے کا عمل شروع ہوتا ہے تو زبان کے نیچے موجود غدودوں سے لعاب دہن (ہارمون) کا ترشح شروع ہوتا ہے۔ یہ ہارموں کھانے کو ہضم کرنے میں مکمّل طور پر شریک ہوتا ہے۔جن کھانوں کو ان ہارمونز کی زیادہ ضروری ہوتی ہے ان کیلئے ان کے ترشح کا عمل بھی زیادہ واقع ہوتا ہے۔کھانے کو نگلنے کے بعد معدے کے اندر ہضم کا عمل شروع ہوتا ہے۔معدے کے اندر موجود قوت جاذبہ (کشش) اس کھانے کو معدے کی دیواروں کی طرف جذب کرتی ہے۔ایک اور قوت جسے قوت ماسکہ (پکڑے رکھنے کی قوت) کہا جاتا ہے، اس کھانے کو معدے کی دیواروں کے ساتھ پکڑے رکھتی ہے۔معدے کے اندر بھی کھانے میں کچھ اور مواد شامل ہوتے ہیں اور ہضم کا نیا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ کچھ دیر بعد معدے کا عمل ختم ہو جاتا ہے۔پھر کھانے کے وہ اجزاء جو بدن کے اندر جذب ہو کر اس کا حصہ بننے کے قابل ہیں وہ باریک رگوں (Cappilaries) کے ذریعے کلیجے میں منتقل ہو جاتے ہیں۔اس کے برعکس غذا کے جن اجزاء کی بدن کو ضرورت نہیں ہوتی ،یعنی فاضل مواد معدے کی نچلی جانب واقع راستے سے

گزر کر اثنا عشر (Doudenium) نامی آنت میں جا پہنچتے ہیں۔ معدے کے نیچے واقع گزرگاہ کو ''ابواب'' (دروازے) کہا جاتا ہے، کیونکہ غیر ضروری اوقات میں یہ دروازہ بند ہوتا ہے۔ وہاں سے گزر کر یہ اجزاء بڑی آنت میں چلے جاتے ہیں، جیسا کہ علم طب کی کتابوں میں مذکور ہے۔[1] پھر وہاں سے باہر خارج ہو جاتے ہیں۔

کھانے کے جو اجزاء بدن کا حصہ بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ کلیجے میں چلے جاتے ہیں۔ یہ ایک سیال مادے کی شکل میں ہوتا ہے جسے ''کیلوس (Bile)'' کہا جاتا ہے۔ یہ دہی وغیرہ کے پانی جیسا ہوتا ہے، پھر کلیجے کی کاروائی شروع ہوتی ہے۔ اس کاروائی کے بعد چار عناصر (یعنی، صفرا، سودا، بلغم اور خون) وجود میں آتے ہیں۔ ان میں سے ایک حصہ بدن کو غذائیت فراہم کرنے میں سب سے اہم اور مفید کردار ادا کرتا ہے اور یہ ہے خون۔ خون پہلے وریدوں میں داخل ہوتا ہے پھر وہاں سے دیگر رگوں میں منتقل ہوتا ہے۔ ان رگوں کو ''سواقی''، ''جداول''، ''رواضح'' اور ''عروق شعریہ'' کہا جاتا ہے۔ ان رگوں کے ذریعے خون پورے بدن میں پھیل جاتا ہے اور ہاضمے کا تیسرا عمل وہاں انجام پاتا ہے۔ خون کا تصفیہ شدہ حصہ جو بدن میں جذب ہو کر نئے سیلوں کی تشکیل کے قابل ہوں وہ نہایت باریک سوراخوں کے ذریعے جو باریک رگوں میں موجود ہوتے ہیں ترشح کرتا ہے۔ وہاں ہاضمے کا چوتھا مرحلہ انجام پاتا ہے۔ اس عمل انہضام کے دوران جگر کے ذریعے ایک اور مواد حاصل ہوتا ہے جو غذاؤں کے نچوڑ سے آمادہ اور جدا ہوتا ہے جس سے ایک جدید مواد بنتا ہے۔ دل کے اندر داخل ہونے والے خالص اور صاف خون کو وہاں مزید صاف اور مناسب بنایا جاتا ہے۔ اس خون کا ایک حصہ اوکسیجن میں شامل ہو کر مخصوص راستون کے ذریعے دماغ کی جانب جاتا ہے اور وہاں مغز کی تشکیل عمل میں آتی ہے جو ادراک کا مرکز ہے۔ ان امور کی تفصیلات بیان کرنے کی یہاں گنجائش موجود نہیں اور کوئی شخص ان کے تمام جوانب کا احاطہ نہیں کر سکتا۔

اب ذرا ٹھنڈے دل سے غور کرو کہ طبیعیاتی مواد کو کس کارخانے میں اس طرح سے صاف اور الگ کیا جا سکتا ہے اور پکایا جا سکتا ہے کہ ایک مادہ جس کے اجزاء متشابہ ہیں اور ان کی کیفیت یکساں ہے کبھی اس

۱۔ دیکھئے ابن سینا کی ''القانون فی الطب'' ج ۳، فن ۱۳، مقالہ اولیٰ، ص ۲۸۳ ۔ ۲۸۶ (احوال المری و فی الاصول من امر المعدۃ)۔

قدر سخت ہڈی بن جاتی ہے اور کبھی آنکھ کا پردہ یا عدسہ یا مغز یا حرام مغز جیسے لطیف اعضا کی شکل اختیار کرتا ہے؟! وہ کبھی ادراکات کے مرکز کو وجود میں لاتا ہے اور کبھی تحرکات کے مرکز کو اس قدر منظم اور پیچیدہ شکل میں وجود بخشتا ہے؟!

کون سی پاک اور آلائیشات سے منزہ فطرت سلیم اس بات کی تصدیق کرے گی یا یہ احتمال دے گی کہ یہ پیچیدہ جسمانی نظام کسی ایسے خالق کے بغیر وجود میں آیا ہے جس کا علم ہر لحاظ سے کامل ہو اور جو تمام مفاسد اور مصالح سے آگاہ ہو؟ جبکہ علم الاعضاء اور جراحی کے ماہرین ہزاروں سالوں سے مکمل توجہ کے ساتھ انسانی اعضاء کی جراحی اور شناخت پر تحقیق کیلئے اپنی زندگیاں وقف کر چکے ہیں، لیکن پھر بھی اس کی حقیقتوں اور باریکیوں سے اچھی طرح آگاہی حاصل نہیں کر سکے ہیں، نیز اس سلسلے میں حاصل ہونے والی جدید ترین سائنسی وعلمی کامیابیوں کے باوجود وہ انسانی بدن کی شناخت کے معاملے میں لاعلم ہیں اور ان کی عقلیں حیران!!

یہ کیسے معقول ہے کہ ایک جھوٹی اور سادہ سی گھڑی بغیر کسی ماہر بنانے والے کے نہ بن سکے لیکن انسان کا جسمانی نظام اپنی تمام تر عظمت اور بے شمار اعضاء واجزاء کے باوجود کسی حکیم وعلیم صانع کا محتاج نہ ہو جبکہ اس کے سارے اعضاء نہایت مہارت وحکمت کے ساتھ بنائے گئے ہیں؟!!

یہ کیونکر ممکن ہے کہ ریڈیو سیٹ (جو فضا میں موجود امواج کو پکڑ کر نشر کرتا ہے) کیلئے تو عقل وحکمت اور تدبّر کے حامل لائق صد تحسین صانع کی ضرورت ہو لیکن روح انسانی (جو عقل وحس اور عالم ملک وملکوت سے مربوط لطیف لہروں کو لے کر منتقل کرتی ہے) کو ایک مکمل علم وحکیم اور مدبّر ہستی کی ضرورت نہ ہو؟!!

اگر کوئی دل کا اندھا آدمی مذکورہ احتمال دے تو وہ فطرت انسانی کے دائرے سے خارج ہے۔ ایسا آدمی ایک انسان نما حیوان ہے۔ وہ دل کی بیماریوں میں مبتلا ہونے کی وجہ سے ہی یہ احتمال دے سکتا ہے، کیونکہ دل کی بیماری تمام باطنی بیماریوں کا سرچشمہ ہے۔ پس ایسے آدمی کو چاہیئے کہ وہ اس باطنی بیماری کا مکمل علاج کرے۔ یہ چلتا پھرتا مردہ آدمی ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ سے سورۂ فاطر، آیت ۲۲ میں فرماتا ہے: ﴿وَمَا أَنتَ بِمُسْمِعٍ مَنْ فِي الْقُبُورِ﴾ ۱؎

۱۔ آپ قبر کے اندر سوئے مردوں کو اپنی بات نہیں سنا سکتے۔

یہ وہ حیوان ہے جو دنیا کی چراہ گاہ میں گھومتا پھرتا اور چرتا ہے۔ اس کے بارے میں فرماتا ہے: ﴿ذَرۡهُمۡ یَاۡكُلُوا وَیَتَمَتَّعُوا وَیُلۡهِهِمُ الۡأَمَلُ﴾ ۱ نیز ارشاد ہوتا ہے: ﴿إِنۡ هُمۡ إِلَّا كَالۡأَنۡعَامِ بَلۡ هُمۡ أَضَلُّ سَبِیۡلًا﴾ ۲ رہے وہ نیک اعمال جو نفسانی احوال اور نفس کے انکار، نیز اس کی ظلمت کو تصدیق و روشنی میں تبدیل کرنے کیلئے مفید ہیں تو ان کی دو اقسام ہیں: الف: قلبی اعمال ب: جسمانی اعمال۔

یہاں قلبی اعمال سے مراد وہ اعمال ہیں جو فطرت کو اس کی ابتدائی حالت کی طرف پلٹائیں اور فطری روحانیت کی واپسی کے خواہاں ہوں۔ قلبی اعمال میں سب سے اہم توبہ ہے بشرطیکہ اس کی باطنی اور ظاہری شرائط کی رعایت کی جائے۔ ہم انشاء اللہ اس کتاب میں توبہ اور اس کے ارکان و شرائط کا ذکر متعلقہ جگہ پر کریں گے، نیز ہم نے اپنی کتاب ''شرح چہل حدیث'' میں بھی اس کی تشریح کی ہے۔ ۳

اس کے بعد تزکیہ و تطہیر قلب، نیز اسے مادی پردوں سے نجات دینے کیلئے سرگرم عمل ہونا چاہئے۔ یاد رہے کہ مادی پردوں میں سب سے اہم حبّ دنیا، خود پسندی، تکبّر اور خودسری ہے۔ تزکیہ نفس تقرب خداوندی کے حصول اور سلوک الی اللہ کا اہم مرحلہ ہے۔ اہل ریاضت و سلوک اسے ہر چیز سے زیادہ اہمیّت دیتے ہیں ان اوراق میں ان میں سے ہر ایک کا مختصر تذکرہ انشاء اللہ اپنے اپنے مقام پر کیا جائے گا۔

رہے ظاہری اعمال تو اس سے یہاں وہ اعمال مراد ہیں جو روح کو اس کے احوال کی طرف متوجہ رکھیں، نیز اسے خواب گراں اور مادیت کے نشے سے بیدار کریں، یہ عبارت ہے ان اوراد و اذکار میں مشغول رہنے سے جو اہل بیت طاہرینؑ سے مروی ہیں۔ البتہ ان کی شرائط کی رعایت کے ساتھ (جن میں سب سے اہم حضور قلب ہے) تاکہ نفس خواب غفلت سے بیدار ہو۔ اس کام کیلئے مناسب اوقات وہ ہیں جب انسان کا ذہن مادی اور دنیوی مصروفیات کی طرف زیادہ راغب نہ ہو۔ مثلاً رات کا آخری حصہ، نیز طلوع صبح اور طلوع آفتاب کا درمیانی وقت۔

اصول کافی میں روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ سے فرمایا: ''اے عیسیٰ میرے لئے اپنے دل

۱۔ انہیں چھوڑ دیجئے کہ وہ کھائیں اور مزے کریں اور طویل آرزوئیں انہیں غافل بنا دیں۔ سورۂ حجر ۳۔

۲۔ یہ لوگ جانوروں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔ سورۂ فرقان ۴۴۔

۳۔ دیکھئے شرح چہل حدیث، حدیث ۱۷۔

کونرم کرو اور خلوت میں میری یاد زیادہ کرو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم دعا کے دوران '' تَبَصْبُص '' کیا کرو۔ یعنی خوف ورجاء اور ذلت وخواری کے ساتھ میری طرف توجہ کرو۔ البتہ زندوں کی طرح ذکر ودعا کرو، مردوں کی طرح نہیں ۔[1]

احادیث شریف میں متعدد مقامات پر مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''میں ان لوگوں کا ہم نشین ہوں جو مجھے یاد کریں'' ۔[2]

ہاں! ذکر حقیقی کے ذریعے ہی عبد ومعبود کے درمیان موجود پردے ختم ہوتے ہیں اور اللہ کی بارگاہ میں حاضری کی راہ میں مانع رکاوٹیں دور ہوجاتی ہیں، دل کی سختی اور غفلت کا ازالہ ہوتا ہے، سالک راہ حق کے سامنے ملکوت اعلیٰ کے دروازے واہوجاتے ہیں اور لطف ورحمت خداوندی کے راستے کھل جاتے ہیں، لیکن اہم بات یہ ہے کہ ذکر کے دوران دل زندہ رہے اور مردہ نہ ہو اور مردوں کی طرف راغب نہ ہو۔ یاد رہے کہ جو چیز بھی ذات برحق سے مربوط نہ ہو وہ مردہ ہے اور انسان کا دل ان چیزوں سے وابستگی کے باعث موت اور مردار خوری کے قریب ہوجاتا ہے: ﴿كُلُّ شَيْءٍ هٰالِكٌ اِلاّٰ وَجْهَهُ﴾ ۔[3]

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، کا فرمان ہے: ''تمام عرب شاعروں کے کلاموں میں سب سے سچا کلام ''لبید'' کا یہ جملہ ہے: ﴿أَلاٰ كُلُّ شَيْءٍ مٰا خَلاٰ اللّٰهَ بٰاطِلٌ﴾ ۔[4]

اللہ کے علاوہ دیگر موجودات (خواہ وہ جو بھی ہو) سے دل لگانا خدا سے غافل ہونے کے مترادف

۱۔ روایت کچھ یوں ہے: ﴿قٰالَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ لِعِيسىٰ علیہ السلام: يٰا عِيسىٰ! اذْكُرْنِي فِي نَفْسِكَ أَذْكُرْكَ فِي نَفْسِي وَاذْكُرْنِي فِي مَلَإٍ [كَ] أَذْكُرْكَ فِي مَلَإٍ خَيْرٍ مِنْ مَلَإِ الآدَمِيِّينَ. يٰا عِيسىٰ أَلِنْ لِي قَلْبَكَ وَأَكْثِرْ ذِكْرِي فِي الخَلَوٰاتِ وَاعْلَمْ أَنَّ سُرُورِي أَنْ تُبَصْبِصَ اِلَيَّ وَكُنْ فِي ذٰلِكَ حَيّاً وَلاٰ تَكُنْ مَيِّتاً﴾۔
(اصول کافی، ج۲،ص۳۶۴، باب ذکر اللہ فی السرّ، ح۳)۔

۲۔ حدیث قدسی کے الفاظ یہ ہیں: ﴿أَنَا جَلِيسُ مَنْ ذَكَرَنِي﴾ ۔ (اصول کافی، ج۲ص۳۵۹، باب ما یجب من ذکر اللہ فی کلّ مجلس، ح۴؛ نیز بحار الانوار، ج۹۰ص۱۵۳، ح۱۱، اور ص۱۵۶، ح۲۵ اور ص۱۶۳، ح۴۲)۔

۳۔ ہر چیز فانی ہے سوائے اللہ کے ۔ سورۂ قصص ۸۸۔

۴۔ رسول اللہ ؐ نے فرمایا: ﴿أَصْدَقُ كَلِمَةٍ قٰالَهٰا شٰاعِرٌ كَلِمَةُ لَبِيدٍ: أَلاٰ كُلُّ شَيْءٍ مٰا خَلاٰ اللّٰهَ بٰاطِلٌ﴾ (صحیح مسلم، ج۴، کتاب الشعر، ص۲۴۴۲، حدیث ۳ تا ۶)۔

ہے۔البتہ جن ہستیوں کی یاد خدا کی یاد اور ان کی محبت اللہ کی محبت ہے وہ خاصان حق اور جمیل مطلق کے جمال میں فنا شدہ افراد ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ''میں اور ہم'' کے مرحلے سے گزر چکے ہیں۔ یہ خودی کے بت کو توڑ کر دو جہاں سے ماوراء ہو چکے ہیں۔ یہ ہستیاں اسمائے حق اور اللہ کی کامل نشانیاں ہیں۔

خلاصہ یہ کہ دل کو زندہ کرنے کیلئے اللہ کا ذکر خاص کو اسم مبارک ﴿یا حيّ يا قيّوم﴾ کا حضور قلب کے ساتھ ورد کرنا سودمند ہے (جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے)۔[1]

بعض اہل ذکر اور صاحبان معرفت سے منقول ہے کہ روزانہ ایک بار سجدے میں جا کر ﴿لاٰ اِلٰـهَ اِلاّٰ أَنـتَ سُبـحـانَكَ اِنّي كُـنتُ مِنَ الظالِمِينَ﴾[2] کا زیادہ ورد کرنا روحانی پیشرفت کیلئے مفید ہے۔ کسی سالک راہ آخرت سے منقول ہے کہ کہ جب انہوں نے اپنے استاد سے اس عمل کا فائدہ سن لیا تو روزانہ ایک مرتبہ سجدے میں جا کر اس ذکر شریف کو ایک ہزار بار پڑھنے کا وظیفہ اختیار کیا۔ ایک اور شخص کے بارے میں نقل ہے کہ وہ تین ہزار بار پڑھتے تھے۔[3]

سید الساجدین امام زین العابدین، علی ابن الحسین (علیہما السلام) سے منقول ہے کہ آپؑ نے ایک سخت پتھر دیکھا تو اپنا سر مبارک اس پر رکھا، سجدہ کیا، گریہ فرمایا اور ایک ہزار مرتبہ فرمایا: ﴿لاٰ اِلٰـهَ اِلاّٰ اللهُ حَقّاً حَقّاً؛ لاٰ اِلٰـهَ اِلاّٰ اللهُ تَعَبُّداً وَرِقّاً؛ لاٰ اِلٰـهَ اِلاّٰ اللهُ اِيماناً وَتَصدِيقاً﴾۔[4]

ہمارے آقا و مولا حضرت موسی بن جعفر (علیہما السلام) کے طویل سجدے تو معروف ہیں[5] ثقہ جلیل القدر جناب ابن ابی عمیر[6] طولانی سجدہ کرنے میں اس امامؑ کی سیرت پر عمل کرتے تھے۔

۱۔ یہ ان روایات کی طرف اشارہ ہے جن میں ذکر اہل بیتؑ کو ذکر خدا قرار دیا گیا ہے، چنانچہ امام محمد باقرؑ نے فرمایا ہے: ﴿اِنَّ ذِكـرَنا مِنْ ذِكـرِ اللهِ﴾۔ (اصول کافی، ج۲، ص۳۶۰، حدیث۲؛ نیز بحار الانوار، ج۳۶، کتاب الامامۃ، باب ۹، باب: انہم علیہم السلام الذکر)۔

۲۔ تیرے سوا کوئی خدا اور معبود نہیں، تو منزہ اور پاک ہے، بے شک میں ظالموں میں سے ہوں۔ سورۂ انبیاء ۸۷۔

۳۔ ملاحظہ ہو مرزا جواد آقا ملکی تبریزیؒ کی کتاب المراقبات، ص۱۲۳۔

۴۔ ملاحظہ ہو وسائل الشیعہ، ج۶ ص۳۸۲، کتاب الصلاۃ، باب۲۳ (ابواب السجود)، حدیث ۱۵۔

۵۔ بحار الانوار، ج۴۸ (تاریخ الامام موسی بن جعفرؑ)، ص۱۱۶، حدیث ۲۹۔

۶۔ ابن ابی عمیر امام موسی بن جعفرؑ کے اصحاب اور بزرگان امامیہ میں سے ایک ہیں۔ وہ شیعہ و سنّی سب کے نزدیک -->

جناب فضل بن شاذان[۱] سے منقول ہے: جب میں عراق پہنچا تو میں نے دیکھا کہ ایک شخص اپنے ساتھی پر اعتراض کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے: تم بال بچوں والے آدمی ہو اور تمہیں ان کی خاطر کمانا ہے۔ مجھے خطرہ ہے کہ کہیں طولانی سجدوں کی وجہ سے تمہاری آنکھوں کی بینائی نہ چلی جائے۔

اس شخص نے کہا: وائے ہو تم پر اگر طویل سجدوں کی وجہ سے کسی کی بینائی چلی جاتی تو ابن ابی عمیر کی بینائی چلی گئی ہوتی۔ تیرا کیا خیال ہے اس کے بارے میں جس نے نماز صبح کے بعد سجدہ شکر کیا اور اپنا سر سجدے سے نہیں اٹھایا مگر زوال آفتاب کے وقت؟[۲]

مروی ہے کہ سجدے کو طول دینا ائمہ (علیہم السلام) کی سیرت اور ''اوّابین'' کا وطیرہ ہے[۳]

جی ہاں! جو لوگ حق کی معرفت اور اس ذات مقدس سے انس ومحبت رکھتے ہیں وہ اس طرح کے اعمال کو باعث زحمت ومشقت نہیں گردانتے۔ وہ محبوب کے ساتھ وصل اور اس کی ہمنشینی سے تنگ نہیں آتے۔ خاص کر اس محبوب سے جو تمام محبوں کا محور ہو اور دیگر ساری محبتیں اس کی محبت کا ایک جلوہ ہوں۔ کیا

<-- موثق ہونے کے علاوہ عابدترین اور متقی ترین لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اسی لئے محدّثین اور علم الرجال کے ماہرین انہیں ''اصحاب اجماع'' میں شمار کرتے ہیں اور ان کی مرسلہ روایات کو مسانید کے برابر سمجھتے ہیں۔ وہ ان شیعوں میں سے تھے جو بنی عباس اور ظالموں کا مقابلہ کرنے کی وجہ سے ان کے ہاتھوں قید ہوئے۔ انہوں نے ۲۱۷ ہجری قمری میں دار فانی کو وداع کہا۔

(رجال نجاشی، ص۲۲۶؛ اردبیلی کی جامع الرواۃ، ج۲ ص۵۰؛ اور خیابانی تبریزی کی ریحانۃ الادب، ج۷ ص۳۶۱)۔

۱۔ فضل بن شاذان کا تعلق نیشاپور سے تھا۔ وہ امام رضاؑ کے اصحاب میں سے تھے۔ کچھ لوگ انہیں امام جوادؑ کے اصحاب میں بھی شمار کرتے ہیں۔ وہ ایک زبردست فقیہ اور علم کلام کے ماہر تھے۔ نقل حدیث میں موثق مانے جاتے ہیں۔ وہ شیعوں کے ہاں صاحب عظمت وجلالت عالم ہیں۔ فضل نے تقریباً دوسو اسی کتابیں لکھیں جن میں سب سے اہم ''الایضاح'' ہیں۔ یہ کتاب غیر امامیہ فرقوں کی رد میں لکھی گئی ہے۔

رجال نجاشی، ج۳۰۶؛ جامع الرواۃ، ج۲ ص۵؛ آغا بزرگ طہرانی کی کتاب، الذریعہ، ج۲، ص۴۹۰۔

۲۔ اختیار معرفۃ الرجال، کشّی، ج۲، ص۸۵۵، ح۱۱۰۶؛ الکنی والالقاب، شیخ عباس قمی، ج۱، ص۲۰۰۔

۳۔ حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہے کہ فرمایا: ﴿یا أبا مُحمّد! عَلَیکَ بِطُولِ السُّجُودِ، فَإنَّ ذٰلِکَ مِنْ سُنَنِ الأوّابِینَ﴾ (اے ابو محمد! اپنے سجدوں کو طول دیا کرو، کیونکہ یہ اوّابین کا وطیرہ ہے۔ (وسائل الشیعہ، ج۶ ص۳۸۱، کتاب الصلاۃ، باب۲۳، ابواب السجود، ح۱۲)۔

خوب کہا ہے کسی نے:

آن کس کہ تو را شناخت جان را چہ کند　　　فرزند و عیال و خانمان را چہ کند

دیوانہ کنی ہر دو جہانش بخشی　　　دیوانہ تو ہر دو جہان را چہ کند[۱]

عارف شیراز (حافظؒ) کہتے ہیں:

در ضمیر ما نمی گنجد بغیر از دوست کس　　　ہر دو عالم را بہ دشمن دہ کہ ما را دوست بس[۲]

جو لوگ دوست کی محبت کا جام نوش کرتے ہیں اور اس کے وصال کا آب حیات پی کر ہمیشہ کی زندگی پاتے ہیں وہ دونوں جہانوں کو دشمن کے ہی لائق سمجھتے ہیں۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ کے دل میں چونکہ ﴿وَجَّهۡتُ وَجۡهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالأَرۡض﴾[۳] سمایا ہوا تھا اس لئے جب علم و وحی کے امین عظیم الشان فرشتے حضرت جبرئیل نے ان سے کہا: "کیا آپ کو کسی چیز کی حاجت ہے؟" تو فرمایا: "(ہاں!) مگر تجھ سے نہیں"۔[۴]

راہ حق کے یہ حقیقی عاشق اپنی حاجات صرف محبوب حقیقی سے طلب کرتے ہیں۔ وہ اپنے حقیقی قبلۂ دل کے علاوہ کسی چیز کی آرزو نہیں رکھتے۔ " قبلہ عشق یکی آمد و بس "

ہاں! ہم اندھے، بہرے اور محجوب لوگ ہیں جو تمام معنوی مقامات کو چھوڑ کر حیوانی خواہشات اور شہوانی رغبتوں میں مگن اور خوش ہیں۔ ہم نے کامیابی کے تمام مدارج کے بدلے چند ایک کھوکھلے مفاہیم سے دل لگایا اور اسی پر اکتفا کر لیا ہے!!

اس حالت سے نکلنے کی ایک ہی راہ ہے اور وہ یہ کہ محبوب حقیقی کا لطف و کرم ہماری دستگیری کرے، ہمیں ان غلیظ پردوں اور تہہ در تہہ تاریکیوں سے باہر نکالے، ہمارے دلوں کو اپنی محبت کے ذریعے زندہ کرے اور ہمارا رشتہ دوسروں سے منقطع کر کے صرف اپنے ساتھ جوڑ دے۔

۱۔ مناجات ہائے خواجہ عبد اللہ انصاری، ص ۲۴۱، مطبوعہ انتشارات اقبال، دوسرا ایڈیشن، ۱۳۶۵ ہجری شمسی۔

۲۔ دیوان حافظ بہ تصحیح قزوینی و غنی، ص ۲۶۷، طبع مجلس، ۱۳۲۰ ھ ش۔

۳۔ میں اس ہستی کی طرف رخ کرتا ہوں جس نے آسمانوں اور زمین کو خلق کیا۔ سورۂ انعام ۷۹۔

۴۔ بحار الانوار، ج ۱۲، ص ۳۸، ابواب قصص ابراہیمؑ؛ نیز بحار الانوار، ج ۶۸، ص ۱۵۵۔۱۵۶، کتاب الایمان والکفر، باب ۶۳، حدیث ۷۰۔

مقصد / ٤

رجاء اور قنوطیت (امید اور مأیوسی)

یہ مقصد چند فصلوں پر مشتمل ہے:

پہلی فصل

اس باب کا بیان کہ امید کا تعلّق عقل کے لشکروں سے ہے اور مأیوسی کا تعلّق جہل و ابلیس کے لشکروں سے

جان لو کہ جب عقل اپنے فطری نور، شفاف طینت اور اپنے معنوی و عرفانی ذوق کی بدولت یہ جان لے کہ اللہ تعالیٰ کامل مطلق ہے، نیز وہ ذات وصفات اور افعال کے لحاظ سے قیود سے ماوراء ومنزہ ہے (کیونکہ حدود وقیود وہ نقائص ہیں جو ممکنات کا خاصہ ہیں) علاوہ ازیں یہ بھی جان لے کہ اس ذات پاک کی رحمت بھی ہر لحاظ سے لامحدود ہے تو اس معرفت کا لازمی نتیجہ ذات پروردگار اور اس کی رحمت سے واثق امید اور رجاء کامل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جس طرح فطرت، عقل کو کامل مطلق ہستی اور اس کی رحمت کی طرف دعوت دیتی ہے اسی طرح طبعی طور پر اسے کامل امید ورجاء سے بھی ہمکنار کرتی ہے۔ لیکن اگر فطرت اپنے اصلی نور کو کھودے تو اس کے نتیجے میں وہ ذات حق، اس کے ذاتی وصفاتی کمالات اور اس کی رحمت واسعہ کے ادراک سے محروم ہو جاتی ہے۔ یہ حجاب ومحرومی کبھی اس تک جا پہنچتی ہے کہ انسان رحمت حق سے مأیوس ہو جاتا ہے۔ اس قنوطیت اور مأیوسی کی برگشت درحقیقت اس کی رحمت کو محدود سمجھنے کی طرف ہوتی ہے۔ اس کا لازمہ اسماء وصفات بلکہ ذات کے لحاظ سے بھی (نعوذ باللہ) اللہ کو محدود قرار دینا ہے۔ ﴿تَعَالَی اللّٰہُ عَمّا یَقُولُ الظّالِمُونَ عُلُوّاً کَبِیراً﴾۔

پس معلوم ہوا کہ امید ورجاء ایک فطری امر ہے اور اس کے برعکس مأیوسی فطرت مخمورہ سے متصادم ایک

حجاب اور پردہ ہے، نیز یہ کہ امید ورجاء کے حصول کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ سے حسن ظن رکھنا ہے اور اللہ کی رحمت سے مایوسی ذات حق سے بدظنی کا نتیجہ ہے۔ اس حسن ظن اور بدظنی کی وجہ رحمت خداوندی کی وسعت، نیز اسماء وصفات وافعال کے لحاظ سے اللہ کے کمال کا علم رکھنا یا نہ رکھنا ہے اور ان دونوں کی برگشت ذات خداوندی کی معرفت اور عدم معرفت کی طرف ہوتی ہے۔

عقل اپنی ذاتی واصلی فطرت کی رو سے بے پردہ وشفاف ہے، کیونکہ حجاب اور پردے طبیعیات کی طرف رجوع کا نتیجہ ہیں۔ طبیعیات اور مادیات ہی شجرہ خبیثہ ہیں جو عالم تنزل میں شجرہ ممنوعہ سے عبارت ہے۔ پس عقل اپنی اصلی فطرت کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی فطری معرفت کی حامل ہے۔ اگر عقل مادی وطبیعیاتی شجرہ خبیثہ سے لگاؤ کے باعث اپنے آپ کو حق سے محجوب نہ بنائے تو اسی باطنی پاکیزگی کے باعث اسماء کا عکس حدود وقیود کے بغیر اس میں جلوہ گر ہوگا۔ یہ جلوہ دلبستگی، انس ومحبت اور امید کو وجود میں لائے گا۔ یہ خود محکم امید اور رجاء واثق سے عبارت ہے۔

لیکن اگر عقل شجرہ خبیثہ وممنوعہ کی طرف توجہ دے تو اسی توجہ کے تناسب سے اسماء، صفات اور افعال میں محدودیت نظر آئے گی اور رحمت واسعہ کا ادراک نہ ہوگا یہاں تک کہ وہ مکمّل طور پر دائرہ فطرت سے خارج ہوجائے اور حجابوں کا اثر غالب آجائے، نیز دھندلا پن اور ظلمت آئینہ دل کو اس طرح ڈھانپ لیں کہ وہ عالم غیب اور اسماء وافعال کے جلوؤں سے محروم ہوجائے، نیز جلوہ رحمانی کا عکس اس میں نظر نہ آئے اس طرح مایوسی اور قنوطیت کے اثرات کا دل پر غلبہ ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کی رحمت واسعہ سے محروم کردیتا ہے اور یہ ناکامی کی انتہا ہے۔ نعوذ باللہ منہ۔

دوسری فصل

امید اور غرور میں فرق

جان لو کہ انسان حبّ ذات، خودپسندی اور خودبینی کے باعث اپنے آپ سے غافل ہوتا ہے اور کبھی تو وہ اپنے اندر موجود عیوب ونقائص کو خوبی اور کمال خیال کرتا ہے۔ صفات نفسانی کے درمیان انسان اکثر اوقات غلط فہمی کا شکار رہتا ہے۔ بہت کم لوگ ان صفات کے درمیان صحیح اور غلط میں فرق رکھ سکتے ہیں۔ یہ خود فراموشی کی ایک صورت یا اس کا ایک مرحلہ ہے۔ خود فراموشی خدا فراموشی کا نتیجہ ہے۔ سورۂ حشر کی آیت ۱۹

میں اسی نکتے کی طرف یوں اشارہ ہوا ہے: ﴿وَلاَ تَکُونُوا کَالَّذِینَ نَسُوا اللهَ فَأنسَاهُمْ أنفُسَهُمْ أوْلٰئِکَ هُمُ الفَاسِقُونَ﴾[۱] یہاں ہم اس نکتے کی تفصیلات میں جانا نہیں چاہتے۔

جن امور میں انسان فطرت کی محجوبیت کے باعث دھوکہ کھاجاتا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ایک طرف سے غرور اور باطل امیدوں، نیز دوسری طرف سے برحق امید واطمینان کے درمیان پہچان نہیں کرسکتا۔ صاف واضح ہے کہ غرور شیطان کے بہت بڑے لشکروں میں شامل ہیں۔ اس کے برخلاف امید ورجاء کا تعلّق عقل اور رحمان کے لشکروں سے ہے۔ یہ دونوں اسباب وآثار کے لحاظ سے بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

امید ورجاء کا سبب اللہ کی بے پایاں رحمت کا یقین، نیز اس کے لامحدود فیض، کمال اور اسماء وصفات پر ایمان ہیں۔ اس کے برعکس غرور کا سبب امر خداوندی کو اہمیت نہ دینا، عالم غیب سے ناآگاہی اور نفسانی صفات کے ملکوتی لوازم کی شناخت کا فقدان ہیں۔ اس لحاظ سے ان دونوں کے آثار بھی مختلف ہیں، کیونکہ جو شخص اللہ کی لامحدود رحمت اور بے پایاں نعمتوں کا شناسا اور معتقد ہو اس کے اندر امید ورجاء کی حالت پیدا ہوگی۔ یہ شناخت اور اعتقاد اسے تطہیر اعمال، تزکیہ اخلاق اور منعم حقیقی کی اطاعت کی دعوت دیتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص غرور میں مبتلا ہو وہ شیطانی دام اور نفس امارہ کا شکار ہو کر حصول معرفت، اخلاق کریمہ کی تلاش اور اعمال صالحہ کی توفیق سے محروم رہتا ہے۔

اللہ سے امید ورجاء رکھنے والے اگرچہ ہر طریقے سے اوامر مولیٰ کی تعمیل کرتے رہتے ہیں اس کے باوجود وہ اپنے اعمال واحوال پر ہرگز تکیہ نہیں کرتے، کیونکہ وہ ربّ کی عظمت سے آگاہ ہوتے ہیں اور جانتے ہیں کہ عظمت پروردگار کے سامنے ہر چیز حقیر اور ہر کمال بے قیمت ہے۔ اس کے جلال کبریائی کے آگے تمام اعمال صالحہ ایک پائی کی بھی حیثیت نہیں رکھتے۔ اسی لئے یہ لوگ اس کی رحمت اور لامحدود فیض پر بھروسہ کرتے ہیں۔

اس کے برعکس غرور وگھمنڈ کے شکار لوگ ہر قسم کے کمالات سے محروم رہتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو پست ترین حیوانوں کی صفت میں لاکھڑا کرتے ہیں۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کی رحمت سے غافل اور

۱۔ ان لوگوں کی طرح نہ بنو جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے بھی انہیں اپنے آپ سے غافل بنا دیا یہی لوگ فاسق ہیں۔

منہ پھیرے ہوتے ہیں۔ وہ صرف زبانی جمع خرچ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا ارحم الراحمین ہے اور اللہ بڑا بخشنے والا ہے۔ شیطان انہیں گناہ کبیرہ کے ارتکاب اور سنگین واجبات کو ترک کرنے پر آمادہ کرتا ہے اور انہیں اپنے گناہوں کی توجیہہ کیلئے یہ بہانہ تراشنے کی تلقین کرتا ہے، خدا بڑا (بخشنے والا) ہے، حالانکہ اگر وہ اللہ کی عظمت ذرہ برابر بھی احساس رکھتے تو یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ اس کے سامنے اس کی نعمتوں کی مخالفت کرتے۔ یہ لوگ اللہ کی عظمت و بزرگی کا ذکر کرتے ہیں اور اس کی رحمت واسعہ کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں لیکن ان کے افعال واعمال اس شخص کے مناسب حال نہیں ہوتے جس کے دل میں عظمت پروردگار کا کوئی جلوہ ظاہر ہوا ہو یا اللہ کی رحمت واسعہ کی کوئی کرن اس کے دل میں ضوفشاں ہوئی ہو۔ یہ لوگ آخرت کے معاملے میں سستی اور بے پروائی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور اس بے پروائی کو ''امید ورجاء'' کا نام دیتے ہیں۔ وہ اسے عظمت پروردگار پر بھروسہ قرار دیتے ہیں۔ اس کے برخلاف دنیوی امور میں وہ بڑی دلچسپی اور پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور مال دنیا جمع کرنے میں کوئی دقیقہ ضائع نہیں کرتے۔ گویا اللہ تعالیٰ صرف آخرت اور اخروی امور کے معاملے میں ''بڑا'' ہو اور دنیوی امور میں اسے بڑائی حاصل نہ ہو!!

یہ لوگ دنیوی امور میں مکمل طور پر اپنے نفس اور لوگوں پر بھروسہ کرتے ہیں اور اللہ سے مکمل طور پر غفلت برتتے ہیں یہاں تک کہ اس کا نام بھی نہیں لیتے، لیکن اخروی امور کے بارے میں کہتے ہیں: ''ہم اللہ پر توکل اور بھروسہ رکھتے ہیں''۔ یہ غرور، بے جا اور باطل توقعات کے علاوہ کچھ نہیں۔

خلاصہ یہ کہ ''امید ورجاء'' رکھنے والے عمل سے پہلو تہی نہیں کرتے، بلکہ وہ دوسروں سے زیادہ سنجیدہ اور سرگرم عمل ہوتے ہیں۔ البتہ وہ اپنے اعمال پر بھروسہ نہیں کرتے، بلکہ عمل کرنے کے باوجود وہ صرف اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں، کیونکہ وہ اپنی کوتاہیوں پر بھی نظر رکھتے ہیں اور اللہ کی رحمت واسعہ پر بھی۔ لیکن غلط توقعات باندھنے والوں کی مثال ان لوگوں کی طرح ہے جو بیج بوتے وقت لہو ولعب میں مشغول رہیں یا سستی کا مظاہرہ کریں اور یہ کہیں کہ اللہ بڑا (کریم) ہے وہ بیج کے بغیر بھی فصل دے سکتا ہے!!

اس کے برخلاف ''امید ورجاء'' کے حامل لوگوں کی مثال اس کسان کی طرح ہے جو وقت مقررہ پر کھیتی باڑی کرتے ہیں، نیز مقررہ وقت پر بیج بوتے اور کھیتوں کو پانی دیتے ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ اس کھیتی کی نشوونما اور پیداوار میں اللہ کی مدد کے خواہاں ہوتے ہیں۔ وہ زرعی پیداوار کے حصول کو اللہ کی قدرت کا کرشمہ

سمجھتے ہیں۔ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ یہ حقیقت دلائل و براہین سے ثابت ہے[۱] اور رسول ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے بھی مروی ہے۔[۲]

جو لوگ عمل نہیں کرتے لیکن جزاء و نتیجہ کی توقع رکھتے ہیں وہ غرور اور غلط توقعات کا شکار ہوتے ہیں۔ جو لوگ عمل کرتے ہیں اور اپنے عمل کو کافی بھی سمجھتے ہیں وہ خود بین ہیں جو دراصل اپنے آپ سے غافل ہیں اور اللہ کو بھولے ہوئے ہیں۔

جو لوگ عمل کرتے ہیں لیکن اپنے عمل اور اپنے آپ کو معمولی خیال کرتے ہیں، نیز اللہ اور اس کی رحمت کا سہارا لیتے ہیں وہی صاحبان "رجاء و امید" ہیں۔ ان لوگوں کی یہ علامت ہے کہ وہ دنیا میں بھی غیر اللہ پر بھروسہ اور توکل نہیں کرتے۔ وہ دیگر موجودات سے اپنی آنکھیں موندھ لیتے ہیں اور صرف جمیل مطلق کے جمال پر نظریں مرکوز رکھتے ہیں۔ وہ اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی اور اطاعت مولا سے پہلو تہی نہیں کرتے، بلکہ ان کی معرفت انہیں عمل کرنے پر آمادہ کرتی اور اللہ کی نافرمانی سے روکتی ہے۔

احادیث شریف میں اس نکتے کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ چنانچہ اصول کافی شریف میں ایک حدیث ہے جس کی سند امام جعفر صادق ؑ تک پہنچتی ہے۔ حدیث کا راوی کہتا ہے: میں نے آپ ؑ سے عرض کیا کہ کچھ لوگ اللہ کی نافرمانی کرتے ہیں اور پھر کہتے ہیں: کہ ہم (اللہ سے) امید و رجاء رکھتے ہیں۔ یہ لوگ مرتے دم تک اس روش پر باقی رہتے ہیں۔ امام ؑ نے فرمایا: یہ لوگ غلط توقعات اور جھوٹی آرزوؤں کے شکار ہیں۔ یہ لوگ جھوٹے ہیں۔ یہ اللہ سے امید و رجاء نہیں رکھتے (کیونکہ) جو شخص کسی چیز کے حصول کی امید و رجاء رکھے وہ اسے طلب کرتا ہے اور جو شخص کسی چیز سے خوف کھائے وہ اس سے دور بھاگتا ہے۔[۳]

اسی مضمون کی ایک اور حدیث ہے جس میں یہ بھی فرمایا گیا ہے "وہ ہمارے چاہنے والے نہیں"۔[۴]

۱۔ الاسفار الاربعہ، ج ۹ ص ۱۲۱ تا ۱۳۱، فصل ۱-۲، باب ۱۰۔

۲۔ حدیث یہ ہے: ﴿الدُّنیا مَزرَعَةُ الآخِرَة﴾ (عوالی اللئالی، ج ۱، ص ۲۶۷، ح ۶۶)۔

۳۔ کافی کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: ﴿قُلتُ لَهُ: قَومٌ یَعمَلُونَ بِالمَعاصِي وَیَقُولُونَ نَرجُو، فَلا یَزالُونَ کَذٰلِکَ حَتّٰی یَأتِیَهُمُ المَوتُ. فَقالَ: هٰؤُلاءِ قَومٌ یَترَجَّحُونَ فِي الأَمانِيِّ، کَذَبُوا، لَیسُوا بِراجِینَ، إِنَّ مَن رَجا شَیئاً طَلَبَهُ، وَمَن خافَ مِن شَيءٍ هَرَبَ مِنه﴾ (اصول کافی، ج ۲، ص ۵۵، کتاب الایمان والکفر، باب الخوف والرجاء، حدیث ۵)۔

۴۔ امام صادق ؑ کے الفاظ یہ ہیں: ﴿کَذَبُوا، لَیسُوا لَنا بِمَوالٍ. . .﴾ (سابقہ ماخذ وہی باب، ص ۵۶، حدیث ۶)۔

کلینیؒ "کافی شریف میں یہی امام صادقؑ سے ایک اور حدیث نقل کرتے ہیں کہ مؤمن اس وقت تک مؤمن نہیں بن سکتا جب تک وہ خائف اور راجی (امید ورجاء کا مالک) نہ ہو اور وہ خائف وامیدوار نہیں ہوسکتا جب تک وہ اس چیز پر عمل نہ کرے جس سے وہ خائف ہے یا جس کی وہ امید رکھتا ہے۔[۱]

کافی شریف میں ہی حضرت امام محمد باقرؑ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "جو لوگ میری خاطر عمل کرتے ہیں انہیں چاہئے کہ وہ ان اعمال پر بھروسہ نہ کریں جو وہ میرا ثواب حاصل کرنے کیلئے انجام دیتے ہیں، کیونکہ وہ میری عبادت کی خاطر اپنی پوری زندگی سعی وکوشش میں گزار دیں اور مشقت اٹھاتے رہیں تب بھی وہ اپنی عبادتوں میں میری عبادت کا حق ادا نہیں کرسکیں گے اور میری عبادت کی حقیقت کو نہیں پہنچ سکیں گے۔ ان چیزوں میں جو وہ میرے ہاں سے طلب کرتے ہیں، یعنی میرے ہاں موجود عزت ومقام، میری جنتوں کی نعمتوں اور میرے جوار میں بلند وبالا درجات کے معاملے میں، انہیں میری رحمت پر بھروسہ کرنا چاہئے اور میرے فضل وکرم کی امید رکھنی چاہئے اور وہ مجھ پر حسن ظن کے ذریعے اطمینان حاصل کریں، کیونکہ اس صورت میں میری رحمت انہیں حاصل ہوگی اور میرا کرم انہیں میری خوشنودیوں تک پہنچادے گا اور میری مغفرت انہیں میری بخشش کا لباس پہنا دے گی، کیونکہ میں ہی خدائے رحمان ورحیم ہوں اور میں نے اپنے لئے یہی نام اختیار کیا ہے"۔[۲]

اس سلسلے میں مروی احادیث بہت زیادہ ہیں۔[۳]

۱۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں: ﴿ لَا يَكُونُ الْمُؤْمِنُ مُؤْمِناً حَتّٰى يَكُونَ خَائِفاً رَاجِياً، وَلَا يَكُونُ خَائِفاً رَاجِياً حَتّٰى يَكُونَ عَامِلاً لِمَا يَخَافُ وَيَرْجُو ﴾ (اصول کافی، ج ۲، ص ۵۷، باب الخوف والرجاء، حدیث ۱۱)۔

۲۔ حدیث کی الفاظ یہ ہیں: عَنْ أَبِي جَعْفَرٍ (علیهما السلام) قَالَ: ﴿ قَالَ رَسُولُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: قَالَ اللهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَىٰ: لَا يَتَّكِلُ الْعَامِلُونَ لِي عَلَىٰ أَعْمَالِهِمُ الَّتِي يَعْمَلُونَهَا لِثَوَابِي، فَإِنَّهُمْ لَوِ اجْتَهَدُوا وَأَتْعَبُوا أَنْفُسَهُمْ. أَعْمَارَهُمْ فِي عِبَادَتِي كَانُوا مُقَصِّرِينَ غَيْرَ بَالِغِينَ فِي عِبَادَتِهِمْ كُنْهَ عِبَادَتِي فِيمَا يَطْلُبُونَ عِنْدِي مِنْ كَرَامَتِي وَالنَّعِيمِ فِي جَنَّاتِي وَرَفِيعِ الدَّرَجَاتِ الْعُلَىٰ فِي جِوَارِي، وَلٰكِنْ بِرَحْمَتِي فَلْيَثِقُوا وَفَضْلِي فَلْيَرْجُوا وَإِلَىٰ حُسْنِ الظَّنِّ بِي فَلْيَطْمَئِنُّوا، فَإِنَّ رَحْمَتِي عِنْدَ ذٰلِكَ تُدْرِكُهُمْ، وَمَنِّي يُبَلِّغُهُمْ رِضْوَانِي، وَمَغْفِرَتِي تُلْبِسُهُمْ عَفْوِي، فَإِنِّي أَنَا اللهُ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيمُ وَبِذٰلِكَ تَسَمَّيْتُ ﴾۔ (اصول کافی، ج ۲ ص ۵۸، باب حسن الظن باللہ، ح ۱)۔

۳۔ دیکھیے اصول کافی، ج ۲ ص ۵۵، باب الخوف والرجاء؛ نیز، ص ۵۸، باب حسن الظن باللہ؛ نیز، ص ۵۹، باب الاعتراف بالتقصیر؛ نیز بحار الانوار، ج ۶۷، ص ۳۲۳، کتاب الایمان والکفر، باب ۵۹۔

عزیزوں! اب ذرا اپنا جائزہ لو۔ احوال نفس کے اسباب وثمرات سے اپنے آپ کو پہچاننے کی کوشش کرو اور دیکھو کہ ہمارا تعلق کس گروہ سے ہے؟

دیکھو! کیا اللہ کی بزرگی، رحمت کی عظمت، مغفرت کی وسعت اور عفو کی کثرت نے اس ذات مقدس سے ہماری امیدیں وابستہ کردی ہیں یا ہم شیطان اور باطل توقعات کے شکار ہیں؟ کہیں ہم حق اور اس کی صفات جلال وجمال سے غافل تو نہیں ہوئے؟ کہیں ہم اخروی امور سے سہل انگاری تو نہیں برت رہے؟

عظیم اور منعم ہستیوں کا احترام ہر شخص کی فطرت میں شامل ہے۔ دنیا والے دنیوی نعمتوں اور دنیوی قدرت وشوکت کے حامل افراد کے سامنے ان کا احترام کرتے ہیں، کیونکہ وہ ان کو عظیم اور منعم سمجھتے ہیں۔ پس ان کی فطرت مجوبہ انہیں احترام کرنے کی دعوت دیتی ہے۔

اب اگر تمہارے دل میں اللہ کی عظمت، رحمت خداوندی کی وسعت، نعمت ومغفرت کی کثرت، نیز عفو ودرگزر کی عمومیت کا کوئی جلوہ موجود ہے تو تمہاری فطرت مخمورہ تمہیں اس کا احترام اور اس کی تعظیم کرنے کی دعوت دے گی۔ تم اس کی بارگاہ (جو پوری کائنات سے عبارت ہے) میں اس کی نافرمانی نہیں کرسکتے۔ پس یہ نافرمانیاں حجابوں کی وجہ سے ہیں اور یہ حجاب باطل توقعات کا سبب ہیں۔

عزیزوں! خواب گراں سے بیدار ہو جاؤ اور ان شیطانی توقعات سے دور رہو کہ یہ غرور انسان کو ابدی بربادی سے ہمکنار کردیتی ہیں اور سالکان راہ حق کے قافلے سے جدا کرتی ہیں، نیز معارف الٰہیہ کے حصول (جو خدا والوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے) سے محروم کردیتی ہیں

جان لو کہ غرور کی موجودگی میں نصائح خداوندی، انبیاء کی دعوت، اور اولیاء کے مواعظ کا اثر مرتب نہیں ہوتا، کیونکہ غرور ان سب کی بنیادوں کو تباہ کردیتی ہیں۔ نفس اور شیطان کے سخت ترین حربوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ انسان کو اپنی اور اپنے عیوب کی شناخت سے روکتے ہیں اور اسے خود فراموشی سے دوچار کردیتے ہیں۔ روحانی علاج کرنے والے ان افراد کے علاج سے عاجز ہوتے ہیں۔ پھر یہ لوگ اس وقت بیدار ہوتے ہیں جب پانی سر سے گزر چکا ہوتا ہے اور اصلاح کی کوئی راہ باقی نہیں ہوتی۔ اللہ فرماتا ہے:

﴿وَأَنذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ إِذْ قُضِيَ الْأَمْرُ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ وَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ﴾[1] (سورہ مریم/۳۹)۔

۱۔ ان کو حسرت والے دن سے ڈراؤ جب قطعی فیصلہ کردیا جائیگا جبکہ یہ لوگ غفلت میں پڑے ہیں اور ایمان نہیں لاتے۔

تیسری فصل

خوف اور قنوطیت کے فرق کا بیان

یاد رہے کہ خوف عقل اور رحمان کے لشکروں میں شامل ہے جبکہ قنوطیت کا تعلق جہل اور شیطان کے لشکروں سے ہے۔

جان لو کہ خوف خداوندی کے اسباب وثمرات سے مختلف ہیں، کیونکہ خوف کا سبب یا تو عظمت وجلال کبریائی کی تجلّی ہے یا اللہ کی سخت گرفت، حساب وکتاب اور عذاب وعقاب کے وعدوں کی طرف توجہ ہے یا اطاعت خداوندی میں انسان کی کوتاہی وتقصیر ہے، لیکن ان تینوں باتوں کے باوجود اللہ کی رحمت سے امید وشوق برقرار رکھنے کی گنجائش ہے۔ اس قسم کے خوف کا نتیجہ اطاعت خداوندی میں مزید شدت اور مکمّل احتیاط وپابندی کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ البتہ ان اسباب کے تناسب سے افعال واعمال کے مقاصد مختلف ہوں گے۔ چنانچہ جو شخص اللہ کی جلالت وعظمت کے مشاہدے کے نتیجے میں عمل کرتا ہے اس کے اعمال کا مقصد اس عظیم وجلیل ہستی کی تعظیم وتجلیل ہے۔ ایسا آدمی ﴿وَجَدْتُکَ أَهْلاً لِلْعِبادَةِ فَعَبَدْتُکَ﴾[۱] کا قائل ہوتا ہے۔ ان کا خوف بھی دوسروں کے خوف سے مختلف ہوتا ہے اور ان کے اعمال کی کیفیت بھی دوسروں سے مختلف ہوتی ہے۔ یہ لوگ بہشت اور جہنم سے سروکار نہیں رکھتے اور اعمال کی جزاء وسزا پر نظر نہیں کرتے۔

جو لوگ اللہ کے عذاب وعقاب اور حساب اخروی کے ڈر سے عمل کرتے ہیں ان کا واحد مقصد اس عذاب سے نجات حاصل کرنا اور نعمتوں کا حصول ہوتا ہے۔ جو شخص اپنے عیوب ونقائص کے مشاہدے سے حاصل ہونے والے خوف کے باعث عمل پر مجبور ہوا ہو اس کا مقصد بھی حتی المقدور اپنے عیوب ونقائص کو دور کرنا اور ممکنہ حد تک کمال کے مدارج کا حصول ہی ہوگا۔

خوف خداوندی کے مقابلے میں رحمت خداوندی سے مایوسی وقنوطیت پر نظر کریں تو معلوم ہوگا کہ اس کا سبب رحمت خداوندی کے دائرے کو محدود سمجھنا اور اللہ کے عفو ودرگزر کو اپنے ناقص وجود کے لئے ناکامی

۱۔ امیر المؤمنین علیہ السلام کے اس ارشاد کی طرف اشارہ ہے: میں نے تیری عبادت اس لئے کی کیونکہ میں نے تجھے اس کے لائق پایا۔ (بحار الانوار، ج۴۱ ص۱۴، کتاب تاریخ امیر المؤمنینؑ، باب ۱۰۱، ح۴)۔

سمجھنا ہے۔ تمام گناہوں میں سب سے بڑا گناہ یہی قنوطیت ہے، بلکہ یہ اسماء الٰہی سے انکار ہے اور حقیقت میں خدائے عظیم سے کفر اختیار کرنے کے مترادف ہے۔ یہ مایوسی وقنوطیت اللہ تعالیٰ، نیز اس کے اسماء وافعال وصفات کی عدم شناخت کا مظہر ہے۔

اس ناامیدی کا نتیجہ ترک عمل، بندگی سے اجتناب اور بے بند وباری کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ شاید ہی کوئی چیز ایسی ہو جو قنوطیت کی طرح بے چارے انسان کو بارگاہ خداوندی اور رحمت پروردگار سے دور اور محروم کردے۔

شیطان کا ایک بڑا پھندہ یہ ہے کہ وہ انسان کو پہلے موہوم توقعات میں مبتلا کر کے بے لگام بنا دیتا ہے۔ یوں وہ اسے چھوٹے گناہوں سے بڑے گناہوں کی طرف اور وہاں سے مہلک گناہاں کبیرہ کی طرف لے جاتا ہے۔ کچھ مدت تک اس کے ساتھ یہ کھیل کھیلنے کے بعد اور اسے رحمت خداوندی کی امید کے نام پر باطل توقعات میں مبتلا کر دیتا ہے۔ لیکن بعد میں اگر شیطان اس انسان کے اندر توبہ واصلاح کی کوئی چنگاری دیکھے تو وہ اسے اللہ کی رحمت سے مایوسی وقنوطیت کی طرف لے جاتا ہے اور اس سے کہتا ہے: ''اب پانی تیرے سر سے گزر چکا ہے اور تو اصلاح کے قابل نہیں رہا''۔

یہ ایک بہت بڑا جال ہے جو بندے کو اللہ کے دروازے سے منہ موڑنے پر مجبور اور رحمت الٰہی کے دامن سے تمسک کرنے سے محروم بنا دیتا ہے۔ یہ امر عجیب وغریب قسم کی خرابیوں اور بے شمار مفاسد کا سرچشمہ ہے۔ یہ لوگ اپنے لئے اور دوسروں کیلئے کسی بھی شخص سے زیادہ نقصان دہ ہیں۔ یہ جہل، شقاوت اور بدبختی وناکامی کی انتہا ہے۔

پس انسان کو چاہئے کہ اس گناہ کبیرہ کے علاج کا اہتمام کرے، نیز اللہ کی رحمت واسعہ اور اس کے الطاف خفی وجلی کی طرف توجہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو خصوصی الطاف اور رحمتوں سے نوازا ہے علاوہ ان رحمتوں کے علاوہ جن میں وہ دوسرے جانداروں کے ساتھ شریک ہے اور جو حیاتیاتی یا نباتیاتی نقطہ نظر سے اس کیلئے مفید ہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان مشترک امور میں اللہ نے اسے دیگر جانداروں پر فوقیت دی ہے۔

پانی اور ہوا کو لیجئے۔ جانداروں اور نباتات کی زندگی کا دارومدار ان دونوں پر ہے۔ یہ ان نعمتوں میں سے ہیں جن سے ہم غافل ہیں، چونکہ ان دونوں عظیم نعمتوں نے مکمّل طور پر ہمیں گھیر رکھا ہے اور ہم ان سے مالا مال ہیں اس لئے ہم انہیں کو اہمیت نہیں دیتے۔

انسان کی ولادت سے پہلے اللہ نے اس کیلئے مناسب ترین خوراک کا بندوبست فرمایا۔ اللہ نے دیگر جانداروں کے مقابلے میں انسان کے والدین کے دل میں اس کی محبت کو زیادہ رکھا ہے، یعنی انسان دیگر جانداروں کے مقابلے میں اولاد سے زیادہ محبت کرتا ہے۔ وہ اولاد کی حفاظت، نگہداری اور تربیت میں دیگر جانداروں کی بہ نسبت زیادہ دلچسپی لیتا ہے۔ اس غیر معمولی محبت اور لگاؤ کے باعث وہ اپنی اولاد کی خدمت صرف اور صرف جذبہ شفقت والفت کے تحت کرتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ نہ احسان جتاتا ہے اور نہ معاوضہ طلب کرتا ہے۔

ماں کبھی رات بھر وہ تکالیف اٹھاتی ہے جس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا اور نہ کسی قیمت پر کسی کو ان تکالیف کیلئے آمادہ کیا جاسکتا ہے، لیکن اس کے باوجود وہ ان تکالیف کو بخوشی سہہ لیتی ہے اور بچے کو آرام پہنچانے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ طویل راتیں جاگ کر کاٹتی ہے تاکہ اپنے جگر گوشے کو آرام سے سلائے۔ یہ سب بنی آدم کے ساتھ اللہ کی محبت کے کرشمے ہیں جو ماؤں کے دلوں سے ظاہر ہوتے ہیں۔

انسان کی خصوصی عزت وتکریم کا ایک نمونہ یہ ہے کہ اللہ نے ماں کے پستان کو اس طرح سے خلق فرمایا ہے کہ دودھ پلاتے وقت وہ بچے کو عزت واحترام کے ساتھ گود میں بٹھا سکے۔

یہ اور اس قسم کی لاکھوں مثالیں ایام طفولیت اور بچپنے میں انسان کی ظاہری تکریم وعزت کو ظاہر کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں عمر کے تمام مراحل میں اللہ نے اسے ایسی نعمتوں اور رحمتوں سے نوازا ہے جن کا تفصیلی ذکر باعث طوالت ہوگا۔ تمام نعمتوں سے بڑے نعمت اور تمام رحمتوں میں کامل ترین نعمت معنوی تربیت کی نعمت ہے جو صرف انسان کے ساتھ مخصوص ہے۔ آسمانی کتابوں اور انبیاء ورسل کا بھیجنا اسی سلسلے کی کڑی ہے جو انسان کی ابدی کامیابی اور دائمی آرام کا ضامن ہے۔ اس طرح اللہ نے سعادت جاودانی اور انسانی کمالات کی طرف انسان کی رہنمائی فرمائی ہے۔

یہ مختلف نعمتیں اور یہ ظاہری وباطنی لطف وکرم کسی خدمت یا عبادت کا صلہ نہیں ہیں، بلکہ یہ سب اس کی طرف سے مفت اور بلاعوض عطا ہوئی ہیں۔[۱]

۱۔ یہ مفہوم امام زین العابدینؑ کے کلام سے ماخوذ ہے۔ آپؑ نے فرمایا ہے: ﴿کُلُّ نِعَمِکَ ابْتِداءٌ﴾ (صحیفہ کاملہ سجادیہ، ص ۹۵، دعاء فی الاعتراف وطلب التوبہ الی اللہ (۲۱))۔

آج سے چودہ سو سال قبل اللہ نے ہمارے لئے قرآن جیسی کتاب اتاری جو معارف الٰہیہ کے کامل ترین مراتب کی حامل، نیز عالی ترین دینی و دنیوی کامیابیوں کی ضامن ہے۔ یہ کتاب حضرت ختم رسلؐ جیسی شخصیت پر نازل ہوئی جو تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ معزز اور تمام موجودات میں سب سے عظیم اور اللہ کے سب سے قریب ہیں۔ پھر یہ کتاب اللہ کے فرشتوں میں سب سے افضل فرشتے حضرت جبرئیل امینؑ کے ذریعے نازل کی گئی۔ یہ ساری باتیں انسان کی عزت افزائی کی دلیل ہیں۔

یہ سب نعمتیں اور رحمت خداوندی کے یہ مظاہرے ہماری کس خدمت، عبادت اور اطاعت کا صلہ ہیں؟ اندھی ہو وہ چشم و دل جو ان تمام نعمتوں کو پانے اور انہیں دیکھنے کے باوجود مایوسی اور قنوطیت کے شکار ہوں۔

اے بے چارے انسان! جہنم اور عالم ملکوت و قیامت کے متعدد عذاب خود تیرے اعمال و اخلاق کے سبب ہیں۔ تو نے اپنے ہاتھوں اپنے لئے ذلت و عذاب مول لیا ہے اور لے رہے ہو۔ تم اپنے پاؤں پر چل کر جہنم کی طرف بڑھ رہے ہو۔ تم اپنے عمل سے خود ہی جہنم تیار کر رہے ہو۔ جہنم تیرے غلط اعمال کے باطن کے علاوہ کچھ نہیں۔ برزخ، قبر اور قیامت کی تاریکیاں اور وحشتناکیاں بنی نوع انسان کے اخلاق فاسدہ اور باطل عقائد کے تاریک سایوں کے علاوہ کچھ نہیں: ﴿فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْراً يَرَهُ ☆ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرّاً يَرَهُ﴾[۱] امیر المؤمنین علیہ السلام کا ارشاد ہے: یہ آیت سب سے محکم آیت ہے۔[۲] آیت کا ظاہری مفہوم یہی ہے کہ اچھے اور برے اعمال بذات خود دکھائی دیں گے۔

سورہ آل عمران کی آیت ۳۰ میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُحْضَراً وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوءٍ﴾۔[۳]

اگر انسان کے اعمال نہ ہوتے، اگر ہمارے قبیح اعمال کی غیبی صورتیں نہ ہوتیں تو کوئی جہنم بھی موجود نہ ہوتی اور پورا عالم غیب ٹھنڈک اور سلامتی سے عبارت ہوتا۔

اس کے باوجود جہنم کا باطن اللہ کی رحمت اور لطف کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ گناہگار مؤمنین کو نجات دینے

۱۔ جو کوئی ذرہ برابر نیکی کرے وہ اسے دیکھ لے گا اور جو ذرہ برابر برائی کرے وہ اسے دیکھ لے گا۔ سورۂ زلزال ۷، ۸۔

۲۔ تفسیر مجمع البیان، ج ۱۰، ص ۸۰۰ اور تفسیر نور الثقلین، ج ۵، ص ۶۵۰، حدیث ۱۶ میں اس بات کی نسبت صحابی رسولؐ عبداللہ بن مسعود کی طرف دی گئی ہے۔

۳۔ اس دن ہر شخص اپنا نیک عمل حاضر پائے گا اسی طرح ہر برا عمل بھی۔ سورۂ آل عمران ۳۰۔

اور انہیں ابدی کامیابی سے ہمکنار کرنے کیلئے آخری چارہ کار ہے، کیونکہ انسان کی پاک و پاکیزہ فطرت مخمورہ کی مثال خالص سونے کی طرح ہے جسے ہم لوگ اپنی زندگی میں کھوٹا بناتے اور تانبے وغیرہ سے مخلوط کر دیتے ہیں۔ اس سونے کو بھٹیوں اور پگھلانے والی آگ کے ذریعے دوبارہ خالص اور کھرا بنانے، نیز ملاوٹوں سے پاک کرنے کی ضرورت ہے۔ حدیث نبویؐ ہے: ﴿النّاسُ مَعادِنُ کَمَعادِنِ الذَّهَبِ وَالفِضَّةِ﴾۔[1]

پس جہنم ان لوگوں کیلئے غضب کی صورت میں ایک نعمت ہے جن کی فطرت مکمّل طور پر محجوب نہ ہو چکی ہو اور جو کفر و الحاد اور نفاق کی حد تک نہ پہنچ چکے ہوں۔

چوتھی فصل

خوف و رجاء کو جمع کرنے کی کیفیت

یہ دو طرح سے ممکن ہے۔ ان میں سے ایک کامل لوگوں اور اہل معارف سے مخصوص ہے۔ وہ اس طرح کہ لطیف اور رحمانی تجلیات (جو اسمائے جمال سے عبارت ہیں) کو قہری اور کبریائی تجلیات (جو اسمائے جلالی سے عبارت ہیں) کے ساتھ یکجا کیا جائے۔ بالفاظ دیگر تجلیات رحمت اور تجلیات عظمت کا اجتماع ہو۔

اولیاء کے قلوب اپنی اصلی فطرت کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں۔ بعض قلوب وہ ہیں جو افق رحمت سے زیادہ قریب اور زیادہ مناسبت کے حامل ہیں۔ یہ وہ قلوب ہیں جو اسماء جمال و رحمت کے مظہر ہیں اور بذات خود رحمت و جلال کی تجلی کا ظہور ہیں، جس طرح حضرت عیسیٰ (علی نبینا و آلہ و علیہ السلام) کا قلب[2]۔ ان

۱۔ لوگ سونے چاندی کے کانوں کی طرح کے کان ہیں۔ (مسند احمد بن حنبل، ج۲، ص ۵۳۹)۔

۲۔ اشارہ ہے امام موسیٰ کاظمؑ کی اس حدیث کی جانب:

﴿کانَ یَحیی بْنُ زَکَرِیّا عَلَیْهِ السَّلامُ یَبْکِي وَلا یَضْحَکُ، وَکانَ عِیسی بْنُ مَرْیَمَ عَلَیْهِمَا السَّلامُ یَضْحَکُ وَیَبْکِي، وَکانَ الَّذِي یَصْنَعُ عِیسیٰ عَلَیْهِ السَّلامُ أَفْضَلَ مِنَ الَّذِي کانَ یَصْنَعُ یَحییٰ عَلَیْهِ السَّلامُ﴾

یعنی، حضرت یحیی (علیہ السلام) روتے تھے اور ہنستے نہیں تھے جبکہ عیسی (علیہ السلام) ہنستے بھی تھے اور روتے بھی تھے۔ البتہ عیسیٰ (علیہ السلام) کی روش یحییٰ (علیہ السلام) کی روش سے بہتر تھی۔

(اصول کافی، ج۲، ص ۴۸۸، کتاب العشرۃ، باب الدعابة والضحک، ح ۲۰؛ نیز بحار الانوار، ج ۱۴، ص ۱۸۸، باب قصص زکریاؑ و یحییؑ، ح ۴۰؛ نیز شیخ داؤد قیصری کی کتاب ''شرح فصوص الحکم''، ص ۳۹۸۔۳۹۹، فصل یحیوی)۔

قلوب میں خوف کے پر امید و رجاء کا غلبہ ہوتا ہے، نیز تجلیات جمال تجلیات جلال پر غالب ہوتی ہیں۔

دلوں کی ایک قسم وہ ہے جو افق جلال و عظمت کے نزدیک ہے۔ یہ وہ قلوب ہیں جو تجلی جلال سے ظاہر ہوتے ہیں اور وہ خود تجلی کا ظہور ہیں، جس طرح حضرت یحییٰ علیہ السلام کا پاک دل۔ ان دلوں میں امید و رجاء پر خوف غالب ہوتا ہے، نیز جلالی تجلیات جمالی تجلیات پر غالب ہوتی ہیں۔

دلوں کی ایک قسم وہ ہے جس میں تجلی کی دونوں قسمیں جمع ہوتی ہیں۔ اس طرح کے قلوب افق اعتدال سے جس قدر نزدیک ہوں اسی قدر کامل تر ہوتے ہیں یہاں تک کہ تجلیات جمالی اور تجلیات جلالی مساوی طور پر اور حقیقی اعتدال کے ساتھ ان دلوں پر ظاہر ہوتے ہیں۔ وہ اس طرح سے کہ نہ جلال کو جمال پر غلبہ ہو اور نہ جمال کو جلال پر۔ اس قلب جمعی احدی احمدی کا مالک دائرہ کمال کا خاتم اور ولایت مطلقہ و نبوت مطلقہ کا جامع ہے اور وہ نبوتوں کا خاتم اور ولایتوں کا مرجع ہے۔ [1]

یہ خوف و رجاء جو تجلیات اسماء کا مظہر ہیں کبھی ختم نہیں ہوتے۔ اس مادی عالم کے خاتمے اور اس عالم رنگ و بو سے ان پاک ارواح کی واپسی کے بعد بھی یہ سلسلہ ختم نہیں ہوتا۔ البتہ ہر مرحلہ حیات میں ان کے ظہور کی کیفیت مختلف ہوتی ہے اور اثرات بھی مختلف ہوتے ہیں۔

شرح اصول کافی میں عظیم مسلمان فلسفی اور حکیم ایمانی (صدر المتألہین) نے حدیث شریف کے اس فقرے کی شرح میں فرمایا ہے: ''خوف عالم آخرت میں باقی رہنے والے کمالات میں شامل نہیں۔ وہ اس دنیا کے خاتمے کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے''۔ [2] یہاں خوف سے ان کی مراد وہ خوف نہیں جس کا تعلق تجلیات جلال سے ہے، کیونکہ یہ تجلیات مادیات سے رابطہ ختم ہونے کے بعد زیادہ کامل اور زیادہ اعلیٰ وارفع بن جاتی ہیں اور ارواح و نفوس جس قدر مادیت کے غلاف میں بند رہیں اسی قدر وہ تجلیات سے زیادہ محروم رہتی ہیں۔

خوف کی یہ قسم وہ نہیں جس کا تعلق عذاب و عقاب سے ہے۔ اس لئے یہ عالم آخرت سے منافات نہیں رکھتا۔ شاید عالم آخرت میں بھی تمام کامل نفوس و ارواح کی مناسبت سے لطف و رحمت کی تجلی جلال و عظمت کی تجلی پر غالب ہو۔ بنابریں خوف کا خاتمہ ہوگا۔

۱۔ دیکھئے سید حیدر آملی ؒ کی المقدمات من کتاب نص النصوص، ص ۱۶۹؛ نیز شیخ عبدالکریم جیلی کی الانسان الکامل، ص ۱۳۲۔

۲۔ دیکھئے صدر المتألہین شیرازی کی شرح اصول کافی، ج ۱، ص ۴۱۸۔

لیکن اہل دل اورارباب معرفت تحقیق سے ثابت کر چکے ہیں کہ ہراسم جمالی کے باطن میں جلال اور ہر اسم جلال کے باطن میں جمال پوشیدہ ہے۔[1] جب تجلیات جلالیہ کے بعد انس ومحبت حاصل ہوتی ہے تو عظمت سے لاحق شدہ خوف اطمینان وسکون میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ پس خوف (جو اسماء جلالی کی ابتدائی تجلیات میں سے ایک ہے) ختم ہو جاتا ہے اور اس کے بدلے میں انس ومحبت اور اطمینان حاصل ہوتا ہے، واللہ العـــالم۔

یاد رہے کہ یہاں ذکر شدہ خوف کے خاتمے سے مراد وہ خاتمہ نہیں جس کا ذکر مذکورہ فلسفی اور بعض شارحین ومحدّثین نے کیا ہے۔[2] کیونکہ جس خاتمے کا ذکر ہوا وہ درحقیقت خاتمہ نہیں، بلکہ یہ بظاہر باطن کی طرف بازگشت ہے اور صورت کی بازگشت ہے معنی کی طرف۔ اس بات کی تفصیل میں جانے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

خوف ورجاء کے ایک جگہ جمع ہونے کی دوسری صورت یہ ہے کہ انسان کو ہمیشہ دو زاویوں پر باہم نظر رکھنی چاہئے۔ (ممکن ہے کہ احادیث شریف اور معصومین ؑ سے منقول دعاؤں میں بھی یہی صورت مراد ہو) وہ اس طرح کہ ایک طرف سے وہ اپنے نقائص وعیوب اور فقر واحتیاج کو ملحوظ خاطر رکھے اور یہ سمجھے کہ وہ ہر طرح سے نقص اور کمی کا پیکر ہے اور ذاتی طور پر کسی قسم کی طاقت وقوت یا کمال وعزت کا مالک نہیں، بلکہ ہر کمال وجمال اور حسن وخوبی اللہ کی طرف سے ہے، نیز ہر قسم کی حمد وثنا اللہ کی مقدس ذات کی طرف لوٹتی ہے۔ درحقیقت عالم امکان کے آئینے میں کمال ازلی اور حسن ازلی نقص اور کمی سے روبرو ہوتے ہیں جس طرح ایک دھندلا اور چھوٹا آئینہ آفتاب کی روشنی کو محدود اور دھندلا بنا دیتا ہے۔ اس نقطہ نظر سے عبادات وطاعات میں بھی خوف کا عنصر موجود ہوتا ہے، خطاؤں اور گناہوں کی تو بات ہی اور ہے۔ بعض اصحاب معرفت کے نزدیک ہماری اکثر عبادات خود پرستی اور خواہشات نفسانی کی مظہر ہیں جن سے ظلمت وتاریکی ہی حاصل ہوتی ہے۔ پس اس نقطہ نظر سے نہایت خوف لاحق ہوتا ہے۔

۱۔ دیکھئے شیخ عبدالکریم جیلی کی الانسان الکامل، ص ۹۱۔

۲۔ دیکھئے صدر المتألہین کی شرح اصول کافی، ج ۱، ص ۴۱۹؛ نیز ملا صالح مازندرانی کی شرح اصول کافی، ج ۱، ۲۸۰۔

دوسرے نقطہ نظر اور زاویہ نگاہ سے انسان کو چاہئے کہ اللہ کی وسیع رحمت، رحمانیت، رحیمیت، لامتناہی نعمتوں اور دائمی اعزازات کو ملحوظ نظر رکھے۔ اس نقطہ نظر سے انسان کو امید ورجا حاصل ہوتی ہے۔

پس انسان کو چاہئے کہ ہمیشہ ان دونوں زاویوں پر باہم نظر رکھے۔ ایک طرف سے اپنی ذلت و بیچارگی اور ضرورت پر اور دوسری طرف سے اللہ کی رحمت ونعمت پر نظر رکھے تاکہ خوف وامید دونوں مکمّل طور پر بیک وقت جمع ہو جائیں۔

چنانچہ کافی شریف میں امام صادقؑ سے مروی ہے:

''لقمان کی وصیت میں بہت سی عجیب چیزیں تھیں۔ زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ لقمان نے اپنے فرزند سے کہا: اللہ سے اس طرح ڈرو کہ اگر تم ثقلین کی نیکیوں کے ساتھ اس کی بارگاہ میں حاضر ہو جاؤ تو بھی وہ تجھے عذاب میں مبتلا کرے گا۔ اور اس سے اتنی امید رکھو کہ اگر تم ثقلین کا گناہ لے کر اس کے پاس حاضر ہو تو بھی وہ تم پر رحم کرے گا''۔

اس کے بعد حضرت صادقؑ نے فرمایا:

''ہر بندہ مؤمن کے دل میں دو نور ہوتے ہیں، یعنی خوف کا نور اور امید کا نور۔ اگر ان دونوں میں سے ایک کا موازنہ دوسرے سے کیا جائے تو ان میں سے کوئی دوسرے پر غالب نہ آئے''۔[۱]

امام زین العابدین علیہ السلام کی دعاؤں میں اس نکتے کی طرف متعدد بار اشارہ ہوا ہے۔ دعائے ابوحمزہ ثمالیؒ عبودیت کی ایک بلندترین تصویر پیش کرتی ہے۔ اللہ کی بارگاہ میں بندے کی زبانی آداب بندگی پر مشتمل اس قسم کی دعا بنی آدم کے درمیان اور کہیں نہیں پائی جاتی۔ اس دعا میں امام زین العابدینؑ اللہ کے

۱۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں: عَنْ أبي عَبْدِاللهِ علیہ السلام، قالَ:

﴿قُلْتُ لَهُ: ما كانَ فِي وَصِيَّةِ لُقْمانَ؟ قالَ: كانَ فِيها الأعاجِيبُ، وَكانَ أعْجَبُ ما كانَ فِيها أنْ قالَ لابْنِهِ: خَفِ اللهَ. عَزَّوَجَلَّ. خِيفَةً لَوْ جِئْتَهُ بِبِرِّ الثَّقَلَيْنِ لَعَذَّبَكَ، وَأرْجُ اللهَ رَجاءً لَوْ جِئْتَهُ بِذُنُوبِ الثَّقَلَيْنِ لَرَحِمَكَ.

ثُمَّ قالَ أبُوعَبْدِ اللهِؑ: كانَ أبي يَقُولُ: اِنَّهُ لَيْسَ مِنْ عَبْدٍ مُؤْمِنٍ اِلاّٰ [وَ] فِي قَلْبِهِ نُوران: نُورُ خِيفَةٍ وَنُورُ رَجاءٍ، لَوْ وُزِنَ هٰذا لَمْ يَزِدْ عَلىٰ هٰذا وَلَوْ وُزِنَ هٰذا لَمْ يَزِدْ عَلىٰ هٰذا﴾

(اصول کافی، ج۲، ص۵۵، باب الخوف والرجاء، ح۱)۔

حضور عرض کرتے ہیں:

﴿أدْعُوکَ راهِباً راغِباً راجِیاً خائِفاً اِذا رَأیْتُ مَولايَ ذُنُوبِي فَزِعْتُ؛ وَاِذا رَأیْتُ کَرَمَکَ طَمِعْتُ. فَاِنْ عَفَوتَ فَخَیْرُ راحِمٍ؛ وَاِنْ عَذَّبْتَ فَغَیْرُ ظالِمٍ﴾ ۔[۲]

۱۔ خدایا میں تجھے میل ورغبت اور خوف وامید کے ساتھ پکارتا ہوں ۔اے مولا! جب میں اپنے گناہوں کو دیکھتا ہوں تو میں فریاد کرتا ہوں، اور جب تیرے کرم کو دیکھتا ہوں تو للچاتا ہوں ۔ پس اگر تو عفو ودرگزر سے کام لو تو سب سے بہتر رحم کرنے والا ہے اور اگر تو عذاب دے تو بھی تو ظلم کرنے والا نہیں ہے۔

(دیکھئے مصباح المتہجد وسلاح المتعبد (جو شیخ الطائفہ طوسی، قدس سرّہ، کی تالیف ہے) ص ۵۲۶، دعائے ابوحمزہ ثمالی ؒ)۔

'عدل' اور اس کی ضد 'جور' کا بیان

یہ مقصد چند فصلوں پر مشتمل ہے:

پہلی فصل

عدل اور جور کا مفہوم

جان لو کہ عدل سے مراد ہے، درمیانی راستہ جو افراط وتفریط سے خالی ہو۔ عدل اہم ترین اخلاقی خوبیوں میں سے ایک ہے، بلکہ تمام ظاہری، باطنی، روحانی، قلبی، نفسانی اور جسمانی خوبیاں مکمّل طور پر عدل مطلق سے عبارت ہیں، کیونکہ عدل مطلق سے مراد براہ راست یہ ساری چیزیں ہیں۔ اس کی درج ذیل صورتیں ہوسکتی ہیں:

الف: اسماء وصفات کے اظہار اور وجود کے لحاظ سے جو استقامت مطلقہ ہے اور انسان کامل سے مختص ہے اور اس کا ربّ، اللہ کا اسم اعظم ہے جو اسماء والے صراط مستقیم پر ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: ﴿مَا مِنْ دابَّةٍ اِلَّا هُوَ آخِذٌ بِناصِيَتِها اِنَّ رَبِّي عَلىٰ صِراطٍ مُسْتَقِيم﴾ [۱]

انسان کامل حضرت خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، کا ربّ صراط مستقیم اور مکمّل حد اعتدال پر ہے۔ اسی طرح اس کا مربوب بھی مکمّل طور پر صراط مستقیم اور حد اعتدال پر ہے۔ البتہ فرق یہ ہے کہ ربّ جل جلالہ، بذات خود صراط مستقیم پر ہے بغیر کسی سہارے کے جبکہ مربوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اللہ کی رحمت کے سہارے صراط مستقیم پر ہیں۔

۱۔ روئے زمین پر جتنے چلنے والے ہیں سب کی چوٹی اسی کے ہاتھ میں ہے، اس میں تو شک ہی نہیں کہ میرا پروردگار (انصاف کی) سیدھی راہ پر ہے۔

سورۂ ہود ۵۶۔

یہاں جور سے مراد لطف پر قہر کا غلبہ یا قہر پر لطف کا غلبہ ہے۔ با الفاظ دیگر، اس سے مراد صرف اسماء جلال کا ظہور یا صرف اسماء جمال کا ظہور ہے۔ شاید کُمّل الاولیاء آیت شریفہ ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾[1] میں اسی مقام کو طلب کرتے ہیں۔

ب: صاحبان معرفت کے دلوں میں معارف الٰہیہ اور توحید کے جلووں کے لحاظ سے، یہاں عدل سے مراد یہ ہے کہ مخلوقات خالق کیلئے حجاب نہ بنیں اور نہ ہی خالق مخلوقات کیلئے۔ با الفاظ دیگر، کثرت میں وحدت کا مشاہدہ ہو اور وحدت میں کثرت کا۔ یہ اللہ کے کامل بندوں کا خاصہ ہے۔ یہاں افراط وتفریط سے مراد ہے: خالق کو مخلوقات کیلئے اور مخلوقات کو خالق کیلئے حجاب قرار دینا۔ شاید اللہ کے کامل بندوں کے نزدیک مذکورہ آیت سے مقصود اسی مقام کا حصول ہو۔

ج: عقائد اور حقائق ایمانیہ کے لحاظ سے عدل سے مراد ہے: موجودات کی حقیقت کو اسی طرح پہچاننا جس طرح وہ ہیں۔ یعنی کمال آسمانی کی ابتدائی حدوں سے لے کر مظاہر کے ظواہر کی طرف آخری حدود تک بازگشت جو درحقیقت معاد سے عبارت ہے۔

د: اخلاق باطنی کے لحاظ سے جو قوائے ثلاثہ (یعنی قوت غضبیہ، قوت شہوانیہ اور قوت شیطانیہ) میں اعتدال کا نام ہے۔ حدیث شریف[2] میں بظاہر یہی آخری قسم مقصود ہے۔ اسی لئے اس کو عقل کے لشکروں میں شمار کیا ہے۔ بنابریں ہم بھی اسی قسم کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔

جان لو کہ انسان اپنی دنیوی زندگی کی ابتدا ہی سے قوت عاقلہ کے ساتھ تین اور قوتوں کا حامل ہوتا ہے جو یہ ہیں:

الف: قوت وہمیہ؛ جسے ''شیطنت'' بھی کہا جاتا ہے۔ یہ قوت چھوٹے بچوں میں ابتدا سے موجود ہوتی ہے۔ بچہ اسی قوت کے باعث جھوٹ بولتا، دھوکہ دیتا اور مکر وحیلہ سے کام لیتا ہے۔

ب: قوت غضبیہ؛ جسے ''جذبہ درندگی'' بھی کہا جاتا ہے۔ ضرررساں عوامل کو دفع کرنے اور مفادات کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے کیلئے اسی قوت سے کام لیا جاتا ہے۔

۱۔ ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت فرماتا رہ۔ سورۂ حمد ۶۔

۲۔ اس سے مراد یہی حدیث جنود عقل ہی ہے۔

ج: قوت شہویہ: اسے "جذبہ حیوانی" بھی کہا جاتا ہے۔ یہ قوت خواہشات وشہوات اور مفادات کے حصول، نیز کھانے پینے کی لذتوں اور جنسی لذات کی خواہش کا سرچشمہ ہے۔

یہ تینوں قوتیں سن وسال کے حساب سے مختلف ہوتی ہیں۔ انسان جسمانی لحاظ سے جس قدر ترقی کرتا جائے اسی حساب سے یہ تینوں قوتیں اس کے اندر زیادہ مضبوط ہوتی جاتی ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ تینوں قوتیں انسان کے اندر اپنی آخری حدوں کو اس طرح چھولیں کہ ان میں سے کوئی دوسرے پر غالب نہ ہو، نیز اس بات کا بھی امکان ہے کہ ان میں سے کوئی ایک دوسری دونوں قوتوں پر غالب ہو اور یہ بھی ممکن ہے ان میں سے دو قوتیں تیسری پر غالب ہوں۔ اس بنا بر بنیادی ملکوتی مسخ شدگان کی سات سے زیادہ صورتیں بنتی ہیں:

ان میں سے ایک صورت حیوانی ہے۔ اگر نفس کا باطن حیوانی صورت اختیار کرے اور حیوانی جذبہ غالب ہو تو انسان اپنے ملکوتی، غیبی اور اخروی زندگی میں اسی جذبے سے متناسب حیوان کی شکل اختیار کر جاتا ہے، مثلاً گائے، گدھا وغیرہ۔ اگر انسان کی آخری حالت پر جذبہ درندگی کا غلبہ ہو تو اس کی باطنی واخروی شکل وصورت درندوں والی ہوگی، مثلاً شیر، بھیڑیا وغیرہ۔ جب دیگر قوتوں اور جذبوں پر شیطنت کا جذبہ غالب ہو اور آخری حالت شیطانی جذبے سے مغلوب ہو تو انسان کی باطنی، ملکوتی اور اخروی شکل وصورت کسی شیطان کے مانند ہوگی۔ یہ "مسخ ملکوتی" کی اہم ترین اور بنیادی ترین صورت ہے۔

ان تینوں میں سے دو کے اشتراک سے بھی تین صورتیں بنتی ہیں۔ شیر گائے، گائے شیطان اور شیر شیطان۔ تینوں کے باہمی اشتراک سے ایک مخلوط صورت سامنے آتی ہے اور وہ ہے، گائے شیطان شیر کی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی درج ذیل حدیث سے یہی بات مراد لی گئی ہے۔ حدیث یہ ہے: ﴿يُحْشَرُ بَعْضُ النَّاسِ عَلىٰ صُورَةٍ تَحْسُنُ عِنْدَهَا الْقِرَدَةُ وَالْخَنَازِيرُ﴾[۱]

یاد رہے کہ جس طرح ان تینوں قوتوں کا حد سے بڑھنا انسانیت کیلئے نقصان دہ ہے اور یہ انسان کو کبھی دائرہ انسانیت سے اور کبھی مقام انسانیت سے خارج کر دیتی ہیں، اسی طرح ان کا حد اعتدال سے کم ہونا بھی مقام انسانیت میں خرابی کا باعث بنتا ہے اور اس کا شمار صفات رذیلہ میں ہوتا ہے۔

۱۔ کچھ لوگ ایسی شکلوں میں محشور ہوں گے جن کے مقابلے میں بندر اور سور زیادہ خوبصورت ہوں گے۔ دیکھیے علم الیقین، ج ۲، ص ۹۰۱۔

اگر یہ افراط وتفریط پیدائشی طور پر موجود ہوں اور انسان کا اس میں کوئی عمل دخل نہ ہو تو یہ پیدائشی خرابی ہے اور اس قسم کے طبیعی و پیدائشی نقائص کو قلبی اور جسمانی ریاضتوں اور کوششوں کے ذریعے دور کیا جاسکتا ہے۔ نفس کی تمام پیدائشی صفات قابل تغیر نہ بھی ہوں تو کم از کم الٰہی صفات کم ہی ہیں جو قابل تغیر نہ ہوں۔

خلاصہ یہ کہ عدل وہ درمیانی راستہ ہے جو افراط وتفریط، غلو اور تقصیر سے پاک ہو۔ یہ ایک عظیم انسانی کمال ہے۔ عظیم فلسفی ارسطو سے منقول ہے کہ: عدل کمال کا ایک حصہ نہیں، بلکہ یہ تمام کمالات کا مجموعہ ہے۔ اسی طرح جور (ظلم) جو عدل کی ضد ہے۔ پستی ورذالت کا ایک حصہ نہیں، بلکہ تمام صفات رذیلہ کا مجموعہ ہے۔[۱]

دوسری فصل

علم اخلاق کی کتابوں میں عدل اور ظلم کا بیان

علم اخلاق کے ماہرین تمام اخلاقی خوبیوں کو چار خوبیوں میں منحصر سمجھتے ہیں جو یہ ہیں:

حکمت، شجاعت، عفت اور عدالت (عدل)[۲] اس کی وجہ یہ ہے کہ نفس دو قوتوں کا حامل ہے۔ ان میں سے ایک قوت ادراک ہے اور دوسری قوت تحریک۔ ان میں سے ہر ایک کو مزید دو شعبوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

قوت ادراک عقل نظری اور عقل عملی میں تقسیم ہوتی ہے جبکہ قوت تحریک قوت دافعہ (جو قوت غضبیہ کی ایک صورت ہے) اور قوت جاذبہ (جو شہوت ہے) میں تقسیم ہوتی ہے۔ ان چار قوتوں کو حد اعتدال پر رکھنا اور انہیں افراط وتفریط سے بچانا ایک خوبی ہے۔

پس حکمت عبارت ہے: عقلی، فکری اور نظری قوت کو حد اعتدال پر رکھنے اور اس کی اصلاح سے۔ اور عدل عبارت ہے: عملی قوت کو حد اعتدال پر رکھنے اور اس کی اصلاح سے۔ نیز شجاعت نام ہے قوت غضبیہ کو معتدل رکھنے اور اس کی اصلاح کا اور عفت سے مراد ہے: شہوانی قوت کی تعدیل واصلاح۔

۱۔ دیکھئے خواجہ نصیر الدین طوسیؒ کی کتاب اخلاق ناصری، ص ۱۳۶۔

۲۔ اخلاق ناصری، ص ۱۰۹؛ نیز ملا مہدی نراقی کی جامع السعادات، ج ۱، ص ۸۴۔

یاد رہے کہ عدل کا ایک اور مفہوم بھی ہے اور وہ ہے تمام باطنی، ظاہری، روحانی اور نفسانی قوتوں کو اعتدال پر رکھنا۔ اس مفہوم کی رو سے ارسطو نے کہا تھا کہ: عدل تمام کمالات کا مجموعہ ہے جزء نہیں۔

اس لحاظ سے جور (ظلم) کے بھی دو مفہوم ہوں گے۔ ایک مفہوم وہ ہے جو عدل کے محدود مفہوم کے مقابلے میں ہے اور دوسرا مفہوم وہ ہے جو عدل کے وسیع تر مفہوم کے مقابلے میں ہے۔ یہ وہی مفہوم ہے جو مذکورہ فلسفی (ارسطو) کے بقول تمام صفات رذیلہ کا مجموعہ ہے۔

یاد رہے کہ چونکہ عدل افراط وتفریط سے پاک درمیانی راستہ ہے لہذا اگر ہم مقام عبودیت سے لے کر مقام قرب ربوبیت تک کی ایک حسی مثال دیں تو یہ دونوں ایک خط مستقیم کے ذریعے باہم جاملیں گے۔ پس عبودیت کے ناقص مقام سے ربوبیت کے عظیم مقام کی طرف انسان کامل کے سفر کا راستہ ''عدل'' ہے جو خط مستقیم اور اعتدال کا راستہ ہے۔ قرآن وسنّت میں اس بات کی طرف بہت سے مقامات پر اشارہ ہوا ہے۔ چنانچہ ہم نماز میں جس صراط مستقیم کی دعا کرتے ہیں وہ اسی عادلانہ سفر کا نام ہے۔

احادیث شریف میں ہے کہ ''صراط'' بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے۔[1] اس کی وجہ یہ ہے کہ حد اعتدال وسط حقیقی سے عبارت ہے۔ بنابریں عالم ظہور میں موجودات وحقائق اسی طرح سے وجود پذیر ہوتے ہیں۔

رسول اللہ سے منقول ہے کہ ایک دفعہ آپ ؐ نے ایک سیدھی لکیر کھینچی اور اس کے اردگرد (منحنی) لکیریں کھینچیں۔ اس کے بعد فرمایا: میرا راستہ یہ درمیانی لکیر ہے۔[2]

۱۔ جیسا کہ امام صادقؑ نے صراط کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا: ﴿هُوَ أَدَقُّ مِنَ الشَّعْرِ، وَأَحَدُّ مِنَ السَّيف﴾۔ تفسیر نور الثقلین، ج ۱، ص ۲۱، حدیث ۹۳؛ نیز بحار الانوار، ج ۸، ص ۶۴، کتاب العدل والمعاد، باب ۲۲، حدیث ۱۔

۲۔ بزرگ صحابی جابر بن عبداللہ انصاریؒ کہتے ہیں:

﴿كُنَّا جُلُوساً عِندَ النَّبِيِّ ﷺ، فَخَطَّ خَطّاً هٰكَذا أَمامَه، فقالَ: هٰذِهِ سَبِيلُ اللهِ، وَخَطَّيْنِ عَنْ يَمِينِهِ وَخَطَّيْنِ عَنْ شِمالِهِ، وَقالَ: هٰذا سَبِيلُ الشَّيْطانِ، ثُمَّ وَضَعَ يَدَهُ عَلَى الخَطِّ الأَوْسَطِ وَتَلا: وَإِنَّ هٰذا صِراطِي مُسْتَقِيماً فَاتَّبِعُوه﴾۔

ترجمہ: ہم رسول کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، آپ ؐ نے اپنے سامنے اس طرح ایک لکیر کھینچی پھر فرمایا: یہ اللہ کا راستہ ہے۔ پھر اس کی دائیں جانب اور بائیں جانب دو دو لکیریں کھینچیں، پھر فرمایا: یہ شیطان کے راستے ہیں۔ اس کے بعد آپ ؐ -->

یادر ہے کہ حقیقی اعتدال کا راستہ سوائے انسان کامل کے (جو ابتدائے سفر سے لے کر منزل مقصود تک ہر قسم کے انحراف اور ہر طرح کی کجی سے محفوظ رہے) کسی اور کیلئے حاصل نہیں ہوسکتا۔

حقیقی اعتدال کا یہ راستہ راہ محمدی ؐ اور طریق احمدی ؐ ہے۔ تمام دوسرے لوگ حضور ؐ کے اتباع میں ہی راہ اعتدال پر چل سکتے ہیں اور راہ احمدی ؐ سے مستغنی و بے نیاز ہو کر نہیں چل سکتے، کیونکہ دو نقطوں کے درمیان سیدھا اور اصلی راستہ صرف ایک ہی ہوتا ہے۔ بنابریں حقیقی فضل وکمال کا اور حقیقی عدل واعتدال کا راستہ ایک سے زیادہ نہیں ہوسکتا۔ اس کے برخلاف رذالت وپستی کی بے شمار اقسام ہیں جن کے آٹھ بنیادی سرچشمے بیان ہوئے ہیں، کیونکہ ان چار کمالات میں سے ہر ایک کے دو دو رخ ہیں۔ ایک افراط کا اور دوسرا تفریط کا۔ اس لئے صفات رذیلہ کے آٹھ سرچشمے ہیں۔

علم اخلاق کی کتابوں میں ان آٹھ سرچشموں اوران کی اقسام پر بحث کی گئی ہے۔[۱] ان اقسام کے اعداد وشمار کا حساب کرنے میں وقت صرف کرنا منزل انسانیت کی طرف ہمارے سفر اور حصول کمال کی راہ میں کسی قسم کی مدد نہیں کرسکتا۔

تیسری فصل

عدل سے آراستہ ہونے کا طریقہ

جان لو کہ کمال انسانی کے منزل مقصود تک رسائی اور اس کمال کی طرف ہمارا سفر اس بات پر موقوف ہے کہ نفسانی قوتوں میں اعتدال برقرار رکھا جائے، بلکہ ایک لحاظ سے یہی کمال انسانی ہے۔ یہ ایک نہایت اہم امر ہے، جس سے غفلت عظیم خسارے، نیز ناقابل تلافی نقصان اور ناکامی کا باعث ہے۔

انسان جب تک اس عالم طبیعیات میں موجود ہے اپنی سرکش نفسانی قوتوں میں اعتدال قائم کرسکتا ہے

<-- نے اپنا ہاتھ درمیانی لکیر پر رکھا اور یہ آیت تلاوت کی: ''بہ تحقیق یہ میرا سیدھا راستہ ہے تم لوگ اس پر چلو''۔
اسی طرح کی ایک حدیث ابن مسعود نے بھی رسول اکرم ؐ سے نقل کی ہے۔
(دیکھئے تفسیر الدر المنثور (سیوطی)، ج ۳ ص ۵۶ تفسیر آیت ۱۵۳)۔

۱۔ تہذیب الاخلاق، ابن مسکویہ، ص ۳۸۔۳۹؛ نیز اخلاق ناصری، ص ۱۱۲ تا ۱۲۲؛ جامع السعادات، ج ۱، ص ۹۴، اور ص ۹۹ تا ۱۰۸۔

اور اپنے سرکش نفس کو عقل و شرع کا تابع فرمان بنا سکتا ہے۔ یہ کام ابتدائے جوانی میں بہت آسان ہوتا ہے، کیونکہ ابھی فطرت کا نور مغلوب نہیں ہو چکا ہوتا، روح کی پاکیزگی باقی ہوتی ہے، نیز اخلاق فاسدہ و صفات رذیلہ کی بنیادیں نفس کے اندر راسخ نہیں ہو چکی ہوتیں۔

ابتدا میں بچوں کی روح سادہ کاغذ کی طرح صاف ہوتی ہے اور وہ ہر نقش کو آسانی سے قبول کر لیتی ہے۔ پھر جب اس پر کوئی چیز نقش ہو جاتی ہے تو اسے آسانی سے مٹایا نہیں جا سکتا۔ چنانچہ ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ بچے جو معلومات اور عادات بچپنے میں سیکھ جاتے ہیں وہ بڑھاپے کی انتہا تک برقرار رہتی ہیں۔ ایام طفولیت میں حاصل ہونے والی معلومات پر نسیان کا حملہ بہت کم واقع ہوتا ہے۔ بنا بریں بچوں کی تعلیم و تربیت والدین کی نہایت اہم ذمہ داری ہے۔ اگر اس ذمہ داری کے معاملے میں سستی اور سہل انگاری سے کام لیا جائے تو بے چارے بچے اخلاق رذیلہ کا شکار ہو جاتے ہیں اور یہ امر اس کی ناکامی اور بدبختی کا موجب بنتا ہے۔

یاد رہے کہ ایک بچے کی تربیت کو ایک کام شمار نہیں کرنا چاہئے۔ اسی طرح ایک بچے کی غلط تربیت یا اس سے غفلت کو ایک غلطی شمار نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ عین ممکن ہے کہ ایک بچے کی تربیت کے نتیجے میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد، بلکہ ایک ملت یا پورے ملک کی اصلاح ہو۔ اس کے برعکس ایک بچے کی خرابی ایک ملک یا ایک ملت کی تباہی و خرابی پر اختتام پذیر ہو۔

ہم دیکھتے ہیں کہ عظیم مسلمان فلسفی نصیر الملۃ والدین، خواجہ نصیر الدین طوسی (رضوان اللہ علیہ) اور علامہ حلّی (قدس سرّہ)۱ جیسے ایک فرد کے نور نے کس طرح ایک ملک کو روشن کر دیا۔ یہ روشنی ابد تک باقی رہے گی۔ اسی طرح ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ یزید بن معاویہ بن ابی سفیان۲ اور اس جیسے ظالم حکمرانوں کی

۱۔ یوسف بن علی بن مطہر، جن کی کنیہ ہے ''ابو منصور'' اور ''ابن مطہر'' نیز ان کے القاب ''آیۃ اللہ، جمال الدین اور فاضل'' ہیں۔ وہ علامہ حلّی کے نام سے معروف ہیں۔ وہ شیعوں کے بہت بڑے عالم ربانی اور فقیہ ہیں۔ وہ تمام علمی، عقلی اور نقلی میدانوں میں شہرہ آفاق اور زہد و تقویٰ میں بے نظیر تھے۔ فقہ و اصول اور علم کلام میں ان کی تالیفات بہت ہیں یہاں تک کہ ان کے علمی آثار کی تعداد ایک سو بیس تک بتائی گئی ہے۔ علامہ حلّی ۲۹ رمضان ۶۴۸ ھ کو پیدا ہوئے اور ۱۱یا۱۲ محرم ۷۲۶ ہجری کو دار بقا کی طرف کوچ کر گئے۔ (ریحانۃ الادب، خیابانی تبریزی، ج ۲، ص ۱۷۸)۔

۲۔ اس کے حالات اور اس کے مظالم کے مطالعے کیلئے دیکھئے علامہ امینی ؒ کی کتاب الغدیر، ج ۱۰۔

ظلمت وشقاوت ہزاروں سالوں تک دنیا کی ملتوں اور حکومتوں کے درمیان ناکامی اور خسارے کا بیج بوگئی۔

چونکہ بچے ہمیشہ یا اکثر اپنے والدین کے ساتھ رہتے ہیں اس لئے انہیں عملی تربیت کا اہتمام کرنا چاہئے ،یعنی اگر بالفرض والدین اخلاق حسنہ اور اعمال صالح سے آراستہ نہ بھی ہوں پھر بھی انہیں چاہئے کہ بچوں کے سامنے اپنے آپ کو باکردار ظاہر کریں اور نیکی کا مظاہرہ کریں تاکہ وہ عملی طور پر تربیت دینے والے بن جائیں۔شاید یہ کام خود والدین کی اصلاح کا بھی موجب بن جائے ، کیونکہ مجاز ، حقیقت کی نہر اور تصنع حقیقی اخلاق کی پگڈنڈی ہے۔

اسی طرح والدین کی عملی بے راہروی اور خرابی ہر چیز سے زیادہ بچے پر منفی اثرات چھوڑتی ہے۔ممکن ہے کہ برے والدین کے زیر سایہ غلط تربیت پانے والا بچہ تربیت دینے والوں کی جدوجہد کے باوجود آخری دم تک اصلاح سے ہمکنار نہ ہوسکے۔

والدین کی اچھی تربیت اور ان کا اچھا کردار ایک ایسی غیر اختیاری توفیق اور خوش قسمتی ہے جو بہت کم بچے کو نصیب ہوتی ہے۔اسی طرح والدین کی خرابی اور غلط تربیت بھی خواہ ناخواہ بچے کی بدبختی وناکامی کا باعث بنتی ہیں۔علاوہ ازیں اس مرحلے سے پہلے بھی چند ایسے مراحل ہیں جن میں مستقبل کے انسان کی خوشبختی و بدبختی اور کامیابی وناکامی کا بیج بویا جاتا ہے۔ان عوامل میں سے ایک اچھی ، نیک اور خوش اخلاق بیوی کا انتخاب ہے۔اسی طرح حمل سے پہلے، حمل کے دوران اور رضاعت وغیرہ کے دوران مناسب، پاکیزہ اور حلال رزق کا استعمال بھی انہی عوامل میں شامل ہے۔ان امور کی تفصیلات بیان کرنے کیلئے ایک الگ کتاب درکار ہے۔امید ہے کہ اللہ کی مدد سے مجھے یہ توفیق حاصل ہوگی کہ اس بارے میں الگ اور تفصیلی بحث کروں۔انشاءاللہ تعالیٰ۔

اس مرحلے کے بعد بیرونی تربیت کا مرحلہ آتا ہے،یعنی ماں باپ سے ہٹ کر گھر سے باہر کی تربیت، مثلاً اساتذہ وغیرہ کی تربیت۔ابتداء میں اس مرحلے کی نگرانی بھی والد ہی کرتا ہے اور اس مرحلے کی درستی وخرابی کا ذمہ دار بھی والد ہوتا ہے۔ دیندار، خوش عقیدہ اور خوش اخلاق استاد، نیز دینی و اخلاقی لحاظ سے مناسب اسکول کا انتخاب بچے کی ابتدائی تربیت میں مکمل طور پر مؤثر اور اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اکثر اوقات بچے کی کامیابی وناکامی کا بیج اسی مرحلے میں ڈالا جاتا ہے۔اساتید و معلمین کی تربیت بچے کیلئے یا تو شفا ثابت ہوتا ہے یا زہر ہلاہل جس کا ذمہ دار باپ ہوتا ہے۔

اس مرحلے سے گزرنے کے بعد آہستہ آہستہ رشد و بلوغ، فکری، آزادی اور جوانی کے دن قریب آتے ہیں۔اس مرحلے میں پہنچنے کے بعد انسان اپنی کامیابی وسعادت یا ناکامی وبدبختی کا ذمہ دار خود ہی ہوتا ہے۔ ہر قدم جو نونہالی اور جوانی کے زیادہ قریب ہو وہ حصول تربیت کیلئے زیادہ سہل ہوتا ہے اور اس کی بنیادیں زیادہ مضبوط ہوتی ہیں، کیونکہ انسان کی روح کا آئینہ اس دوران مختلف نقوش سے نسبتاً زیادہ خالی اور سادگی کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔اگر انسان اس مرحلے تک بری عادات اور اخلاق رذیلہ میں گرفتار ہو تو ان کی بنیادیں اتنی مستحکم نہیں ہوتیں۔ معمولی توجہ اور مشق کے ذریعے ان بری صفات کا صفایا کیا جاسکتا ہے، کیونکہ ایک ننھا پودا جس کی جڑیں ابھی زیادہ نہ پھیل چکی ہوں معمولی محنت سے اکھاڑا جاسکتا ہے۔لیکن اگر کچھ عرصے تک سہل انگاری سے کام لیا جائے اور ان اخلاقی مفاسد کا قلع قمع نہ کیا جائے تو خرابیوں کا درخت مضبوط اور پرانا ہو جائے گا، نیز اس کی جڑیں دل کے اندر مستحکم ہو جائیں گی۔اس صورت میں طویل عرصے تک مسلسل ریاضتوں کے باوجود بھی نفس کو ان خرابیوں سے پاک کرنے میں زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہوگی۔ پھر شاید عمر اور وقت بھی انسان کو اصلاح نفس کی فرصت نہ دے اور انسان اس درخت کی طرح ہو جائے جس کی جڑیں زمین کے اندر مستحکم ہو چکی ہوں اور انتھک محنت اور کافی زحمت ومشقت کے باوجود انہیں اکھاڑنا ممکن نہ ہو۔بقول سعدیؒ:

درختی کہ اکنون گرفت است پای | بہ نیروی شخصی بر آید زجای
ورش ہمچنان روزگاری ہلی | بہ گردونش از بیخ برنگسلی [1]

عین ممکن ہے کہ بخل یا حسد جیسی ایک بری خصلت جو کسی نوجوان کے اندر موجود ہو کہ تھوڑی توجہ اور کوشش سے درست، بلکہ اسے اچھی خصلت میں تبدیل کیا جاسکے،لیکن اگر کچھ مدت تک غفلت اور سستی سے کام لیا جائے تو اس کے ازالے کیلئے سخت ریاضت اور طویل جدوجہد کی ضرورت پیش آتی ہے۔ پھر اس بات کا بھی امکان ہے کہ اصلاح کی کوشش کرنے والے کو گردش روزگار یا اجل اصلاح کا موقع نہ دے،اور وہ اپنی اخلاقی تاریکیوں اور معنوی غلاظتوں (جو قبر، برزخ اور قیامت میں عذاب اور ظلمت کا سرچشمہ ہیں) کے ساتھ دوسرے عالم کو سدھار جائے۔

۱۔ گلستان سعدی شیرازیؒ ص ۷۱، باب اول، بادشاہوں کی سیرت۔

پس جوانوں پر لازم اور ضروری ہے کہ جب تک جوانی، باطنی پاکیزگی اور اصلی فطرت اپنی اصلی حالت پر باقی ہیں فرصت کو غنیمت شمار کرتے ہوئے تزکیہ و اصلاح نفس کیلئے کمر ہمّت باندھ لیں اور اپنے دلوں سے اخلاق فاسدہ اور اوصاف ظلمانیہ کی جڑوں کو اکھاڑ پھینکیں، کیونکہ کسی ایک اخلاقی برائی کی موجودگی میں بھی انسان کا مستقبل عظیم خطرات کی زد میں رہے گا۔ جوانی کے ایام میں انسان کی قوت فیصلہ مضبوط ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے بھی اصلاح کی گنجائش زیادہ اور آسان تر ہے، لیکن بڑھاپے میں انسان کا ارادہ بھی بوڑھا اور کمزور ہو جاتا ہے، لہذا نفسانی قوتوں پر کنٹرول پہلے سے زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔ البتہ بوڑھوں کو بھی تزکیہ و اصلاح نفس سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہئے اور مایوس نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ جب تک انسان اس دنیا میں (جو تغیر و تبدل اور امکان کی دنیا ہے) موجود ہے کسی نہ کسی طرح اپنی اصلاح کرنے پر قادر ہے اور نفس کی بیماریاں جس قدر صعب العلاج اور سخت ہوں پھر بھی ان کا قلع قمع ہو سکتا ہے۔ کوئی روحانی بیماری ایسی نہیں جس کی اصلاح اس دنیا میں نہ ہو سکے، اگر چہ وہ نفس کے اندر راسخ ہو چکی ہو اور عادت ثانیہ بن چکی ہو۔ البتہ اس بیماری کی شدت کے حساب سے اصلاح کیلئے زیادہ ریاضت و کوشش درکار ہوگی۔ اس سلسلے میں جسمانی و روحانی ریاضت جس قدر مشکل، سخت اور پر مشقت ہو اسی حساب سے اس کی قدر و قیمت زیادہ ہوگی، کیونکہ بہر حال انسان جب تک اس عالم رنگ و بو میں موجود ہے اپنے ارادے کا مالک ہے اور اپنی مرضی سے اللہ کی عبادت و طاعت بجا لا سکتا ہے۔

لیکن اگر خدانخواستہ کوئی انسان صفات رذیلہ اور عادات فاسدہ کے ساتھ دوسری دنیا میں منتقل ہو جائے تو اگر چہ اس کے باطن میں فطرت اور ایمان کا نور باقی ہو لیکن اس کے باوجود اصلاح نفس اور تزکیہ روح کا اختیار اس کے ہاتھوں سے نکل جائے گا، بلکہ مرنے سے پہلے ہی اس کا اختیار سلب ہو جائے گا۔ اب اس کی اصلاح کیلئے دوسرے طریقوں سے کام لیا جائے گا۔ مثال کے طور پر موت کے وقت کی سختیاں، قبض روح کا عذاب، موت کے فرشتوں کو دیکھ کر طاری ہونے والا خوف (کیونکہ یہ فرشتے حقیقی معنوں میں سخت گیر ہیں)، نیز قبر کی تاریکی، سختیاں اور ستم قسم کے عذاب جو ہماری نظروں سے پوشیدہ ہیں۔ چنانچہ حدیث نبوی ؐ ہے کہ: ''قبر یا تو بہشت کے باغوں میں سے ایک بہشت ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا''[۱]

۱۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں: ﴿الْقَبْرُ اِمَّا رَوْضَةٌ مِنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ أَوْ حُفْرَةٌ مِنْ حُفَرِ النِّيرانِ﴾ <--

حضرت امام صادقؑ سے منقول ہے کہ: ''قبر میں کافر کے اوپر ننانوے اژدھے مسلّط کئے جاتے ہیں جن میں سے ایک اژدھا اگر روئے زمین میں پھونک مارے تو زمین سے کوئی پودا نہ اگے''۔[1]

اہل عرفان کہتے ہیں کہ: ''قبر میں انسان پر مسلّط کئے جانے والے موذی حیوانات اخلاق رذیلہ کی اخروی شکل ہیں''۔[2] یہ صفات رذیلہ اس دنیا میں بھی انسان کو تکلیف دیتی ہیں، لیکن چونکہ نفس مادیت کے غلاف میں لپٹا ہوا ہوتا ہے اس لئے مادی نشے کے غلبے کی وجہ سے وہ اپنی روحانیت ومعنویت سے غافل ہے اور اس کے اندر مکمّل روحانی ومعنوی طاقت کا ظہور نہیں ہوا۔ اس لئے وہ اپنے نفس کے باطن میں موجود موذی اشیاء سے غافل ہوتا ہے اور اسے ان کی موجودگی کا احساس نہیں ہوتا۔

جب دنیوی زندگی کا مرحلہ ختم ہوتا ہے اور قبر یا برزخ کی زندگی شروع ہوتی ہے تو ظاہری پردے ہٹ جاتے ہیں اور باطن کا سکرین نمایاں ہوتا ہے۔ یوں نفس کا غیب شہود میں بدل جاتا ہے۔ باطنی ملکات محسوس ومشہود ہو جاتے اور مناسب اشکال میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ تب انسان اپنے آپ کو قسم قسم کی بلاؤں اور موذی اشیاء کے درمیان گھرا ہوا پاتا ہے اور طرح طرح کی تاریکیاں، ظلمتیں اور وحشتناکیاں اسے گھیر لیتی ہیں۔

پھر اگر عالم برزخ اور قبر کی تکالیف، ذلت اور عذاب کے نتیجے میں نفسانی غلاظتوں کا ازالہ ہو جائے اور فطرت کا زنگ اتر جائے تو وہ انسان اخروی فلاح سے ہمکنار ہوگا اور شفاعت کرنے والی ہستیوں کی عنایات کے طفیل اپنے بلند مقام موعود کو پالے گا، لیکن اگر خدانخواستہ صفات رذیلہ اور اخلاق فاسدہ کی جڑیں پوری طرح سے ختم نہ ہوں، نیز نفس کی تاریکیاں مکمّل طور پر برطرف نہ ہوں تو وہ شخص روز قیامت اور پچاس منازل ومواقف[3] کی ہولناکیوں اور سزاؤں کے روبرو ہوگا۔ یہاں اسے مزید سختیوں اور عذابوں سے گزرنا ہوگا تاکہ جہنم کے ہولناک عذاب کی نوبت نہ آئے۔ اگر ان خوفناک مواقف ومراحل میں بھی فطرت

<-- (ملاحظہ ہو بحارالانوار، ج ۶ ص ۲۰۵، کتاب العدل والمعاد، باب ۸)۔

۱۔ حدیث کا متن یوں ہے: ﴿اِنَّهُ يُسَلَّطُ عَلَى الكافِرِ فِي قَبْرِهِ تِسْعَةٌ وَتِسْعُونَ تِنِّيناً... لَوْ أَنَّ تِنِّيناً مِنْها نَفَخَ فِي الأَرْضِ لَمْ تُنْبِتْ زَرْعاً﴾ (دیکھئے بحارالانوار، ج ۶ ص ۲۱۸، کتاب العدل والمعاد، باب ۸، حدیث ۱۳)

۲۔ دیکھئے فیض کاشانیؒ کی علم الیقین، ج ۲ ص ۸۷۶ و ۸۸۳۔ یہ نکتہ بعض احادیث میں بھی موجود ہے۔ دیکھئے بحارالانوار، ج ۶ ص ۲۲۴، کتاب العدل والمعاد، باب ۸، حدیث ۲۵، ۲۶۔

۳۔ بحارالانوار، ج ۷ ص ۱۲۶، کتاب العدل والمعاد، باب ۶، حدیث ۳ و ۵۔

کا نور غالب نہ آئے تواب جہنم کی نوبت آئے گی، جیسا کہ کہا گیا ہے: ﴿آخِرُ الدَّوآءِ اُلْکَيُ﴾ [۱]
یعنی آخری علاج داغنا ہے۔

پس اسے جہنم کے مختلف طبقوں میں قسم قسم کے عذاب میں مبتلا کیا جائے گا یہاں تک کہ اس کی روح اور فطرت کا میل اور زنگ اتر جائیں اور خدا داد فطرت کا خالص سونا نکھر کر سامنے آئے، کیونکہ یہی خالص فطرت ہی عزت والے دائمی خدائی گھر کا سزاوار ہے، ﴿وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غِلٍّ اِخْوَاناً عَلىٰ سُرُرٍ مُتَقَابِلِينَ﴾ [۲] دل کی صفائی کی کیفیت لوگوں کے معنوی واخلاقی کمالات ونقائص میں اختلاف کے تناسب سے مختلف ہوتی ہے۔

۱۔ نہج البلاغہ، ص۵۹، خطبہ ۱۶۸ ۔

۲۔ ہم ان کے دلوں میں موجود کینہ دور کر دیں گے، وہ بھائیوں کی طرح تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔
سورہ حجر ۴۷۔

مقصد / ٦

"رضا اور اس کی ضد "سخط" کا بیان

یہ مقصد چھ فصلوں پر مشتمل ہے:

پہلی فصل

رضا اور سخط سے کیا مراد ہے؟

جان لو کہ "رضا" سے مراد یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے ارادوں، فیصلوں اور اس کی تقسیم سے راضی ہو۔ رضا کا سب سے بلند مرتبہ انسانیت کے بلند ترین، نیز اہل جذبہ وعشق کے برزگترین مقامات میں سے ایک ہے۔ انشاء اللہ اس کا ذکر آیندہ صفحات میں ہوگا۔ اس کا مرتبہ مقام "تسلیم" سے بالا اور مقام "فنا" سے نیچے ہے۔

سالک راہ حق اور نامور عارف انصاری (قدس سرّہ)[۱] اس کی تعریف میں تقریباً یوں فرماتے ہیں کہ: "رضا سے مراد یہ ہے کہ بندہ سچے دل سے اللہ کے ارادوں کا اس طرح سے پابند ہو کہ اپنے ارادوں سے

۱۔ اس سے مراد ابو اسماعیل عبداللہ بن محمد انصاری ہروی ؒ ہیں۔ وہ خواجہ عبداللہ انصاری کے نام سے معروف ہیں۔ وہ ۳۹۶ھ میں پیدا ہوئے اور ۴۸۱ھ میں وفات پا گئے۔ وہ عارف، سالک اور عالم ربانی تھے۔ ان کا سلسلہ نسب معروف صحابی رسولؐ ابوایوب انصاری ؒ تک پہنچتا ہے۔ ہرات میں پیدا ہوئے اور بچپن سے ہی فصیح اللسان اور مضبوط طبیعت کے حامل تھے۔ جوانی کے ایام میں ادبیات اور علوم دینی، نیز عربی اشعار کو یاد کرنے میں معروف تھے۔ تصوّف میں وہ معروف عارف شیخ ابوالحسن خرقانی کے شاگرد اور جانشین تھے۔ ان کی زیادہ عمر ہرات میں ہی گزری اور زندگی کے آخری لمحات تک وہیں علم سکھانے اور ارشاد وہدایت میں مشغول رہے۔ ان کی مشہور کتابوں میں تفسیر قرآن، منازل السائرین، صد میدان، زاد العارفین، مناجات نامہ اور محبت نامہ وغیرہ شامل ہیں۔ (ریحانۃ الادب، ج۲، ص۱۷۰۔ تلخیص وتغییر کے ساتھ)

دستبردار ہو اور کسی بھی کام کے تقدم وتأخر کی خواہش اور طلب نہ کرے، نیز نہ کسی چیز میں اضافے کی خواہش کرے نہ کسی حالت کی تبدیلی کی۔ بالفاظ دیگر بندہ اپنی طرف سے کوئی ارادہ نہ کرے، بلکہ اس کے ارادے اور اس کی خواہشات ارادۂ خداوندی میں فانی ہوں۔ بنابریں یہ مرحلہ خاصان خدا کے ابتدائی مراحل میں سے ایک ہے، لیکن عام لوگوں کیلئے سخت ترین مرحلہ ہے''۔[۱] یہ تھا خواجہ انصاری کے کلام کا ترجمہ معمولی تبدیلی کے ساتھ۔

راقم کی نظر میں یہ تعریف درست نہیں، کیونکہ اگر اللہ کے ارادوں کا پابند ہونے سے مراد بندے کے ارادوں کا فنا ہونا ہے تو یہ مقام فنا کے ابتدائی مراحل میں سے ایک ہے اور مقام ''رضا'' سے مربوط نہیں، لیکن اگر اس سے مراد یہ ہو کہ بندہ اللہ کے ارادوں کے مقابلے میں کوئی ارادہ نہ کرے تو یہ ''مقام تسلیم'' ہے جو ''مقام رضا'' سے نیچے ہے۔

خلاصہ یہ کہ رضا سے مراد ہے اللہ اور اس کے ارادوں، نیز قضا وقدر خداوندی کے آگے بندے کی خوشنودی، اس خوشنودی کا ایک لازمہ ہے بندوں سے خوشنودی۔ یہاں خوشنودی سے مراد عام ہے۔

شیخ الرئیس ''بوعلی سینا''[۲] نے ''مقامات عارفین'' پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنی کتاب ''اشارات''[۳]

۱۔ رجوع ہو ملا عبدالرزاق کاشانیؒ کی کتاب شرح منازل السائرین، ص ۲۰۴ کی طرف۔

۲۔ حجۃ الحق، شرف الملک، الشیخ الرئیس ابوعلی حسین بن عبداللہ بخاری المعروف ''ابن سینا'' ۳۷۳ھ میں متولد ہوئے اور ۴۲۷ھ میں وفات پا گئے۔ وہ عالم اسلام کے عظیم ترین فلسفیوں، حکماء اور طبیبوں میں سے ایک تھے۔ انہوں نے بخارا میں علم حاصل کیا۔ دس سال کی عمر میں قرآن حفظ کرلیا۔ منطق، ریاضی اور علم نجوم ابوعبداللہ ناتلی سے سیکھے۔ پھر طبیعیات، طب اور ما بعد الطبیعیات سیکھنے میں مشغول ہو گئے۔ وہ فارابی کی کتابوں کے مطالعے سے زبردست متأثر ہوئے اور فلسفہ کی طرف خوب رغبت حاصل کی۔ ابن سینا بہت سی تالیفات چھوڑ گئے ہیں جن میں سب سے مشہور ''شفا'' اور ''قانون'' ہیں۔ ''شفا'' عقلی علوم کا انسائیکلوپیڈیا ہے جبکہ ''قانون'' طب کی کتاب ہے۔ مشہور یہی ہے کہ وہ ہمدان میں مدفون ہیں۔
(دیکھئے ریحانۃ الادب، ج ۷، ص ۵۸۲؛ نیز الذریعہ، ج ۲، ص ۹۶)۔

۳۔ ''الاشارات والتنبیہات''، علم فلسفہ پر لکھی گئی شیخ الرئیس بوعلی سینا کی بہترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ یہ دو حصوں پر مشتمل ہے، یعنی منطق اور فلسفہ پر۔ منطق والا حصہ دس ابواب پر اور فلسفہ والا حصہ بھی دس ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کے آخری دو باب علم عرفان سے مربوط ہیں۔ یہ فلسفی کتاب عبارتوں کی سلاست اور دلائل کی مضبوطی کے باعث بعد -->

میں جو کچھ کہا ہے شاید اس سے مراد بھی یہی ہو، چنانچہ شہرۂ آفاق محقق خواجہ نصیر الدین طوسی (قدس سرّہ) نے شیخ الرئیس کی عبارت سے ''مقام رضا'' کے اسی لازمے کو مراد لیا ہے اور فرمایا ہے:

﴿العارفُ هشّ بشّ بسّام يُبجِّلُ الصغيرَ مِن تو ضُعِه كما يُبجِّلُ الكبيرَ، ويَنبَسِطُ مِن الخَاملِ مثلَ ما يَنبسطُ مِن النبيه. و كيفَ لا يهشُّ و هو فَرحَان بالحقِّ و بكلِّ شيء؟! فإنّه يرىٰ فيه الحقَّ. و كيفَ لا يستوي والجميعُ عنده سواسيّة؟! أهلُ الرحمة قد شغلوا بالباطل﴾[1] انتهىٰ

محقق طوسیؒ فرماتے ہیں:

یہ دونوں صفات، یعنی سب کے ساتھ خوش ہونا اور سب کو ایک نظر سے دیکھنا ایک ہی صفت کے دو اثرات ہیں وہ صفت رضا ہے۔[2]

شیخ کے کلام کا ایک مفہوم اور بھی ہے جو ''مقام رضا'' سے بھی بالاتر مقام کی طرف اشارہ ہے، یعنی توحید ذاتی یا توحید فعلی کا مقام۔ ان مقامات پر نقد و تحقیق کی کتاب ہذا میں گنجائش نہیں۔ اس بحث کو چھیڑنا بقول سعدیؒ: ''باز دارد پیادہ راز سبیل''[3] کے مترادف ہوگا۔

<-- والے فلاسفہ کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ بہت سے لوگوں نے اس کی شرحیں لکھی ہیں یا اس پر حاشیے لکھے ہیں۔ ان میں سب سے مشہور اور تحقیقی مطالب سے لبریز شرح شہرۂ آفاق محقق خواجہ نصیر الدین طوسیؒ کی شرح ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے فخر الدین رازی کے ان اعتراضات کا جواب دیا ہے جو ''الاشارات'' پر کئے گئے ہیں۔ انہوں نے اپنی اس شرح کا نام ''حل مشکلات الاشارات'' رکھا ہے۔

۱۔ عارف ہشاش بشاش اور متبسم ہوتا ہے۔ وہ بڑوں کی طرح چھوٹوں سے بھی تواضع اور احترام سے پیش آتا ہے۔ وہ گمنام اور مشہور دونوں افراد کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آتا ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو جبکہ وہ حق اور ہر چیز سے خوش ہے وہ اس میں حق کا مشاہدہ کرتا ہے؟ اس کا رویہ یکساں کیوں نہ ہو جبکہ سب اس کی نظر میں یکساں ہیں؟ یہ اہل رحمت ہیں جو باطل کے ساتھ مشغول ہو گئے ہیں۔ (شرح الاشارات والتنبیہات (طوسیؒ)، ج۳، ص۳۹۱)۔

۲۔ شرح الاشارات والتنبیہات، ج۳، ص۳۹۱۔

۳۔ پورا شعر، دیباچہ گلستان سعدی شیرازیؒ ص۵ پر یوں ہے:

خواب نوشین بامداد رحیل   باز دارد پیادہ راز سبیل

دوسری فصل

''رضا '' کا تعلق عقل کے لشکروں سے ہے اور یہ فطرت مخمورہ کا لازمہ ہے

نیز

''سخط '' کا تعلق جہل کے لشکروں سے ہے اور یہ فطرت محجوبہ کا لازمہ ہے

قبل ازیں یہ بات عیاں ہو چکی کہ انسان فطری طور پر حق، یعنی کمال مطلق کا دلدادہ ہوتا ہے، اگر چہ وہ نورفطرت پر پڑنے والے حجابات کے باعث اس کا ادراک نہ کرے۔ پس جس شخص کی فطرت پردوں اور آلائشات سے پاک وصاف ہو وہ اللہ تعالیٰ ہی کو کمال مطلق سمجھے گا اور کمال مطلق کی مقدس ذات کی معرفت حضوری کا حامل ہوگا۔ ایسا شخص اللہ کے تمام آثار کو بھی کامل ہی دیکھے گا اور تمام موجودات میں اللہ کے جمال وکمال کو ظاہر وعیاں دیکھے گا۔ وہ جس طرح اللہ کی مقدس ذات کو کامل مطلق دیکھتا ہے اسی طرح اس کی صفات جمالی وجلالی کو بھی کامل دیکھتا ہے، نیز اللہ کے افعال کو بھی جمیل وکامل پاتا ہے۔ وہ مشاہدۂ عینی اور علم حضوری کے ذریعے درک کرتا ہے کہ ''جمیل مطلق کا ہر کام بھی مطلق جمیل'' ہوتا ہے۔

وہ جس طرح اللہ کا عاشق اور اس سے راضی ہوتا ہے اسی طرح پورے نظام کائنات کا بھی عاشق اور اس سے راضی ہوتا ہے، کیونکہ یہ کمال مطلق کا لازمہ ہے۔ پس وہ تمام وجودی انوار سے ان کی نورانیت اور ذاتی کمال کے تناسب سے راضی وخوشنود ہوتا ہے۔ چنانچہ اس مقام کے حامل انسان نے کہا ہے:

به جهان خرّم از آنم كه جهان خرّم از وست　　عاشقم بر همه عالم كه همه عالم از وست [1]

اس ذاتی عشق اور فطری خوشنودی کا لازمہ کمال کی ضد (یعنی نقائص وعیوب اور ظلمت وعدم) کی ناپسندیدگی ہے۔

پس ایسا بندہ اللہ کے ہر فعل اور اس کے بارے میں اللہ کے ہر فیصلے سے راضی وخوشنود رہے گا، نیز وہ غیر اللہ اور غیر اللہ سے مربوط ہر چیز کو ناپسندیدگی اور نفرت کی نظر سے دیکھے گا۔

اس کے برعکس فطرت محجوبہ کے حامل افراد چونکہ دیگر چیزوں میں کمال کو تلاش کرتے ہیں اس لئے ان کی خوشنودی، دلبستگی اور پسندیدگی انہی چیزوں سے وابستہ ہوتی ہے۔ وہ حق سے اپنی محجوبیت کے تناسب سے اللہ تعالیٰ اور اس کے افعال سے ناراض اور ناخوش رہتا ہے۔ اس کا محبوب یہ دنیا اور نفسانی خواہشات

۱۔ کلیات سعدی شیرازیؒ، ص ۵۶۴، طیبات۔

ہیں اس لئے اگر اس دنیا اور خواہشات کو ٹھیس پہنچے تو اپنی جبلّت اور فطرت ثانیہ کی رو سے ٹھیس پہنچانے والے سے غضبناک، ناراض اور بدگمان ہوگا، اگر چہ زبان پر نہ لائے۔

ہمارے استاد بزرگوار، عارف باللہ جناب شیخ محمد علی شاہ آبادی ؒ ۱ (خدا ان کا سایہ ان کے مریدوں کے سروں پر باقی رکھے) فرماتے تھے: ''دنیا سے زیادہ محبت کرنا اس بات کا موجب بنتا ہے کہ جب موت کے وقت وہ یہ دیکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتے اور موکلین اس کے محبوب (دنیا اور دنیوی خواہشات) کو اس سے چھین رہے ہیں تو وہ فطری طور پر ان سے ناراض اور غضبناک ہوگا۔ یوں وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے مقدس فرشتوں کی عداوت لے کر دنیا چھوڑے گا! کافی شریف کی ایک حدیث میں بھی تقریباً یہی نکتہ مذکور ہے ۲ ہم نے اربعین (چہل حدیث) کی شرح میں اس حدیث کو اٹھائیسویں حدیث قرار دیا ہے اور اس کی تشریح لکھی ہے۔ ۳

خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے افعال سے ناخوش اور ناراض ہونا ابلیس اور جہل کے لشکروں میں داخل ہے اور فطرت محجوبہ کا لازمہ ہے۔ اللہ ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔

﴿آمین یا ربّ العالمین﴾

۱۔ مرزا محمد علی بن محمد جواد اصفہانی شاہ آبادی ۱۲۹۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۶۹ھ ق میں وفات پا گئے۔ وہ چودھویں صدی ہجری کے معروف فقیہ، اصولی، فلسفی اور عارف تھے۔ انہوں نے اصفہان، تہران اور نجف میں تعلیم حاصل کی۔ ان کے اہم ترین اساتذہ یہ ہیں: ان کے بھائی شیخ احمد اور میرزا محمد ہاشم چہارسوقی (اصفہان میں)، میرزا ہاشم اشکوری اور میرزا حسن آشتیانی (تہران میں)، آخوند ملا کاظم خراسانی، شریعت اصفہانی اور مرزا محمد تقی شیرازی (نجف اشرف میں)۔ انہوں نے پہلے سامراء پھر قم اور تہران میں تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔

امام خمینی ؒ ۱۳۴۷ھ ق سے لے کر ۱۳۵۴ھ ق تک قم میں ان کے اخلاقی و عرفانی دروس میں شرکت کرتے اور ان سے کسب فیض کرتے رہے۔ قم سے واپسی کے بعد تہران میں بس گئے اور وہیں لوگوں کی روحانی ہدایت میں مشغول ہو گئے اور وہیں راہی ملک بقا ہوئے۔

وہ حضرت عبد العظیم حسنی ؑ کے جوار میں مدفون ہیں۔ ان کی معروف کتابوں میں ''رشحات البحار'' اور ''شذرات المعارف'' وغیرہ شامل ہیں۔

۲۔ فروع کافی، ج ۳، ص ۱۳۴، کتاب الجنائز، باب مایعاین الکافر والمؤمن، حدیث ۱۲۔

۳۔ شرح چہل حدیث، حدیث نمبر ۲۸۔

تیسری فصل

رضا کے مراتب

یاد رہے کہ ''رضا'' اور دیگر نفسانی کمالات کے متعدد مراتب اور مختلف درجات ہیں۔ یہاں ہم ان میں سے بعض مراتب و درجات کا ذکر کریں گے۔

پہلا درجہ: یہ اللہ کی ربوبیت پر راضی برضا ہونے سے عبارت ہے۔ وہ اس طرح کہ سالک راہ حق اپنے آپ کو اللہ کی ربوبیت و تربیت کے ماتحت قرار دے اور اپنے آپ کو شیطان کے تسلّط سے خارج کرے۔ یوں وہ اللہ تعالیٰ کی اس بندگی سے راضی اور خوشنود ہو۔ ظاہر ہے کہ جب تک شیطان انسان کے اوپر مسلّط ہے وہ اللہ کی ربوبیت اور تربیت کے دائرے سے خارج ہی رہے گا خواہ یہ شیطانی نفوذ اس کے دل میں ہو یا اس کی روح میں یا اس کے بدن میں۔ بہر حال وہ اس صورت میں ﴿رَضِیتُ بِاللهِ رَبّاً﴾[۱] کا عملی ثبوت نہیں دے سکے گا۔

پس ''رضا'' کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ انسان اللہ کی ربوبیت و تربیت کے دائرے میں داخل ہونے کے بعد اللہ کی اس تربیت سے راضی و خوشنود رہے۔ اس کی علامت یہ ہے کہ اطاعت کی مشقت آسانی میں بدل جاتی ہے، وہ احکام خداوندی سے خوش ہوتا ہے اور دل و جان سے انہیں قبول کرتا ہے، شریعت کی ممنوعہ چیزوں سے اسے نفرت ہوتی ہے اور وہ اللہ کی بندگی و اطاعت پر نازاں و شاداں رہتا ہے۔

اگر کوئی شخص اس مرحلے میں تربیت الٰہی کے زیر سایہ رہنا قبول نہ کرے، اپنے آپ کو اللہ کی ربوبیت کے حوالے نہ کرے، اپنے دل اور دیگر اعضاء پر اللہ کا تسلّط قائم نہ کرے اور شیطان کے عمل دخل سے اپنے وجود کو پاک نہ کرے تو اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ وہ قبر اور عالم برزخ میں ﴿اللهُ، جَلَّ جَلالُهُ، رَبِّي﴾ کا اقرار کر سکے۔

اللہ تعالیٰ کے تمام ناموں میں اس نام کو جو خصوصیت دی گئی ہے، شاید اس کی وجہ یہی ہو کہ انسان اپنے آپ کو اپنے تکاملی سفر میں ربّ العالمین کی تربیت کا تابع قرار دے جس طرح تکوینی لحاظ سے وہ اس تربیت کا تابع ہے۔ بنابریں ﴿رَضِیتُ بِالاسْلامِ دِیناً وَبِمُحَمَّدٍ﴿صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم﴾ نَبِیّاً وَرَسُولاً وَبِالقُرآنِ کِتاباً

۱۔ فروع کافی، ج۳، ص۱۹۶، کتاب الجنائز، باب سلّ المیت ومایقال عند دخول القبر، حدیث ۷۔

وَبِعَلِيٍّ أَمِيرِ الْمُؤمِنِينَ وَأَوْلَادِهِ الْمَعْصُومِينَ ﴿علیہم السلام﴾ أَئِمَّة ﴾اکا زبانی اقرار اگر حقیقی نہ ہو تو یہ نفاق اور جھوٹ کی ایک صورت ہوگی۔

جو شخص اسلامی اصولوں اور قوانین کا تابع اور ان سے راضی وخوشنود نہ ہو، نیز اسلامی احکام سے شادان وفرحان نہ ہو (اگرچہ یہ احکام اس کے اور اس کے گھر والوں کیلئے باعث نقصان ہی کیوں نہ ہوں) وہ مذکورہ اقرار اور دعوی کیسے کرسکتا ہے؟

جو شخص (نعوذ باللہ) اسلام کے کسی ایک حکم پر دل ہی دل میں معترض ہو یا اس سے کبیدہ خاطر ہو یا اس بات کا خواہاں ہو کہ اللہ کا کوئی حکم اس طرح نہ ہو جس طرح وہ اب ہے یا وہ یہ کہے کہ کاش اللہ کا فلاں حکم ایسا نہ ہوتا، بلکہ ویسا ہوتا، ایسا انسان درحقیقت اسلام سے راضی نہیں ہے۔ اگر ایسا شخص مذکورہ بالا دعویٰ کرے تو یہ جھوٹا دعویٰ ہوگا۔ یہی حال دوسرے مراحل کا بھی ہے۔ پس نبوت وامامت سے راضی ہونے کا بھی مطلب یہ نہیں کہ ہم راہ نجات کے ان پیشواؤں سے تو راضی وخوشنود رہیں، لیکن انسانیت کی فلاح اور آدمیت کے کمال کیلئے ان کے دکھائے ہوئے راستوں پر عمل پیرا نہ ہوں۔ انبیاء وائمہ سے راضی ہونے کا یہ دعویٰ ہی ایک طرح کا مذاق ہے۔

عزیزو! مقامات عالیہ کا دعویٰ کرنا آسان ہے۔ بسا اوقات انسان کو خود بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ اس دعوے کا اہل بھی ہے یا نہیں!! حقائق سے آشنا ہونے اور مقامات عالیہ حاصل کرنے کیلئے یہ دعوے کافی نہیں خاص کر مقام ''رضا'' حاصل کرنے کیلئے جو سب سے سخت مرحلہ ہے۔

دوسرا درجہ: یہ اللہ کے قضا وقدر پر راضی برضا ہونے سے عبارت ہے۔ یعنی ہر خوشگوار یا ناگوار واقعے پر راضی ہونا اور جو کچھ اللہ نے اسے دیا ہے اس پر خوش ہونا خواہ وہ بلاؤں، بیماریوں اور عزیزوں سے جدائی کی شکل میں ہو یا اس کے برعکس۔ یوں اس کی نظر میں بلائیں اور بیماریاں وغیرہ اور ان کی اضداد یکسان ہوتی ہیں، یعنی وہ دونوں کو اللہ کا تحفہ سمجھتا ہے اور دونوں سے راضی ومطمئن ہوتا ہے، چنانچہ روایت ہے کہ حضرت باقر العلوم ؑ نے بچپن میں جابر بن عبداللہ انصاری ؓ سے سوال فرمایا:

''آپ کا کیا حال ہے؟ جابر نے عرض کیا: صحت کی بہ نسبت بیماری زیادہ عزیز ہے اور مالداری کی بہ

۱۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۳۹۸، کتاب الدعاء، باب ۵۲، حدیث ۶۔

نسبت فقر زیادہ پسند ہے وغیرہ۔ حضرتؑ نے فرمایا: لیکن ہم تو اس چیز کو پسند کرتے ہیں جو اللہ ہمیں عنایت کرے۔ اگر وہ ہمیں بیماری دے تو ہم اسی کو پسند کرتے ہیں اور اگر صحت عطا کرے تو ہم اسی پر راضی ہوتے ہیں''[۱] (یہاں اس حدیث کے مفہوم کو نقل کیا گیا ہے نہ کہ لفظی ترجمے کو)۔

یادرہے کہ اس مقام کا حصول اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہمیں بندے کے حق میں اللہ کی رحمت ومہربانی کی معرفت نہ ہو اور اس بات پر مستحکم عقیدہ وایمان نہ ہو کہ اس دنیا میں اللہ جو کچھ عطا کرتا ہے وہ بندوں کی تربیت، روحانی کمالات کے حصول اور ان کی فطرت سلیم کے تقاضوں کی تکمیل کیلئے کرتا ہے۔ بسا اوقات انسان فقر وتنگدستی کی بناء پر ذاتی کمالات کو حاصل کرتا ہے اور کبھی بیماری اور کمزوری کی بدولت دائمی کامیابیوں سے ہمکنار ہوتا ہے۔ یہ سب اس صورت میں ہیں جب انسان سیر وسلوک کے ابتدائی مراحل سے گزر رہا ہو، لیکن اگر وہ محبت کا مقام حاصل کر چکا ہو اور کاسہ عشق کا ایک گھونٹ بھی نوش جان کر چکا ہو تو اس کے بعد محبوب کی ہر چیز اس کے ہاں محبوب ہوتی ہے۔ سعدیؒ کے بقول:

زهر از قِبَل تو نوش دارو　　　　فحش از دهن تو طیبات است[۲]

اس مقام، یعنی مقام محبت کو ''رضا'' کے تیسرے مرحلے کی ابتداء سمجھنا چاہئے۔ یہ وہ مرتبہ ہے جسے ﴿رِضَىً بِرِضَى اللهِ﴾[۳] کہا جاتا ہے، یعنی اللہ کی پسند کو اپنی پسند قرار دینا۔ اس کی کیفیت یہ ہے کہ بندے کی اپنی کوئی پسند نہ ہو، بلکہ اس کی پسند اللہ کی پسند کی تابع ہو جس طرح اس کا ارادہ بھی ارادہ خداوندی کے تابع ہوتا ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے: ﴿رِضَى اللهِ رِضَانَا أَهْلَ الْبَيْتِ﴾[۴] اگرچہ اس بات کا

۱۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ امام باقرؑ نے جابر بن عبداللہ انصاریؒ سے فرمایا: ﴿كَيْفَ تَجِدُ حَالَكَ؟ قال: أَنَا فِي حَالِ الْفَقْرِ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنَ الْغِنَىٰ، وَالْمَرَضِ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنَ الصِّحَّةِ وَالْمَوتِ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنَ الْحَيَاةِ. فقَالَ الإمام (ع): أَمَّا نَحْنُ. أَهْلَ الْبَيْتِ. فَمَا يَرِدُ عَلَيْنَا مِنَ اللهِ مِنَ الْفَقْرِ وَالْغِنَىٰ وَالْمَرَضِ وَالصِّحَّةِ وَالْمَوتِ وَالْحَيَاةِ فَهُوَ أَحَبُّ إِلَيْنَا﴾۔ (جامع السعادات، ج۳، ص۲۸۵)۔

۲۔ کلیات سعدی (طیبات)، ص۵۵۰، بالتصحیح فروغی؛ نیز اقبال طبع ۸، انتشارات جاویدان، ۱۳۷۱ھ ش۔ مؤلف کے اصلی نسخے میں ''دارواست'' مرقوم ہے۔

۳۔ ملا عبدالرزاق کاشانیؒ کی ''منازل السائرین''، ص۲۰۹۔

۴۔ اللہ کی رضامندی ہی ہم اہل بیت کی رضامندی ہے۔ (بحارالانوار، ج۴۴، ص۳۶۷؛ نیز تاریخ الحسینؑ، باب۳۷، حدیث۲۔

امکان ہے کہ یہاں اس سے بلند تر مقام کی طرف اشارہ ہو جو ''قرب فرائض'' یعنی بقاء بعد الفناء سے عبارت ہے۔

چوتھی فصل

''رضا'' کی بنیادیں

جان لو کہ مقام رضا معارف الٰہیہ کے آثار و نتائج میں سے ایک ہے جس طرح خاصان خدا کے دیگر مقامات۔ بنابریں ''رضا'' کی بعض بنیادوں کی جانب اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ عرض ہے کہ جب بندہ اللہ کے افعال کو نیک اور اچھا سمجھتا ہے تو اس سے ''رضا'' کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ بنابریں ہم یہاں ذات، صفات اور افعال کے لحاظ سے جمال خداوندی کا تذکرہ کریں گے اور اس مقام پر بندے کی معرفت کے مراتب کو بیان کرتے چلیں گے۔

جان لو کہ بندے کو حاصل ہونے والا پہلا مرتبہ ذات، صفات اور افعال کے لحاظ سے ذات برحق کے جمال کا علم (مضبوط علمی، عقلی اور فلسفی بنیادوں پر) حاصل کرنا ہے۔ یہ مرحلہ تمام علوم و معارف کے دروازوں کی چابی ہے۔ اگر کوئی کسی دوسرے راستے سے عرفان کی بلند منزلوں کو چھولے تو جاننا چاہئے کہ ایسا بہت کم ہوتا ہے اور عام طور پر ایسا نہیں ہوتا۔ لیکن اسی مرحلے میں گم ہو کر رہ جانا ایک بڑا حجاب ہے یہاں تک کہ اس کے بارے میں کہا گیا ہے: ﴿العِلْمُ هُوَ الحِجابُ الأكْبَر﴾۔[۱]

دلائل و براہین سے حاصل ہونے والا یہ علم عقل و ذہن سے مربوط ہے۔ اس سے روحانی و نفسانی صفات (جو معارف کے آثار ہیں) حاصل نہیں ہوتیں۔ اسی لئے اکثر بڑے بڑے فلسفی اور حکیم تسلیم و رضا، دیگر روحانی کمالات، اخلاقی صفات اور معارف الٰہیہ سے تہی دامن ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ہمیشہ کیلئے علمی حجابوں کے اندر سرگرداں رہتے ہیں۔

دوسرا مرتبہ: بندے کو حاصل ہونے والا دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ اللہ کی ذات و صفات اور افعال کے حسن و جمال کا علم اس کے دل میں اتر جائے اور دل جمال حق کا معتقد ہو جائے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ کی

۱۔ یہ مقولہ اہل معرفت کے ہاں مشہور و معروف ہے لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ کس کا قول ہے۔

نعمتوں اور جمال خداوندی کے آثار میں خوب غور وفکر کے ذریعے دل کو رام کیا جائے تاکہ دل رفتہ رفتہ جمال حق کی صفت کو قبول کر لے۔ یہ مقام ایمان ہے۔ جب بندہ اس مقام تک رسائی حاصل کرتا ہے اور اس کا دل اس حقیقت کو تسلیم کر لیتا ہے تو دل کے اندر تسلیم ورضا، حسن ظن اور اطمینان وخوشنودی کا جلوہ ظاہر ہوتا ہے۔ یہ رضا کا پہلا مرحلہ ہے۔ اس سے قبل اس کا کوئی نام ونشان نہیں بھی ہوتا۔ اسی لئے احادیث میں ''رضا'' کو ایمان کے ارکان میں شمار کیا گیا ہے۔ چنانچہ کافی شریف میں مروی ہے کہ امیر المؤمنین علیہ السلام نے فرمایا: ﴿الایمانُ أربعةُ أرکانٍ: الرِّضا بِقضاءِ اللهِ، وَالتَّوکُّلُ عَلَی اللهِ، وَتفویضُ الأمرِ اِلَی اللهِ، وَالتَّسلِیمُ لِأمرِ اللهِ﴾ [1]

تیسرا مرتبہ: یہ ہے کہ بندہ سالک اطمینان کا مرتبہ حاصل کر لے۔ جب جمال حق کے بارے میں دل مطمئن ہو جائے تو ''رضا'' کامل تر ہوتا ہے۔ سورۂ فجر کی یہ آیت شاید اسی مفہوم کی طرف اشارہ ہو:
﴿یٰـا أیَّتُهَا النَّفسُ المُطمَئِنَّةُ ☆ ارجِعِي اِلیٰ رَبِّکِ راضِیَةً مَرضِیَّةً﴾ [2]

اس آیت میں اللہ کی طرف واپسی (جو صاحبان اخلاص کے مقامات کاملہ میں سے ایک ہے) کو ان لوگوں سے مخصوص کیا گیا ہے جو نفس مطمئنہ کے مالک، نیز راضی اور پسندیدہ ہیں۔ یوں آیت نے بے جا اور ناپسندیدہ امیدوں کا خاتمہ کر دیا ہے۔

چوتھا مرتبہ: یہ مشاہدے کا مرحلہ ہے۔ یہ مرتبہ اہل معرفت اور دل والوں کو حاصل ہوگا۔ جو دل کے ایک گوشے کو اس مادی عالم کی تاریکیوں سے ہٹا کر خانہ دل کو غبار اغیار سے پاک کریں اور کثرت کے آثار کو مٹا دیں۔ اس صورت میں اللہ ان کے قلوب کی مناسبت سے ان میں اپنا جلوہ دکھائے گا اور ان کے دلوں کو اپنی ذات پاک سے راضی بنا دے گا اور دوسروں سے ان کی توجہ ہٹا دے گا۔

مرتبہ چہارم کے تین بنیادی درجے ہیں:

پہلا درجہ: یہ افعال کی تجلی کے مشاہدے سے عبارت ہے۔ اس درجے میں قضائے خداوندی سے

۱۔ امیر المؤمنینؑ نے فرمایا کہ: ایمان کے چار ارکان ہیں: اللہ کے فیصلوں پر راضی برضا رہنا، اللہ پر توکل کرنا، کاموں کو اللہ کے سپرد کرنا اور حکم خداوندی کے آگے سر تسلیم خم کرنا۔ (اصول کافی، ج ۲، ص ۴۷، کتاب الایمان والکفر، باب ۲۹، ح ۵)۔

۲۔ اے مطمئن روح خوشی اور پسندیدگی کے ساتھ اپنے ربّ کی طرف لوٹ جا۔ سورۂ فجر ۲۷۔۲۸۔

خوشنودی ورضا کا بطور کامل حصول ہوگا۔

دوسرا درجہ: یہ صفات واسماء کی تجلی کے مشاہدے پر مشتمل ہے۔

تیسرا درجہ: یہ ذات کی تجلی کے مشاہدے سے عبارت ہے۔ یہ دو درجے اسم ''رضا'' وغیرہ سے زیادہ اعلیٰ وارفع ہیں اگرچہ روح ''رضا'' جو جذبۂ محبت سے عبارت ہے اس درجے میں بھی بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے۔ احادیث شریفہ میں ''کمال رضا'' کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ امام صادقؑ سے مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: ﴿إِنَّ أَعْلَمَ النَّاسِ بِاللهِ أَرْضَاهُمْ بِقَضَاءِ اللهِ عَزَّوَجَلَّ﴾[۱]

پانچویں فصل

مؤمنین کی آزمائش

جس طرح ''رضا'' کا تعلّق عقل اور رحمان کے لشکروں سے ہے اور یہ فطرت مخمورہ کا لازمہ ہے اسی طرح ''سخط'' کا تعلّق جہل اور ابلیس کے لشکروں سے ہے اور یہ فطرت محجوبہ کا لازمہ ہے۔ یہ مقام ربوبیت کی معرفت میں کمی اور اللہ تعالیٰ کے عظیم مرتبے سے ناآگاہی کا نتیجہ ہے، نیز یہ حبّ نفس اور حبّ دنیا کا منحوس ثمر ہے جو انسان کی سماعت وبصارت کو خواہشات نفسانی اور دنیوی آرزوؤں کے علاوہ دیگر امور کے ادراک سے محروم کردیتا ہے۔ یہ روحانی مدارج، اہل معرفت کے درجات اور اہل قلوب کے مقامات سے محجوبیت کے باعث نفوس کی اصلاح اور دلوں کی تربیت کرنے والی بلاؤں اور آزمائشوں سے روگرداں رہتا ہے جبکہ حصول دنیا سے راضی وخوشنود ہوتا ہے جبکہ دنیا بدترین امتحان اور آزمائش ہے۔

یہاں ہم اس سلسلے میں بعض احادیث کا ذکر کریں گے۔ شاید صاحبان وحی وتنزیل کے فرامین کی برکت سے دلوں کی سختی میں نرمی پیدا ہوجائے اور غافل نفوس کو کچھ بیداری نصیب ہو۔ اگرچہ ہم نے اپنی کتاب اربعین (چہل حدیث) میں مؤمنین کی آزمائش کی بحث میں طویل شرح لکھی ہے اور آزمائش کا فلسفہ بیان کیا ہے، لیکن مزید استفادہ اور حوالے کی زحمت سے اجتناب کی خاطر چند ایک کا تذکرہ کرتے ہیں۔

۱۔ لوگوں میں اللہ کی سب سے زیادہ پہچان رکھنے والے وہ ہیں جو خدائے عزوجل کے فیصلوں پر سب سے زیادہ راضی ہوتے ہیں۔ (اصول کافی، ج ۲، ص ۴۹، کتاب الایمان والکفر، باب الرضا بالقضاء، حدیث ۲)۔

اصول کافی میں علامہ مجلسیؒ نے اپنی اسناد کے ذریعے امام صادقؑ سے روایت کی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: ﴿اِنَّ أَشَدَّ النّٰاسِ بَلاءً الأنْبِیاءُ، ثُمَّ الَّذِینَ یَلُونَهُمْ، ثُمَّ الأمْثَلُ فَالأمْثَل﴾ ۱

نیز امام صادقؑ سے ہی مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: ﴿اِنَّ عَظِیمَ الأجْرِ لَمَعَ عَظِیمِ البَلاءِ وَمٰا أَحَبَّ اللّٰهُ قَوماً اِلّٰا ابْتَلاهُمْ﴾ ۲

آپؑ ہی سے منقول ہے کہ فرمایا: ﴿ اِنَّ لِلّٰهِ . عَزَّوَجَلَّ . عِبٰاداً فِي الأرْضِ مِنْ خٰالِصِ عِبٰادِهِ مٰا یُنْزِلُ مِنَ السَّمٰاءِ تُحْفَةً اِلَی الأرْضِ اِلّٰا صَرَفَهٰا عَنْهُمْ اِلیٰ غَیْرِهِمْ، وَلاٰ بَلِیَّةً اِلّٰا صَرَفَهٰا اِلَیْهِم﴾ ۳

اس سلسلے میں احادیث زیادہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اولیاء ومؤمنین پر اپنے لطف وکرم کے باعث انہیں اس دنیا میں آزمائشوں میں مبتلا کرتا ہے۔۴ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اگر وہ انہیں ناز ونعمت میں مبتلا کرے تو وہ غالباً دنیا کی طرف مائل ہوجائیں گے اور دنیوی لذتوں اور خواہشات کا ان کے دلوں پر اثر پڑے گا جو دنیا سے ان کی محبت اور لگاؤ میں اضافہ کرے گا۔ اس طرح وہ طبعی طور پر اللہ تعالیٰ، آخرت کی باعزّت زندگی، نفس کی معنویت اور نفسانی امراض کے معالجہ سے غافل ہوجائیں گے، نیز روحانی درجات کے حصول میں ناکام ہوجائیں گے۔

خلاصہ یہ کہ اگر کوئی مالداروں کی حالت پر غور کرے تو مشاہدہ کرے گا کہ مال ودولت صحت وسلامتی اور امن وسکون اگر لوگوں کے ہاں جمع ہوجائیں تو بہت کم لوگ اپنے آپ کو خرابیوں اور روحانی بیماریوں سے محفوظ رکھنے اور نفس کی سرکشی کو لگام دینے میں کامیاب رہیں گے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جابر بن عبداللہؓ نے حضرت باقرؑ سے عرض کی: ''میں تونگری کی بہ نسبت فقر کو اور صحت کی بہ نسبت بیماری کو زیادہ دوست رکھتا

۱۔ لوگوں میں سب سے زیادہ سخت آزمائش انبیاء کی ہوتی ہے پھر ان کی جو ان سے نزدیک ہیں، پھر ان کی جو رتبے میں دوسروں سے بالاتر ہیں۔ (اصول کافی، ج۲، ص۱۹۶، کتاب الایمان والکفر، باب شدّۃ ابتلاء المؤمن، ح۱)۔

۲۔ بہ تحقیق بڑا ثواب بڑی آزمائش پر موقوف ہوتا ہے۔ اللہ جس جماعت سے محبت کرتا ہے انہیں امتحان وآزمائش میں مبتلا کرتا ہے۔ (سابقہ مأخذ، حدیث۳)۔

۳۔ بے شک زمین میں اللہ کے کچھ خالص بندے ہیں۔ اللہ آسمان سے جو تحفہ نازل کرتا ہے اس کا رخ ان کی طرف سے موڑ کر دوسروں کی طرف کرتا ہے اور جو بلا وہ نازل کرتا ہے اس کا رخ ان کی طرف کر دیتا ہے۔ (سابقہ مأخذ، حدیث ۵)۔

۴۔ سابقہ مأخذ کے مذکورہ باب کی احادیث۔

ہوں''۔ کیونکہ انہیں اپنے اوپر اطمینان و وثوق حاصل نہ تھا کہ سلامتی اور امن وسکون کی صورت میں وہ اپنی خاطر خواہ حفاظت کرسکیں اور وہ نفس کی سرکشی سے خائف تھے۔ لیکن امام محمد باقرؑ عام انسانوں کی عقل سے ماوراء مقام کے مالک تھے۔ آپؑ نے جابر کی ذہنی گنجائش کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کو سمجھا کر اور تقرب الی اللہ کے سفر میں ان کی دستگیری فرماتے ہوئے مقام ''رضا'' کو بیان فرمایا اور محبت الٰہیہ کی ایک چنگاری دکھادی کہ ''محبوب کی طرف سے ہمیں جو چیز ملتی ہے، ہمیں وہی پسند ہے'' مسلک عشق و محبت میں محبوب کی طرف سے ملنے والی ہر چیز مساوی ہے خواہ وہ بلائیں اور بیماریاں ہوں یا صحت و سلامتی اور آرام و سکون۔

جی ہاں! اولیائے خدا آزمائشوں اور بلاؤں کو تحفہ آسمانی سمجھتے ہیں اور تنگی و سختی کو الطاف خداوندی۔ وہ صرف حق سے راضی رہتے ہیں اور حق کے علاوہ کسی چیز کی خواہش نہیں کرتے۔ ان کی توجہ ذات حق کی طرف ہوتی ہے اور صرف اسی کو دیکھتے ہیں۔ اگر وہ جنت کی خواہش کرتے ہیں تو صرف اس لئے کہ وہ ذات حق سے مربوط ہے۔ وہ نفسانی لذتوں کی خاطر جنت کی خواہش نہیں کرتے۔ یہ لوگ قضا وقدر پر راضی برضا رہتے ہیں، کیونکہ یہ اللہ کا فیصلہ ہے۔ وہ اللہ سے محبت کی بناء پر اس کے اسماء و صفات اور افعال سے بھی محبت کرتے ہیں۔

چھٹی فصل

احادیث کی روشنی میں ''رضا'' کی فضیلت اور ''سخط'' کی مذمت

کافی میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: ﴿رَأسُ طاعَةِ اللهِ الصَّبْرُ والرِّضا عَنِ اللهِ فِيما أحَبَّ العَبْدُ أوْ كَرِهَ، وَلا يَرضىٰ عَبْدٌ عَنِ اللهِ فِيما أحَبَّ أوْ كَرِهَ، إلّا كانَ خَيْراً لَهُ فِيما أحَبَّ أوْ كَرِهَ﴾[1]

۱۔ اطاعت خداوندی کی بنیاد بندے کے ہاں پسندیدہ اور ناپسندیدہ دونوں امور میں اللہ کی خاطر صبر و رضا کا ثبوت دینا ہے۔ بندہ اپنی مرغوب یا نامرغوب چیز میں اللہ سے راضی نہیں ہوتا مگر یہ کہ اس مرغوب یا نامرغوب چیز میں اس کی بھلائی ہوتی ہے۔ (اصول کافی، ج ۲، ص ۴۹، کتاب الایمان والکفر، باب الرضا بالقضا، حدیث ۱)۔

امام صادقؑ ہی سے منقول ہے کہ فرمایا: ﴿اِنَّ أَعْلَمَ النَّاسِ بِاللّٰهِ أَرْضَاهُمْ بِقَضَاءِ اللّٰهِ تَعَالیٰ﴾ ۱

اور آپؑ سے یہ بھی منقول ہے کہ فرمایا: ﴿قَالَ اللّٰهُ تَعَالیٰ: عَبْدِي الْمُؤْمِنَ لاٰ أُصْرِفُهُ فِي شَيْءٍ اِلاّٰ جَعَلْتُهُ خَيْراً لَهُ، فَلْيَرْضَ بِقَضَائِي وَلْيَصْبِرْ عَلیٰ بَلاٰئِي وَلْيَشْكُرْ نَعْمَائِي أَكْتُبُهُ. يَا مُحَمَّدُ. مِنَ الصِّدِّيقِينَ عِنْدِي﴾ ۲ معلوم ہوتا ہے کہ صدیقین کا مرتبہ جو انسانیت کے اعلیٰ ترین مراتب میں سے ایک ہے وہ رضا، صبر اور شکر کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ رضا کا مقام صبر اور شکر کے مقام سے زیادہ ارفع واعلیٰ ہے۔

امام صادقؑ ہی سے مروی ہے کہ فرمایا: ﴿لَمْ يَكُنْ رَسُولُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، يَقُولُ لِشَيْءٍ قَدْ مَضیٰ: لَوْ كَانَ غَيْرُهُ!﴾ ۳

عمار یاسرؓ سے منقول ہے کہ انہوں نے صفین میں کہا: ﴿أَللّٰهُمَّ اِنَّكَ تَعْلَمُ أَنِّي لَوْ أَعْلَمُ أَنَّ رِضَاكَ فِي أَنْ أَقْذِفَ بِنَفْسِي هٰذَا الْبَحْرَ لَفَعَلْتُ. أَللّٰهُمَّ اِنَّكَ تَعْلَمُ أَنِّي لَوْ أَعْلَمُ أَنَّ رِضَاكَ فِي أَنْ أَضَعَ ظَبَّةَ سَيْفِي فِي بَطْنِي ثُمَّ أَنْحَنِي عَلَيْهِ حَتّٰى يَخْرُجَ مِنْ ظَهْرِي لَفَعَلْتُ. أَللّٰهُمَّ اِنِّي أَعْلَمُ مِمَّا عَلَّمْتَنِي أَنِّي لاٰ أَعْمَلُ عَمَلاً الْيَوْمَ هٰذَا هُوَ أَرْضیٰ لَكَ مِنْ جِهَادِ هٰؤُلاٰءِ الْفَاسِقِينَ﴾ ۴

۱۔ بہ تحقیق اللہ کی سب سے زیادہ پہچان رکھنے والا انسان وہ ہے جو اللہ کے فیصلوں پر سب سے زیادہ راضی رہنے والا ہو۔ (سابقہ ماٴخذ، حدیث۲)۔

۲۔ اللہ فرماتا ہے کہ میں اپنے مؤمن بندے کو کسی امر میں نہیں ڈالتا مگر یہ کہ اس میں اس کی بھلائی قرار دیتا ہوں۔ پس اسے میری قضا پر راضی رہنا اور میری آزمائش پر صبر کرنا اور میری نعمتوں پر شکر کرنا چاہئے۔ اے محمدؐ (اگر وہ ایسا کرے تو) میں اسے اپنے ہاں صدیقین میں درج کروں گا۔ (سابقہ ماٴخذ کا مذکورہ باب، ص۵۰۔۵۱، حدیث۶)۔

۳۔ رسول اللہ کسی گزشتہ واقعے کے بارے میں یہ نہیں فرماتے تھے کہ کاش ایسا نہ ہوتا ویسا ہوتا۔ (سابقہ ماٴخذ، ص۵۲، ح۱۳)۔

۴۔ منقول ہے کہ عمار یاسرؓ نے صفین میں کہا: ''اے اللہ! تو جانتا ہے کہ اگر مجھے یہ معلوم ہو کہ تیری رضا سمندر میں چھلانگ لگانے میں ہے تو میں ایسا ہی کروں گا۔ اے اللہ! تو جانتا ہے کہ اگر مجھے یہ علم ہوتا ہے کہ میں اپنی تلوار کی نوک اپنی پیٹ میں چبھودوں پھر اس پر جھک جاؤں تاکہ وہ میری پشت سے نکل جائے تو میں ایسا ہی کروں گا۔ اے اللہ! تو نے مجھے جو کچھ سکھایا ہے اس کی بدولت میں یہ جانتا ہوں کہ آج میں کوئی ایسا کام نہیں کروں گا جو ان فاسقوں کے ساتھ جہاد کرنے سے تجھے زیادہ پسند ہو''۔

<--

یہ رضائے پروردگار کے حصول کی منزل ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ رضا کی منزل نہ ہو، بلکہ کوئی اور منزل ہو، نیز یہ بھی ممکن ہے کہ یہ رضائے عبد کی منزل یا خدا کی رضا میں بندے کی رضا کے فانی ہونے کی منزل ہو۔

حدیث میں مذکور ہے کہ حضرت موسیٰ (علی نبینا وآلہ وعلیہ السلام) نے اللہ سے عرض کیا: ''مجھے اپنا محبوب ترین اور عابد ترین بندہ دکھا''۔ اللہ نے انہیں ساحل پر واقع ایک بستی میں جانے کا حکم دیا اور وہ جگہ بتا دی گئی جہاں وہ اسے پا سکیں۔

جب حضرت موسیٰؑ وہاں پہنچے تو ایک مرد نظر آیا جو جذام اور برص میں مبتلا تھا اور چل پھر نہیں سکتا تھا۔ وہ اللہ کی تسبیح پڑھ رہا تھا۔ حضرت موسیٰؑ نے جبرئیلؑ سے پوچھا: وہ شخص کہاں ہے جسے دکھانے کا میں نے اللہ سے مطالبہ کیا تھا؟

جبرئیلؑ نے کہا: یا کلیم اللہ! وہ شخص یہی ہے! فرمایا: اے جبرئیل! میرا خیال تو یہ تھا کہ وہ نماز اور روزہ بہت بجالانے والا ہوگا! جبرئیلؑ نے کہا: یہ شخص بہت سے روزہ رکھنے اور نماز پڑھنے والوں کی بہ نسبت اللہ کی نظر میں زیادہ عبادت گزار اور زیادہ محبوب ہے۔ اب میں حکم دیتا ہوں کہ اس کی آنکھیں اندھی ہو جائیں پھر دیکھئے کہ وہ کیا کہتا ہے؟ تب جبرئیلؑ نے اس کی آنکھوں کی طرف اشارہ کیا۔ پس اس کی آنکھیں اس کے رخساروں پر لڑھک گئیں۔ جب ایسا ہوا تو وہ کہنے لگا: اے اللہ! تو نے جب تک چاہا مجھے آنکھوں سے نوازا اور جب چاہا اسے مجھ سے واپس لیا۔ اور اپنے ہاں میرے لئے طویل آرزو باقی رکھی، ﴿یَا بَارُّ یَا وَصُولُ﴾۔ موسیٰؑ نے اس سے فرمایا: اے بندہ خدا! میری دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ اگر چاہو تو میں دعا کرتا ہوں تاکہ اللہ تمہارے اعضاء تمہیں واپس عطا فرمادے اور تمہاری بیماریوں کو شفا عنایت کرے۔ اس نے کہا: جو کچھ آپ نے کہا مجھے ان کی ضرورت نہیں۔ خدا میرے بارے میں جو کچھ چاہے وہ میرے نزدیک زیادہ محبوب ہے اس چیز سے جو میں خود اپنے بارے میں چاہوں!

پس موسیٰؑ نے فرمایا: میں نے سنا کہ تم ﴿یَا بَارُّ یَا وَصُولُ﴾ کہہ کر اللہ کو پکار رہے تھے۔ برّ اور وصلہ سے کیا مراد ہے؟ اس نے عرض کیا: میرے علاوہ اس شہر میں کوئی ایسا نہیں جو اسے پہچانتا اور اس کی

-> اس حکایت کے متن میں ﴿جِهَادِ هٰؤُلاءِ الفَاسِقِينَ﴾ کے بعد مذکور ہے: ﴿وَلَوْ أَعْلَمُ اليَومَ عَمَلاً أَرْضىٰ لَكَ مِنْهُ لَفَعَلْتُهُ﴾ (دیکھئے نصر بن مزاحم المنقری کی وقعۃ الصفین، ص ۳۲۰)۔

عبادت کرتا ہو۔ موسیٰؑ کو تعجب ہوا اور بولے: یہ واقعی دنیا کا عابد ترین شخص ہے''۔[۱] انتہی۔

جی ہاں! اللہ کی محبت دل میں رکھنے والے جن کے دل نور معرفت سے منور ہیں ان کی خوشی ہمیشہ حق سے وابستہ ہوتی ہے اور وہ رضائے الٰہی پر راضی رہتے ہیں۔ وہ ہماری طرح اس دنیا کی تاریکیوں میں غوطہ ور نہیں ہوتے۔ وہ یہاں کی فانی لذتوں اور خواہشات سے متاثر نہیں ہوتے ان کے دلوں کے دروازے اللہ اور اس کے اسماء وصفات کیلئے کھلے جبکہ دوسروں کیلئے بند رہتے ہیں۔ وہ غیر اللہ سے اپنی آنکھیں موندھ لیتے ہیں۔

عزیزو! اللہ تعالیٰ اپنے فیصلوں کو ضرور نافذ کرتا ہے خواہ ہم ان کو پسند کریں یا نہ کریں۔ اللہ کے فیصلے ہماری پسند اور ناپسند کے تابع نہیں۔ اگر ہم اس کے فیصلوں سے ناراض اور ناخوش رہیں تو اس کا نتیجہ ہمیں پستی، سلب درجات، اولیاء اور ملکوتیوں کی نظروں سے گرنا اور سلب ایمان کی شکل میں ملے گا۔ چنانچہ احادیث میں حضرت صادقؑ سے مروی ہے:

''وہ شخص مؤمن کیسے ہوسکتا ہے جو اپنے حصے سے (جو اللہ نے اسے دیا ہے) ناخوش رہتا ہے اور اپنی حیثیت کو (جو اسے اللہ نے دی ہے) حقیر سمجھتا ہے حالانکہ اس کے بارے میں فیصلہ کرنے والا اللہ ہے۔[۲]

مروی ہے کہ امام صادقؑ سے سوال کیا گیا کہ مؤمن کے مؤمن ہونے کا کیسے پتہ چلتا ہے؟ آپؑ نے فرمایا: اللہ کے آگے سر تسلیم خم ہونے سے، نیز خوشی اور ناخوشی کے مواقع پر راضی برضا رہنے سے۔[۳]

۱۔ شیخ عباس قمی کی سفینۃ البحار، ج۱، ص۵۲۴، باب الرضا۔

۲۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

عَنْ أبي عَبْدِاللهِ ؑ قالَ: ﴿لَقِيَ الحَسَنُ بْنُ عَليٍّ . عليهما السلام . عَبْدَ اللهِ بْنِ جَعْفَرٍ، فَقالَ: يا عَبْدَ اللهِ كَيْفَ يَكُونُ المُؤمِنُ مُؤمِناً وَهُوَ يَسْخَطُ قِسْمَهُ وَيُحَقِّرُ مَنْزِلَتَهُ وَالحاكِمُ عَلَيْهِ اللهُ؟﴾۔

(اصول کافی، ج۲، ص۵۱، کتاب الایمان والکفر، باب الرضا بالقضاء، حدیث ۱۱)۔

۳۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں:

عَنْ أبي عَبْدِاللهِ ؑ قال: ﴿قُلْتُ لَهُ بِأيِّ شَيءٍ يُعْلَمُ المُؤمِنُ بِأنَّهُ مُؤمِنٌ؟ قالَ: بِالتَّسْلِيمِ لِلّٰهِ وَالرِّضا فِيما وَرَدَ عَلَيْهِ مِنْ سُرُورٍ أوْ سَخَطٍ﴾۔

(سابقہ مأخذ کا مذکورہ باب، ص۵۲، حدیث ۱۲)۔

ابو جعفر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

﴿أَحَقُّ خَلْقِ اللهِ أَنْ يُسَلِّمَ لِمَا قَضَى اللهُ. عَزَّوَجَلَّ. مَنْ عَرَفَ اللهَ تَعالىٰ، وَمَنْ رَضِيَ بِالْقَضَاءِ، أَتىٰ عَلَيْهِ الْقَضَاءُ وَعَظَّمَ اللهُ أَجْرَهُ، وَمَنْ سَخِطَ الْقَضَاءَ، مَضىٰ عَلَيْهِ الْقَضَاءُ وَأَحْبَطَ اللهُ أَجْرَهُ﴾[1]

۱۔ اللہ کا سب سے شائستہ بندہ وہ ہے جو قضائے خداوندی کے آگے سرِ تسلیم خم ہو۔ جو کوئی اللہ تعالیٰ کو پہچانے اور قضائے الٰہی پر راضی رہے تو قضا اس پر واقع ہوگی اور اللہ اسے اجرِ عظیم عطا کرے گا۔ اس کے برعکس جو شخص قضائے خداوندی سے ناراض ہو تو اس پر بھی قضاء واقع ہوگی لیکن اللہ اس کے اجر کو ضائع کردے گا۔

(ملاحظہ ہو سابقہ مآخذ کا مذکورہ باب، ص ۵۱، حدیث ۹)۔

شکر اور اس کی ضد کفران کا بیان

پہلی فصل
شُکر کا مفہوم

جان لو کہ شکر سے مراد ہے نعمت دینے والے کی نعمت کا اظہار کرنا یا وہ امر جس سے اظہار نعمت ہو۔ چنانچہ راغب اصفہانیؒ سے منقول ہے کہ: شکر نام ہے نعمت کے تصور اور اس کے اظہار کا۔ کہا جاتا ہے کہ شکر ''کشر'' کی بگڑی ہوئی شکل ہے اور کشر سے مراد ''کشف'' ہے۔ اس کی ضد کفر ہے جس سے مراد نعمت کو چھپانا یا بھلا دینا ہے۔ موٹے تازے حیوان کو ''دابۃ شکور'' کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ اپنی موٹائی کے ذریعے گویا اپنے مالک کی نعمتوں کا اظہار کرتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شکر ''عین شکری'' سے مأخوذ ہے۔ شکری سے مراد ہے ''پُر''۔ بنابریں شکر سے یہ مراد ہے کہ جسے نعمت دی جائے وہ اپنے منعم کے ذکر سے ''لبریز'' ہو جائے۔[1]

بعض حضرات کہتے ہیں کہ شکر نام ہے کسی نعمت کا جواب قول و فعل اور نیت کے ذریعے دینا۔[2]

شکر کے تین ارکان ہیں:

الف: منعم، اس کی اچھی صفات اور دی گئی نعمت کی معرفت۔

ب: اس معرفت کے نتیجے میں حاصل ہونے والی حالت جو حالت خضوع و تسلیم، تواضع اور خوشی سے عبارت ہے، کیونکہ یہ حالت منعم کی عنایت پر دلالت کرتی ہے۔

ج: عمل جو مذکورہ حالت کا نتیجہ ہے۔

۱۔ مفردات فی غریب القرآن، راغب اصفہانی، ص ۲۶۵، مادۂ شکر۔

۲۔ لسان العرب، ج ۷، ص ۱۷۰۔

عمل کی بھی تین صورتیں ہیں:

ایک ''قلبی'' ہے اور اس سے مراد ہے: منعم کی تعظیم، تعریف اور تمجید کا ارادہ۔

دوسری صورت ''لسانی'' ہے، یعنی اس قلبی ارادے کو حمد، تسبیح اور تہلیل وغیرہ کے ذریعے زبان سے ظاہر کرنا۔

تیسری صورت ''جوارحی'' ہے، یعنی اعضاء و جوارح کے ذریعے اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو اس کی اطاعت کے دائرے میں رہتے ہوئے استعمال کرنا۔[۱]

راقم کہتا ہے کہ شکر عبارت ہے منعم کی نعمتوں کی قدردانی سے۔ اب یہ قدردانی دل کے اندر ایک طرح سے جلوہ گر ہوگی، زبان پہ دوسری طرح سے اور اعضاء و جوارح میں کسی اور شکل سے۔ اس قدردانی کیلئے منعم کی معرفت اور اس کی دی ہوئی نعمت کی شناخت ضروری ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔

دوسری فصل

شکر کے مراتب

جان لو کہ منعم کی معرفت اور نعمتوں کی شناخت کے مختلف درجات کے حساب سے شکر کے مراتب بھی مختلف ہوں گے۔ اسی طرح انسانی کمال کے مختلف درجات کی مناسبت سے بھی شکر کے مراتب مختلف ہوں گے، کیونکہ ایک طرف وہ شخص ہے جو حیوانیت کے دائرے میں اور حیوانی درجے میں زندگی گزارتا ہے۔ اس کی ساری توجہ حیوانی نعمتوں پر، یعنی خواہشات حیوانی کی تکمیل پر مرکوز ہوتی ہے۔ وہ اسی دائرے میں مگن اور خوش رہتا ہے۔ وہ کھانے پینے، پہننے اور جنسی خواہشات کی تکمیل میں ہی لگا رہتا ہے جو حیوانیت کی منزل ہے۔ وہ دنیوی اور مادی مقاصد سے ہٹ کر وجود کے دیگر مدارج اور کمال انسانی کے دیگر مقامات و مراحل سے نا آشنا رہتا ہے۔ عالم غیب و تجرد کی اسے کوئی خبر نہیں ہوتی۔ پس اس شخص کے اور اس انسان کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے جو اس حیوانی حجاب سے نکل کر دیگر دنیاؤں میں قدم رکھ چکا ہو اور عالم غیب کی کرنیں اس کے دل میں جلوہ فگن ہو چکی ہوں۔

۱۔ احیاء علوم الدین، ج ۴، ص ۸۱ تا ۸۵؛ نیز المحجۃ البیضاء، ج ۷، ص ۱۴۴ تا ۱۵۱۔

اسی طرح ان دو گروہوں میں بھی مشرق و مغرب کا فرق موجود ہے جن میں سے ایک کی نظر میں ظاہری وباطنی اسباب کسی واجب الوجود کے محتاج نہیں ہیں، بلکہ خود مختار اور بے نیاز ہیں۔ وہ اسباب، مسبّبات اور وسائط کو بے نیاز سمجھتے ہیں جبکہ دوسرا گروہ خالق ومخلوق، نیز واجب الوجود اور ممکن الوجود کے رابطے سے آگاہ ہے۔ یہ لوگ موجودات کی ابتداء وانتہا کے مراتب کا سبب ذات حق کو قرار دیتے ہیں۔ وہ نورانی اور ظلمانی حجابات اور پردوں کے پیچھے مسبّب الاسباب کا جلوہ اپنے دل کی روشنی کی بدولت دیکھ لیتے ہیں۔

پس جب وجود کی پہلی تجلی، یعنی بساط وجود کے بچھنے سے لے کر قبض کے آخری جلوے (جو قہاریت اور مالکیت کی بساط پر ختم ہو) تک ہر لحاظ سے اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا ہو جائے تو سالک کے دل میں علم حضوری کے ذریعے اللہ کی رحمانیت، رحیمیت، مالکیت اور قہاریت کا جلوہ ظاہر ہوتا ہے، بلکہ سالک کا دل بذات خود اس جلوے کا مظہر ہوتا ہے۔ یاد رہے کہ یہ مقام صرف کُمّل الاولیاء کو ہی حاصل ہوسکتا ہے، بلکہ حقیقت میں سوائے حضرت ختمی مرتبت ﷺ کے کسی اور کیلئے براہ راست اس کا حصول ممکن نہیں۔ ہاں! کُمّل الاولیاء (علیہم السلام) کو بالواسطہ (رسول کے ذریعے) یہ قیام حاصل ہوسکتا ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿وَقَلِيلٌ مِنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ﴾[1]

پس جو لوگ تجلیات ذاتیۂ احدیہ سے بے خبر ہیں اور موجودات عالم کو خالق حقیقی کا محتاج نہیں، بلکہ خود مختار سمجھتے ہیں وہ ایک طرح سے کفران نعمت کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اسی طرح جو لوگ اسماء وصفات کی تجلیوں کا مشاہدہ نہیں کرتے اور ان کے دل آئینہ اسماء نہیں ہیں وہ بھی ایک طرح سے کفران نعمت میں مبتلا ہیں، نیز جو لوگ تجلیات افعالی اور توحید فعلی سے غافل ہیں وہ بھی کفران نعمت کے مجرم ہیں، اگرچہ وہ خود اس سے غافل ہیں: ﴿وَذَرُوا الَّذِينَ يُلْحِدُونَ فِي أَسْمَائِهِ﴾[2] اس کے برعکس جو لوگ خمسۂ الٰہیہ کو جمع کریں، انسان کے سرایر خفیہ کے پیکر بن جائیں، برزخیت کبریٰ کی منزل کے مکین بنیں اور ظاہری وباطنی نعمتوں سے بہرہ مند ہو جائیں وہ تمام زبانوں میں اللہ جل جلالہ کا شکر ادا کرتے اور اس کی حمد وثنا کرتے ہیں، کیونکہ شکر منعم حقیقی (جلّ شانہ) کی عطا کردہ نعمتوں کی تعریف سے عبارت ہے۔

۱۔ میرے بندوں میں شکر کرنے والے کم ہیں۔ سورۂ سبا ۱۳۔

۲۔ ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اللہ کے اسماء میں الحاد کے مرتکب ہوتے ہیں۔ سورۂ اعراف ۱۸۰۔

پس اگر وہ نعمت ظاہری نعمتوں میں سے ہو تو اس کا شکر اور ہے اور اگر اس کا تعلّق باطنی نعمتوں سے ہو تو اس کا شکر اور۔ اگر وہ حقیقی علوم و معارف سے مربوط ہو تو اس کا انداز شکر مختلف ہے۔ اگر وہ نعمت افعال کی تجلّی ہو تو اس کا انداز شکر اور ہے۔ اسی طرح اگر وہ اسماء وصفات کی تجلّی ہو تو اس کا شکر اور طرح کا ہے، نیز اگر اس کا تعلّق تجلیات ذاتیہ سے ہو تو اس کا انداز شکر جدا گانہ ہے۔ چونکہ اس قسم کی نعمتیں اللہ کے گنتی کے چند خالص ترین بندوں کو حاصل ہوتی ہیں اس لئے شکر اور ثنائے معبود کی ذمہ داریوں کی ادائیگی بھی یہی تھوڑے سے مگر خالص ترین اولیاء ہی کر سکتے ہیں: ﴿وَقَلِيلٌ مِنْ عِبَادِيَ الشَّكُور﴾۔

یاد رہے کہ بعض صاحب معرفت محقّقین نے کہا ہے کہ: ''شکر بندگان خاص سے مختص مقام نہیں، بلکہ یہ عام درجہ ہے، کیونکہ شکر، منعم کی نعمتوں کا بدلہ چکانے کا مفہوم اپنے اندر رکھتا ہے جبکہ یہ بے ادبی ہے۔ اگر سالک یہ دیکھے کہ اللہ کو اپنی سلطنت میں مکمّل اختیار حاصل ہے جو چاہے کرے پھر وہ اپنا بھی کوئی اختیار دیکھے تو وہ اپنے آپ کو اداء شکر کا اہل نہیں سمجھے گا، کیونکہ انسان اور اس کے تمام اختیارات وافعال سب کے سب اللہ کے اختیار میں ہیں۔ پس چونکہ شکر میں ''بدلے'' کا عنصر موجود ہے اس لئے یہ بے ادبی ہے مگر یہ کہ بندے کو شکر کرنے کا حکم دیا جائے۔ اس صورت میں شکر کی ادائیگی حکم خداوندی کی تعمیل محسوب ہوگی۔ بنا بریں اولیاء کا شکر اطاعت خداوندی سے عبارت ہوگا اور خود شکر (نعمت کا بدلہ چکانے) کے مفہوم میں نہیں ہوگا''۔[۱]

البتہ یہ واضح ہے کہ بدلے کا یہ مفہوم ان لوگوں کے شکر میں موجود ہوتا ہے جو اسماء کے جامع، مقام وحدت و کثرت کے حافظ اور برزخیت کبریٰ کے حامل اولیاء خدا نہ ہوں۔ اسی لئے عارف محقّق شیخ خواجہ عبداللہ انصاری'' اگر چہ یہ کہتے ہیں کہ شکر عام مرتبہ ہے لیکن وہ شکر کے تیسرے مرحلے کے بارے میں کہتے ہیں: ﴿وَالدَّرَجَةُ الثَّالِثَةُ أَنْ لاَ يَشْهَدَ العَبْدُ اِلاَّ المُنْعِمَ، فَاِذا شَهِدَ المُنْعِمَ عُبُودَةً اسْتَعْظَمَ مِنْهُ النِّعْمَةَ، وَاِذا شَهِدَهُ حُبّاً اسْتَحْلىٰ مِنْهُ الشِّدَّةَ، وَاِذا شَهِدَهُ تَفْرِيداً لَمْ يَشْهَدْ مِنْهُ نِعْمَةً وَلاَ شِدَّةً﴾[۲]

ان الفاظ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مرحلہ، یعنی شکر کا مرحلہ ''سلوک'' کے دیگر مراحل کی طرح ابتداء میں عام و خاص سب کیلئے ہے یا صرف عام لوگوں کیلئے لیکن اس کے آخری مراحل صرف خاص ہستیوں کے ساتھ مختص ہیں اور عام لوگوں کیلئے ان میں کوئی حصہ نہیں۔

۱۔ ملاحظہ ہو عبدالرزاق کاشانی'' کی شرح منازل السائرین، ص ۲۱۲، ۲۱۳۔

۲۔ ایضاً، ص ۲۱۵۔

تیسری فصل

شکر عقل کا لشکر اور فطرت مخمورہ کا لازمہ ھے
جبکہ
کفران نعمت جہل کا لشکر اور فطرت محجوبہ کا لازمہ ھے

جان لو کہ منعم کی تعظیم اور اس کی تعریف کا جذبہ ان فطریات میں سے ایک ہے جنہیں اللہ نے اپنے قلم قدرت سے تمام بنی نوع انسان کی فطرت میں رکھ چھوڑا ہے اور سب انسان اس میں برابر کے شریک ہیں۔ جو کوئی اپنی فطرت سلیم کی طرف رجوع کرے وہ جان لے گا کہ منعم کی تعظیم اور محبت کا جذبہ اس کی ذات کی کتاب میں محفوظ ہے۔

دنیا والے اپنے دنیوی منعموں اور مالکوں کی جو تعریف اور تعظیم بجالاتے ہیں وہ اسی خداداد فطرت کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح علم حاصل کرنے والے افراد اپنے استادوں اور دانشوروں کی جو تعظیم اور تعریف و تمجید کرتے ہیں وہ بھی اسی فطرت کا ثمر ہے۔

اگر کوئی شخص کفران نعمت کرے یا کسی منعم کی تعریف نہ کرے تو یہ خداداد فطرت کے تقاضوں کی مخالفت، نیز جبلّت اور طبع انسانی سے بغاوت ہے۔ اسی لئے شکر منعم نہ کرنے والوں، یعنی کفران نعمت کرنے والوں کی مذمّت سارے ہی لوگ کرتے ہیں اور کفران نعمت کو انسان کی ذاتی جبلّت کے تقاضوں کے منافی قرار دیتے ہیں۔

البتہ یہ باتیں کسی بھی منعم کے شکر سے متعلّق تھیں خواہ وہ منعم حقیقی ہو یا مجازی، لیکن یہ یاد رہے کہ فطرت سلیم، یعنی غیر محجوب فطرت مخمورہ کا لازمہ اور تقاضا یہ ہے کہ منعم علی الاطلاق، یعنی اللہ کی ذات مقدس کا شکر ادا کیا جائے اور اس کی تعریف کی جائے، کیونکہ اس کی نعمتوں اور رحمت کا دائرہ پورے عالم وجود پر محیط ہے اور کائنات کا ہر ذرّہ اس کے خوان نعمت اور سایۂ رزاقیت کا خوشہ چین ہے۔ اللہ کی پاک ذات کامل مطلق اور کمال مطلق ہے۔ کمال مطلق ہونے کا لازمہ یہ ہے کہ اس کی رحمت اور رزاقیت بھی لامحدود اور مطلق ہو۔ دیگر موجودات اور ان سے حاصل ہونے والی نعمتیں اس کی رحمت کے پرتو اور اس کی رزاقیت کے جلوے ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی بھی موجود ذاتی کمال و جمال اور نعمت و رزاقیت کا ہرگز مالک نہیں۔

جس کسی کے پاس بھی بظاہر کوئی نعمت یا کمال موجود ہے وہ درحقیقت اس ذات مقدس کی رزاقیت اور

کمال کا آئینہ ہے۔ جیسا کہ قرآن کی آیت شریفہ ﴿إِنَّ اللّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ﴾۱ سے یہ نکتہ کھل کر سامنے آتا ہے، کیونکہ اس آیت میں رزاقیت کو صرف اللہ کے ساتھ مختص کیا گیا ہے۔ سورۂ فاتحہ سے یہ نکات اور بھی لطیف انداز میں ثابت ہوتے ہیں۔ فرماتا ہے: ﴿الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾۲ اس آیت میں ہر قسم کی تعریف وثنا کو اللہ سے مختص قرار دیا گیا ہے، خاص کر بسم اللہ کو الحمد للہ کے ساتھ مربوط قرار دے کر جیسا کہ صاحبان عرفان وایقان کا وطیرہ ہے۔۳ اور اس لطیف ودقیق نکتے کے اندر ایسے اسرار پوشیدہ ہیں جن کا اظہار خطرے سے خالی نہیں۔

خلاصہ یہ کہ جو فطرت سلیم خلقت کی محدودیتوں کے پردے میں محجوب نہ ہوئی ہو اور جس نے امانت کو صاحب امانت کے پاس حفاظت کے ساتھ لوٹا دیا ہو وہ ہر نعمت پر ذات حق کا شکر کرتی ہے، بلکہ فطرت سلیمہ کے نزدیک ہر شکر کرنے والے کا ہر شکر، نیز ہر حمد وثنا کرنے والے کی ہر حمد وثنا (خواہ وہ جس طریقے سے، جس کیلئے اور جس نعمت کی بناء پر ہو) کی بازگشت صرف اور صرف اللہ کی ذات پاک کی طرف ہوتی ہے۔ اگرچہ فطرت محجوبہ کے حامل لوگوں کا یہ گمان ہو کہ وہ کسی اور کی تعریف وثنا کر رہے ہیں۔ بنابریں یہ کہا جاسکتا ہے کہ انبیاء کی بعثت کا مقصد جمال ازلی کے جلوؤں سے ان پردوں کو ہٹانا ہے۔ شاید قرآن کی آیت شریفہ: ﴿إِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلٰكِنْ لَا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ﴾۴ اور اس طرح کی دیگر آیات۵ اسی لطیف نکتے کی طرف اشارہ ہوں، لیکن یہ بے چارا اور محجوب انسان جو اپنی خداداد فطرت سلیمہ کو خلقت کی تاریک محدودیتوں کے پردوں کے پیچھے مستور اور پنہاں کر چکا ہے اور اپنی جبلّت کے خداداد نور کو عالم کثرت کی ظلمتوں کے ذریعے بجھا کر خاموش کر چکا ہے کفران نعمت کا مرتکب ہوتا ہے اور ہر نعمت کو کسی مخلوق سے منسوب کرتا ہے۔ اس کی امیدیں ہمیشہ دنیا والوں سے وابستہ ہوتی ہیں اور اس کا دست سوال ان لوگوں کی طرف دراز رہتا ہے جو خود اس کی طرح مجسمۂ فقر واحتیاج ہیں۔

۱۔ اللہ ہی بڑا رزق دینے والا بڑی پائیدار طاقت والا ہے۔ سورۂ ذاریات ۵۸۔

۲۔ تمام تعریفیں اللہ کیلئے ہیں جو عالمین کا ربّ ہے۔ سورۂ حمد ۲۔

۳۔ دیکھئے ابن عربی کی تفسیر القرآن الکریم، ج۱، ص۹، ۱۰۔

۴۔ ہر چیز اللہ کی تسبیح کرتی ہے اس کی تعریف میں، لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے۔ سورۂ اسراء ۴۴۔

۵۔ سورۂ رعد ۱۳، الجمعہ ۱، اور الحدید ۴۔

والے یہ بے چارہ اور محجوب انسان جو عرصہ دراز تک اللہ کی بے انتہا نعمتوں میں غرق اور اس کی بے کراں رحمتوں سے بہرہ مند ہوتا رہا ہے، لیکن اپنے منعم حقیقی کو پہچاننے کی بجائے آنکھیں بند کر کے دوسروں کی تعریف میں مشغول اور نااہلوں کے سامنے کورنش بجالاتا رہا ہے! جان لو کہ مخلوق کا شکریہ ادا کرنا اگرچہ ایک قطعی ذمہ داری ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے: ﴿مَنْ لَمْ يَشْكُرِ المَخْلُوقَ لَمْ يَشْكُرِ الخَالِقَ﴾ [۱] لیکن انہیں اللہ نے ہی ان وسائل سے نوازا ہے جن کے ذریعے وہ اللہ کی نعمتیں دوسروں تک پہنچاتے ہیں لہذا یہ سزاوار نہیں کہ تم صرف ان کا شکریہ ادا کر کے اپنے خالق اور رازق حقیقی کو بھلا ڈالو، کیونکہ یہ منعم حقیقی کے حق میں عین کفران نعمت اور احسان فراموشی ہے۔

خلاصہ یہ کہ شکر فطرت مخمورہ کا لازمہ ہے لیکن کفران نعمت کا تعلق فطرت محجوبہ نیز جہل اور ابلیس کے لشکروں سے ہے۔ ان نکات کی روشنی میں معرفت کے کئی ابواب کھلتے ہیں بشرطیکہ فطرت مخمورہ کی طرف رجوع کیا جائے اور فطرت محجوبہ کی قید سے نجات حاصل کی جائے۔

چوتھی فصل

شکر کے بارے میں بعض احادیث کا بیان

محمد بن یعقوب نے اپنی سندوں کے ساتھ امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل کیا ہے کہ آپ ؑ نے فرمایا:

قَالَ رَسُولُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: ﴿الطَّاعِمُ الشَّاكِرُ لَهُ مِنَ الأَجْرِ كَأَجْرِ الصَّائِمِ المُحْتَسِبِ وَالمُعَافِي الشَّاكِرُ لَهُ مِنَ الأَجْرِ كَأَجْرِ المُبْتَلَى الصَّابِرِ وَالمُعْطَى الشَّاكِرُ لَهُ مِنَ الأَجْرِ كَأَجْرِ المَحْرُومِ القَانِعِ﴾ [۲]

۱۔ یہ عبارت احادیث کی کتابوں میں نہیں ملی، لیکن اسی کا مشابہ جملہ رسول اکرم ؐ سے یوں نقل ہوا ہے:
﴿مَنْ لَمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَايَشْكُرِ اللهَ﴾ (کنز العمال، ج ۳، حدیث ۶۴۴۳)۔

۲۔ امام صادق ؑ نے فرمایا کہ رسول خدا ؐ نے فرمایا ہے: کھا کر شکر کرنے والے کو اتنا ثواب ملے گا جتنا روزہ رکھ کر اللہ سے اپنا اجر مانگنے والے کو۔ اپنی تندرستی پر شکر کرنے والے تندرست کو اتنا ثواب ملے گا جتنا مصیبت میں صبر کرنے والے کو۔ حصول نعمت پر شکر کرنے والے کو اتنا ثواب ملتا ہے جتنا اس شخص کو جو اپنی محرومی کے باوجود قناعت سے کام لیتا ہے۔
(دیکھئے اصول کافی، ج ۲، ص ۷۷، باب شکر، حدیث ۱)۔

نیز انہی اسناد کے ساتھ مروی ہے کہ فرمایا: قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ ؐ: ﴿ مَا فَتَحَ اللّٰہُ عَلٰی عَبْدٍ بَابَ شُکْرٍ فَخَزَنَ عَنْہُ بَابَ الزِّیَادَۃِ ﴾ ۱

اسی قسم کا مضمون نہج البلاغہ میں مذکور ہے: ﴿ مَا کَانَ اللّٰہُ لِیَفْتَحَ عَلٰی عَبْدٍ بَابَ الشُّکْرِ وَیُغْلِقَ عَلَیْہِ بَابَ الزِّیَادَۃِ ﴾ ۲ یعنی ایسا نہیں ہوسکتا کہ اللہ کسی بندے پر شکر کا دروازہ تو کھول دے لیکن (نعمت میں) زیادتی کا دروازہ بند کردے، بلکہ جس کیلئے شکر کے دروازے کھولتا ہے اس کیلئے (اپنے نعمت میں) زیادتی کے دروازے بھی کھولتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں بھی ارشاد فرمایا ہے: ﴿ وَلَئِنْ شَکَرْتُمْ لَأَزِیْدَنَّکُمْ ﴾ ۳ مذکورہ حدیث معلوم ہوتا ہے کہ بندوں کیلئے شکر کا دروازہ کھولنے والا بھی خود اللہ ہے۔ پس شکر کا دروازہ کھولنے پر ایک اور شکر لازم ٹھہرتا ہے جو بجائے خود ایک اور نعمت ہے، بلکہ خود شکر زبان، دل، عقل اور شاکر کا وجود اللہ کی نعمتیں ہیں اور اس کے شکر کا حق ادا کرنا کسی کے بس کی بات نہیں ہے، جیسا کہ سابقہ فصل میں بیان ہو چکا اور ارباب معرفت کے ہاں روز روشن کی طرح واضح ہے۔ بقول شاعر:

از دست و زبان کہ برآید　　　کہ از عہدۂ شکرش بہ درآید ۴

شیخ محمد بن حسن حرّ عاملیؒ ۵ وسائل الشیعہ میں محمد بن ادریسؒ ۶ سے ''عیون'' اور مفیدؒ ۷ کی المحاسن

۱۔ رسول اللہؐ نے فرمایا: اللہ جس شخص پر شکر کا دروازہ کھولتا ہے اس پر (نعمت میں) زیادتی کا دروازہ بند نہیں کرتا۔ (اصول کافی، ج۲، ص۷۷، باب شکر، حدیث۲)۔

۲۔ امیر المؤمنینؑ کی یہ حدیث، سید رضیؒ کی نہج البلاغہ، ص۷۵۸، ش۴۲۰، میں مذکور ہے۔

۳۔ اگر تم میرا شکر ادا کرو گے تو میں ضرور تمہاری نعمتوں میں اضافہ کروں گا۔ سورۂ ابراہیم ۷۔

۴۔ رجوع ہو گلستان سعدی شیرازی، ص۶۹ کی طرف۔

۵۔ شیخ محمد بن حسن المعروف ''شیخ حرّ عاملیؒ'' رجب ۱۰۳۳ھ ق میں لبنان کے گاؤں مَشغر میں پیدا ہوئے اور ۱۱۰۴ھ میں مشہد مقدس میں راہی ملک بقا ہوئے۔ وہ عظیم شیعہ محدّث تھے۔ ان کی تالیفات بہت زیادہ ہیں جن میں سب سے معروف تالیف جس کی طرف تمام شیعہ علماء وفقہاء رجوع کرتے ہیں ''وسائل الشیعہ'' ہے۔ (ریحانۃ الادب، ج۲، ص۳۱، ۳۳)۔

۶۔ محمد بن احمد المعروف ''ابن ادریس حلّیؒ''، شیعوں کے قابل فخر فقیہ تھے۔ وہ چھٹی صدی ہجری کے اواخر کے فقیہ ہیں۔ وہ کئی تالیفات کے مالک ہیں جن میں سے ''السرائر الحاوی لتحریر الفتاوی'' (جو ''سرائر'' کے نام سے معروف ہے) سب سے زیادہ مشہور ہے۔ (ریحانۃ الادب، ج۷، ص۳۷۷، ۳۷۸؛ نیز ریاض العلماء، ج۵، ص۳۱)۔

۷۔ محمد بن محمد بن نعمان المعروف ''شیخ مفیدؒ''، شیعوں کے بہت بڑے فقیہ اور علم کلام کے ماہر تھے۔ وہ ذی القعدہ -->>

کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ امام باقرؑ نے فرمایا: ﴿ما أنعمَ اللهُ علیٰ عبدٍ نعمةً فشكرَها بقلبِه، إلّا استوجبَ المزيدَ قبلَ أن يُظهرَ شكرَهُ علیٰ لسانِه﴾۱

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ شکر کرنا زبان سے پہلے دل کی ذمہ داری ہے، جیسا کہ قبل ازیں اس کی طرف اشارہ ہو چکا۔ احادیث میں اس نکتے کی طرف بہت سے مقامات پر اشارہ ہوا ہے۔

قال: وقال أبو عبدِالله ؑ: ﴿مَن قصرَت يدُهُ بالمكافاةِ فليُطِل لسانَه بالشُّكرِ﴾۲

قال: وقال: ﴿مِن حقِّ الشُّكرِ لِلّهِ أن تشكرَ مَن أجرِي تلكَ النِّعمةُ علیٰ يدِه﴾۳

اس حدیث سے اس بات کی تائید ہوتی ہے جس کی طرف سابقہ فصل میں اشارہ ہوا اور وہ یہ کہ مخلوق کا شکر اس لحاظ سے ادا کیا جاتا ہے کہ وہ اللہ کی نعمتوں کے پھیلاؤ کا وسیلہ اور ذریعہ ہے، لیکن اگر کوئی اپنے منعم حقیقی سے غافل ہو اور براہ راست مخلوق کا شکر ادا کرے تو وہ اللہ کی نعمتوں کا کفران کرنے والا اور احسان فراموش محسوب ہوگا۔ یہ نکتہ وضاحت کا محتاج نہیں، بلکہ بذات خود واضح اور روشن ہے۔

وسائل میں شیخ کی المجالس سے منقول ہے کہ شیخ نے اپنی سندوں کے ساتھ رسول اکرمؐ سے روایت کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

﴿يُؤتىٰ العبدُ يومَ القيامةِ فيُوقفُ بينَ يدَي اللهِ. عزَّوجلَّ. فيأمُرُ بهِ إلی النّارِ، فيقولُ: أي ربِّ! أمرتَ بي إلی النّارِ وقد قرأتُ القرآنَ؟! فيقولُ اللهُ: أي عبدي! إنّي قد أنعمتُ

<- ۳۳۳ یا ۳۳۶ میں پیدا ہوئے اور ۴۱۳ میں وفات پا گئے۔ ان کی تالیفات دو سو کتابوں اور رسالوں سے زیادہ بتائی گئی ہیں۔ سید مرتضیٰ علم الہدیٰ، سید شریف رضیؒ اور شیخ طوسیؒ ان کے معروف شاگرد ہیں۔
(ریحانۃ الادب، ج۵، ص۳۶۱ تا ۳۶۵؛ نیز ریاض العلماء، ج۵، ص۱۷۶ تا ۱۷۹)۔

۱۔ امام باقرؑ نے فرمایا: جو بندہ اللہ کی دی ہوئی نعمت پر دل سے شکر کرے اس کا یہ شکر نعمت میں مزید اضافے کا باعث بنتا ہے، قبل اس کے کہ وہ اس شکر کا اظہار زبان سے کرے۔ (وسائل الشیعہ، ج۱۶، ص۳۱۱، باب ۸، ح۷)۔

۲۔ امام صادقؑ نے فرمایا: جس کا ہاتھ نعمت کا بدلہ چکانے سے معذور ہو اسے چاہئے کہ اپنی زبان سے زیادہ شکر بجالائے۔ (وسائل الشیعہ، ج۱۶، ص۳۱۱، باب ۸، حدیث ۸)۔

۳۔ امام صادقؑ نے فرمایا: خدا کے شکر کا حق ادا کرنے کی ذمہ داریوں میں سے ایک یہ ہے کہ تو اس شخص کا شکر ادا کر و جس کے ہاتھوں سے یہ نعمت جاری ہوئی ہو۔ (وسائل الشیعہ، ج۱۶، ص۳۱۱، باب ۸، ح۹)۔

عَلَيْكَ وَلَمْ تَشْكُرْ نِعْمَتِي. فَيَقُولُ: أَيْ رَبِّ! أَنْعَمْتَ عَلَيَّ بِكَذا وَشَكَرْتُكَ بِكَذا، وَأَنْعَمْتَ عَلَيَّ بِكَذا وَشَكَرْتُكَ بِكَذا، فَلا يَزالُ يُحْصِي النِّعْمَةَ وَيُعَدِّدُ الشُّكْرَ. فَيَقُولُ اللهُ تَعالىٰ: صَدَقْتَ عَبْدِي إِلَّا أَنَّكَ لَمْ تَشْكُرْ مَنْ أَجْرَيْتُ لَكَ النِّعْمَةَ عَلىٰ يَدَيْهِ، وَإِنِّي قَدْ آلَيْتُ عَلىٰ نَفْسِي أَنْ لا أَقْبَلَ شُكْرَ عَبْدٍ لِنِعْمَةٍ أَنْعَمْتُها عَلَيْهِ حَتّىٰ يَشْكُرَ مَنْ ساقَها مِنْ خَلْقِي إِلَيْهِ»۱

اس سلسلے میں احادیث اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کے ذکر کی ان اوراق میں گنجائش نہیں۔۲

۱۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن بندے کو لا کر اللہ (عزوجل) کے سامنے کھڑا کیا جائے گا۔ پھر اللہ اسے جہنم کی طرف لے جانے کا حکم دے گا۔ وہ عرض کرے گا: اے میرے ربّ! کیا تو مجھے آگ میں ڈالنے کا حکم دے گا جبکہ میں نے قرآن پڑھا ہے؟ اللہ فرمائے گا: اے میرے بندے! بہ تحقیق میں نے تجھے اپنی نعمتوں سے نوازا لیکن تو نے میری نعمت کا شکر ادا نہیں کیا۔ وہ عرض کرے گا: اے میرے ربّ! تو نے مجھے فلاں نعمت دی اور میں نے فلاں طریقے سے تیرا شکر ادا کیا، نیز تو نے مجھے وہ نعمت دی اور میں نے اس طریقے سے تیرا شکر ادا کیا۔ اس طرح وہ نعمتوں اور شکر کی تعداد کو گنتا جائے گا۔ پس اللہ فرمائے گا: اے میرے بندے! تو نے درست کہا، لیکن تو نے اسکا شکر ادا نہیں کیا جس کے ذریعے میں نے تجھے اپنی نعمت سے نوازا۔ بہ تحقیق میں نے اپنے تئیں یہ عہد کیا ہے کہ میں اپنی دی ہوئی نعمت پر کسی بندے کا شکر قبول نہ کروں گا جب تک وہ میرے اس بندے کا شکر ادا نہ کرے جس نے وہ نعمت اس تک پہنچائی۔ (وسائل الشیعہ، ج۱۶، ص۳۱۲، باب۸، حدیث۱۲)۔

۲۔ وسائل الشیعہ، ج۱۶، ص۳۰۹، باب۸ از ابواب فعل المعروف؛ نیز اصول کافی، ج۲، ص۷۷، باب الشکر۔

مقصد / ۸

"طمع" اور اس کی ضد "یأس" کا بیان

یہ مقصد دو فصلوں پر مشتمل ہے:

پہلی فصل

طمع اور یأس کا مفہوم

اس سے قبل رجاء اور قنوطیت کا ذکر فرمایا۔ ممکن ہے کہ راوی نے صحیح طور پر یاد یا بیان نہ کیا ہو اور حدیث میں موجود بعض ناہمواریاں اسی وجہ سے ہوں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ "رجاء" اور "طمع" کے درمیان فرق ہو۔ وہ اس طرح کے رجاء سے مراد رحمت کی امید ہو، البتہ عمل کے ساتھ اور طمع سے مراد بھی امید ہو لیکن عمل کے بغیر یا عمل پر نظر رکھے بغیر۔

اگرچہ عمل سے عاری طمع کو عقل کے لشکروں میں شمار کرنا بعید معلوم ہوتا ہے، کیونکہ احادیث شریفہ میں اس کی مذمت ہوئی ہے۔[۱] پس شاید اس سے مراد وہ امید ہو جو عمل پر نظر رکھے بغیر باندھی جائے۔ یہ عارفین کا مقام ہے جو اپنے آپ اور اپنے عمل کو خیر باد کہہ چکے ہوں، نیز جو اپنے وجود اور اپنی انانیت و انیت کو چھوڑ کر عالم وجود کو ٹھوکر مار چکے ہوں۔ اس طرح وہ ہر دو جہاں سے آزاد ہو چکے ہوں اور جن کی نظریں محبوب حقیقی پر مرکوز ہوں اور اپنے آپ کو اور اپنے اعمال کو نہ دیکھتے ہوں یوں رحمت حق کے جلوؤں نے ان کے دلوں کو نئی زندگی بخشی ہو اور ان کا دست سوال اللہ اور اس کی رحمت کی طرف دراز ہو، یعنی وہ دوسروں سے بے نیاز ہو کر صرف اللہ سے ہی رشتہ جوڑ چکے ہوں۔

۱۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۲۴۱، باب الطمع۔

بنابریں ''یأس'' جو اس طمع کے مقابلے میں ہو اس کا دائرہ قنوطیت سے اعم ہوگا، کیونکہ اخص کے مقابلے میں اعم ہوتا ہے اور وہ رحمت سے ناامید ہونے سے عبارت ہے خواہ وہ اطاعت گزار نہ ہو یا مطیع تو ہو لیکن اس کی نظر اپنی عبادتوں پر ہو اور اسی سے اس کی امید وابستہ ہو جو اہل عرفان ومعرفت کے مسلک میں بجائے خود اللہ کی رحمت سے مایوسی اور دائرہ رحمت کو تنگ سمجھنے کے مترادف ہے۔

لیکن وہ ''طمع'' جس کا مفہوم بیان ہو چکا عقل کے لشکروں میں شامل ہے اور وہ فطرت سلیم کے تقاضوں کے عین مطابق ہے اور اس کی ضد (یأس) جہل کے لشکروں میں شامل ہے اور فطرت کے تقاضوں کے برخلاف ہے اور یہ بات واضح ہے، کیونکہ اپنے اعمال پر انحصار چھوڑ کر اللہ کی رحمت واسعہ سے لو لگانا ہی کمال مطلق سے عشق اور نقص وعیب سے نفرت کا فطری جذبہ ہے، یعنی اللہ نے بنی نوع انسان کی ذات میں ﴿فِطْرَةَ اللهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا﴾[۱] کے مطابق جو چیز شامل کی ہے یہ اس کا لازمہ ہے۔ جس طرح اپنی بڑائی اور اپنی انانیت نیز انانیت کی مختلف صورتوں (جن میں سے ایک اپنے اعمال پر تکیہ کرنا ہے) کو اہمیّت دینا فطرت محجوبہ کی جاہلانہ خطاؤں میں سے ایک ہے، کیونکہ فطرت محجوبہ خودبین، خود پسند اور خودسر ہوتی ہے۔ رجاء اور قنوطیت والے باب کے مطالعے سے اس سلسلے کے دیگر مباحث کی حقیقت بھی واضح ہو جائے گی۔

دوسری فصل

طمع اور یأس کے آثار

ممکن ہے کہ طمع اور رجاء کے درمیان ایک اور فرق بھی ہو۔ وہ یوں کہ طمع سے مراد ہو: گناہوں کی مغفرت اور جملہ نقائص وعیوب کی بخشش کی امید۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیم خلیل الرحمٰن علیہ السلام کی زبانی فرماتا ہے: ﴿وَالَّذِي أَطْمَعُ أَنْ يَغْفِرَ لِي خَطِيئَتِي يَومَ الدِّيْنِ﴾[۲] اور رجاء سے مراد ہے: ثواب خداوندی اور اللہ کی رحمت واسعہ کی توقّع وامید۔ یہ بھی ممکن ہے کہ معاملہ اس کے برعکس ہو۔ بنابریں ان میں

۱۔ اللہ کی وہ فطرت جس پر اللہ نے لوگوں کو خلق کیا ہے۔ سورۂ روم ۳۰۔

۲۔ اور میں جس سے امید رکھتا ہوں کہ وہ بروز قیامت میری خطاؤں سے درگزر فرمائے۔ سورۂ شعراء ۸۲۔

سے ہر ایک کی ضد بھی اسی حساب سے مختلف ہوگی۔

بہر صورت ذات پروردگار سے رجاء اور طمع رکھنا، نیز مخلوقات سے قطع امید کرتے ہوئے اللہ سے وابستہ ہونا فطرت سلیم کا لازمہ ہے۔ ذات پروردگار اور معصومین (علیہم السلام) نے اس چیز کی تعریف کی ہے۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے: ﴿وَادْعُوهُ خَوفاً وَطَمَعاً اِنَّ رَحْمَةَ اللهِ قَرِيبٌ مِنَ الْمُحْسِنِين﴾[1]

مؤمنین کی توصیف میں فرماتا ہے: ﴿تَتَجَافىٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوفاً وَطَمَعاً وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُون﴾[2]

جس طرح اللہ تعالیٰ سے رجاء، اس کی رحمت واسعہ کی "طمع" اور اس ذات پاک کے چشمہ فیض کی امید توحید کا ایک شعبہ اور فطرت مخمورہ کا لازمہ ہے، نیز اللہ کے علاوہ دیگر موجودات سے اپنی توقعات کو ختم کرنا اور لوگوں سے بے نیازی بھی خداداد فطرت مخمورہ کا لازمہ ہے، اسی طرح غیر اللہ سے طمع اور توقع وابستہ کرنا شرک کا ایک شعبہ ہے، نیز یہ شیطانی وسوسوں کا شاخسانہ فطرت سلیم کے منافی اور فطرت محجوبہ کا لازمہ ہے۔

کافی میں کلینیؒ اپنی اسناد کے ساتھ حضرت سجادؑ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؑ نے فرمایا: "دوسروں کے پاس موجود اشیاء سے اپنی امید قطع کرنے میں ہی مکمل بھلائی ہے"۔[3]

الوسائل میں شیخ حر عاملیؒ اپنی اسناد کے ساتھ امیر المؤمنینؑ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؑ نے محمد بن حنفیہ[4] کے نام اپنی وصیت میں فرمایا: "اگر تم دنیا و آخرت دونوں کی بھلائی باہم حاصل کرنا چاہتے ہو تو

۱۔ اللہ کو خوف اور امید کے ساتھ پکارو کہ اللہ کی رحمت نیکوکاروں کے قریب ہے۔ سورۂ اعراف ۵۶۔

۲۔ رات کو جن کے پہلو بستروں سے الگ رہتے ہیں۔ وہ اپنے ربّ کو خوف اور امید کے ساتھ پکارتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ سورۂ سجدہ ۱۶۔

۳۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۱۴۸، باب ۱۲۷، ح ۳۔

۴۔ محمد بن حنفیہ حضرت علیؑ کے فرزند برومند ہیں۔ ان کی والدہ خولہ بنت جعفر بن قیس ہیں جن کا تعلّق قبیلہ بنی حنفیہ سے تھا۔ وہ ۲۱ ہجری میں متولد ہوئے اور ۸۲ ہجری میں انتقال فرما گئے۔ امیر المؤمنینؑ نے ان کے بارے میں فرمایا: "محمد کا تعلّق ان محمد حضرات میں سے ہے جو اللہ کی نافرمانی سے اجتناب کرتے ہیں"۔
ملاحظہ ہو جامع الرواۃ اردبیلی، ج ۲، ص ۴۵؛ نیز ریحانۃ الادب، ج ۷، ص ۴۸۴، ۴۸۵۔

پھر دوسرے لوگوں کے پاس موجود اشیاء کی طمع نہ کرو"۔ [۱]

وسائل میں ہی ابوجعفر امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ فرمایا:

﴿أتىٰ رَجُلٌ رَسُولُ اللهِ صلى الله عليه وآله وسلم، فقالَ: عَلِّمْني يا رَسُولَ الله شَيْئاً! فقالَ: عَلَيْكَ بِالْيَأسِ مِمّا فِى أيْدي النّاسِ، فَإنَّهُ الغِنَى الحاضِرُ. قالَ: زِدْني يا رَسُولَ الله! قالَ: إيّاكَ والطَّمَعَ، فَإنَّهُ الفَقْرُ الحاضِرُ﴾ [۲] الحديث۔

حضرت صادقؑ اپنے آباءؑ سے نقل کرتے ہیں: ﴿سُئِلَ أميرُ المُؤمِنينَؑ: ما ثَباتُ الايمان؟ قالَ: الوَرَعُ، فَقِيلَ: ما زَوالُهُ؟ قالَ: الطَّمَعُ﴾ [۳]

نہج البلاغہ میں امیر المؤمنینؑ فرماتے ہیں: ﴿أكْثَرُ مَصارِعِ العُقُولِ تَحْتَ بُرُوقِ المَطامِعِ﴾ [۴]

الوسائل میں احمد بن فہد [۵] سے مروی ہے کہ وہ کہتے ہیں: امام صادقؑ سے منقول ہے کہ آپؑ نے اللہ تعالیٰ کے قول: ﴿وَما يُؤمِنُ أكْثَرُهُمْ بِاللهِ إلّا وَهُمْ مُشْرِكُون﴾ [۶] کے بارے میں فرمایا:

۱۔ وسائل الشیعہ، ج۱۶، ص۲۴، باب ۶۷، ح۵۔

۲۔ امام باقرؑ نے فرمایا: ایک شخص رسول اللہؐ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا: اے رسول خدا! مجھے کوئی چیز سکھائیں۔ حضورؐ نے فرمایا: جو کچھ لوگوں کے ہاتھوں میں ہے اس سے اپنی امید قطع کرو، کیونکہ یہ آشکار بے نیازی اور دولتمندی ہے۔ اس شخص نے عرض کیا: اے رسول خدا! میرے علم میں مزید اضافہ فرما۔ فرمایا: طمع سے بچو، کیونکہ طمع آشکار احتیاج اور فقر ہے۔
وسائل الشیعہ، ج۱۶، ص۲۵، باب ۶۷، ح۶۔

۳۔ امیر المؤمنینؑ سے سوال ہوا: ایمان کا استحکام کیا ہے؟ فرمایا: پارسائی۔ سوال ہوا: ایمان کا زوال کیا ہے؟ فرمایا: طمع۔
وسائل الشیعہ، ج۱۶، ص۲۵، باب ۶۷، ح۷۔

۴۔ امیر المؤمنینؑ نے فرمایا: عقلوں کا مات کھا کر گرنا زیادہ تر طمع کی چمک دمک کی وجہ سے ہے۔
عبدہ کی نہج البلاغہ، حکمت ۲۰، ص۷۰۶؛ نیز وسائل الشیعہ، ج۱۶، کتاب جہاد النفس، باب ۶۷، ص۲۵، حدیث ۸۔

۵۔ احمد بن فہد حلّیؒ ایک پرہیزگار، صاحب کرامات اور صاحب مقامات شیعہ عالم وفقیہ گزرے ہیں۔ وہ ۷۵۷ھ میں متولد ہوئے اور ۸۴۱ھ میں راہی ملک بقا ہوئے۔ ان کی بہت سی تالیفات ہیں جن میں سب سے مشہور دو کتابیں ہیں: ایک فقہ میں "المہذب البارع" اور دوسری دعا وذکر میں "عدۃ الداعی ونجاح الساعی" ہے۔
ریحانۃ الادب، ج۸، ص۱۴۵؛ نیز ہدیۃ الاحباب، قمی، ص۹۳۔

۶۔ ان میں سے اکثر اللہ پر ایمان نہیں لاتے مگر یہ کہ وہ مشرک ہیں۔ سورۂ یوسف ۱۰۶۔

طمع اور یأس کا بیان / ۱۸۳

﴿هُوَ قَولُ الرَّجُلِ لَولاَ فُلانٌ لَهَلَكْتُ، وَلَولاَ فَلانٌ مَا أَصِبْتُ كَذا وَكَذا، وَلَولاَ فُلانٌ لَضاعَ عِيالِي. أَلاَ تَرىٰ أَنَّهُ قَدْ جَعَلَ لِلّٰهِ شَرِيكاً فِي مُلْكِهِ يَرْزُقُهُ وَيَدْفَعُ عَنْهُ؟ قُلْتُ: فَيَقُولُ: ماذا؟ يَقُولُ: لَولاَ أَنْ مَنَّ اللهُ عَلَيَّ بِفُلانٍ لَهَلَكْتُ؟ قالَ: نَعَمْ لاَ بَأْسَ بِهٰذا أَوْ نَحْوِهِ﴾ ۱

یہ حدیث شریف معارف الٰہی کا لب لباب اور حقائق توحید کی جڑ ہے جو وحی الٰہی کے معدن اور علم ربانی کے مخزن سے صادر ہوئی ہے۔ یہ حدیث توحید خواص اور وحدت الوجود (وحدت در کثرت) کو بیان کرتی ہے جو اولیائے الٰہی کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔

یہ احادیث شریفہ تزکیۂ نفوس کی ضامن اور تربیت قلوب کا ذریعہ ہیں، کیونکہ مخلوقات سے دلبستگی اور اللہ جل جلالہ، سے غفلت ایسا دبیز حجاب ہے جو نور معرفت کو خاموش اور دل کو تاریک وسیاہ بنا دیتا ہے۔ یہ بدبخت شیطان کے خطرناک ترین حربوں میں سے ایک حربہ اور نفس کا ایک بڑا جال ہے جو انسان کو بارگاہ خداوندی سے دور اور معارف حقہ سے محروم بنا دیتا ہے۔

احادیث میں ہے کہ تمام خوبیاں لوگوں سے طمع اور امید کا رشتہ توڑ دینے میں جمع ہیں ۲۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں سے وابستہ توقعات کا خاتمہ صرف اللہ پر بھروسے اور باب اللہ تک رسائی کا راستہ کھول دیتا ہے جو تمام بھلائیوں کا مجموعہ اور تمام برکات کا محور ومرکز ہے، نیز یہ فطرت انسانی میں شامل ہے اور فطرت کی بنیاد اسی پر استوار ہے۔

۱۔ اس سے مراد یہ ہے کہ کوئی کہے: اگر فلاں آدمی نہ ہوتا تو میں ہلاک ہو جاتا۔ اگر فلاں شخص نہ ہوتا تو مجھے وہ فائدہ نہ ہوتا۔ اگر فلاں آدمی نہ ہوتا تو میرا گھرانہ تباہ ہو جاتا۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ یہ شخص اللہ کی سلطنت میں اس کیلئے ایسا شریک ٹھہرا رہا ہے جو اسے رزق دیتا ہے اور اس کی حفاظت کرتا ہے؟ (راوی کہتا ہے) میں نے عرض کیا: پھر وہ کیا کہے؟ کیا وہ یہ کہے کہ اگر اللہ فلاں شخص کے ذریعے میرے اوپر احسان نہ کرتا تو میں ہلاک ہو جاتا؟ فرمایا: یہ یا اس قسم کی بات کہنے میں کوئی حرج نہیں۔ وسائل الشیعہ، ج ۱۵، ص ۲۱۵، باب ۱۲، ح ۲؛ نیز ابن فہد حلی کی عدۃ الداعی، ص ۸۹۔

۲۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۱۱۹، باب الاستغناء عن الناس؛ نیز یہی ماخذ، ص ۲۴۱، باب الطمع۔

''توکل'' اور اس کی ضد ''حرص'' کا بیان

یہ مقصد چند فصلوں پر مشتمل ہے:

پہلی فصل

توکّل کا مفہوم

جان لو کہ لغت، احادیث اور بزرگان دین کے کلام میں توکل کے کئی قریب المعنی مفاہیم کا ذکر ہوا ہے جن میں سے اکثر کے ذکر کی کوئی ضرورت نہیں۔ بنابریں ہم ان میں سے صرف بعض کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

بظاہر توکل کا مفہوم (جیسا کہ اس کے مشتقات کی دلالت سے معلوم ہوتا ہے) یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے آپ کو کسی کام سے عاجز سمجھتے ہوئے اسے کسی اور شخص پر موقوف کرے، چنانچہ لفظ ''وکالت'' اور ''توکیل''[۱] بھی اس معنی پر مشتمل ہیں۔

جوہری نے صحاح میں، نیز دیگر اہل لغات نے ''توکل'' کی جو تعریف کی ہے شاید اس سے اس کا لازمہ مراد ہو۔ وہ توکل کی تعریف یوں کرتے ہیں: ﴿التَّوَكُّلُ اِظْهَارُ الْعَجْزِ وَالاِعْتِمَادِ عَلیٰ غَيْرِكَ﴾ [۲] یعنی، توکل اظہار عجز اور دوسروں پر اعتماد کا نام ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ توکل بنیادی طور پر عجز کے معنی میں ہو اور کام کو دوسروں پر موقوف کرنا عجز کا لازمہ ہو، چنانچہ عرب لوگ لفظ ''وَکَل'' اور لفظ

۱۔ راغب اصفہانی کی المفردات، ص ۵۳۱۔

۲۔ جوہری کی صحاح اللغہ، ج ۵، ص ۱۸۴۴، ۱۸۴۵؛ نیز لسان العرب، ج ۱۵، ص ۳۸۷، ۳۸۸۔

''وُکَلَہ''(بروزن ہُمَزَہ) کوایسے فرد کیلئے استعمال کرتے ہیں جو کسی کام سے عاجز ہواور اسے دوسروں پر موکول کرے۔[۱] ایک صاحب عرفان کہتے ہیں:﴿اَلتَّوَکُّلُ کِلَةُ الأمرِ کُلِّهِ اِلیٰ مالِکِهِ وَالتَّعوِیلُ عَلیٰ وَکالَتِهِ﴾[۲] یعنی توکل سے مراد ہے تمام امور کوان کے مالک کے سپرد کرنا اور اس کی وکالت پر اعتماد کرنا۔ کچھ علماء کہتے ہیں:﴿اَلتَّوَکُّلُ عَلَی اللهِ اِنقِطاعُ العَبدِ اِلَیهِ فِي جَمِیعِ ما یَأمَلُهُ مِنَ المَخلُوقِینَ﴾ یعنی، اللہ پر توکل سے مراد یہ ہے کہ بندہ ان تمام امور میں اللہ پر مکمّل اعتماد کرے جن کی وہ بندوں سے امید رکھتا ہے۔ ایک عارف کا کہنا ہے:﴿اَلتَّوَکُّلُ طَرحُ البَدَنِ فِي العُبُودِیَّةِ وَتَعَلُّقُ القَلبِ بِالرُّبُوبِیَّة﴾[۳] یعنی، توکل بدن کو عبودیت کیلئے وقف کرنے اور دل کو اللہ سے وابستہ کرنے سے عبارت ہے۔ احادیث شریف میں بھی توکل کے بارے میں روشنی ڈالی گئی ہے جن کا ذکر ہم بعد میں کریں گے۔

دوسری فصل

توکل کے ارکان

چار چیزوں پر ایمان واعتقاد کے بغیر توکل کا حصول ممکن نہیں۔ یہ چار چیزیں توکل کے ارکان کی حیثیت رکھتی ہیں:

پہلی چیز: اس بات کا یقین کہ وکیل کو (جس پر توکل کیا جائے) اس چیز کا پورا علم ہو جس کا موکل (توکل کرنے والا) محتاج ہے۔

دوسری چیز: اس بات کا یقین کہ وکیل موکل کی حاجت روائی پر قادر ہے۔

تیسری چیز: اس بات پر ایمان کہ وکیل بخل سے عاری ہے۔

چوتھی چیز: اس بات پر ایمان کہ وکیل کو موکل سے محبت وانس ہے۔

اگر ان چار شرائط میں سے کوئی ایک بھی حاصل نہ ہو تو توکل، یعنی وکیل پر اعتماد کا حصول ممکن نہیں۔ مثلاً اگر موکل احتمال دے کہ وکیل کو اس کے امور کا علم اور اس کی حاجت کا پتہ نہیں تو وہ اس پر بھروسہ کیسے کرسکتا

۱۔ سابقہ مأخذ۔

۲۔ عبدالرزاق کاشانیؒ کی شرح منازل السائرین، ص ۱۷۱۔

۳۔ عبدالکریم قشیری کی الرسالۃ القشیریۃ، ص ۲۶۳۔

ہے؟ اسی طرح اگر وہ اس کے علم پر تو ایمان رکھتا ہو لیکن یہ احتمال دے کہ علم کامل کے باوجود وکیل اس کی حاجت روائی سے عاجز ہے تو بھی وہ اس پر بھروسہ (توکل) نہیں کرے گا۔ اسی طرح اگر اسے اس کی طاقت وقدرت کا بھی علم ویقین ہو مگر یہ احتمال دے کہ وہ بخیل ہے تو اس صورت میں بھی موکل وکیل پر بھروسہ نہیں کر سکے گا۔ نیز اگر ان تینوں باتوں کا یقین ہو مگر اس کی محبت وشفقت پر شک ہو تو پھر بھی اس پر اعتماد و بھروسہ نہیں کرے گا اور توکل نہ ہو سکے گا۔ بنابریں توکل کی بنیاد مذکورہ چار امور پر استوار ہے۔

قبل ازیں ہم نے عرض کیا تھا کہ مذکورہ چار چیزوں پر ایمان واعتقاد رکھنا توکل کا بنیادی رکن ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ توکل کے مسئلے میں صرف علم واعتقاد کا ہونا کافی نہیں۔

اس مختصر نکتے کی توضیح یہ ہے کہ ممکن ہے کوئی شخص دلائل وبراہین کے ذریعے ان چار ارکان میں سے ہر ایک کو ثابت کرے اور تمام مراحل کو عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر واضح کرے لیکن یہ برہانی علم اس پر بالکل اثر انداز نہ ہو۔

بسا اوقات بعض ماہر اور مشاق فلسفی حضرات دلائل وبراہین کے ذریعے کائنات کے تمام ذرات، نیز عالم غیب وشہود پر اللہ کے مکمّل علمی احاطے کو ثابت کرتے ہیں اور ہر چیز کے خدا کے حضور حاضر ہونے، نیز ہر قسم کے تجرد کو اللہ کے تجرد کامل اور اللہ کی قیومیت کے احاطہ کامل کو قطعی اور محکم دلائل کے ذریعے ثابت کرتے ہیں لیکن ان کا یہ قطعی ویقینی علم ان پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ اسی لئے اگر وہ خلوت میں کسی گناہ میں مشغول ہوں اور کوئی ممیّز بچہ آجائے تو وہ شرم کے مارے اس قبیح عمل سے باز آجاتے ہیں لیکن اللہ کے حاضر وناظر ہونے، نیز فرشتوں کے حاضر ہونے اور اللہ کے اولیاء کُمّل کے حاضر ہونے کا علم رکھنے کے باوجود وہ ان ہستیوں سے شرمندہ نہیں ہوتے جبکہ یہ امور علمی دلائل وبراہین کے ذریعے ان کیلئے ثابت شدہ ہیں۔ ان کا یہ علم انہیں قبیح اعمال سے نہیں روکتا جبکہ حاضر کے حضور مؤدب رہنا، نیز حاضر وناظر، عظیم، منعم اور کامل ہستی کا احترام ملحوظ رکھنا وغیرہ انسانی معاشرے کے مسلّمہ اور بدیہی امور میں سے ہے۔ اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ مروجہ علمی وبرہانی علوم کا تعلّق عقل سے ہے اور ان عقلی امور سے قلبی وروحانی کیفیات حاصل نہیں ہوتیں۔

اسی طرح ممکن ہے کہ کوئی زبردست فلسفی اپنی پوری زندگی قدرت خداوندی کی عظمت کو ثابت کرنے میں صرف کرے اور علمی قطعی دلائل وبراہین سے ثابت کرے کہ کائنات میں اللہ کے علاوہ کسی کا کوئی عمل دخل

نہیں اور یہ کہ تمام موجودات خواہ وعالی مرتبہ ہوں یا حقیر، نیز غیب وشہود کی تمام قوتیں اس کائنات کے احاطے میں خالق کے سامنے بے بس ہیں اور کائنات کی حکومت صرف اللہ کی ہے، نیز پورا عالم بارگاہ خداوندی کے سامنے عاجز و بے بس ہے، نیز وہ دلائل قطعیہ کے ذریعے اس آیت ﴿یـا أَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ إِلَى اللهِ وَاللهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ﴾۱ کی حقیقت کو جان لے اور علمی براہین کی کسوٹی پر اللہ کی توحید افعالی کو پرکھ کر ثابت کرے لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ فلسفی عملی طور پر مخلوقات سے اپنی حاجات طلب کرے جو خود ضعیف اور محتاج ہیں اور غیر اللہ کی طرف اپنا دست حاجت دراز کرے۔ اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ عقلی ادراکات اور علمی براہین انسان کے قلب ودل پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ اس عقلی دنیا سے پرے اور بھی دنیایں ہیں۔ اس وادی سے آگے عشق کی اور بھی وادیاں ہیں اور ہم سب ابھی ان کی ابتدائی راہوں میں گم ہیں۔

پھر یہ بات کسی فلسفی یا علوم الٰہیات کے ماہر سے ہی مختص نہیں، بلکہ بسا اوقات ایک نام نہاد عارف بھی جو تجرید، تفرید، توحید اور وحدت الوجود کی ڈینگیں مارتا ہوا اسی بیماری میں مبتلا ہوتا ہے۔

کتنے ہی عظیم فقہا و محدّثین ایسے ہوں گے جو معصومین (علیہم السلام) کی احادیث سے آشنا ہوں، نیز خدا پر توکل اور بھروسے سے مربوط احادیث کے حافظ بھی ہوں اور ان احادیث کو وحی کا خزانہ بھی سمجھیں، نیز ان کی صداقت کے معتقد بھی ہوں اور برہانی علوم کی طرح ان پر ایمان بھی رکھتے ہوں لیکن اس کے باوجود وہ بھی اسی بیماری میں مبتلا ہوں۔ اب اس کی صرف یہی وجہ ہے کہ ان کے علم نے عقل وذہن کی حدود سے تجاوز نہیں کیا اور وہ دل کی حدود میں داخل ہی نہیں ہوا جو ایمان کے نور کی سرزمین ہے۔ جب تک علم قلب وذہن کی حدود میں مقید رہے گا اس سے قلبی اور روحانی کیفیتیں حاصل نہیں ہوں گی۔

پس اگر کوئی یہ چاہے کہ وہ اللہ پر توکل، اس پر بھروسے اور اس کے آگے تسلیم وغیرہ کی منزل تک رسائی حاصل کرے تو اسے چاہئے کہ وہ عقلی وذہنی علوم کی حدود کو پھلانگ کر ایمان کی حدود میں داخل ہو جائے اور ان ظاہری علوم پر اکتفا نہ کرے اور ان حقائق کے حصول کی شرائط وضروریات کو دل میں جگہ دے تاکہ یہ قلبی وروحانی کیفیات حاصل ہو سکیں۔ ہم نے قبل ازیں ان معارف کے حصول اور انہیں لوح قلب تک پہنچانے

۱۔ اے لوگو! تم لوگ اللہ کے محتاج ہو اور اللہ تو بے نیاز لائق ستائش ہے۔ سورۂ فاطر ۱۵۔

کے طریقے کا تذکرہ مختصر طور پر کیا ہے[1] اور اب بھی ان کا مختصر ذکر کرتے ہیں۔

جب عقل واضح طور پر توکل کی (چار) بنیادی شرائط کا ادراک کرلے تو اب سالک راہ عرفان کو چاہئے کہ وہ ان عقلی حقائق کو دل کے اندر جاگزین کرے اور یہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب نفس کے ساتھ جہاد کرنے والا انسان ہر روز اپنے لئے ایک ساعت معین کرے جس میں وہ مادی مسائل سے فارغ البال ہو اور اس خلوت کی گھڑی میں وہ یکسوئی اور قلبی توجہ کے ساتھ یادِ حق میں مشغول ہوجائے اور منقولہ اذکار و اوراد میں غور و فکر کرے۔

مثلاً اس فراغت کے وقت میں کلمہ ﴿لا الٰہ الا اللّٰہ﴾ (جو سب سے عظیم ورد ہے)[2] کو مکمّل قلبی توجہ کے ساتھ اس نیت سے پڑھے کہ دل کو اس کی تعلیم دے، نیز اطمینان قلبی اور غور و فکر کے ہمراہ اس ذکر شریف کا تکرار کرے۔ یوں وہ اپنے دل کو اس ذکر شریف سے بیدار کرے یہاں تک کہ رقّت قلبی اور دلی توجہ کی کیفیت حاصل ہوجائے پھر غیبی امداد کے ذریعے اس کا دل ذکر غیبی میں مشغول ہوجائے اور اس کی زبان دل کی تابع بن جائے۔

اگر ایک مدت تک یہ عمل ظاہری و باطنی آداب و شرائط کے ساتھ خلوت کے اوقات میں بجالاتا رہے تو احتمال قوی ہے کہ انسان کا دل بیدار ہوجائے اور زبان دل کی تابع بن جائے۔ (اس صورت میں نیند کی حالت میں بھی انسان کی زبان ذکر شریف کا ورد کرتی رہے گی) یہاں تک کہ دنیوی امور میں مشغول ہونے کے باوجود بھی انسان کا دل توحید خداوندی اور تفرید الٰہی کی طرف متوجہ رہے گا۔

اور اگر یہ عمل طہارت باطنی اور اخلاص کے ہمراہ شدّت کے ساتھ جاری رہے تو عین ممکن ہے کہ کوئی مصروفیت اسے یادِ الٰہی سے غافل نہ کرپائے اور توحید کا نور تمام کاموں پر غالب ہوجائے۔

اسی طرح اگر انسان اللہ کی رحمتوں میں خوب غور و خوص کے ذریعے پیدائش سے لے کر ابد تک حاصل شدہ اللہ کے وسیع لطف و شفقت اور رحمت کا احساس اپنے دل کو دلاتا رہے تو آہستہ آہستہ اس کا دل محبت

۱۔ ملاحظہ ہو، ص ۱۰۵ کتاب ہذا۔

۲۔ ﴿أفضَلُ الدُّعاءِ لا اِلٰهَ اِلاّ اللهُ، أفضَلُ الذِّكرِ لا اِلٰهَ اِلاّ اللهُ﴾۔ (کنز العمال، ج ۲، ص ۲۱۷، ح ۳۸۳۵؛ نیز مرصاد العباد، ص ۲۶۷)۔

خداوندی کے آثار کا ادراک کرلے گا اور جس قدر اس کی توجہ زیادہ ہوگی (خاص کر ذہنی فراغت کے اوقات میں) اسی حساب سے محبت میں اضافہ ہوگا یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کو اپنے حق میں تمام موجودات سے زیادہ شفیق ومہربان پائے گا۔ یوں وہ ﴿ أَرْحَمُ الرَّاحِمِين ﴾ کی حقیقت کو اپنے دل کے نور بصیرت سے دیکھنا شروع کرے گا۔

اسی طرح انسان کو چاہیئے کہ وہ سخت غور وفکر اور روحانی مشق کے ذریعے توکل کے دیگر ارکان کا احساس بھی اپنے دل کو دلاتا رہے یہاں تک کہ دل ان حقیقتوں سے مأنوس ہو جائے۔ اس صورت میں ان معارف کے آثار دل کے اندر جلوہ گر ہوں گے اور توکل، تفویض اور اعتماد وغیرہ کے نور سے روح منور ہو جائے گی۔ یوں اس کے دل کا طفل نومولود مادیت (جو اس کی رضاعی ماں ہے) کے پستان سے دودھ پینا چھوڑ دے گا اور غیر مادی وروحانی غذاؤں کا اہل بن جائے گا اور معاملات (جن میں توکل بھی شامل ہے) کے مرحلے سے ترقی کر کے دیگر مدارج تک رسائی حاصل کرے گا۔ اس طرح مادیت اور دنیا سے اس کی بے نیازی میں روز افزوں اضافہ ہوگا، علاوہ ازیں حقیقت، محبت، پاکیزگی اور آخرت کی منزل مقصود سے اس کا رابطہ مزید مستحکم ہوگا، نیز پہلے عملی توحید کا نور اور اس کے بعد اسمائی وصفاتی توحید کا اثر اس کے دل میں جلوہ گر ہوگا۔ یہ نور جس قدر زیادہ جلوہ گر ہوگا خود پرستی، خود بینی، انانیت اور تکبّر کا پہاڑ اسی قدر شدت سے پاش پاش ہوگا یہاں تک کہ انسانوں کے ربّ کے جلوہ کامل سے یہ پہاڑ مکمّل طور پر ریزہ ریزہ ہوگا اور کامل مدہوشی حاصل ہوگی: ﴿فَلَمَّا تَجَلَّىٰ رَبُّهُ لِلْجَبَلِ جَعَلَهُ دَكًّا وَخَرَّ مُوسَىٰ صَعِقًا﴾[۱]

افسوس کہ راقم جو شجرہ خبیثہ کی شاخوں کے درمیان پھنس گیا ہے اور مادیت کے تاریک کنویں میں گر چکا ہے نے روحانی ومعنوی مدارج اور انسانی کمال کے حصول کے بدلے چند بے سروپا الفاظ واصطلاحات کو رٹنے پر اکتفا کیا اور چند کھوکھلے مفاہیم کے پیچ وخم میں عمر عزیز کو برباد کیا۔ ادھر آگاہ وبیدار لوگوں نے دنیا اور دنیوی چیزوں سے اپنا دامن بچاتے ہوئے اپنی نجات کا سامان فراہم کیا۔ یوں وہ حیات انسانی، بلکہ حیات الٰہی سے ہمکنار ہو گئے، نیز وہ مادیت کی زنجیروں سے بیزار ہو گئے ﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُون﴾[۲] یہ مکمّل

۱۔ جب موسیٰ کے ربّ نے پہاڑ پر تجلی فرمائی تو اسے ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ سورۂ اعراف ۱۴۳۔

۲۔ بے شک ایمان والے کامیاب ہو گئے۔ سورۂ مؤمنون ۱۔

آزادی اور مادیت کے زندان سے رہائی بھی انہی مراحل میں سے ایک مرحلہ ہے۔اسی لئے ان کی توصیف میں فرماتا ہے:﴿وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ﴾ ۱ نیز ارشاد ہوتا ہے:﴿وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَعِبٌ وَلَهْوٌ﴾ ۲ ہم جیسے بدبخت لوگ ریشم کے کیڑے کی طرح خواہشات، آرزوں، تمناؤں، نیز دنیا اور اس کی رنگینیوں سے محبت کے تاروں کو اپنے گرد بنتے جارہے ہیں اور اس زندان کے اندر اپنے آپ کو ہلاکت کے منہ میں دھکیل رہے ہیں۔

خداوندا! اس ہلاکت سے نجات کا راستہ یہ ہے کہ تیرا فیض بیکراں ہماری دستگیری کرے اور تیری رحمت واسعہ ہم بیکسوں کے شامل حال ہو، نیز تیری ہدایت اور مدد کے طفیل ہمارے لئے ہدایت وکامیابی کا راستہ کھل جائے:﴿اِنَّكَ رَؤُوفٌ رَحِيمٌ﴾ ۳

تیسری فصل

مزید توضیح اور صاحبان عقل وفکر کیلئے نصیحت

عزیزوں! اگر تم برہان فلسفہ سے آشنا ہو تو پھر تم:﴿كُلُّ مُجَرَّدٍ عَاقِلٌ﴾ ۴ اور﴿بَسِيطُ الْحَقِيقَةِ كُلُّ الْكَمَالِ﴾ ۵ کی روشنی میں جان لوگے کہ عالم غیب کی ابتدا سے لے کر عالم حس کی انتہا تک خدا کے لا محدود، ہر چیز کو محیط، نیز حدود وقیود اور حجاب وتقید سے منزہ ازلی علم کے سامنے ازل سے لے کر ابد تک موجودات کا ہر ذرّہ عیاں اور ظاہر ہے شاید اللہ کا فرمان:﴿اَلاَ يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ﴾ ۶ اشارہ ہو اسی:﴿كُلُّ مُجَرَّدٍ عَاقِلٌ﴾ اور﴿بَسِيطُ الْحَقِيقَةِ كُلُّ الْكَمَالِ﴾ والے

۱۔ جو لوگ فضولیات سے دور رہتے ہیں۔ سورۂ مؤمنون ۳۔

۲۔ دنیا کی زندگی کھیل اور دل لگی کے سوا کچھ نہیں۔ سورۂ انعام ۳۲۔

۳۔ یقیناً تو بڑا مہربان رحم کرنے والا ہے۔ سورۂ حشر ۱۰۔

۴۔ ہر مجرد عاقل ہوتا ہے۔ (الاسفار الاربعۃ، ج ۳، ص ۴۴۷)۔

۵۔ جس کی ماہیت بسیط ہو وہ تمام کمالات کا حامل ہوتا ہے۔ (ایضاً، ج ۲، ص ۳۶۸؛ نیز، ج ۶، ص ۱۱۰)۔

۶۔ کیا موجودات کا خالق ان کی حالت سے باخبر نہیں حالانکہ وہ باریک اسرار سے باخبر اور ہر چیز سے خوب آشنا ہے؟ سورۂ ملک ۱۴۔

برہان کی طرف جیسا کہ آپ محکم فلسفی دلائل کے ساتھ جان چکے ہیں کہ کائنات کا ہر ذرّہ ازل سے لے کر ابد تک اللہ کے آگے حاضر ہے اور پورا عالم اللہ کے سامنے اور اس کی تجلّی گاہ ہے۔ جب یہ ثابت ہو جائے کہ کائنات اللہ کے ساتھ ربط وتعلّق کے علاوہ کچھ نہیں تو اللہ کے علم فعلی کا اثبات ہو جائے گا۔ چنانچہ قرآن کی یہ آیت علم فعلی کے مختلف مدارج کی طرف اشارہ کر رہی ہے: ﴿وَعِندَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ﴾[۱]

اگر تم اہل معرفت وعرفان ہو اور بڑے بڑے عرفاء کے نقش قدم پر چلنے والے ہو تو تم اللہ کے جلوہ احدی، جلوہ واحدی، جلوہ ذاتی اور جلوہ فعلی سے ثابت کرو گے کہ اللہ کا علم ذاتی اور علم فعلی کائنات کے ہر ذرّے پر محیط ہے۔

اگر تم آسمانی کتب، نیز صاحبان وحی کے پیروکار ہو تو یقیناً جان لو گے کہ اللہ کے علم کا ازلی اور ہر چیز پر محیط ہونا تمام ادیان کے نزدیک ایک مسلّمہ چیز ہے اور یہ اقرار کرو گے کہ ذات پروردگار کائنات کے تمام غائب اور حاضر ذرات سے آگاہ ہے، نیز علم خداوندی کی وسعت اور ہر چیز پر اس کے محیط ہونے کو قرآن سے کشف کرو گے۔[۲]

نیز تم علم وعرفان اور تقویٰ وایمان کے جس مرحلے میں بھی ہو بہر حال علم، برہان، شہود، تحقق، یقین، اعتقاد اور ایمان کے ذریعے پہچان لو گے کہ اللہ ربّ العزت کی طاقت ہر جگہ نافذ، اس کی حکومت ہر چیز کو شامل اس کی ملکیت لامحدود وکامل، نیز اس کی قہاریت اور قیومیت بے عیب، بیکراں اور ہر شئے پر محیط ہے، نیز تم اسے نقائص اور محدودیت سے منزہ، عیوب وقیود سے مبرا اور ہر نامناسب صفت، مثلاً بخل، کنجوسی، حسد، لالچ وغیرہ (جو عیوب ونقائص کے آثار ہیں) سے پاک قرار دو گے، کیونکہ اللہ کی ذات مقدس جو کمال مطلق اور جمال بے پایاں سے عبارت ہے ان نقائص سے مبرا اور عاری ہے۔ علاوہ ازیں تم تمام ممکنات وموجودات کے حوالے سے اللہ کی لامحدود اور ہر شئے پر محیط رحمت ورحمانیت، سخاوت وجود اور اس کی نعمتوں کو ظاہر وعیاں دیکھو گے۔ اس کی ساری نعمتیں یکطرفہ ہیں جو کسی سابقہ خدمت کا صلہ نہیں[۳]

۱۔ غیب کی چابیاں اسی کے پاس ہیں جنہیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ سورۂ انعام ۵۹۔

۲۔ سورۂ طٰہٰ ۹۸، سورۂ طلاق ۱۲، سورۂ حدید ۳، یونس ۶۱ اور سورۂ سبا ۲، ۳۔

۳۔ یہ امام سجادؑ کے اس فرمان سے ماخوذ ہے: ﴿كُلُّ نِعَمِكَ ابْتِدَاءٌ﴾ (صحیفۂ سجادیہ، ص ۷۶ فی الاعتراف وطلب التوبہ)۔

اللہ کی رحمانیت اور رحیمیت کا جلوہ تمام ممکنات پر محیط ہے خواہ وہ اطاعت گزار ہوں یا نافرمان، شقی ہوں یا سعید، نیز مؤمن ہوں یا کافر۔[۱]

رحمانِ مطلق صرف وہی ہے جس نے انسان کی خلقت سے پہلے اس کی مادی و معنوی، نیز دنیوی واخروی ضروریاتِ حیات کو آمادہ اور تیار کیا اسی ذات نے عناصر عالم طبیعت اور جسمانی وروحانی قوتوں کو اس انسان کیلئے مسخر کیا۔

اسی طرح رحیم کامل اور رحیم مطلق بھی صرف اللہ کی ذات ہے جس نے انسان کو اگرچہ پست ترین مادے سے پیدا کیا اور مخلوقات کے پاؤں تلے روندے جانے والے کثیف مادے کو اس کے وجود کا بیج قرار دیا[۲] لیکن اس کے باوجود اسے لامتناہی کمال کی بلندیوں کی طرف حرکت کرنے اور فنائے مطلق کے مقام تک پہنچنے کے قابل بنادیا۔[۳]

اے کمزور اور بے چارے انسان! ایک وقت تھا جب تو عدم کے کنویں میں پنہاں تھا۔ نہ تیری کوئی خبری تھی نہ تیرے آباء واجداد کا کوئی پتہ تھا۔ بقول شاعر: ''نہ از دُردنشان بود نہ از دُردنشان''[۴] ﴿هَلْ أَتىٰ عَلَى الاِنْسانِ حِينٌ مِنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئاً مَذْكُوراً﴾[۵] بتاؤ اس وقت کس کی قدرت کاملہ اور رحمت واسعہ نے تجھے اس بیکراں ظلمت سے نجات دی؟ کس کے مضبوط ہاتھوں نے تجھے وجود کا لباس پہنایا؟ کس نے تجھے کمال و جمال کی نعمت سے سرافراز فرمایا؟ اس روز جب کئی مراحل سے گزرنے کے بعد تجھے آباء واجداد کے صلبوں میں منتقل کیا گیا تو اس وقت تو کثیف اور گندے ذرات کا مجموعہ تھا۔ اس وقت

۱۔ اشارہ ہے اس آیت کی طرف: ﴿وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ﴾ (میری رحمت ہر چیز کو محیط ہے) سورۂ اعراف ۱۵۶۔

۲۔ اشارہ ہے اس آیت کی طرف: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَمَإٍ مَسْنُونٍ﴾ (ہم نے انسان کو خشک مٹی اور بدبودار کیچڑ سے پیدا کیا) سورۂ حجر ۲۶۔

۳۔ اشارہ ہے اس آیت شریفہ کی طرف: ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلىٰ رَبِّكَ كَدْحاً فَمُلاقِيهِ﴾ (اے انسان! تو مشقت اٹھا کر یقیناً اپنے ربّ کی طرف جانے والا ہے پھر اس سے ملنے والا ہے) سورۂ انشقاق ۶۔

۴۔ اشارہ ہے اس بیت کی طرف:

بودم آن روز من از طایفہ دُرد کشان کہ　　　نہ از تاک نشان بود و نہ از تاک نشان

۵۔ انسان پر ایسا وقت گزر چکا ہے جب وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا۔ سورۂ دہر ۱۔

کس کے دست قدرت نے تجھے ماؤں کے رحم میں منتقل کیا؟ اس یکساں اور سادہ مواد کو کس نے یہ مختلف شکلیں عطا کیں؟ تم کس عبادت اور خدمت کے عوض انسان بننے کے لائق ٹھہرے ہو؟ کس محنت کے صلے میں تو اس قدر عظیم ظاہری و باطنی نعمتوں کے مالک بنے ہو؟ تمہاری کونسی کوشش اور طلب تھی جس کے نتیجے میں شکم مادر کے تربیتی مراحل مکمّل ہوئے اور تمہیں دنیا میں قدم رکھنے کا موقع ملا؟ تمہارا کیا حق تھا اور کونسا عمل تھا جس کے بدلے اللہ نے ایک انسان کے سخت اور سنگین دل کو تمہارے لئے اس قدر شفیق و مہربان بنا دیا کہ (ولادت کی سختیوں اور دیگر تکالیف کے باوجود) وہ تمہاری ناز برداری کرتے ہوئے تمہیں دل و جان کی گہرائیوں سے پالتا ہے؟ یہ کس کی رحمت اور رحمانیت کا جلوہ ہے؟ یہ تیری کس کوشش طلب کا صلہ ہے؟ کون ہے جس نے تیری ولادت سے پہلے اس گندے خون کو ایسے لطیف اور مزے دار دودھ میں تبدیل کر دیا جو تیرے کمزور معدے کیلئے مناسب ترین غذا ہو؟ کس مخلوق کی کوشش اور سعی نے یہ سارا اہتمام کیا؟

عزیزو! تم کس لیاقت اور کوشش کے بدلے نزول وحی کے مستحق ٹھہرے ہو؟ اللہ کی سب سے بڑی رحمت اور بلند ترین نعمت صراط مستقیم کی ہدایت اور کامیابی کے راستوں کی رہنمائی ہے۔ ہمارا کون سا عمل یا ہماری کون سی لیاقت و عبادت ہے جس کے بدلے اللہ نے ہمیں اس بڑی نعمت سے نوازا ہے؟ ہم اپنی کس خدمت کے باعث انبیائے عظام اور اللہ کے سفیروں کے وجود سے مستفید ہونے کے لایق بنے ہیں؟

اللہ کی عطا کردہ ان لامحدود، لاتعداد اور ان گنت ظاہری و باطنی نعمتوں میں سے کون سی نعمت[۱] ہے جس میں کوئی انسان یا کوئی اور مخلوق شریک اور حصہ دار ہو؟

اے محجوب انسان! تم اللہ کی بے مثال نعمتوں میں غرق ہو اور اس رحمان و رحیم کی رحمتوں میں ڈوبے ہوئے ہو لیکن تم اپنے منعم حقیقی کو بھولے ہوئے ہو۔ اب جبکہ تم عقل و شعور کی منزل پر آ گئے ہو تو ہر تنکے کا سہارا لیتے ہو اور کمزور بنیادوں پر بھروسہ کرتے ہو؟

آج تمہیں چاہئے تھا کہ اللہ کی نعمتوں اور رحمتوں میں غور و فکر کرتے ہوئے کمزور مخلوقات کی طرف اپنا دست حاجت دراز نہ کرتے، نیز اللہ کے لطف عام اور لطف خاص پر نظر رکھتے ہوئے غیر اللہ کے دروازے

۱۔ اشارہ ہے اس آیت کی طرف: ﴿وَاِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللهِ لاٰ تُحْصُوهَا﴾ اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو ان کا شمار نہ کر سکو گے۔ سورۂ نحل ۱۸۔

سے اپنی امیدیں قطع کرتے اور رحمت خداوندی کے علاوہ کسی چیز پر بھروسہ نہ کرتے لیکن کیا بات ہے کہ تم اپنے منعم حقیقی کو بھول چکے ہو؟ کیا وجہ ہے کہ آج تم اپنی ذات اور اپنے عمل کے اوپر، نیز دیگر مخلوقات اور ان کے اعمال پر بھروسہ کرلیا ہے اور اس قسم کے شرک خفی یا شرک جلی کے مرتکب ہوئے ہو؟

کیا تجھے اللہ کے دائرہ اختیار میں اس کے علاوہ کسی اور کا عمل دخل نظر آتا ہے؟ کیا تجھے کسی اور قاضی الحاجات کا سراغ مل گیا ہے یا تو اللہ کے دست قدرت کو کوتاہ اور مجبور پاتا ہے یا اس کی رحمت کے دائرے کو اپنے لئے محدود پاتا ہے؟ کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ وہ تجھ سے یا تیری ضروریات سے غافل ہے؟ کیا تو اس کی قدرت، طاقت وحکومت کو محدود خیال کرتا ہے؟ کیا تو اسے (نعوذ باللہ) کنجوسی اور بخل کا حامل سمجھتا ہے؟

اے دل کے اندھے مصنف! اے خواہشات نفسانیہ کے غلام! اے آب وخاک کے اسیر! تیرے باطن کی یہ تاریکی اور اندھاپن کب تک؟ تیرے دل کا اندھاپن کب تلک؟ تو کب تک اپنے منعم حقیقی سے غافل اور اس کے جمال وجلال کی معرفت سے محروم رہے گا؟ تو کب تک شیطان کے دام فریب اور وساوس نفسانیہ کے گرداب میں پھنسا رہے گا؟

ذرا خواب گراں سے بیدار ہو جاؤ، غیر اللہ کا نظارہ اور غیر اللہ سے محبت چھوڑ دو۔ نور توحید کو اپنے دل میں پہنچاؤ۔ اپنی روح کے باطن کو ﴿لاَ حَولَ وَلاَ قُوَّةَ اِلاَّ بِاللهِ﴾ کی حقیقت سے آگاہ کرو۔ شیاطین جن وانس کو حق کے دائرہ اختیار میں تصرف سے روکو۔ کمزور اور بے چارے انسانوں سے اپنی امیدیں قطع کرلو۔ ﴿يٰـا أَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوا لَهُ اِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللهِ لَنْ يَخْلُقُوا ذُبَاباً وَلَوِ اجْتَمَعُوا لَهُ وَاِنْ يَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئاً لاَ يَسْتَنْقِذُوهُ مِنْهُ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوبُ مَا قَدَرُوا اللهَ حَقَّ قَدْرِهِ اِنَّ اللهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ﴾[1]

خداوندا! عزت اور قوت صرف اقتدار وحکومت صرف تجھے زیبا ہے۔ ہم کمزور اور بیچارے لوگ دنیا سے شدید محبت کے باعث اپنے وجود سے غافل ہو چکے ہیں اور اپنی فطریات کو بھول چکے ہیں۔ ہم

۱۔ اے لوگو! ایک مثال دی جاتی ہے اسے سنو! اللہ کے سوا جن معبودوں کو تم پکارتے ہو وہ ایک مکھی بنانے پر بھی ہرگز قادر نہیں ہیں خواہ اس کام کیلئے وہ سب جمع ہو جائیں اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے تو یہ اس مکھی سے اس چیز کو چھڑا بھی نہیں سکتے۔ طالب اور مطلوب دونوں کمزور ہیں۔ لوگوں نے اللہ کی ویسی قدر نہیں کی جیسی قدر کرنی چاہئے تھی۔ اللہ یقیناً بڑا طاقتور غالب آنے والا ہے۔ سورۂ حج ۷۳،۷۴۔

کمزور اور بیچاری مخلوقات کے دلدادہ ہو چکے ہیں اور ان پر اعتماد و بھروسہ کرنے لگے ہیں، حالانکہ اگر کوئی مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے تو سے اسے اس مکھی سے واپس نہیں لے سکتے، نیز اگر وہ سب متحد ہو جائیں تب بھی کسی چیونٹی میں تصرف نہیں کر سکتے۔ یوں ہم تیری مقدس ذات اور تجھ پر توکل سے دور ہو گئے ہیں۔

خداوندا! ہمارے اس ہرجائی دل کو یکسوئی دے؛ ہماری ان آنکھوں کو جو تیرے علاوہ اوروں پر بھی نظر رکھی ہوئی ہیں صرف اپنے اوپر مرکوز فرما؛ ہمارے دلوں میں توحید، تفرید اور تجرید کا جلوہ ظاہر فرما؛ ہماری انانیت اور خود بینی کے پہاڑ کو ریزہ ریزہ اور ملیامیٹ کر دے۔ ہمیں فنا کی منزل تک پہنچا دے تا کہ ہم ''توکل'' پر توجہ سے بھی بے نیاز ہو جائیں ﴿اِنَّکَ الوَلِيُّ المِفْضَال﴾۔

چوتھی فصل

توکل کے درجات و مراحل

یاد رہے کہ توکل کے ارکان کی معرفت میں اختلاف کے تناسب سے توکل کے درجات میں بھی اختلاف ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص علمی و ذہنی نقطہ نظر سے ارکان توکل کی شناخت حاصل کر لے تو وہ توکل کی ضرورت کا قائل ہو جائے گا (علم برہان کے لحاظ سے)۔ قبل ازیں ہم جان چکے ہیں کہ اس مرحلے کو توکل نہیں کہا جا سکتا۔[۱] اور اگر انسان توکل کے ارکان پر قلبی ایمان و اعتقاد رکھتا ہو تو وہ مقام توکل کا حامل بنے گا اور یہ توکل کا پہلا مرحلہ ہے۔

مؤمن کا یہ ایمان ہے کہ تمام موجودات اس کی خاطر خلق ہوئی ہیں اور وہ خود اللہ کی خاطر خلق ہوا ہے جیسا کہ اس بات کی شہادت انسان کی جامع خلقت دیتی ہے، چنانچہ آیت قرآنی کہتی ہے: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الاِنْسانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيم ☆ ثُمَّ رَدَدْناهُ أَسْفَلَ سافِلِين﴾ [۲] نیز قرآن کہتا ہے: ﴿وَعَلَّمَ آدَمَ الأَسْماءَ كُلَّها﴾ [۳] نیز علی علیہ السلام سے منسوب اشعار میں آپؑ فرماتے ہیں: ﴿أتزعَمُ أنَّکَ جِرمٌ صَغِيرٌ

۱۔ دیکھئے، ص ۱۸۷۔

۲۔ بہ تحقیق ہم نے انسان کو بہترین اعتدال میں پیدا کیا۔ پھر ہم نے اسے پست ترین حالت کی طرف پلٹا دیا۔ تین ۴، ۵۔

۳۔ خدا نے آدمؑ کو سارے نام سکھا دیئے۔ سورۂ بقرہ ۳۱۔

﴿وَفِيكَ انْطَوىٰ الْعَالَمُ الأكْبَرُ﴾۱ بنابریں عالم غیب وشہود کی تمام موجودات اس لئے خلق ہوئی ہیں تا کہ اس عظیم المرتبت انسان کو اپنے اصل مقام تک پہنچائے جیسا کہ حدیث قدسی میں مذکور ہے: ﴿يَا بْنَ آدَمَ خَلَقْتُ الأشْيَاءَ لِأجْلِكَ وَخَلَقْتُكَ لِأجْلِي﴾۲

پس جب انسان یہ دیکھ لے کہ تمام اشیاء اس کیلئے خلق ہوئی ہیں، نیز جب وہ اپنی بھلائی اور اپنے آپ کو منزل کمال تک پہنچانے کیلئے اشیاء کے استعمال کی کیفیت کو پہچان لے اور اللہ جل جلالہ کو ان اشیاء کی صلاح کا عالم جان لے، نیز توکل کے باقی ارکان کو نور ایمانی کے ذریعے درک کرلے تو وہ اللہ پر توکل کرنا شروع کر دے گا اور اس کی مقدس ذات کو اس عظیم مقصد کے حصول کیلئے اپنا معتمد قرار دے گا۔

جب ایمان اطمینان کی حدود میں داخل ہو تو تزلزل اور اضطراب وشکوک کا مکمّل صفایا ہو جائے گا اور دل کو حق اور تصرف برحق کے باعث سکون حاصل ہوگا۔ انسان جب تک ان حدود میں رہے گا دوئی اور کثرت سے روبرو رہے گا اور اللہ کے علاوہ دیگر اشیاء کے تصرفات کا قائل رہے گا۔ لیکن جب وہ اس مقام سے گزر جائے تو نور معرفت کے ذریعے توحید کے جلوؤں میں سے ایک جلوہ دیکھ لے گا اور دیگر اشیاء کے تصرفات کو لغو قرار دے گا، نیز اس کا دل دیگر موجودات سے مکمّل طور پر آنکھیں پھیر لے گا یوں اس کا دل اللہ پر توکل اور بھروسے کے نور سے روشن ہو جائے گا۔

جب وہ اس مقام سے بھی آگے نکل جائے تو وہ مشاہدہ حضوری کے ذریعے جلوہ توحید کا مشاہدہ کرے گا اور توکل کے اسباب کا ادراک کرنے لگے، کیونکہ توکل عبارت ہے ایسے ذاتی امور میں اللہ کو وکیل قرار دینے سے جنہیں وہ اپنے امور سمجھتا ہے۔ پس وہ اس نئے مرحلے میں توکل کو بھی خیر باد کہہ دے گا اور سارے امور کو ذات حق سے منسوب ومربوط قرار دے گا۔ اس طرح وہ توکل، توکیل اور وکالت کو عیب وشرک سمجھے گا، کیونکہ ﴿حَسَنَاتُ الأبْرَارِ سَيِّئَاتُ المُقَرَّبِينَ﴾۳

یاد رہے کہ توکل طلب رزق کے منافی نہیں، بلکہ توکل کے بہانے محنت اور طلب رزق کو ترک کرنا

۱۔ کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ تو ایک چھوٹا سا جسم ہے حالانکہ تیرے اندر عالم اکبر پنہاں ہے؟ دیوان علیؑ، ص ۱۳۴۔

۲۔ اللہ فرماتا ہے: اے بنی آدم! میں نے ہر چیز کو تیرے لئے لیکن تجھے اپنے لئے خلق کیا ہے۔ دیکھئے، کلمۃ اللہ، ص ۱۶۹؛ نیز فیض کاشانیؒ کی علم الیقین، ج ۱، ص ۳۸۱۔

۳۔ ابرار کی نیکیاں مقرب لوگوں کے نزدیک گناہ شمار ہوتی ہیں۔ بحار الانوار، ج ۲۵، ص ۲۰۵، ح ۱۶۔

عیب اور جہل کی علامت ہے۔ توکل اسباب وعلل پر بھروسہ نہ کرنے اور تمام اسباب وعلل کو مسبب الاسباب کی طرف لوٹانے سے عبارت ہے لیکن یہ بات اسباب کے ساتھ سروکار رکھنے سے منع نہیں کرتی۔ کچھ لوگوں کا یہ قول ہے کہ توکل کا ایک مرحلہ (توکل خاصہ) یہ ہے کہ متوکل اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے مقام توکل[۱] کی اصلاح کیلئے زادراہ اور سواری کے بغیر بیابانوں میں سفر کرے، چنانچہ ابراہیم الخواص سے منقول ہے کہ حسین بن منصور نے اس سے ملاقات کی۔ وہ بیابانوں میں پھرتا رہتا تھا۔ جب اس نے اس کے حالات پوچھے تو کہنے لگا: میں بے آب وگیاہ صحراؤں میں پھرتا ہوں تاکہ اپنے آپ کو آزماؤں کہ مجھے اللہ پر توکل اور بھروسہ ہے یا نہیں؟ حسین نے کہا: تم جو اپنے باطن کی اصلاح میں اپنی زندگی صرف کر رہے ہو کب فناء فی التوحید کے مقام کو پہنچو گے؟[۲]

یہ دونوں افراد توحید اور توکل کی حقیقت سے ناآشنا تھے، کیونکہ وہ صحرا میں پھرنے اور توحید میں فرق نہ کرسکے۔ انہوں نے ترک عمل اور اللہ کی خداداد صلاحیتوں سے کام نہ لینے کو توحید وتوکل سمجھا جبکہ یہ توحید وتوکل کو نہ سمجھنے کی دلیل ہے، کیونکہ توحید سے مراد اس بات کا یقین کرنا ہے کہ مخلوق کچھ نہیں کرتی، بلکہ سب کچھ اللہ کر رہا ہے۔ توحید یہ ہے کہ انسان مخلوقات کے آئینے میں جمال پروردگار کا مشاہدہ کرے۔ البتہ اگر مخلوقات رؤیت حق کی راہ میں حجاب بن جائیں تو یہ امر توحید کے منافی ہے خواہ انسان صحرا میں پھرے یا نہ پھرے۔

پس سالک الی اللہ کو چاہئے کہ توکل کی اصلاح کیلئے نور معرفت کے ذریعے ظاہری اسباب سے دوری اختیار کرے، یعنی ظاہری اسباب سے حاجت طلب نہ کرے لیکن اس کا مقصد یہ نہیں کہ وہ سرے سے ترک عمل کا وطیرہ اختیار کرے۔

چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مشہور عارف خواجہ انصاری کے قول کا مفہوم بھی یہی ہے، چنانچہ وہ کہتے ہیں:

﴿وَالدَّرَجَةُ الثّانِيَةُ: التَّوَكُّلُ مَعَ اِسْقاطِ الطَّلَبِ وَغَضِّ العَيْنِ عَنِ السَّبَبِ اِجْتِهاداً فِي

۱۔ دیکھئے، غزالی کی احیاء علوم الدین، ج ۴، ص ۲۶۸، کتاب التوحید والتوکل بیان اعمال التوکلین۔

۲۔ دیکھئے، عبدالکریم قشیری کی الرسالۃ القشیریہ، ص ۲۶۴۔

تَصْحِيحُ التَّوَكُّلِ ۱ یعنی دوسرا مرحلہ توکل کا یہ ہے کہ اسباب (ظاہری) سے چشم پوشی کی جائے اور ان سے طلب حاجت نہ کی جائے تاکہ حقیقی توکل حاصل ہو جائے۔ شارح عبدالرزاق قاسانی ۲ نے اس سے کچھ اور مراد لیا ہے اور اس کی کچھ اور شرح کی ہے۔ ۳

خلاصہ یہ کہ اپنی اور مؤمنین کی حاجتوں کی برآوری کیلئے جدوجہد اور محنت کرنا توکل کے منافی نہیں جیسا کہ واضح ہو چکا ہے۔

پانچویں فصل

توکل کا تعلّق عقل اور فطرت مخمورہ سے ہے، جبکہ حرص کا تعلّق جہل و ابلیس اور فطرت محجوبہ سے ہے

جان لو کہ تمام انسانوں کی فطرت میں قدرت ازلی کے قلم سے رقم شدہ لطائف وحقائق، نیز فطرت مخمورہ کے ثمرات میں سے ایک احتیاج وفقر کی خاصیت ہے۔ وہ اس طرح کہ تمام بنی نوع انسان (بغیر کسی استثناء کے) کسی قسم کے اختلاف رائے کے بغیر اپنی ماہیت، اپنے ذاتی وجود اور اس وجود کو مطلوب کمالات کے لحاظ سے اپنے آپ کو محتاج پاتے ہیں۔ بطور فرض اگر ان کا ایک لامتناہی سلسلہ وجود میں لایا جائے تب بھی اس لامتناہی سلسلے کی تمام کڑیاں یک زبان اپنے احتیاج وفقر کا اعلان واظہار کریں گی، بلکہ احتیاج کا یہ اصول کائنات اور عالم امکان کے تمام موجودات میں جاری وساری ہے۔ پس اگر حیوانات، نباتات، جمادات، معارف اور عناصر کے لامتناہی سلسلے قائم ہو جائیں اور کوئی ان سے سوال کرے کہ کیا تم

۱۔ دیکھئے، شرح منازل السائرین، ص ۱۷۴۔

۲۔ شارح قاسانی سے مراد ملا عبدالرزاق کاشانی" متوفی ۷۳۵ھ ہیں۔ وہ آٹھویں صدی ہجری کے عارف، محقق اور علوم ظاہری وباطنی کے جامع تھے۔ وہ شیخ کبیر صدرالدین قونیوی کے معروف شاگرد اور علاءالدولہ سمنانی کے ہم عصر تھے اور ان کے ساتھ عرفانی مکاتبات کا سلسلہ رکھتے تھے۔ شیخ داؤد قیصری شارح فصوص الحکم جیسے محقق ان کے شاگرد تھے۔ کاشانی کی بہت سی تالیفات ہیں جن میں سب سے مشہور یہ ہیں: ابن عربی کی فصوص الحکم کی شرح، خواجہ عبداللہ انصاری کی منازل السائرین کی شرح، تأویلات آیات قرآن کریم (جسے غلطی سے ابن عربی کی طرف نسبت دی گئی ہے)، اصطلاحات الصوفیہ۔ (دیکھئے، آقا بزرگ تہرانی کی الذریعہ، ج ۱۴، ص ۱۸۸؛ نیز جامی کی نفحات الانس، ص ۴۸۳۔

۳۔ شرح منازل السائرین، ص ۱۷۴، ۱۷۵۔

اپنے وجود اور اس وجود کے کمالات و آثار کے معاملے میں بے نیاز ہو یا نہیں؟ تو وہ سب اپنی ذاتی وفطری زبان حال سے یوں جواب دیں گے: ہم سب کسی کے محتاج، مفتقر اور مرہون منت ہیں۔ اس کے بعد اگر کوئی شخص موجودات کے ان لامتناہی سلسلوں سے ایک جامع و مانع سوال کے طور پر یوں پوچھے: اے خوش بختوں کے لامتناہی سلسلے! اے بدبختوں کے لامتناہی سلسلے! اے حیوانات کے لامتناہی سلسلے! اے نباتات ومعادن وعناصر وجنات وملائکہ وغیرہ وغیرہ کے لامتناہی سلسلے! بتاؤ کہ تم سب کس وجود کے محتاج ہو؟ اس کے جواب میں یہ تمام سلسلے اپنی فطری زبان حال سے بیک زبان کہیں گے: ہم ایسی ذات کے محتاج ہیں جو ہماری طرح محتاج اور مفتقر نہ ہو۔ ہم اس ذات کے مرہون منت ہیں جو خود ہم ممکنات کی طرح کسی اور کا مرہون منت نہ ہو، بلکہ وہ اپنے تئیں بے نیاز، کامل اور آزاد ہو۔ جو کوئی اپنے تئیں کچھ نہ رکھتا ہو اور اپنی ذات وصفات اور افعال میں کسی اور کا محتاج ہو اور بے نیاز نہ ہو، نیز وجود کے تمام زاویوں سے محتاج وفقیر ہو وہ نہ ہمارے احتیاج کو دور کر سکے گا نہ ہماری ضروریات پوری کر سکے گا۔ وہ سب اپنی خداداد اور فطری وذاتی زبان حال سے یہ شعر پڑھیں گے: ذات نایافتہ از ہستی بخش کی تواند کہ شود ہستی بخش ؟![1]

اگر ہم اس فطرت کی تفصیلات میں ذرا جائیں تو تمام اسماء وصفات جو دار وجود میں موجود ہیں اور کمالات مطلقہ میں سے ہیں غنی مطلق کی ذات مقدس کیلئے ثابت ہو جائیں گی پھر اس فطرت کے تقاضے یعنی خوف ورجاء، توکل وتسلیم اور اللہ پر بھروسہ وغیرہ ظاہر ہوں گے۔

معلوم ہوا کہ اپنے نقائص واحتیاجات کی برطرفی کیلئے کسی ناقص کا کامل مطلق ہستی کی طرف توجہ اور رجوع کرنا ایک فطری وجبلی امر ہے۔ نیز یہ کہ توکل کا تعلق عقل کے لشکروں سے ہے اور یہ فطرت مخمورہ کے لوازم میں سے ایک ہے۔

علاوہ ازایں حرص درحقیقت دنیا اور اس کی رنگینیوں کے ساتھ شدید قلبی لگاؤ، ظاہری اسباب کے ساتھ تمسک، نیز اہل دنیا اور دنیوی امور کی طرف ذہنی رغبت سے عبارت ہے اور وہ خود حق تعالیٰ اور اس کی قدرت کاملہ، اس کی عطوفت اور رحمت سے لاعلمی کا نتیجہ ہے۔ پس جب انسان حق کو دیکھ سکتا اور ظاہری اسباب کی طرف توجہ دیتا ہے اور ان اسباب کو بے نیاز خیال کرتا ہے تو وہ قلبی اور عملی طور پر ان اسباب سے

۱۔ جسے وجود کی نعمت ہی حاصل نہ ہو وہ کسی اور چیز کو وجود کیسے عطا کر سکتا ہے؟۔

متمسک اور حق سے لاتعلق ہو جاتا ہے۔ یوں اس کے دل سے اطمینان اور اعتماد رخصت ہوتے ہیں اور اضطراب وتزلزل ان کی جگہ لیتا ہے، پھر جب ظاہری اسباب وعوامل سے اس کی حاجت پوری نہیں ہوتی اور اس کا آتش شوق ٹھنڈی نہیں ہوتی تو اس کے اضطراب میں اضافہ، نیز دنیا اور اہل دنیا کے ساتھ اس کے لگاؤ، تمسک اور ارتباط میں شدت آتی ہے یہاں تک کہ انسان مکمّل طور پر دنیا میں کھو جاتا ہے اور اسی میں غرق ہو جاتا ہے۔

ظاہر کہ خود حرص، نیز اس کا لازمہ اور اس کا ملزوم سب کے سب فطرت کی محجوبیت کا نتیجہ ہیں، نیز یہ سب جہل اور ابلیس کے لشکروں میں شامل ہیں۔ حرص بذات خود شر اور شر کے لوازم میں شامل ہے، نیز شر پر ختم ہوتا ہے۔ حرص کی طرح شاید ہی کوئی چیز انسان کو دنیا سے نزدیک کرنے، نیز حق تعالیٰ اور اس کی مقدس ذات سے تمسک کی دولت سے محروم رکھنے والی ہو۔

چھٹی فصل

توکل کی تعریف
اور حرص کی مذمت آیات و احادیث کی روشنی میں

اللہ تعالیٰ سورۂ انفال میں مؤمنین کی توصیف کرتے ہوئے فرماتا ہے: ﴿اِنَّمَا الْمُؤمِنُونَ الَّذِینَ اِذا ذُکِرَ اللهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَاِذا تُلِیَتْ عَلَیْهِمْ آیاتُهُ زادَتْهُمْ اِیْماناً وَعَلیٰ رَبِّهِمْ یَتَوَکَّلُون﴾ پھر فرماتا ہے: ﴿أُولٰئِکَ هُمُ الْمُؤمِنُونَ حَقّاً﴾[۱]

یہاں اللہ تعالیٰ مؤمنین کے دائرے کو محصور اور محدود کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ مؤمنین یہی ہیں جو ان مذکورہ صفات کے حامل ہوں۔ یعنی ان کے علاوہ دیگر لوگ مؤمن نہیں ہیں!

ان صفات میں سے ایک صفت یہ ہے کہ مؤمنین اپنے پروردگار پر اعتماد، توکل اور بھروسہ کرتے ہیں اور اپنے کاموں کو اس کے سپرد کرتے ہیں، نیز اس کی مقدس ذات کے دلدادہ ہیں۔ جو لوگ اللہ کو چھوڑ کر کسی

۱۔ مؤمن تو صرف وہ ہے کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل کانپ جاتے ہیں اور جب انہیں اس کی آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ اپنے ربّ پر بھروسہ کرتے ہیں، (پھر فرماتا ہے:) یہی لوگ حقیقی مؤمن ہیں۔ سورۂ انفال ۲،۴۔

اورکو اپنے اعتماد اور بھروسے کا محور بنا لیتے ہیں یا اپنے کاموں میں کسی اور سے اپنی امید وابستہ کرتے ہیں، نیز غیر اللہ سے حاجب روائی کے طالب ہوتے ہیں وہ ایمان کی حقیقت سے محروم اور ایمان کے نور سے تہی دامن ہوتے ہیں۔ قرآن کریم کی یہ آیت اور اس طرح کی دیگر آیات[۱] اس بات کی دلیل ہیں کہ جب تک انسان ایمان کے مرتبے تک نہ پہنچے وہ مقام توکل تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔[۲]

سورۂ مبارکہ تغابن میں فرماتا ہے: ﴿اللّٰہُ لَا اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْن﴾[۳] اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بطور تمہید پہلے کلمہ توحید کا ذکر کیا ہے اس کے بعد مؤمنین کو تاکید کے ساتھ حکم دیا ہے کہ وہ اللہ پر بھروسہ کریں۔ شاید اس کا مقصد یہ ہو کہ اس سے قبل ذکر شدہ آیت میں مذکور مرتبے سے بالاتر مقام کی طرف اشارہ کیا جائے، چنانچہ سابقہ آیت میں اللہ پر توکل کو مؤمنین کی صفات میں شمار کیا گیا تھا لیکن اس آیت میں انہی (صاحب توکل) مؤمنین کو توکل کا حکم دیا جا رہا ہے۔ اس آیت میں کلمہ توحید کا ذکر شاید اس بات کی طرف اشارہ ہو (جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا کہ ایمان کے کامل ہونے کے بعد عملی توحید سالک کے دل میں جلوہ فگن ہو اور وہ اس جلوے کی بدولت یہ یقین حاصل کر لے کہ اللہ تعالیٰ کی قلمرو میں اس کے علاوہ کسی اور کی الوہیت یا کسی اور کا عمل دخل نہیں یہاں صرف اسی کا تصرف اور اسی کا عمل دخل ہے اور وہی سارے امور کو چلاتا ہے، نیز اس کے علاوہ عالم میں نہ کوئی ضرر پہنچانے والا موجود ہے نہ فائدہ پہنچانے والا، یوں مؤمن توکل سے بھی بالاتر مقام کو حاصل کرتا ہے۔ سورۂ آل عمران میں رسولؐ سے یوں خطاب ہوتا ہے:
﴿فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَوَکِّلِیْن﴾[۴]

شاید یہ توکل کا بلند ترین مرتبہ ہو جس کا ہم نے قبل ازیں ذکر نہیں کیا۔ یہ توکل کا وہ مقام ہے جو سالک راہ حق کو فناء کامل، اپنے قلمرو میں واپسی اور بقاء باللہ کے مرحلے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ اس مرحلے میں سالک کثرت کے اندر واقع ہونے کے باوجود وحدت کاملہ میں غرق ہوتا ہے، نیز مخلوقات کے عمل دخل کا تفصیلی مشاہدہ کرنے کے باوجود اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو صاحب اختیار نہیں دیکھتا۔ اسی لئے حق تعالیٰ نے

۱۔ دیکھئے سورۂ مجادلہ ۱۰، ال عمران ۱۲۲، ۱۶۰ اور توبہ ۵۱۔

۲۔ ملاحظہ ہو، ص ۱۸۷۔

۳۔ اللہ وہ ہے جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، مؤمنین کو چاہئے کہ صرف اللہ پر توکل کریں۔ سورۂ تغابن ۱۳۔

۴۔ جب آپ فیصلہ کر لیں تو اللہ پر توکل کریں، بے شک اللہ توکل کرنے والوں کو چاہتا ہے۔ سورۂ آل عمران ۱۵۹۔

اپنے رسول کو اس مرتبے کے حصول کا حکم دیتے ہوئے فرمایا ہے: ﴿إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ﴾ ۔یہاں اللہ نے توکل کرنے والوں کیلئے محبوبیت کے مقام کو ثابت کیا ہے۔

توکل کے بارے میں اہل بیت اطہار ؑ کے فرامین

ان میں سے ایک حدیث وہ ہے جسے شیخ جلیل ثقۃ الاسلام کلینی (رحمۃ اللہ علیہ) نے اپنی سند کے ساتھ امام صادق علیہ السلام سے نقل کیا ہے کہ آپ ؑ نے فرمایا: ﴿إِنَّ الغِنىٰ وَالعِزَّ يَجُولانِ فَإِذا ظَفِرا بِمَوضِعِ التَّوَكُّلِ أَوْطَنا﴾ ۱

جی ہاں! بے نیازی، غنا، خودی، عزت نفس اور اس کا کمال اللہ پر اعتماد و توکل کی بدولت حاصل ہوتے ہیں۔ جو شخص غنی مطلق کی طرف دست حاجت دراز کرے اور حق تعالیٰ کی ذات پاک سے دل لگائے، نیز اس کی مخلوقات سے (جو خود محتاج و فقیر ہیں) کوئی توقع نہ رکھے تو اس کے دل میں مخلوقات سے بے نیازی کا جذبہ اور اپنی عظمت کا احساس جاگزین ہوگا۔ یاد رہے کہ ہر فقر و احتیاج اور ذلت و خواری کی وجہ ضعیف مخلوقات سے اپنی امیدیں اور خواہشات وابستہ کرنا ہے، چنانچہ ارشاد ربانی ہے: ﴿وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ فَهُوَ حَسْبُهُ﴾ ۲ جو اللہ پر توکل کرے اس کیلئے اللہ ہی کافی ہے۔ اس آیت میں اللہ نے توکل کرنے والے کو مخلوقات سے بے نیاز قرار دیا ہے یہ عزت نفس کی عظمت اور دوسروں سے بے نیازی کا معراج ہے۔

کلینی ؒ اپنی سند کے ساتھ حضرت صادق علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ؑ نے فرمایا:

مَنْ أُعْطِيَ ثَلاثاً لَمْ يُمْنَعْ ثَلاثاً. مَنْ أُعْطِيَ الدُّعاءَ أُعْطِيَ الاِجابَةَ وَمَنْ أُعْطِيَ الشُّكْرَ اُعْطِيَ الزِّيادَةَ وَمَنْ أُعْطِيَ التَّوَكُّلُ أُعْطِيَ الكِفايَةَ ۔ ثُمَّ قالَ: أَتَلَوْتَ كِتابَ اللهِ ۔عَزَّوَجَلَّ ۔: ﴿وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ فَهُوَ حَسْبُهُ﴾ وَقالَ: ﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُم﴾ وَقالَ: ﴿أُدْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُم﴾ ۔۳

۱۔ بے نیازی اور عزت حرکت کرتی رہتی ہیں پھر جب وہ مقام توکل تک رسائی حاصل کرتی ہیں تو وہاں مستقر اور ساکن ہو جاتی ہیں۔ (دیکھئے، اصول کافی، ج ۲، ص ۵۳، باب ۳۲، کتاب الایمان والکفر، ح ۳)۔

۲۔ دیکھئے، سورۂ طلاق ۳۔

۳۔ جسے تین چیزیں عطا ہوں وہ تین چیزوں سے محروم نہیں رہتا۔ جسے دعا کی توفیق حاصل ہوا سے قبولیت بھی -->

اس کے علاوہ حضرت امام موسیٰ بن جعفر (علیہما السلام) سے نقل ہوا ہے کہ:

سَألتُهُ عَنْ قَولِ اللهِ-عَزَّوَجلَّ-:﴿وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ فَهُوَ حَسْبُهُ﴾ فقالَ: التَّوَكُّلُ عَلَى اللهِ دَرَجاتٌ؛ مِنها أنْ تَتَوَكَّلَ عَلَى اللهِ فِي أُمُورِكَ كُلِّها، فَما فَعَلَ بِكَ، كُنتَ عَنهُ راضِياً، تَعلَمُ أنَّهُ لا يَألُوكَ خَيراً وَفَضلاً، وَتَعلَمُ أنَّ الحُكمَ فِي ذلِكَ لَهُ، فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ بِتَفويضِ ذلِكَ اِلَيهِ وَثِقْ بِهِ فِيها وَفِي غَيرِها۔[1]

اس حدیث شریف میں توکل کے دو ارکان (جن پر اعتقاد نسبتاً زیادہ مشکل ہے) کا ذکر فرمایا ہے۔ ان میں سے ایک یہ کہ انسان جان لے کہ اللہ اچھائی و بھلائی پہنچانے سے کوتاہی نہیں فرماتا۔ دوسرا یہ کہ تمام کاموں کا فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہی مکمّل قدرت کا مالک ہے اور تمام کاموں کی باگ ڈور اسی کے ہاتھ میں ہے، بلکہ شاید یہاں صراحتاً یا اشارتاً توکل کے تمام ارکان کی طرف اشارہ ہوا ہو، کیونکہ تمام امور کی باگ ڈور کے اللہ کے ہاتھ میں ہونے کا لازمہ یہ ہے کہ وہ تمام امور سے باخبر ہو، نیز بندے کے حق میں کوتاہی نہ کرنے کا لازمہ یہ ہے کہ وہ بخل اور کنجوسی سے منزہ ہو۔ مستدرک الوسائل میں حاجی نوریؒ نے الجعفریات سے نقل کیا ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا:﴿الایمانُ لَهُ أرکانٌ أربَعَةٌ: التَّوَكُّلُ عَلَى اللهِ، وَالتَّفويضُ اِلَيهِ، وَالتَّسليمُ لِأمرِ اللهِ تَعالىٰ، وَالرِّضا بِقَضاءِ اللهِ﴾۔[2]

<-- حاصل ہوتی ہے۔ جسے شکر کی توفیق عطا کی جائے اسے (نعمتوں میں) زیادتی بھی عطا ہوتی ہے۔ جسے توکل کی نعمت عطا ہوا سے کفایت بھی حاصل ہوتی ہے۔ پھر فرمایا: کیا تو نے اللہ کی کتاب میں پڑھا ہے کہ جو اللہ پر توکل کرے اس کیلئے اللہ ہی کافی ہے؟ نیز فرمایا: اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہاری نعمتوں میں اضافہ کروں گا، نیز فرمایا: مجھے پکارو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔ (اصول کافی، ج۲، ص۵۳، باب۳۲، کتاب الایمان والکفر، ح۶)۔

۱۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے آپؑ سے اللہ کے قول:﴿وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ فَهُوَ حَسْبُهُ﴾ کے بارے میں سوال کیا تو فرمایا: خدا پر توکل کے کئی درجات ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ تو اپنے سب کاموں میں اللہ پر توکل کرے اور وہ تمہارے ساتھ جو کچھ کرے تو اس پر راضی رہو اور تو جان لے کہ وہ تجھے کسی اچھائی اور بھلائی سے نہیں روکتا اور تو جان لے کہ ان سب امور میں اسی کا حکم چلتا ہے۔ پس تم اللہ پر توکل کرو ان سب امور کو اس کے سپرد کرو پھر وہ جو کچھ تمہارے حق میں انجام دے یا انجام نہ دے ان سب میں اس پر اعتماد اور بھروسہ کرو۔ (اصول کافی، ج۲، ص۵۳، باب۳۲، ح۵)۔

۲۔ امیر المومنینؑ نے فرمایا: ایمان کے چار ارکان ہیں: اللہ پر توکل، امور کو اس کے سپرد کرنا، امر خداوندی کے سامنے -->>

یاد رہے کہ ایمان کا ایک مرحلہ اس قسم کی روحانی قوتوں اور اعلیٰ قلبی کیفیتوں کی بنیاد بن جاتا ہے جیسا کہ پہلے اس کا ذکر ہو چکا۔[۱] اسی طرح یہ امور ایمان کے ارکان بھی بنتے ہیں اور ان کی بدولت ایمان محفوظ رہتا ہے۔ وہ اس طرح کہ ایمان کا ایک مرحلہ ان روحانی صلاحیتوں کو وجود میں لاتا ہے اور جب یہ معنوی صلاحیتیں حاصل اور روح کے اندر راسخ ہو جاتی ہیں تو یہ انسان کو ایمان کے اگلے اور زیادہ بہتر مراحل تک پہنچاتی ہیں۔ پھر ایمان کے یہ بہتر مراحل مذکورہ صفات میں اضافہ کرتے ہیں اور انہیں زیادہ کامل بناتے ہیں۔ اس طرح ہر مرحلہ دوسرے مرحلے پر مبنی ہوتا ہے۔ یوں ہم بہت ساری آیات کے مفاہیم میں ہماہنگی پیدا کر سکتے ہیں، نیز بہت ساری احادیث کو بھی ہم آہنگ کر سکتے ہیں۔

کتاب مستدرک میں ابو بصیر سے مروی ہے کہ امام صادقؑ نے مجھ سے فرمایا: ﴿مَا مِنْ شَيْءٍ اِلاَّ وَلَهُ حَدٌّ. قَالَ: فَقُلْتُ: وَمَا حَدُّ التَّوَكُّلِ؟ قَالَ: اليَقِينُ. قُلْتُ: فَمَا حَدُّ اليَقِينِ؟ قَالَ: أَنْ لاَيَخَافَ مَعَ اللهِ شَيْئاً﴾[۲]

کسی چیز کی حد وہ ہے جس پر وہ چیز ختم ہو۔ اس حدیث میں حد سے مراد شاید یہ ہو کہ توکل یقین پر ختم ہوتا ہے اور یہ کہ توکل کرنے والا یقین کا حامل ہوتا ہے۔ جس طرح یقین توحید فعلی پر ختم ہوتا ہے اور انسان اللہ کے علاوہ کسی طاقت کو ضرر رساں، نفع رساں، با اختیار اور فیصلہ کنندہ نہیں پاتا۔ اس سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ توکل یقین کے دائرے کے اندر مقید ہوتا ہے اور حصول یقین کے بغیر حقیقی توکل کا وجود ممکن نہیں۔ اسی طرح حقیقت کا یقین توحید کا ثمرہ ہے اور اسی کی حدود میں مقید ہوتا ہے، نیز ممکن ہے کہ اختلاف درجات کے حساب سے یہ دونوں باتیں درست ہوں۔

مستدرک ہی میں ابوذر سے مروی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: ﴿يَا أَبَاذَر! اِنْ سَرَّكَ أَنْ تَكُونَ

<-- سر تسلیم خم ہونا اور اللہ کے فیصلوں پر راضی برضا ہونا۔ (دیکھئے، مستدرک الوسائل، ج ۱۱، ص ۲۱۵، باب ۱۱، ابواب جہاد النفس، ح ۱؛ نیز الجعفریات، ص ۲۳۲، باب البرّ وسخاء النفس۔

۱۔ دیکھئے، ص ۱۸۷۔

۲۔ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ میں (راوی) نے عرض کیا: توکل کی حد کیا ہے؟ فرمایا: یقین۔ میں نے عرض کیا: یقین کی حد کیا ہے؟ فرمایا: یہ کہ انسان اللہ کے ہوتے ہوئے کسی سے نہ ڈرے۔ (مستدرک الوسائل، ج ۱۱، ص ۲۱۵، باب ۱۱، ح ۲)۔

أَقْوَى النَّاسِ، فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ﴾۔[۱]

نیز اسی کتاب مستدرک میں رسول اللہؐ سے مروی ہے: ﴿مَنْ أَحَبَّ أَنْ يَكُونَ أَتْقَى النَّاسِ فَلْيَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ﴾[۲]

نیز اسی کتاب میں مذکور ہے کہ رسول اللہؐ نے جبرئیل سے توکل کی تفسیر پوچھی۔ جبرئیلؑ نے کہا: ﴿اليَأْسُ مِنَ المَخْلُوقِينَ، وَأَنْ يَعْلَمَ أَنَّ المَخْلُوقَ لا يَضُرُّ وَلا يَنْفَعُ وَلا يُعْطِي وَلا يَمْنَعُ﴾[۳]

یہ تفسیر توکل کے ذہنی لوازمات میں سے ایک کا بیان ہے جو حصول توکل کیلئے بھی ضروری ہے۔ وہ اس طرح کہ جب تک انسان مخلوقات سے اپنی توجہ نہ ہٹالے اور مادیت وکثرت کو خیرباد نہ کہہ دے اس وقت تک اس کے دل میں حق کی طرف توجہ کی خصوصیت مستحکم نہیں ہوتی اور وہ روحانیت ووحدت کی منزل سے ہمکنار نہیں ہوتا، نیز اسی کتاب میں ارشاد القلوب کے حوالے سے امیر المؤمنینؑ سے مروی ہے کہ رسول اللہؐ نے حدیث معراج میں فرمایا: ﴿يَا رَبِّ أَيُّ الأَعْمَالِ أَفْضَلُ؟ فَقَالَ اللهُ ـ عَزَّ وَجَلَّ ـ: يَا أَحْمَدُ لَيْسَ شَيْءٌ أَفْضَلَ عِنْدِي مِنَ التَّوَكُّلِ عَلَيَّ وَالرِّضَا بِمَا قَسَمْتُ﴾[۴]

اس سلسلے میں بہت ساری احادیث مروی ہیں[۵] لیکن ہم اس بحث کو یہیں ختم کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے اس خصوصیت کے حصول کی توفیق طلب کرتے ہیں اور ان غیر متناہی مراحل کو طے کرنے کیلئے اللہ جلّ جلالہ، پر توکل اور بھروسہ کرتے ہیں۔

۱۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا: اے ابوذر! اگر تمہیں یہ پسند ہو کہ تم لوگوں میں سب سے زیادہ قوی شخص بنو تو اللہ پر توکل کرو۔ (مستدرک الوسائل، ج۱۱، ص۲۱۶، باب۱۱، ح۳)۔

۲۔ جو شخص یہ چاہے کہ وہ لوگوں میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہو تو اسے چاہئے کہ اللہ پر توکل کرے۔ (ایضا ص۲۱۷، ح۶)

۳۔ توکل مخلوقات سے اپنی امیدیں قطع کرنے کا نام ہے، نیز توکل اس بات پر یقین سے عبارت ہے کہ مخلوقات نہ ضرر پہنچا سکتی ہیں، نہ نفع دے سکتی ہیں، نہ عطا کرسکتی ہیں اور نہ محروم کرسکتی ہیں۔ (ایضاً ص۲۱۸، ح۱۳)۔

۴۔ اے میرے پروردگار! کونسا عمل سب سے بہتر ہے؟ اللہ نے فرمایا: اے احمدؐ! میرے نزدیک کوئی چیز میرے اوپر توکل اور میری تقسیم پر راضی برضا رہنے سے زیادہ بہتر نہیں ہے۔

(ایضاً ص۲۲۰، ح۱۸؛ نیز ارشاد القلوب دیلمی، ج۱، ص۱۹۸، باب۵۵)۔

۵۔ دیکھئے، اصول کافی، ج۲، ص۸۳، باب التفویض والتوکل علیہ؛ نیز بحار الانوار، ج۶۸، ص۹۸۔

﴿وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ فَهُوَ حَسْبُهُ إِنَّ اللهَ بَالِغُ أَمْرِهِ قَدْ جَعَلَ اللهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا﴾ ا

خاتمہ

اب جبکہ توکل اور اس کی اچھی صفات وخصوصیات کا علم ہو چکا تو اس کی ضد یعنی حرص اور اس کی مذموم صفات بھی خود بخود معلوم ہو جاتی ہیں۔ حرص ابلیس اور جہل کے بڑے لشکروں میں سے ایک ہے۔ شیطان کے داموں میں سے شاید ہی کوئی اور دام ہو جو حرص کی مانند انسان کے اوپر اثر انداز ہو سکے۔ حرص نتیجہ ہے حق، توحید، خدا کے اسماء وصفات، نیز خدائی فیصلوں کے راستوں سے آشنائی کا۔

اس بری خصلت اور مہلک صفت کا حامل انسان اللہ تعالیٰ، اس کی قدرت اور اس کی نعمتوں سے غافل ہوتا ہے۔ وہ اہل معرفت کے نقطہ نظر سے شرک وکفر کی حدود میں داخل ہے، چونکہ حرص کی پوری بنیاد ہی جہل پر استوار ہے اور جہل بجائے خود فطرت کا حجاب ہے (جیسا کہ قبلاً ذکر ہو چکا) بنابریں حرص فطرت محجوبہ کا لازمہ ہے اور اس کا شمار جہل کے لشکروں میں ہوتا ہے۔ یہ بری خصلت انسان کو دنیا کی طرف راغب کرتی ہے، حبّ دنیا کو آدمی کے دل میں راسخ بنا دیتی ہے اور دنیا کی رنگینیوں کو مزّین بنا کر پیش کرتی ہے، نیز دیگر قبیح صفات واعمال کو جنم دیتی ہے، مثال کے طور پر بخل، لالچ، غصہ، غصب حقوق الٰہیہ، رشتہ داروں سے قطع رحم اور مؤمن بھائیوں سے قطع رابطہ وغیرہ جن میں سے ہر ایک بجائے خود انسان کی ہلاکت کا موجب ہے۔

اللہ تعالیٰ سورۂ معارج میں قیامت کے بعض حالات اور وہاں کی ہولناکیوں کا ذکر کرنے کے بعد ایسے انداز میں جو بیدار لوگوں کے دلوں کو شگافتہ کرے فرماتا ہے: ﴿كَلَّا إِنَّهَا لَظَىٰ ☆ نَزَّاعَةً لِلشَّوَىٰ ☆ تَدْعُو مَنْ أَدْبَرَ وَتَوَلَّىٰ ☆ وَجَمَعَ فَأَوْعَىٰ ☆ إِنَّ الْإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ☆ إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا ☆ وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا﴾ ۲

ا۔ جو کوئی اللہ پر توکل کرے اس کیلئے اللہ ہی کافی ہے۔ بہ تحقیق اللہ اپنے امور کو چلاتا ہے اور اس نے ہر چیز کیلئے ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔ سورۂ طلاق ۳۔

۲۔ ایسا ہرگز نہ ہوگا کیونکہ وہ تو بھڑکتی ہوئی آگ ہے۔ وہ منہ اور سر کی کھال ادھیڑنے والی ہے۔ وہ ہر پیٹھ پھیرنے والے اور منہ موڑنے والے کو پکارے گی اور اسے بھی جس نے مال جمع کیا اور بند رکھا۔ انسان یقیناً کم حوصلہ خلق ہوا ہے۔ -->

پاک ومنزہ ہے وہ ذات۔ اس معجزانہ کلام کا بیان الفاظ کے ذریعے نہیں ہوسکتا اور نہ اس کے قیامت آفرین بدن کو ترجمے کا لبادہ پہنایا جاسکتا ہے، کیونکہ اس کا ترجمہ خواہ جن الفاظ میں بھی کیا جائے بہر حال اس کی لطافت اور روحانی تاثیر میں کمی ضرور ہوگی۔

''کلا'' کا لفظ گزشتہ آیات سے مربوط ہے، یعنی اس ہولناک دن کوئی چیز انسان کو عذاب سے نجات نہیں دے سکتی اگرچہ وہ اپنے بیوی بچوں اور کائنات کی ہر چیز کو اس عذاب سے بچنے کیلئے فدیہ دے۔
بے شک جہنم کی آگ شعلہ ور ہے اس شعلے کی وجہ سے گوشت، پوست، پٹھے اور گیں ہڈیوں سے مسلسل جدا ہوتی اور دوبارہ اگتی رہتی ہیں یہ شعلہ حق سے منہ موڑ لینے والوں اور مال وزر جمع رکھنے والوں کو اپنی طرف دعوت دیتا ہے۔

انسان بے شک بہت لالچی خلق ہوا ہے۔ جب وہ کسی تکلیف سے دوچار ہوتا ہے تو چیخ اٹھتا ہے لیکن جب اسے آرام ملتا ہے تو بخل سے کام لیتا ہے۔ پھر وہ اللہ اور بندوں کے حقوق ادا نہیں کرتا۔ یاد رہے کہ چونکہ فطرت مجوبہ فطرت ثانیہ بن جاتی ہے اس لئے اللہ نے فرمایا ہے: ﴿اِنَّ الاِنْسانَ خُلِقَ هَلُوعاً﴾[۱] یعنی انسان بہت حریص خلق ہوا ہے اور یہ بات اس حقیقت کے منافی نہیں ہے کہ فطرت کی بنیاد اچھائی پر استوار ہے جیسا کہ بات واضح ہے۔ اس سلسلے کی احادیث وروایات بہت زیادہ ہیں۔ یہاں ہم ان میں سے صرف بعض کے ذکر پر اکتفا کریں گے۔

کافی میں امام صادقؑ سے مروی ہے کہ امام باقرؑ نے فرمایا: ﴿مَثَلُ الحَرِيصِ عَلَى الدُّنيا مَثَلُ دُودَةِ القَزِّ، كُلَّما ازدادَتْ مِنَ القَزِّ عَلى نَفْسِهِ لَفّاً كانَ أبْعَدَ لَها مِنَ الخُرُوجِ حَتّىٰ تَمُوتَ غَمّاً﴾۔ دنیا کی لالچ میں مبتلا انسان کی مثال ریشم کے کیڑے کی طرح ہے۔ وہ اپنے اردگرد ریشم کے تانے بانے جس قدر زیادہ بنتا ہے اسی قدر اس سے باہر نکلنا اس کیلئے دشوار تر ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ تنگ آکر مرجاتا ہے۔ نیز امام صادقؑ نے فرمایا: ﴿أغْنَى الغَنِيِّ مَنْ لَمْ يَكُنْ لِلْحِرْصِ أسيراً﴾[۲] یعنی سب

<-- جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو گھبرا اٹھتا ہے اور جب اسے آسائش حاصل ہوتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے۔
سورۂ معارج ۱۵ الی ۲۱۔

۱۔ سورۂ معارج، آیت ۱۹/۔

۲۔ دیکھئے، اصول کافی، ج ۲، ص ۲۳۸، باب ۱۱۶، ح ۷۔

سے زیادہ بے نیاز شخص وہ ہے جو لالچ کا غلام نہ ہو۔

الوسائل میں حضرت صادقؑ سے مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: لالچی انسان دو خصلتوں سے محروم اور دو خصلتوں کا حامل ہوتا ہے۔ وہ قناعت سے محروم ہوتا ہے اس لئے اس کا سکون بھی سلب ہو جاتا ہے، نیز چونکہ وہ تسلیم و رضا سے محروم ہوتا ہے اس لئے اس کا یقین بھی سلب ہو جاتا ہے۔[1]

مستدرک الوسائل میں رسول اکرمؐ سے مروی ہے کہ جب انسان بوڑھا ہوتا ہے تو اس میں دو خصلتیں جوان ہو جاتی ہیں، یعنی مال کی لالچ اور عمر کی خواہش[2]

نیز منقول ہے کہ حضرت امیر علیہ السلام سے سوال کیا گیا کہ کس چیز کی ذلت سب سے زیادہ ہے؟ فرمایا: لالچ دنیا کی ذلت۔[3]

تحف العقول میں امیر المؤمنینؑ سے منقول ہے کہ آپؑ نے حسینؑ کے نام اپنی نصیحت میں فرمایا:

﴿أيْ بُنَيَّ! الحِرصُ مِفتاحُ التَّعَبِ، وَمَطِيَّةُ النَّصَبِ، وَداعٍ إلَى التَّقَحُّمِ فِي الذُّنوبِ. وَالشَّرَهُ جامِعٌ لِمَساوِيَ العُيوبِ﴾[4]

۱۔ دیکھئے، وسائل الشیعہ، ج۱۶، ص۲۰، باب۶۴، ابواب جہاد النفس، ح۴۔

۲۔ مستدرک الوسائل، ج۱۲، ص۵۹، باب۶۴، ابواب جہاد النفس، ح۲۔

۳۔ ایضاً ص۵۹، ح۴۔

۴۔ اے میرے بیٹے! لالچ رنج کی چابی، تکلیف کی سواری اور گناہوں میں مبتلا ہونے کا سبب ہے، نیز شکم پرستی تمام عیوب اور برائیوں کی جڑ ہے۔ (تحف العقول، ص۶۰)۔

مقصد ۱۱،۱۰/

''رأفت'' اور اس کی ضد ''قسوت''
نیز ''رحمت'' اور اس کی ضد ''غضب'' کابیان

یہ مقصد چند فصلوں پر مشتمل ہے:

فصل اول
رأفت اور قسوت کا مفہوم

عربی لغت وادب کے ماہرین ''رأفت'' سے مراد ''کمال رحمت'' لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ رأفت رحمت سے بھی زیادہ لطیف ورقیق ہوتی ہے۔ جوہری کہتا ہے: ﴿الرَّأفَةُ أشَدُّ الرَّحْمَة﴾[۱] یعنی، رأفت ورحمت سے بھی زیادہ (لطیف) جذبہ ہے۔ طریحی مجمع البحرین میں کہتا ہے: ﴿الرَّؤُوفُ شَدِيْدُ الرَّحْمَةِ، وَالرَّأفَةُ أرَقُّ مِنَ الرَّحْمَة﴾[۲]

بعض محققین اور فلسفیوں کا کہنا ہے کہ رحمت کا مفہوم رأفت کے مفہوم سے ملتا جلتا ہے۔ اسی طرح ان دنوں کی ضد (قسوت۔غضب) کا بھی یہی حال ہے۔ ان کے نزدیک رأفت اور رحمت دونوں سے مراد ''رقّت قلبی'' ہے۔

گویا ''رحمت''، معنوی دل یعنی ''نفس'' کی حالت کا نام ہے لیکن ''رأفت'' جسمانی دل کی ایک حالت سے عبارت ہے، کیونکہ روح یعنی عقل کے نفس وبدن کی طرح کئی منازل ومراحل ہیں۔ اسی طرح غضب

۱۔ صحاح اللغه، ج۴، ص۱۳۶۲۔

۲۔ فخر الدین طریحی کی مجمع البحرین، ج۵، ص۶۱۔

بھی نفس کی ایک حالت کا نام ہے جبکہ ''قسوت'' جسمانی اور صنوبری دل کی کیفیت کا نام ہے[1] (یہ تھا ان کے کلام کا ترجمہ)[2]۔

اس محقق کا یہ فرمانا کہ: رأفت اور اس کی ضد قسوت جسمانی دل کی حالت ہیں، بظاہر درست نہیں، کیونکہ یہ دونوں معنوی اور غیر جسمانی کیفیت ہیں جن کیلئے ادراک ضروری ہے یا ادراک ان کا حصہ ہے جبکہ ادراک جسم اور جسمانیات سے بعید اور منزہ ہے۔ پس ان کا مقصود یہ ہے کہ رأفت رحمت کے مقابلے میں جسمانیت سے نزدیک تر ہے۔ بالفاظ دیگر رحمت، غیبی وملکوتی زاوئے سے نفس کی ایک کیفیت کا نام ہے جبکہ رأفت نفس کی ایک ظاہری کیفیت وصفت سے عبارت ہے۔ نفس کے اس ظاہری پہلو کو ہم صدر یا سینہ کہہ سکتے ہیں۔

یاد رہے کہ رحمت ورأفت کے مفہوم میں رقّت (جو تأثیر پذیری کا لازمہ ہے) کا مفہوم شامل نہیں ہے، بلکہ یہ مفاہیم بھی دیگر وجودی مفاہیم کی طرح ہیں جن کے احکام مختلف مراحل ومنازل کے حساب سے ''عرضی'' طور پر مختلف ہوتے ہیں۔ چنانچہ علم، طاقت اور حیات جو بنیادی اور وجودی اوصاف کمال ہیں) کے مفاہیم اپنے صعودی ونزولی منازل ومراحل کے حساب سے مختلف احکام کے حامل ہیں۔ علم، طاقت اور حیات کا اعلیٰ مرتبہ وہ ہے جو ذاتی، واجب، قدیم اور قیومی ہے جبکہ ان کا نچلا مرتبہ انفعالی، تجددی اور حدوثی ہے جو اپنے وجود میں غیر کا محتاج ہے۔

یہ اختلاف، حقیقت وجود اور اس حقیقت کو لاحق ہونے والی عرضیات میں اختلاف کی فرع ہے جیسا کہ یہ اپنے مقام پر ثابت شدہ حقیقت ہے[3]۔

بنابریں رحمت، رأفت اور عطوفت وغیرہ کا مفہوم، وجود کے مختلف مراحل اور صعود ونزول کے درجات کے حساب سے مختلف احکام وآثار کا حامل ہے، جیسا کہ عالم طبیعیات کے نچلے مرحلے میں انفعال اور اثر پذیری اس کا لازمہ ہیں۔

۱۔ دیکھئے، صدرالدین شیرازی کی شرح اصول کافی، ج۱، ص ۴۳۵۔

۲۔ اس باب کی تیسری فصل میں ہم نے ایک مفید بحث کی ہے، ملاحظہ ہو۔ (امام خمینیؒ)۔

۳۔ دیکھئے، الاسفار الاربعہ، ج۱، ص۷۱، فصل ۷۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ تمام مراحل میں اس کا حکم لازماً ایسا ہی ہوتا کہ ہم اس بات پر مجبور ہوں کہ اس قسم کے اسماء (جن کا اطلاق ذات باری تعالیٰ پر ہوتا ہے) کی تأویل ''ترتیب آثار'' سے کریں یا یہ کہیں کہ اللہ کی رأفت وعطوفت سے مراد مؤمنین کے ساتھ اس کا رأفت وعطوفت والا سلوک ہے۔

یہی حال ہے اللہ کے جمالی اسماء کی اضداد کا۔

یاد رہے کہ یہ تأویلات بے رنگ ہونے کے علاوہ عقلی دلائل کے بھی منافی ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ عظیم محقق وفلسفی جناب صدر المتألہین ؒ نے یہاں اسی سرد تأویل کو اپنایا ہے۔ چنانچہ وہ شرح اصول کافی میں فرماتے ہیں:

﴿وَاِذا وُصِفَ اللہُ بِالرَّأفَةِ وَالرَّحْمَةِ۔ فَاِنَّ مِنْ أسْمآئِہِ الرَّؤُوفُ الرَّحِیمُ۔ کانَ اتِّصافُہُ بِھِما عَلیٰ وَجْہٍ أعْلیٰ وَأشْرَفَ وَکانَ بِاعْتِبارِ الظاھِرِ وَالآثارِ وَکَذا نِسْبَةُ الغَضَبِ اِلَیْہِ بِاعْتِبارِ ما یَصْدُرُ عَنْہُ فِي حَقِّ أعْدآئِہ﴾[۱]

اگرچہ ممکن ہے کہ ان کے قول: ''اللہ تعالیٰ ان دونوں صفات سے متصف ہے ان کے سب سے اعلیٰ اور بہترین مفہوم کے لحاظ سے'' سے مراد وہی ہو جس کا ہم نے ذکر کیا۔ اور ان کا دوسرا جملہ: ﴿وَکانَ بِاعْتِبارِ المظاھِرِ...﴾ اشارہ ہو کسی اور صورت کی طرف تاکہ دیگر لوگوں کے ہمنوا بن سکیں۔ بنابریں ''وَکانَ'' کے بجائے ''أوْ کانَ'' ہوتا تو بات آسان ہو جاتی۔

دوسری فصل

''رأفت'' کے آثار

جان لو کہ اللہ تعالیٰ نے تمام جاندار اور خاص کر انسانوں کو رحم، رأفت اور عطوفت جیسے جذبات (جو اللہ کے اسمائے جمالی کے جلوے ہیں) عطا کئے ہیں تاکہ جانداروں کو تحفظ حاصل ہو، نیز انسان اور انسان کے

۱۔ اللہ کے ناموں میں ''رؤوف'' اور ''رحیم'' بھی شامل ہیں۔ پس جب اسے رحمت ورأفت سے جوڑا جائے تو ان دونوں صفات سے اس کے اتصاف ان کے کامل ترین اور اعلیٰ ترین مفہوم کے ساتھ ان کے مظاہر وآثار کے لحاظ سے ہوگا۔ اللہ کے ساتھ غضب کی نسبت کا بھی یہی حال ہے۔ یعنی غضب خداوندی سے مراد اللہ کا وہ رویہ ہے جو وہ اپنے دشمنوں کے ساتھ روا رکھتا ہے۔ (شرح اصول کافی، ج۱، ص۴۳۵)۔

گھریلوی نظام کی حفاظت ونگہداری ممکن ہو۔ یہ رحمت رحمانیہ کا ایک جلوہ ہے جس پر پورے نظام کائنات کی بنیادیں استوار ہیں۔

اگر انسانوں اور حیوانوں کے اندر رحم اور عطوفت کا یہ جذبہ موجود نہ ہوتا تو انفرادی واجتماعی زندگی کا شیرازہ بکھر جاتا۔ رحم اور عطوفت کا یہی جذبہ ہے جس کے سہارے حیوانات اپنی اولاد کی حفاظت ونگہداری کرتے ہیں، انسان اپنے گھرانے کو تحفظ فراہم کرتا ہے اور عادل حکمراں اپنی رعایا اور مملکت کی حفاظت کرتا ہے۔ اگر یہ رحمت، شفقت اور رأفت نہ ہوتی تو کوئی ماں اپنی اولاد کی خاطر غیر معمولی تکالیف اور مشقتیں برداشت نہ کرتی۔

رحم وشفقت اور رأفت کا یہی جذبہ ہے جس کے طفیل دل کو دل سے راہ پیدا ہوتی ہے اور فطری طور پر نظام عالم کی حفاظت ہو جاتی ہے۔ یہی جذبہ روحانی معلموں، انبیائے عظام، اولیائے کرام اور علمائے ربانی کو انسانوں کی فلاح کیلئے اس قدر مشکلات اور تکالیف برداشت کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ وحی اور آسمانی کتابوں کا نزول بھی دنیا میں اللہ کی رحمت ورأفت کا مظہر ہے۔ حدود وتعزیرات قصاص اور شریعت کے دیگر احکام رحمت ورأفت پر مبنی ہیں جو غضب اور انتقام کی شکل میں ظاہر ہیں۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ﴾[۱] بلکہ جہنم بھی غضب کی صورت میں ان لوگوں کیلئے رحمت ہے جو کامیابی وفلاح کی لیاقت رکھتے ہیں۔ اگر ان لوگوں کو جہنم میں تطہیر اور تخلیص کے مراحل سے نہ گزارا جائے تو یہ لوگ ہرگز نجات اور کامیابی کی صورت نہیں دیکھ سکیں گے۔

خلاصہ یہ کہ جس شخص کا دل اللہ کے بندوں پر رحم اور رأفت کے جذبے سے خالی ہو اسے انسانیت کے دائرے سے خارج قرار دینا چاہئے۔

صاحبان معرفت کہتے ہیں: اگر اللہ نے وجود کی بساط کو بچھایا ہے اور موجودات کو کمال کا راستہ دکھایا ہے تو یہ اسم رحمان ورحیم کی بدولت ہے[۲] یہ دونوں مبارک نام ''رحمٰن، رحیم'' اللہ کے بڑے، ہر شئے پر محیط اور وسیع ناموں میں سے دو نام ہیں۔ چنانچہ آیت قرآنی کہتی ہے: ﴿وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ

۱۔ اے عقل والو! تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے۔ سورۂ بقرہ ۱۷۹۔

۲۔ الفتوحات المکیۃ، ابن عربی، ج۱، ص۱۰۲۔

شَيْءٍ﴾[1] نیز ارشادِ ربانی ہے: ﴿رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَحْمَةً وَعِلْمًا﴾[2] یہی وجہ ہے کہ کتاب خداوندی کی چابی[3] میں ان دونوں بڑے ناموں کو اسمِ اعظم (اللہ) کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وجود کی چابی خداوند رحمٰن ورحیم کی رحمت ہے، نیز یہ کہ رحمت کو غضب پر سبقت حاصل ہے۔ اسی لئے اربابِ معرفت کہتے ہیں: ﴿بِبِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ظَهَرَ الْوُجُودُ﴾[4]

یہ رحمت والا اسم (جس کے شعبے رأفت، عطوفت اور اس طرح کے دیگر صفاتی وافعالی اسماء ہیں) ایک ایسا اسم ہے جس کے ذریعے اللہ نے اکثر اپنا تعارف کرایا ہے، نیز قرآن کے ہر ایک سورے میں اس کو تکرار کیا ہے تاکہ اللہ کی رحمت واسعہ کے ساتھ بندوں کی دلچسپی ودلبستگی میں روز افزون اضافہ ہو اور رحمت خداوندی کے ساتھ دلبستگی نفوس کی تربیت اور سخت دلوں میں نرمی پیدا کرنے کا سرچشمہ بنے۔

لوگوں سے دوستی اور مودت کا رشتہ استوار کرنے، نیز انہیں سرکشی ونافرمانی سے روکنے کیلئے رحم ورأفت سے زیادہ مؤثر کوئی چیز نہیں۔ اسی لئے انبیاء عظام اللہ تعالیٰ کی رحمت کے مظہر ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، کا تعارف سورۂ توبہ (جو سورۂ غضب ہے) میں یوں کیا ہے: ﴿لَقَدْ جَآئَكُمْ رَسُولٌ مِنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُوفٌ رَحِيمٌ﴾[5]

تمام بنی نوع انسان کے ساتھ آنحضرتؐ کی شدید شفقت ورأفت کے معاملے میں یہی بس کہ سورۂ شعراء کی پہلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ﴾[6]

سورۂ کہف کی ابتدا میں فرمایا جارہا ہے: ﴿فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسَكَ عَلَىٰ آثَارِهِمْ إِنْ لَمْ يُؤْمِنُوا

۱۔ میری رحمت ہر چیز پر محیط ہے۔ سورۂ اعراف ۱۵۶۔

۲۔ اے ہمارے ربّ تیری رحمت اور تیرا علم ہر چیز پر محیط ہے۔ سورۂ غافر ۷۔

۳۔ اس سے مراد سورۂ فاتحہ (سورۂ حمد) ہے۔

۴۔ الفتوحات المکیۃ، ج ۱، ص ۱۰۲ (چہار جلدی، عثمان یحیی کی تحقیق کے ساتھ)، ج ۲ ص ۱۳۳۔

۵۔ بہ تحقیق تمہارے ہاں تمہیں میں سے ایک رسول آیا ہے۔ جو چیز تمہیں تکلیف دیتی ہے وہ اس پر گراں ہے۔ وہ تمہیں بیحد چاہتا ہے۔ وہ مؤمنین پر رؤوف ومہربان ہے۔ سورۂ توبہ ۱۲۸۔

۶۔ کہیں آپ ان لوگوں کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے اپنے آپ کو ہلاک نہ کر بیٹھیں۔ سورۂ شعراء ۳۔

بِهٰذا الحَدِيثِ أَسَفاً﴾[۱]

سبحان اللہ! کافروں اور منکرین حق کی حالت پر افسوس اور بندگاں خدا کی فلاح سے شدید دلچسپی نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ، پر عرصہ حیات کس قدر تنگ کر دیا کہ اللہ تعالیٰ آپ ؐ کو تسلی دے رہا ہے اور آپ ؐ کے نرم و نازک دل کو دلاسا دے رہا ہے تاکہ کہیں ان بد بخت جاہلوں کی حالت پر حزن و ملال کی شدت کی وجہ سے آپ ؐ کا دل پارہ نہ ہو جائے اور آپ ؐ کی روح پرواز نہ کر جائے!

علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ مؤمنون کا بھی اس پاکیزہ صفت کے ذریعے تعارف فرماتا ہے، چنانچہ سورۂ فتح میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدّآءُ عَلَى الكُفّارِ رُحَماءُ بَيْنَهُم﴾[۲]

ان صفات شریفہ کے بارے میں احادیث کی بہتات ہے۔ یہاں ہم ان میں سے بعض کے ذکر پر قناعت کرتے ہیں۔

وسائل الشیعہ، کتاب الحج میں کافی شریف سے نقل ہے کہ امام صادق ؑ اپنے اصحاب سے فرماتے تھے:

﴿اتَّقُوا اللهَ وَكُونُوا اِخْوَةً بَرَرَةً، مُتَحابِّينَ فِي اللهِ، مُتَواصِلِينَ مُتَراحِمِينَ، تَزاوَرُوا وَتَلاقُوا وَتَذاكَرُوا أَمْرَنا وَأَحْيُوه﴾[۳]

الوسائل میں ہی امام صادق ؑ سے مروی ہے کہ آپ ؑ نے فرمایا:

يَحِقُّ عَلَى المُسْلِمِينَ الاِجْتِهادُ فِي التَّواصُلِ ، وَالتَّعاوُنُ عَلَى التَّعاطُفِ، وَالمُواساةُ لأَهْلِ الحاجَةِ، وَتَعاطُفُ بَعْضِهِمْ عَلىٰ بَعْضٍ حَتّىٰ تَكُونُوا كَما أَمَرَكُمُ اللهُ ـ عَزَّ وَجَلَّ ـ:

۱۔ پس اگر یہ لوگ اس قرآنی مضمون پر ایمان نہ لائیں تو ان کی وجہ سے شاید آپ اس رنج میں اپنی جان گنوا بیٹھیں۔ سورۂ کہف ۶۔

۲۔ محمد ؐ اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار کے ساتھ سخت گیر اور آپس میں مہربان ہیں۔ سورۂ فتح ۲۹

۳۔ اللہ سے ڈرو اور آپس میں نیک دل بھائی بنے رہو، اللہ کی خاطر ایک دوسرے سے محبت کرو، ایک دوسرے سے رابطے میں رہو اور ایک دوسرے پر رحم کرو، ایک دوسرے کی زیارت کرو، آپس میں ملاقاتیں کیا کرو اور ہمارے امر کا ذکر کیا کرو اور اسے زندہ رکھو۔

دیکھئے: وسائل الشیعہ، ج ۸، ص ۵۵۲، باب ۱۲۴، ح ۱ (اسلامیہ)؛ نیز ج ۱۲، باب ۱۲۴، ص ۲۱۵، ح ۱ (طبع آل البیت)؛ نیز: اصول کافی، ج ۲، ص ۱۴۰، باب التراحم والتعاطف، ح ۱۔

﴿رُحَمَآءُ بَيْنَهُم﴾ مُتَراحِمِينَ مُغتَمِّينَ لِما غابَ عَنكُم مِن أمرِهِم، عَلىٰ ما مَضىٰ عَلَيهِ مَعْشَرُ الأنصارِ عَلىٰ عَهدِ رَسُولِ اللهِ صلى الله عليه وآله وسلم ۱

عظیم المرتبت عالم ربانی، شیخ حسن بن محمد طوسیؒ کی مجالس میں علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا: ﴿قالَ رَسُولُ اللهِ: اِنَّ اللهَ -عَزَّوَجَلَّ- رَحِيمٌ يُحِبُّ كُلَّ رَحِيمٍ﴾ ۲

مستدرک الوسائل میں علامہ حلیؒ کی رسالہ سعدیہ سے یہ حدیث نبویؐ منقول ہے: ﴿وَالَّذِي نَفسِي بِيَدِهِ لا يَضَعُ اللهُ الرَّحْمَةَ اِلّا عَلىٰ رَحِيمٍ. قالُوا: يا رَسُولَ اللهِ! كُلُّنا رَحِيمٌ؟ قالَ: لَيسَ الَّذِي يَرحَمُ نَفسَهُ وَأهلَهُ خاصَّةً، وَلٰكِنَّ الَّذِي يَرحَمُ المُسلِمِينَ. وَقالَ صلى الله عليه وآله وسلم: قالَ -تَعالىٰ- اِن كُنتُم تُرِيدُونَ رَحْمَتِي فَارحَمُوا﴾ ۳

الجعفریات میں حدیث نبویؐ ہے کہ فرمایا: ﴿مَن لا يَرحَمُ النّاسَ لا يَرحَمُهُ اللهُ﴾ ۴

۱۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ باہمی روابط کی خاطر کوشش کریں، ایک دوسرے کے ساتھ شفقت سے پیش آئیں، حاجتمندوں کی دلجوئی اور مدد کریں اور ایک دوسرے کے ساتھ مہربانی سے پیش آئیں تاکہ تم اس طرح بن جاؤ جس طرح اللہ تعالیٰ تمہیں ﴿رُحَمَآءُ بَيْنَهُم﴾ (کی عملی تصویر بننے) کا حکم دیتا ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ رحم کرنے والے اور مسلمانوں کے ان امور میں جو تمہاری آنکھوں سے پوشیدہ ہیں ان کے غمخوار بنو۔ یہ وہ روش ہے جس کو انصار کی جماعت نے رسول اللہؐ کے عہد میں اختیار کیا۔

دیکھئے، وسائل الشیعہ، ج۲، ص۲۱۵، باب۱۲۴، ح۲؛ نیز اصول کافی، ج۲، ص۱۴۰، باب التراحم والتعاطف، ح۴۔

۲۔ رسول اللہؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ رحیم ہے اور ہر رحم کرنے والے کو دوست رکھتا ہے۔

دیکھئے، شیخ طوسی کی کتاب، امالی، مجلس ۱۸، ص۵۱۶، ح۱۱۲۹؛ نیز وسائل الشیعہ، ج۱۲، ص۲۱۶، باب۱۲۴، ح۶۔

۳۔ قسم ہے اس کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ اللہ رحم نہیں کرتا مگر اس پر جو رحیم (رحم کرنے والا) ہو۔ لوگوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا ہم سب رحیم ہیں؟ فرمایا: رحیم وہ نہیں جو صرف اپنے اور اپنے کنبے پر رحم کرتا ہے، بلکہ رحیم وہ ہے جو مسلمانوں پر رحم کرتا ہے۔

نیز آنحضرتؐ نے ہی فرمایا ہے: اللہ نے فرمایا ہے: اگر تم میری رحمت کے طلبگار ہو تو (دوسروں پر) رحم کرو۔

مستدرک الوسائل، ج۹، ص۵۴، باب۱۰۷، ح۳؛ نیز الرسالۃ السعدیہ، ص۱۶۵۔

۴۔ جو شخص لوگوں پر رحم نہیں کرتا، اللہ بھی اس پر رحم نہیں فرماتا۔

مستدرک الوسائل، ج۹، ص۵۵، باب۱۰۷، ح۴؛ نیز الجعفریات، ص۱۶۷، باب صفۃ المتقین۔

عوالی اللئالی میں رسول اللہؐ سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

﴿الرّاحِمُونَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ؛ اِرْحَمُوا مَنْ فِي الأَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمٰاءِ﴾[۱]

تیسری فصل

قساوت اور غضب میں فرق

جان لوکہ ''قساوت'' سے مراد ہے: دل کی سختی یا سنگدلی۔ استعمال میں کہا جاتا ہے: ''قَسٰا قَلْبُهُ قَسٰاوَةً وَقَسْوَةً وَقَسٰاءً؛ غَلُظَ وَصَلَبَ، وَحَجَرٌ قٰاسٍ؛ أَيْ صَلْب''[۲]

اس کی ضد، نرمی اور رقّت ہے۔ چنانچہ سورۂ زمر کی آیت ۲۲ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿أَفَمَنْ شَرَحَ اللهُ صَدْرَهُ لِلإِسْلامِ فَهُوَ عَلىٰ نُورٍ مِنْ رَبِّهِ فَوَيْلٌ لِلْقٰاسِيَةِ قُلُوبُهُمْ مِنْ ذِكْرِ اللهِ أُولٰئِكَ فِي ضَلالٍ مُبِينٍ﴾[۳]

اس آیت میں شرح صدر (جس کا لازمہ قبول حق ہے) کے مقابلے میں قساوت قلب (جس کا لازمہ قبول حق سے انکار ہے) کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس آیت کے بعد دل کی رقّت اور نرمی کا ذکر کیا گیا ہے جو قساوت قلب کی حقیقی ضد ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اللهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتٰاباً مُتَشٰابِهاً مَثٰانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِينُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلىٰ ذِكْرِ اللهِ...﴾[۴]

۱۔ خدائے رحمٰن رحم کرنے والوں پر رحم فرماتا ہے۔ زمین والوں پر رحم کروتا کہ آسمان والا تمہارے اوپر رحم کرے۔ مستدرک الوسائل، ج۹، ص۵۶، باب ۱۰۷، ح۸؛ نیز عوالی اللئالی، ج۱، ص۳۶۱، ح۴۲۔

۲۔ یعنی اس کا ماضی ''قَسٰا'' ہے اس کا مصدر ''قساوت، قسوت اور قساء'' ہے۔ قَسٰا قَلْبُہ سے مراد ہے: اس کا دل سخت ہوگیا۔ حَجَرٌ قاسٍ سے مراد ہے: سخت پتھر۔ (صحاح اللغہ، ج۶، ص۲۴۶۲؛ نیز لسان العرب، ج۱۱، ص۱۶۸)۔

۳۔ تو کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے اسلام (کی قبولیت) کیلئے کھول دیا ہے [اس شخص کے برابر ہے جس کا دل تاریک ہے؟] پس وہ اللہ کی طرف سے ایک نور پر ہے۔ پس تباہی ان لوگوں کیلئے جو دل کی سختی کی وجہ سے اللہ کا ذکر نہیں کرتے، یہ لوگ صریح گمراہی میں ہیں۔ سورۂ زمر ۲۲۔

۴۔ اللہ نے ایسی کتاب کی شکل میں بہترین کلام نازل فرمایا ہے جس کی آیات باہم مشابہہ اور مکرر ہیں اور جس -->

یاد رہے کہ قساوت اور غضب کے درمیان واضح فرق موجود ہے، کیونکہ قساوت سے مراد یہی تھی جس کا ذکر ہوا۔ رہا غضب تو وہ ایک نفسانی کیفیت اور حرکت کا نام ہے جس کے باعث دل کا خون جذبہ انتقام سے جوش مارتا ہے۔ پس جب یہ حرکت تیز اور سخت ہو جاتی ہے تو غیظ و غضب کی آگ بھڑکتی ہے۔ نتیجے کے طور پر شریانیں اور دماغ ایک سیاہ اور مضطرب دھویں سے پر ہو جاتے ہیں جس کے باعث عقل اپنے راستے سے بھٹک جاتی ہے، یوں ادراک اور غور وفکر کی طاقت سلب ہو جاتی ہے۔ اس حالت میں اس شخص پر وعظ ونصیحت کا اثر نہیں ہوتا، بلکہ غیظ وغضب کی آگ مزید بھڑکتی ہے۔ چنانچہ علم اخلاق کے ماہرین کہتے ہیں:

''اس حالت میں انسان کی مثال اس غار کی جیسی ہے جس میں زبردست آگ بھڑکائی جائے جس کے باعث وہ شعلوں اور دھویں سے بھر جائے۔ پھر اس میں ہوا، دھویں اور شعلوں کی بھڑک سے حبس پیدا ہو جس کے نتیجے میں اس غار سے سخت قسم کی آوازیں نکلیں اور آگ کے شعلے آپس میں مدغم ہوں اور آگ میں شدت آتی جائے۔ اس حالت میں اس کا علاج بہت مشکل اور اس آگ کو بجھانا ممکن نہ ہوگا، کیونکہ ان بھڑکتے ہوئے شعلوں کو بجھانے کیلئے جو کچھ اس میں ڈالا جائے آگ اسے نگل جائے گی اور اپنا حصہ بنا لے گی۔ اس لئے انسان جب غیظ وغضب کی آگ میں شعلہ ور ہو تو اس وقت وہ اندھا ہو جاتا ہے اور ہدایت ورہنمائی قبول کرنے سے قاصر ہوتا ہے، نیز وہ بہرا ہو جاتا ہے اور وعظ ونصیحت کو نہیں سن سکتا، بلکہ اس حالت میں وعظ ونصیحت کے باعث اس کے غضب کی آگ مزید شعلہ ور ہوگی۔ اس حالت میں اس شخص کیلئے کوئی راہ علاج باقی نہیں رہے گا''۔[۱]

بقراط حکیم کہتا ہے: ''میں ایک ایسی کشتی کو جو سمندر کی طوفانی اور متلاطم موجوں میں گھر جائے، نیز سمندری چٹانوں کے درمیان پھنس جائے زیادہ محفوظ سمجھتا ہوں اس شخص کے مقابلے میں جس کے غضب کی آگ بھڑکی ہوئی ہو اور اس کے وجود کی کشتی غصے کی خطرناک موجوں میں ہچکولے کھا رہی ہو، کیونکہ کشتی کو ماہر ملاح مختلف ترکیبوں اور علمی نسخوں کے ذریعے نجات سے ہمکنار کر سکتے ہیں، لیکن مذکورہ شخص کا اس حالت

<- سے اپنے ربّ سے ڈرنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں پھر ان کی جلدیں اور دل نرم ہو کر ذکر خدا کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ سورۂ زمر ۲۳۔

۱۔ دیکھئے ابن مسکویہ کی تہذیب الاخلاق، ص ۱۶۵، باب التھور والجبن۔

میں کوئی علاج اور چارہ نہیں ہوسکتا۔ آپ جو بھی طریقہ استعمال کریں (مثال کے طور پر پند ونصیحت وغیرہ) اور اس کے ساتھ جس قدر بھی فروتنی کا مظاہرہ کریں اس کے شعلوں اور ایندھن میں اضافہ ہی ہوگا"۔[1]

غیظ وغضب کے بارے میں ہم نے یہاں عظیم المرتبت معلم اخلاق ابن مسکویہ کے کلام کا مذکورہ ترجمہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کی، کیونکہ اس بارے میں اس معلم اخلاق کے کلام سے بہتر کوئی چیز ہمارے سامنے موجود نہ تھی۔

پس معلوم ہوا کہ قساوت اور غضب دل کی دو مختلف حالتوں کے نام ہیں جن کا آپس میں کوئی ربط نہیں۔ حدیث شریف میں رأفت ورحمت کو ان دونوں کے مقابلے میں ذکر کرنے کا مقصد حقیقی مقابلہ نہیں، بلکہ مقابل کا لازم وملزوم مراد ہیں، کیونکہ رأفت لینت (نرمی) کا لازمہ ہے جو قسوت (سختی) کی ضد ہے جبکہ رحمت حلم کا لازمہ یا ملزوم ہے جو غضب کی ضد ہے۔

چوتھی فصل

رأفت فطرت سلیم کا لازمہ اور عقل کا لشکر ہے

جان لو کہ رحم، رأفت، شفقت، نرمی اور حلم میں سے ہر ایک فطرت مخمورہ کا لازمہ ہے اور ان کا تعلّق عقل اور رحمٰن کے لشکروں سے ہے۔ محبت، عطوفت، رحم، مودت اور عدل کے جذبات تمام بنی نوع بشر کے خمیر میں شامل ہیں۔

ہر شخص خواہ وہ کتنا ہی ظالم ہو فطری اور جبلّی طور پر اپنے ماتحتوں، غریبوں، بے چارون، کمزوروں اور کمزور بچوں کے معاملے میں رحم، عطوفت اور رأفت کے جذبات رکھتا ہے، بلکہ ہر جاندار کے حق میں رحم اور ہر موجود کے حق میں رأفت کا جذبہ انسان کی فطرت میں شامل ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی رحمت کی حقیقت سے خلق کیا ہے۔ انسان اللہ کی رحمت کا مظہر ہے۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے: ﴿الرَّحْمٰنُ ☆ عَلَّمَ القُرآنَ ☆ خَلَقَ الاِنْسَانَ﴾[2] یہاں اللہ نے تخلیق انسان کی

۱۔ ایضاً، ص ۱۶۵، باب التہور والجبن؛ نیز خواجہ نصیر الدین طوسی کی اخلاق ناصری، ص ۱۷۶۔

۲۔ (خداوند) رحمٰن نے قرآن سکھایا، اس نے انسان کو خلق کیا۔ سورۂ الرحمٰن ۱، ۲، ۳۔

نسبت اپنے اسم رحمٰن سے دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ظالم اور سنگدل انسان بھی فطری طور پر ظلم اور بے رحمی سے بیزار ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ اپنی سنگدلی اور اپنے ظلم سے چشم پوشی کر لیتا ہے لیکن دوسروں کے ظلم اور سنگدلی کی فطری طور پر مذمت کرتا ہے۔ وہ عدل وانصاف، رحم اور شفقت کو فطری طور پر چاہتا ہے، بلکہ ظالم کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ عدل کے ساتھ ظلم کرے، نیز یہ چاہتا ہے کہ سنگدلی کے پیچھے بھی جذبہ رحم کو کارفرما دیکھے وہ اسے خواہ ناخواہ رحم کا لبادہ اڑھائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فطرت اور جبلّت کو ظلم سے نفرت ہوتی ہے اور لطف وکرم اور رحم سے لگاؤ ہوتا ہے۔ پس وہ چاہتا ہے کہ اپنے آپ کو رحم اور رأفت سے قریب کرے اگرچہ ظاہری طور پر اور برائے نام ہی کیوں نہ ہو۔

واضح رہے کہ یہ نکتہ (یعنی رحم، شفقت، عدل وانصاف اور محبت ومودت وغیرہ کا لازمۂ فطرت مخمورہ ہونا اور اس کی اضداد کا فطرت سلیم کے برخلاف اور فطرت محجوبہ کا لازمہ ہونا) اپنے ضمیر وادراک اور دوسرے انسانوں کی حالت میں غور وفکر کرنے کے بعد مزید دلائل وبراہین اور تطویل وبیان کا محتاج ہے۔

اگرچہ یہ سب اس علم الاسماء کی بحث میں مکمّل علمی وعقلی وفلسفی دلائل وبراہین کی روشنی میں ثابت شدہ ہیں، لیکن کتاب حاضر کا موضوع بحث یہ نہیں۔ اس لئے اس موضوع سے مربوط کتب کی طرف رجوع کیا جائے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ جملہ کمالات اور اچھائیاں اسماء الٰہیہ سے مربوط اور مجعول بالذات ہیں جبکہ ان کی اضداد کا تعلّق صفات سلبیہ اور اسماء تنزیہیہ سے ہے اور وہ مجعول بالعرض ہیں، نیز یہ کہ فطرت مخمورہ (خداداد فطرت سلیم) رحمانی کمالات کا آئینہ دار ہے اور نظام کائنات کی بنیاد بھلائی اور کمال پر ہے جبکہ عیوب ونقائص اور شرور کا تعلّق فطرت محجوبہ سے ہے اور یہ معدن نور وعظمت سے دور ہیں۔

پانچویں فصل

قوت غضبیہ کے آثار

جان لو کہ قوت غضبیہ تمام جانداروں خصوصاً انسانوں پر اللہ کی عظیم نعمتوں میں سے ایک ہے، کیونکہ اس قوت کے باعث انفرادی، اجتماعی، معاشرتی، خاندانی اور عائلی نظام کو تحفظ حاصل ہوتا ہے، کیونکہ انسان جب تک اس مادی دنیا میں موجود ہے یہاں کارفرما تضادات، تغیر وتبدل، انفعال اور اثر پذیری جو عالم طبیعت کا خاصہ ہیں کی وجہ سے ہر دم انحلال وتحلیل کی زد میں ہے۔ اگر اس انسان کو تحلیل شدہ عناصر کا بدل نہ

ملے تو اس کے اندر کے مخرب عناصر اسے تباہ اور ختم کر دیں گے۔ اسی طرح وہ جب تک اس عالم تضاد و تصادم میں موجود ہے اس کا سامنا خطرات اور دشمنوں سے رہے گا جن کی روک تھام نہ ہو تو وہ اس کا خاتمہ کر دیں گے۔

جس طرح کسی انسان یا حیوان کو انفرادی اور ذاتی سطح پر اندرونی اور بیرونی خطرات اور موذی اشیاء سے سروکار رہتا ہے اسی طرح انسان کی عائلی زندگی، اجتماعی زندگی اور مثالی معاشرتی زندگی کے نظام کو بھی خطرات اور نقصان دہ عناصر کا سامنا رہتا ہے جن کو رفع دفع نہ کیا جائے تو انفرادی و اجتماعی نظام زندگی درہم برہم ہو جائے گا اور معاشرتی نظام زوال و اضمحلال سے دوچار ہو گا۔

بنابریں اللہ کی عنایت ازلی اور رحمت کاملہ کو یہ منظور ہوا کہ تمام جانداروں خاص کر انسان کو قوت غضبیہ سے نوازے تاکہ انسان اور دیگر جاندار (جاندار ہونے کے ناطے) اندرونی اور بیرونی خطرات کی روک تھام کریں خاص کر انسان اپنی عائلی، اجتماعی اور مثالی معاشرتی زندگی کے نظاموں کو درپیش خطرات کی بیخ کنی کرے۔

دوسری طرف سے یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قوت غضبیہ (جو ایک خداداد آسمانی تحفہ ہے اور جسے اللہ تعالیٰ کے دست قدرت نے انسان کی خمیر اور فطرت میں ودیعت فرمایا ہے) کے بغیر انسان نہ اپنی ناموس کی حفاظت کر سکتا ہے نہ ملک کی سرحدوں کی اور نہ قومی و ملی نظام کی، نیز نہ وہ اس کے بغیر دشمنوں کے حملوں سے مثالی معاشرتی نظام کو بچا سکتا ہے نہ انسانیت اور دین کے دشمنوں کے خلاف جہاد کر سکتا ہے۔

حدود و تعزیرات اور قوانین الٰہیہ کا عملی نفاذ (جو نظام زندگی کی حفاظت کا ضامن ہے) بھی اسی قوت کے طفیل ممکن ہے۔ اسی طرح نفس امارہ کے ساتھ جہاد، نیز ابلیس اور جہل کے لشکروں سے بچاؤ بھی اسی قوت کے سہارے ہی ممکن ہیں۔ یہ قوت انتقام خداوندی اور غضب الٰہی کی مظہر ہے۔ جس کسی کے اندر یہ قوت مطلوبہ مقدار سے کم ہو وہ لازمی طور پر بہت سی صفات خبیثہ اور عادات فاسدہ کا شکار ہو گا، مثال کے طور پر خوف، بزدلی، سستی، تن آسانی، مفاد پرستی، بے صبری، بے ثباتی، آرام طلبی، جمود، ظلم پر خاموشی (جو ظلم کی طرح بلکہ اس سے بھی بدتر ہے)، برائیوں پر رضامندی، نیز ذاتی، گھریلو اور قومی و ملی سطح پر بے غیرتی کا اظہار وغیرہ وغیرہ۔

اللہ تعالیٰ مؤمنین کی توصیف میں فرماتا ہے: ﴿أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ﴾ [۱] یہ نفسانی اعتدال کی حالت ہے جس کی رو سے انسان موقع کی مناسبت سے گاہے رحمت وشفقت اور گاہے شدت وغضب کا مظاہرہ کرتا ہے۔

احادیث شریفہ میں اس بات کی مذمت ہوئی ہے کہ انسان مناسب وقت پر غیظ وغضب کا مظاہرہ نہ کرے۔

محمد بن یعقوب کلینی ؒ اپنی اسناد کے ساتھ حضرت باقر العلوم علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ؑ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے حضرت شعیب ؑ پیغمبر پر وحی فرمائی: بہ تحقیق میں تیری قوم کے ایک لاکھ افراد کو عذاب میں مبتلا کروں گا جن میں سے چالیس ہزار برے لوگ ہیں جبکہ ساٹھ ہزار اچھے لوگ ہیں۔ شعیب ؑ نے عرض کیا: اے اللہ! برے لوگ تو اپنی جگہ لیکن اچھے لوگوں کو سزا کیوں؟ وحی ہوئی: کیونکہ انہوں نے گناہگاروں کے معاملے میں رعایت اور سہل انگاری سے کام لیا، نیز وہ میری ناراضگی کو دیکھ کر ناراض نہیں ہوئے'' [۲]

الوسائل میں برقی کی المحاسن سے ایک حدیث مروی ہے جس کی سند امام زین العابدین علیہ السلام تک پہنچتی ہے کہ آپ ؑ نے فرمایا: ''حضرت موسیٰ بن عمران نے کہا: خدایا! تیرے وہ بندے کون ہیں جنہیں تو اپنے عرش کے سائے میں اس دن جگہ دے گا جس دن تیرے سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہوگا؟ اللہ نے موسیٰ ؑ پر وحی کی: یہ وہ لوگ ہیں جن کے دل پاکیزہ ہیں اور ان کے ہاتھ نیکی کرتے ہیں۔ وہ میری عظمت کو یاد کرتے ہیں جس طرح وہ اپنے آباء کو یاد کرتے ہیں... پھر فرمایا: جب میری حرام کردہ چیزوں کو حلال قرار دیا جائے تو وہ اس طرح ناراض ہوتے ہیں جس طرح کسی شیر کو زخمی کیا جائے تو وہ ناراض ہوتا ہے'' [۳]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق کریمہ کے بارے میں مذکور ہے کہ: ''آپ ؐ کسی بے انصافی کے معاملے میں اپنے لئے مدد طلب نہیں کرتے تھے یہاں تک کہ جب محرمات الٰہیہ کا ارتکاب ہوتا تو آپ ؐ اللہ تبارک

۱۔ رسول کے ساتھی کفار پر سخت گیر اور اپنے درمیان مہربان ہیں۔ سورۂ فتح ۲۹۔

۲۔ فروع کافی، ج ۵، ص ۵۵، باب امر بمعروف نہی از منکر، حدیث ۱۔

۳۔ دیکھئے، وسائل الشیعہ، ج ۱۶، ص ۱۴۷، باب ۸، ح ۳؛ نیز محاسن البرقی، ج ۱، ص ۱۶، باب ۹، ح ۴۵۔

وتعالیٰ کی خاطر غضبناک ہوتے تھے"۔[1]

معلوم ہوا کہ وہ غضب جو رحمت کی ضد ہے (اور اس کا تعلق جہل اور ابلیس کے لشکروں سے ہے) اس غضب سے مختلف ہے جو حد اعتدال کا نام ہے اور جو عقل، خالق اور آسمانی شریعت کے تابع ہے، بلکہ اس سے مراد وہ غضب ہے جو افراط کا شکار ہو۔ اس قوت غضبیہ کی مذمت کا بیان آیندہ فصل میں ہوگا۔

چھٹی فصل

قوت غضبیہ کا انحراف

یہ تو معلوم ہو چکا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو قوت غضبیہ سے نوازا ہے تا کہ نظام زندگی کی حفاظت ہو اور دنیا و آخرت میں کامیابی حاصل ہو۔ اب اگر کوئی انسان اس خدائی نعمت کا صحیح استعمال نہ کرے اور مناسب موقع پر ان بنیادوں کی حفاظت کیلئے اس قوت کو بروئے کار نہ لائے تو وہ کفران نعمت کا مرتکب قرار پائے گا اور وہ قرآن کی آیت: ﴿وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيد﴾[2] کا مصداق ٹھہرے گا۔

اس سے بھی بدتر اور قبیح تر یہ ہے کہ انسان اس خداداد قوت کو خدائی مقاصد، نیز عائلی اور مثالی معاشرتی نظام کے برخلاف استعمال کرے، کیونکہ یہ کفران نعمت ہونے کے علاوہ ہتک حرمت بھی ہے۔ اس صورت میں قوت غضبیہ (جسے اللہ کے لشکروں میں شامل ہونا، نیز شیطان اور جہل کے لشکروں کے برخلاف ہونا چاہئے) شیطان کے بڑے لشکروں میں شامل ہوگی، نیز عقل اور رحمٰن کے لشکروں کے مقابلے میں کھڑی ہوگی، یوں آہستہ آہستہ غصب کی مملکت پر شیطان اور جہل کا تسلط ہو جائے گا۔ پھر یہ قوت عقل اور حق کی تابع فرمان غلام بننے کی بجائے شیطان کی غلام بن جائے گی اور دوست و دشمن میں تمیز نہ کر سکے گی اور دونوں کو کاٹ کھائے گی۔ یوں یہ دنیا کے نظام اور عائلی زندگی کی بنیادوں کو متزلزل اور منہدم کر ڈالے گی۔ عین ممکن ہے کہ ایک شخص کی قوت غضبیہ کے باعث تمام بنی نوع انسان اور پوری دنیا تباہ اور برباد ہو۔

انسان کی درندگی دوسرے جانداروں کی درندگی کی مانند نہیں، کیونکہ انسانی درندگی حد اور دائرے کے

۱۔ مستدرک الوسائل، ج ۱۲، ص ۱۹۷، ۱۹۸، باب ۷، ح ۲؛ نیز مکارم الاخلاق، ص ۲۳۔

۲۔ اگر تم کفران نعمت کرو تو میرا عذاب سخت ہے۔ سورۂ ابراہیم ۷۔

اندر محدود نہیں رہتی۔ انسان اگر پورے عالم کو ہڑپ کر لے تب بھی وہ سیر نہیں ہوگا اور اس کی طمع کی آگ نہیں بجھے گی۔ اس طرح ممکن ہے کہ اس کے غضب کا جہنم اس مادی دنیا کو جلا ڈالے۔

اب جبکہ راقم یہ اوراق لکھ رہا ہے اتحادیوں اور جرمنوں کے درمیان جنگ کی آگ بھڑکی ہوئی ہے۔ اس آگ نے پوری دنیا کے مکینوں کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ یہ شعلہ سوزان اور آتش فروزان ایک آدم خور اور ظالم درندے کے غصے کی آگ ہے جس نے جرمن پیشوا کے نام سے پوری دنیا خاص کر اپنی بد بخت ملت کے مستقبل کو تباہ اور تیرہ بخت بنا دیا ہے اور اب وہ زوال واضمحلال کی شکار ہے۔

عالمی نظام کے انحطاط اور کرہ ارضی کے مکینوں کے اندر جذبۂ درندگی وشیطنت میں اضافے کے ساتھ اگر موجودہ محیر العقول اور جدید ترین آلات وایجادات (جن سے اللہ نے جدید یورپ کو نوازا ہے) کا استعمال اگر عقل اور دین خداوندی کی روشنی میں ہوتا تو یہ دنیا مکمّل طور پر عدل کی روشنی سے جگمگا اٹھتی اور پوری دنیا آپس کے بہترین روابط کے باعث ابدی فلاح اور کامیابی سے ہمکنار ہوتی، لیکن بدقسمتی سے جدید ایجادات کی قوت جہل ونادانی، شیطنت اور خود پسندی وتکبّر کے ہاتھوں پوری طرح انسانیت کی تباہی اور فلاحی معاشرے کے برخلاف استعمال ہو رہی ہے۔ جن چیزوں سے اس دنیا کو منور اور روشن کیا جانا چاہئے انہی چیزوں نے دنیا کو تاریک اور مفلوک الحال بنا دیا ہے۔ ناکامی وذلت کا یہ تکلیف دہ سفر کب تک جاری رہے گا؟ یہ بے نوا لوگ چند انسان نما حیوانوں سے کب رہا ہوں گے؟ انہیں حیوان کہنا بھی شاید درست نہ ہو، کیونکہ یہ حیوانوں کیلئے بھی باعث ننگ وعار ہیں۔ بدبختی وبے چارگی کا یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا اور یہ ظلمت کدہ اللہ کے ولی برحق اور مصلح کامل کے ہاتھوں کب منور ہوگا؟

اَللّٰھُمَّ عَجِّلْ فَرَجَهُ الشَّرِيْفَ

وَمُنَّ عَلَيْنَا بِظُهُوْرِهِ

ساتویں فصل

قوت غضبیہ کے بارے میں چند احادیث کا ذکر

وسائل الشیعہ میں اصول کافی کی اسناد کے ساتھ امام صادقؑ سے مروی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

﴿الغَضَبُ یُفسِدُ الایمَانَ کَمَا یُفسِدُ الخَلُّ العَسَلَ﴾۱

مستدرک الوسائل میں جعفریات کی اسناد کے ساتھ علی بن ابی طالب (علیہما السلام) سے مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: ﴿قالَ رَسُولُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وآلہ: الغَضَبُ یُفسِدُ الایمَانَ کَمَا یُفسِدُ الصَّبرِ العَسَلَ وَکَمَا یُفسِدُ الخَلُّ العَسَلَ﴾۲ یہ حدیث شریف چند اور اسناد کے ساتھ منقول ہے۔۳

یاد رہے کہ ہم لوگ ابھی تک عالم طبیعیات کے پردوں اور دنیا کی پست زندگی کے حجاب میں لپٹے ہوئے ہیں۔ ہم عالم غیب اور ملکوت نفس سے غافل ہیں۔ ہم نفس کو درپیش خطرات، خرابیوں، ہلاکت خیز گردابوں سے ناآشنا ہیں، نیز جن چیزوں سے اس کی اصلاح ہوسکتی ہے ان سے بھی غافل اور بے خبر ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ غضب اور غصے کی وجہ سے ایمان کا نور کیونکر زائل ہوتا ہے اور ایمان کیسے خراب ہوجاتا ہے۔ بنابریں ہم لوگ حقیقی ایمان اور بے جا غیظ وغضب کے درمیان موجود تضاد کا ادراک نور بصیرت کے ذریعے نہیں کرسکتے۔

جو لوگ قلوب ونفوس کا علاج کرنے والے طبیب ہیں یہ لوگ اپنے وسیع اور خداداد علم کے باعث، نیز عالم ملک وملکوت کی باطنی حقائق سے آشنائی کے باعث دلوں کے امراض اور ان کے علاج کا علم رکھتے ہیں، نیز دل کی اصلاح کرنیوالی یاد سے اور اسی طرح فاسد کرنے والے عناصر سے آشنا ہیں۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حقائق کو کشف کرنے، بواطن کو ظاہر کرنے اور ہم خفتگان کو بیدار کرنے کیلئے بھیجے گئے ہیں۔ یہ ہستیاں ہمیں ہمارے دلوں کے باطن کی خبر دیتی ہیں اور ہمارے دلوں کی ملکوتی حقائق سے ہمیں یہ آگاہ کرتی ہیں۔ یہ ہستیاں جانتی ہیں کہ جس طرح سرکہ وصبر (الوا) شہد کو فوراً خراب کردیتے ہیں اور شہد کی مٹھاس اور لطافت کو تلخی وترشی میں تبدیل کردیتے ہیں اسی طرح غیظ وغضب کی آگ بھی ایمان کے نور کو بجھا دیتی ہے اور ایمان کو خراب کردیتی ہے۔

۱۔ غصہ ایمان کو اس طرح خراب کردیتا ہے جس طرح سرکہ شہد کو۔ (دیکھئے، وسائل الشیعہ، ج ۱۵، ص ۳۵۸، باب ۵۳، ابواب جہاد النفس، ح ۲؛ نیز اصول کافی، ج ۲، ص ۲۲۹، باب غضب، ح ۱)۔

۲۔ رسول اللہؐ نے فرمایا: غصہ ایمان کو اس طرح خراب کردیتا ہے جس طرح صبر (ایک درخت کا تلخ رس) اور سرکہ شہد کو۔ دیکھئے، مستدرک الوسائل، ج ۱۲، ص ۷، باب ۵۳، ابواب جہاد النفس، ح ۳؛ نیز جعفریات، ص ۱۶۳، باب غضب۔

۳۔ دیکھئے، بحار الانوار، ج ۷۳، ص ۲۶۶، ح ۱۹ و ۲۱۔

غصے کا صرف یہی نقصان ہی کافی ہے کہ وہ انسان کے ملکوتی سرمایہ حیات (جو ایمان سے عبارت ہے) کو تباہ کر دیتا ہے اور فلاح انسانی کا راستہ مسدود کر دیتا ہے اور اسے خالی ہاتھوں دوسرے عالم کی طرف بھیج دیتا ہے۔ جبکہ غصہ اور غضب انسان کو اس دنیا میں بھی مہلک خطرات سے دوچار کر دیتا ہے اور اسے دونوں جہانوں میں ناکامی و بدبختی کا شکار بنا دیتا ہے۔

کم ہی چیزیں ایسی ہیں جو آتش غضب کی طرح انسان کو اتنی تیزی سے ناکامی و بربادی کی جانب دھکیل دے۔ بسا اوقات ایک لمحے کا غیظ و غضب انسان کو دین خدا سے خارج کر دیتا ہے، نیز وہ اللہ تعالیٰ اور انبیائے عظام کی شان میں گستاخی کر بیٹھتا ہے۔ بسا اوقات انسان ایک گھڑی کے غصے کی وجہ سے بے قصور انسانوں کو قتل کرنے پر اتر آتا ہے۔ چنانچہ اصول کافی میں حضرت صادقؑ سے منقول ہے: ''میرے پدر (بزرگوار) فرماتے تھے: کونسی چیز غصے سے زیادہ سخت ہے؟ بہ تحقیق انسان غضبناک ہوتا ہے پھر وہ قتل کرتا ہے اس نفس کو جسے خدا نے حرام قرار دیا ہے، نیز وہ پاکدامن عورتوں پر تہمت لگاتا ہے''۔[1]

وسائل میں الخصال کی اسناد کے ساتھ امام صادقؑ سے مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

﴿قَالَ الْحَوارِيُّونَ لِعِيسىٰ علیہ السلام: أَيُّ الأَشْيَاءِ أَشَدُّ؟ قَالَ: أَشَدُّ الأَشْيَاءِ غَضَبُ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ - قَالُوا: بِمَا نَتَّقِي غَضَبَ اللهِ؟ قَالَ: أَنْ لاَ تَغْضَبُوا. قَالُوا: وَمَا بَدْءُ الْغَضَبِ؟ قَالَ: الْكِبْرُ وَالتَّجَبُّرُ وَمَحْقِرَةُ النَّاسِ﴾[2]

یہ حدیث شریف اشارہ کر رہی ہے کہ غصہ درحقیقت غضب الٰہی کی آگ ہے۔

جی ہاں! یہ آتش سوزاں دل کے باطن سے ظاہر ہوتی ہے، چنانچہ ﴿نَارُ اللهِ الْمُوقَدَةُ ☆ الَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى الأَفْئِدَةِ﴾[3] کا اشارہ شاید اسی آگ کی طرف ہو جس کی ابتدا دل کے باطن سے ہوتی ہے اور

۱۔ دیکھئے، اصول کافی، ج ۲، ص ۲۲۹، کتاب الایمان والکفر، باب غضب، ح ۴۔

۲۔ حواریوں نے حضرت عیسیٰؑ سے سوال کیا: سب سے سخت چیز کونسی ہے؟ فرمایا: سب سے سخت چیز اللہ تعالیٰ کا غیظ و غضب ہے۔ انہوں نے عرض کیا: ہم کس چیز کے ذریعے اللہ کے غضب سے بچیں؟ فرمایا: اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم غصہ نہ کرو۔ انہوں نے عرض کیا: غصے کا سرچشمہ کیا ہے؟ فرمایا: تکبّر و خود بینی اور لوگوں کو حقیر سمجھنا۔

وسائل الشیعہ، ج ۱۵، ص ۳۶۲، باب ۵۳، ابواب جہاد نفس، ح ۱۵؛ نیز شیخ صدوقؒ کی الخصال، ص ۶، ح ۱۷۔

۳۔ اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ جو دلوں تک پہنچ جائے گی۔ سورۂ ہمزہ ۶، ۷۔

دلوں تک پہنچ جاتی ہے۔

آج ہم غضب خداوندی کی آگ کے بارے میں صرف سنتے ہیں۔اس آگ کی حقیقت کو کماحقہ بیان کرنا کسی کیلئے ممکن نہیں۔نہ دنیا میں اتنی ہمت ہے اور نہ ناموس طبیعیات میں اتنی گنجائش ہے کہ وہ عالم غیب اور ماوراء الطبیعیات سے مربوط حقائق کو کماحقہ بیان کریں۔ہم لوگ غیبی اور اخروی کامیابی وناکامی کے بارے میں جو کچھ سنتے ہیں انہیں اس دنیا اور یہاں کی محسوس اور مأنوس باتوں کے آئینے میں دیکھتے اور سمجھتے ہیں۔عالم آخرت اور عالم ملکوت کا اس دنیا اور عالم ملک کے ساتھ قیاس درست نہیں ہے۔

ہم نے جس آگ کا بھی مشاہدہ کیا ہے وہ بدن (خاص کر بدن کی ظاہری سطح) کے ساتھ مس کرنے والی آگ ہے۔اس سے زیادہ ہم نے کسی آگ کا مشاہدہ نہیں کیا۔اگر اس دنیا کی تمام آگ کو ایک جگہ جمع کیا جائے تو بھی وہ انسان کے دل کو نہیں جلا سکتیں، کیونکہ دل کا تعلق عالم ملکوت سے ہے اور دنیوی آگ کی رسائی وہاں تک نہیں۔دنیوی آگ کی رسائی صرف دنیوی بدن تک ممکن ہے۔صرف خدا کی ملکوتی آگ ہی روح وقلب کے ظاہر وباطن کو جلا سکتی ہے۔یہ آگ دل کے باطن سے نکلتی ہے اور حواس خمسہ کے راستوں سے ظاہر ہوتی ہے۔

حضرت عیسیٰؑ فرماتے ہیں: جو شخص غضب خداوندی کی آگ سے محفوظ رہنا اور ﴿نَارُ اللهِ المُوقَدَةُ﴾ سے بچنا چاہے اسے چاہئے کہ غصے کی آگ سے اجتناب کرے۔

اصول کافی کی ایک حدیث میں حضرت امام باقرؑ فرماتے ہیں: ''بہ تحقیق غصہ شیطان کی جلاء ہوئی آگ کا ایک ٹکڑا ہے جو انسان کے دل میں بھڑکتی ہے۔بے شک تم میں سے جو شخص غضبناک ہو اس کی آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں، اس کی گردن کی رگیں پھول جاتی ہیں اور شیطان اس کے اندر داخل ہو جاتا ہے۔ تم میں سے جو شخص اس کے شر سے بچنا چاہے وہ زمین پر بیٹھ جائے تا کہ اس حالت میں شیطان کی پلیدی سے نجات حاصل کرلے''۔[1]

حضرت امام صادقؑ سے ہی مروی ہے: ''غصہ حلیم انسان کے دل کو تاریک بنا دیتا ہے۔جو شخص اپنے غصے پر قابو نہ پا سکتا ہو وہ اپنی عقل کا بھی مالک نہیں ہو سکتا''۔[2]

۱۔ اصول کافی، ج۲، ص۲۳۱، کتاب الایمان والکفر، باب غضب، ح۱۲۔

۲۔ ایضاً، ص۲۳۲، ح۱۳۔

حضرت امام باقرؑ سے منقول ہے: ''جو شخص اپنے غصے سے لوگوں کو بچائے اللہ تعالیٰ قیامت کے عذاب سے اسے محفوظ رکھے گا''۔[۱]

اس سلسلے میں احادیث شریفہ اس قدر زیادہ ہیں جن کے ذکر کی اس مختصر کتاب میں گنجائش نہیں[۲]

آٹھویں فصل

غصے کا علاج

یاد رہے کہ ہم نے ''چہل حدیث'' کی ساتویں حدیث کی تشریح کرتے وقت غصہ اور اس کے علاج کے بارے میں کسی حد تک تفصیل سے گفتگو کی ہے۔[۳] بنابریں اس کتاب میں اختصار کے ساتھ اس کتاب کے مطالب کا خلاصہ پیش کرتے ہیں تاکہ یہ کتاب بھی اس فائدے سے محروم نہ رہے۔

جان لو کہ نفس کا بنیادی علاج اس وقت کرنا چاہئے جب غصے کی آگ خاموش ہو، کیونکہ جس وقت یہ مہلک و ہولناک اور جلا دینے والی آگ شعلہ ور ہو اس کی روک تھام بہت مشکل ہے۔ اس حالت میں علاج نفوس کے ماہرین بھی اس کی چارہ گری سے عاجز ہوتے ہیں، کیونکہ وہ اس دوران جس قدر چارہ گری، علاج اور پند و نصیحت کی جدوجہد کریں اس شیطانی آگ[۴] کے شعلے مزید بھڑکیں گے۔ بنابریں اس حال میں ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کی حالت کو اچانک تبدیل کیا جائے اور نفس کو اس ہیجانی کیفیت سے خارج کیا جائے۔ اس حالت میں غضبناک انسان کو چاہئے کہ پہلے اپنی حالت کو بدلنے کی تدبیر کرے اور غصے کے برے انجام پر غور کرے بشرطیکہ اس کے اندر عقل و شعور کی کوئی رمق موجود ہو۔ اسے چاہئے کہ اپنی حالت میں

۱۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۳۰۲، کتاب الایمان والکفر، باب غضب، ح ۱۵۔

۲۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۲۲۹، کتاب الایمان والکفر، باب غضب؛ نیز بحار الانوار، ج ۷۰، ص ۲۶۲، کتاب الایمان والکفر، باب مساوی الاخلاق، باب ۲۱۳۲؛ نیز مستدرک الوسائل، ج ۱۲، ص ۶ تا ۱۵۔

۳۔ شرح چہل حدیث (امام خمینیؒ)، ص ۱۳۹۔

۴۔ یہ تعبیر امام محمد باقرؑ کی حدیث سے ماخوذ ہے جس میں آپؑ نے فرمایا: ﴿إِنَّ هٰذَا الْغَضَبَ جَمْرَةٌ مِنَ الشَّيْطَانِ﴾ یعنی یہ غصہ شیطان کی (بھڑکائی ہوئی) آگ کا ایک ٹکڑا ہے۔
اصول کافی، ج ۲، ص ۳۰۱، کتاب الایمان والکفر، باب الغضب، ح ۱۲۔

تبدیلی لاکر دل کے ہیجان میں اضافہ نہ ہونے دے اور اس مہلک آگ کے شعلوں کو مزید بڑھنے کا موقع نہ دے۔ اگر ممکن ہو تو اسے چاہیئے کہ اپنے آپ کو غصے کا سبب بننے والے عوامل کے گرداب سے باہر نکال کر اپنے آپ اور دوسروں کو ہلاکت کے خطرے سے نجات دے یا اسے چاہیئے کہ اپنی حالت میں تبدیلی لائے مثلاً اگر وہ کھڑا ہے تو بیٹھ جائے اور اگر بیٹھا ہوا ہے تو لیٹ جائے یا ذکر خدا میں مشغول ہو جائے۔ کچھ علماء اس حالت میں ذکر خدا کو واجب قرار دیتے ہیں۔[۱]

کافی شریف کی روایت ہے کہ حضرت صادقؑ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک نبی پر وحی کی کہ: اے فرزند آدم! تم اپنے غصے کے وقت مجھے یاد کرو تاکہ میں اپنے غصے کے وقت تجھے یاد کروں اور تجھے ان لوگوں کے ساتھ ہلاک نہ کروں جنہیں میں ہلاک کروں گا۔ اور اگر تمہارے اوپر ظلم ہو تو اس مدد پر راضی ہو جاؤ جو میں تم پر کروں، کیونکہ اگر میں تمہاری مدد کروں تو یہ اس سے بہتر ہے کہ تم اپنی مدد آپ کرو"۔[۲]

کافی شریف کی ایک حدیث میں امام باقرؑ کا حکم ہے: "جب تمہیں غضب اور غصے کا خوف لاحق ہو اور شیطان کے آتشیں انگارے سے خطرہ محسوس ہو تو زمین کے ساتھ لگ جاؤ کہ اس صورت میں شیطان کی پلیدی تم سے دور ہو جائے گی"۔[۳]

اصول کافی ہی میں حضرت باقرؑ سے روایت ہے: "بہ تحقیق انسان غضبناک ہوتا ہے اور ہرگز راضی نہیں ہوتا جب تک داخل آتش نہ ہو۔ پس جو شخص کسی گروہ سے غضبناک ہو وہ اگر کھڑا ہے تو فوراً بیٹھ جائے، کیونکہ شیطان کی پلیدی اس سے دور ہو جائے گی۔ جو شخص اپنے رشتہ داروں سے غضبناک ہو وہ اس کے پاس جائے اور اسے مس کرے، کیونکہ جب رشتہ دار کو مس کیا جائے تو غصہ ٹھنڈا ہوتا ہے"۔[۴]

طرق اہل سنّت سے روایت ہے کہ جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، کھڑے ہونے کی حالت میں غضبناک ہوتے تو بیٹھ جاتے تھے اور جب بیٹھنے کی حالت میں غضبناک ہوتے تو پشت کے بل لیٹتے تھے۔ اس طرح آپؐ کا غصہ ٹھنڈا ہو جاتا تھا"۔[۵]

۱۔ وسائل الشیعہ، ج ۱۵، کتاب الجہاد، ابواب جہاد النفس و ما یناسبہا، باب ۵۴، ص ۳۶۴ (باب وجوب ذکر اللہ عند الغضب)

۲۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۲۳۰، کتاب الایمان والکفر، باب غضب، ح ۸۔

۳۔ ایضاً، ص ۲۳۱، ح ۱۲۔ ۴۔ ایضاً، ص ۲۲۹، ح ۲۔

۵۔ کنز العمال، ج ۷، ص ۱۴۱، ح ۴۸۴۔

یہ وہ طریقے تھے جن کے ذریعے غضبناک انسان اپنے غصے کا علاج کرسکتا ہے۔

لیکن اگر دوسرے لوگ اس کا علاج اس حالت میں کرنا چاہیں جب وہ غضبناک ہو تو یہ بہت مشکل ہے۔ مگر یہ کہ غصے کی آگ بھڑکنے سے پہلے مذکورہ بالا طریقوں میں سے کسی ایک کے ذریعے اس کا مداوا کیا جائے۔ شاید اس کے علاج کا ایک طریقہ اسے ڈرانا اور دھمکانا ہو خاص کر ایسے طاقتور شخص کے ذریعے جس کا خوف اس کے غصے کو اندر سے ہی بجھادے۔ البتہ اس بات کا خیال رہے کہ یہ ڈرانا اس وقت نہ ہو جب غصہ اپنے عروج پر ہو کیونکہ یہ خود اس غضبناک انسان کیلئے باعث خطر ہوسکتا ہے۔ بہر حال جب غصہ عروج پر ہو تو اس وقت چارہ کار بہت مشکل ہے؛ ﴿نعوذ باللهِ منه﴾۔

نویں فصل

حالت سکون میں غصے کا علاج نیز غصے کے اسباب کا علاج

غصے کے بہت سارے اسباب ہیں جن میں سے بعض اہم اسباب کا ہم یہاں ذکر کریں گے:

ان سے ایک جو شاید ان تمام میں سب سے اہم ہو "حبّ دنیا" ہے جسے "ام الامراض" کے نام سے پکارنا چاہیئے۔ اکثریا تمام روحانی بیماریوں کی وجہ یہی خرابی ہے۔ احادیث شریفہ میں بھی اسے "ہر غلطی کا سرچشمہ" قرار دیا گیا ہے۔[1]

مال کی محبت، جاہ پسندی، اقتدار و طاقت کی ہوس، کھانے پینے کی خواہش جنسی لذتوں سے لگاو، نیز لباس اور دیگر اشیاء کی محبت حبّ دنیا اور نفس پرستی کی مختلف صورتیں ہیں۔[2] بنابریں غصے کو بھڑکانے والے تمام اسباب کا سرچشمہ اسی حبّ دنیا کو قرار دینا چاہیئے۔ جب انسان مذکورہ چیزوں کا دلدادہ اور اسیر ہو جاتا ہے اور پھر اگر کہیں ان خواہشات کی راہ میں کوئی رکاوٹ آجائے تو اس رکاوٹ کو دور کرنے کیلئے اس کے دل کا خون جوش مارنے لگتا ہے اور اس کے غصے کی آگ بھڑکنے لگتی ہے جس طرح بھوکے کتے کسی مردار پر جھپٹتے ہیں اور شدید بھوک کو مٹانے کیلئے ایک دوسرے پر پہل کرنے اور ایک دوسرے کو اس سے دور رکھنے کی کوشش کرتے ہیں یوں ایک معرکہ بپا ہوتا ہے۔

۱۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۲۳۸، باب حبّ دنیا، ح ۱۔

۲۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۱۰۶، باب ذم دنیا، ح ۱۱۔

اسی مناسبت سے امیر المومنین علی علیہ السلام نے فرمایا ہے: ﴿الدُّنیا جِیفَةٌ وَطالِبُها کلابٌ﴾ ۱ طالب دنیا کو کتے سے تشبیہ دینے کی وجہ شاید یہی غصہ ہو جو انسان کو کتے جیسا یا خود کتا بنا دیتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ اکثر خرابیوں کا علاج نفس پرستی اور حبّ دنیا کے علاج میں پوشیدہ ہے، کیونکہ اس مرض کا علاج کیا جائے تو نفس میں اطمینان وسکون کی کیفیت آ جاتی ہے قلب مطمئن رہتا ہے اور دنیوی امور کی اہمیّت کم ہو جاتی ہے، نیز کھانے پینے کی اہمیّت کم ہو جاتی ہے۔ پھر اگر کوئی شخص اس کے ساتھ کسی دنیوی معاملے میں جھگڑے تو وہ جوش میں نہیں آتا بلکہ سکون واطمینان کا مظاہرہ کرتا ہے اور اس معاملے کو اہمیّت نہیں دیتا، کیونکہ اس کا محبوب اہل دنیا کا تر نوالہ نہیں ہے۔ دنیا کی محبت کی جڑوں کو دل سے اکھاڑ پھینکنا اگرچہ ایک مشکل کام ہے (خاص کر سلوک وریاضت کے ابتدائی مراحل میں) لیکن ہر مشکل کام عزم صمیم اور مردانہ اقدام کے آگے آسان ہو جاتا ہے۔ انسان کا پختہ ارادہ ہر مشکل کام کو رام کر لیتا ہے اور ہر قسم کے طولانی اور سنگلاخ راستوں کو نزدیک اور آسان بنا دیتا ہے۔

سالک راہ حقیقت کو یہ توقع نہیں رکھنی چاہئے کہ وہ ابتدائے امر میں ہی خرابیوں کی اس جڑ اور اس مہلک بیماری کا مکمّل طور پر صفایا کر سکتا ہے۔ البتہ وہ مسلسل محنت، غور وفکر اور ریاضت ومجاہدت کے ذریعے، نیز خواہشات کی شاخوں کو یکے بعد دیگرے کاٹ کر اور حبّ دنیا کی بعض جڑوں کو اکھاڑ کر بتدریج اپنے اصلی مقصد تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ ہاں! اسے شروع سے ہی یہ یاد رکھنا چاہئے کہ تمام پست مقاصد اور اہداف کے راستوں کا کانٹا دنیا اور نفس کی محبت ہے۔ اگر کسی کے دل میں معرفت، حق پرستی اور حبّ خداوندی کی چنگاری موجود ہو تو وہ محسوس کرے گا کہ حبّ دنیا اور حبّ نفس ''رخ یار'' کا نظارہ کرنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اور سب سے بڑا پردہ ہیں۔ بقول مولوی: مادر بت ھا بتِ نفس شما است ۲

حضرت موسیٰ کلیم (علیٰ نبینا وآلہ وعلیہ السلام) نبوت ومعرفت کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔ وہ زبردست ریاضتوں اور جہاد النفس کے بعد مقدسین اور محبین کے مرتبے پر فائز ہوئے۔ پھر وہ محبوب کی ملاقات کو چلے تو

۱۔ دنیا مردار ہے اور اسے طلب کرنے والے کتے ہیں۔ (غرر الحکم، ص ۱۳۷، مختصر فرق کے ساتھ)۔

۲۔ مادر بتہا بت نفس شما است   ز آنکہ آن بت، مار واین یک اژدہاست

(مثنوی معنوی مولوی، دفتر اول، ص ۲۲)۔

﴿فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى﴾[1] کی آواز نے انہیں اہل وعیال کی محبت سے روکا[2] یعنی اگر وادئ عشق (جو مقدس اور مخلص ہستیوں کی وادی ہے) میں قدم رکھنا چاہتے ہو تو یاد رکھو کہ دوسروں کی محبت کے ساتھ یہاں داخل نہیں ہو سکتے (حالانکہ حضرت موسیٰ کی محبت کا ہم جیسے لوگوں کی محبت سے کیا موازنہ؟) شاید اسی لئے ''نعلین'' کا لفظ لایا گیا جو سب سے نچلے عضو میں پہنی جاتی ہیں اور ان کا اتارنا بھی آسان ہے۔

خلاصہ یہ کہ دنیا اور نفس کی محبت کے ساتھ معرفت خداوندی کی خواہش خام خیالی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص تزکیہ نفس، تصفیہ قلب اور تطہیر اخلاق کا خواہاں ہو تو وہ بھی حبّ دنیا اور نفسانی خواہشات کی پیروی کے ساتھ مہلک نفسانی خرابیوں میں سے کسی ایک کی بھی جڑ نہیں کاٹ سکتا اور نہ روحانی ونفسانی خوبیوں میں سے کسی ایک خوبی سے متصف وآراستہ ہو سکتا ہے۔ ہر قسم کی اصلاح کا سرچشمہ یہ ہے کہ تین قوتوں کو حد اعتدال پر رکھا جائے جو یہ ہیں: وسوسہ شیطانی کی قوت، حیوانی ونفسانی خواہشات کی قوت اور درندوں والی غیظ وغضب کی قوت۔ دنیا کی محبت ان تینوں قوتوں کے اعتدال کو ختم کر دیتی ہے۔ شہوت اور غصے کی آگ کا شعلہ ور ہونا دنیا سے محبت اور نفس پرستی کا شاخسانہ ہے۔ اس کے نتیجے میں وساوس شیطانی کی قوت بھی اعتدال سے ہٹ جاتی ہے اور شیطانی خیالات کو اپنا لیتی ہے۔

اگر کوئی شخص حصول آخرت اور جنت کا طالب ہو تو وہ بھی حبّ دنیا کی موجودگی میں تقویٰ یا اچھے اعمال کے ذریعے آخرت کے کسی درجے کو حاصل نہیں کر سکتا۔ دنیا کی محبت انسان کو گناہوں میں مبتلا اور واجبات شرعیہ سے روگردان بنا دیتی ہے۔ مالی حقوق مثلاً زکات، خمس اور حج وغیرہ کی ادائیگی سے اجتناب مال اندوزی کے جذبے کا نتیجہ ہیں۔ بدنی اور جسمانی واجبات (مثلاً نماز روزہ وغیرہ) کی ادائیگی سے اجتناب تن پروری اور تن آسانی کا شاخسانہ ہے۔

خلاصہ یہ کہ محبت دنیا (جو تمام امراض کی جڑ ہے) انسان کو قسم قسم کی مشکلات میں مبتلا کر دیتی ہے اور

۱۔ (اے موسیٰ!) اپنی دونوں جوتیاں اتار دو کیونکہ تم طوی کی مقدس وادی میں ہو۔ سورۂ طٰہٰ ۱۲۔

۲۔ خلع نعلین (جوتیاں اتارنے) کی یہ تاویل اس روایت سے ماخوذ ہے جسے طبرسی نے کتاب الاحتجاج، ج ۲، ص ۴۶۳ میں امام عصر (عج) سے نقل کیا ہے۔

انسان کوابدی ہلاکت سے دوچار کردیتی ہے۔ بنابریں عاقل انسان پر لازم ہے کہ فرصت کے ان لمحات اور خداداد زندگی کو (جو اللہ نے ابدی کامیابیوں کے حصول کی خاطر اسے عطا کی ہے) مفت میں نہ گنوادے اور اسے خسارے کی نذر نہ کرے۔

اے عزیز! ہماری خوبی وخرابی اور کامیابی وناکامی سے اللہ تعالیٰ، انبیائے کرام، مبلغین وحی اور اولیائے عظام کو کوئی نفع یا نقصان نہیں پہنچے گا۔ اگر پوری دنیا خراب اور تباہ ہوجائے تو اس سے اللہ کی حکومت میں کوئی رخنہ پیدا نہیں ہوگا۔ اسی طرح اگر سب کے سب صالح اور نیک بن جائیں تو اس سے اللہ کے دائرہ اختیار میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔

انسان اور اس سے مربوط اشیاء سلطنت الٰہیہ کی عظمتوں کے سامنے کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتیں جو اس کی خوبی وبدی کی کوئی اہمیّت ہو۔ ان سب باتوں کے باوجود نزول وحی اور نزول احکام الٰہیہ کا اہتمام انبیاء کی زحمات اور قربانیاں اور اولیاء خدا کی فداکاریاں صرف ہماری بھلائی کیلئے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ مفسدوں کا انجام کیا ہوگا۔ وہ عالم غیب سے آگاہ ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہم خواب غفلت سے بیدار ہوں اور اپنی ذمہ داریوں سے آگاہ ہوجائیں۔ لیکن ہم بے چارے اس وقت خواب گراں سے بیدار ہوں گے جب پانی سر سے گزر چکا ہوگا اور کوئی چارکار باقی نہ ہوگا۔ اس دن حسرت وافسوس اور ندامت وشرمندگی کے علاوہ ہمارے پاس کوئی چیز نہ ہوگی جس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿وَأَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ إِذْ قُضِيَ الْأَمْرُ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ﴾[1]

۱۔ انہیں حسرت کے دن سے ڈراؤ جب کام تمام ہوچکا ہوگا اور وہ (اب بھی) غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ مریم ۳۹۔

علم اور اس کی ضد جہل کا بیان

یہ مقصد چار فصلوں پر مشتمل ہے:

پہلی فصل

علم اور جہل کا مفہوم

جان لو کہ یہ علم و جہل جس کا ذکر عقل و جہل کے لشکروں میں یہاں ہو رہا ہے خود عقل و جہل سے جدا اور الگ ہیں، کیونکہ عقل (جیسا کہ قبل ازیں ذکر ہو چکا) سے مراد یا تو انسان کے اندر موجود ''عقل مجرد'' ہے جس کی ضد ''قوت وہمیہ'' ہے جو خود مجرد ہے اور یہ تجرد ''عقلی تجرد'' سے نچلی سطح کا ہے۔ یا عقل سے مراد ''عقل کل'' ہے جو ''عالم کبیر'' والی عقل ہے، اس کے مقابلے جو جہل ہے اس سے مراد ''وہم کل'' ہے۔ شاید یہ وہم کل وہی ہے جسے شریعت مطہرہ کی زبان میں ''شیطان'' کہا گیا ہے۔ ان دونوں کی تفصیلات کا ذکر قبل ازیں ہو چکا ہے۔[1]

یہاں علم و جہل سے مراد حقیقت عقل اور حقیقت جہل (جن کا ذکر پہلے ہو چکا) کی دو صورتیں یا ان کے دو آثار و مظاہر ہیں۔ بنا بریں عقل کا مظہر علم ہے، کیونکہ عقل ایک مجرد اور غیر محجوب حقیقت ہے اور عقلی براہین سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ حقیقت (عقل) عالم بھی ہے اور صاحب عقل بھی۔[2]

اس کے مقابلے میں جہل بھی اگرچہ مجرد اور عالم ہے لیکن اس پر دنیوی، مادی اور طبیعیاتی پہلو کے غلبے کے باعث اس کے تمام ادراکات جہل مرکب کے مترادف ہیں اور یہ خدا کے جامع نظام اور جمال الٰہی کے

۱۔ دیکھئے، ص ۲۹۔

۲۔ الاسفار الاربعہ، ج ۳، ص ۴۴۷، مرحلہ ۱۰۔

مطابق نہیں۔

ممکن ہے کہ صدور روایت کے مطابق ''علم'' سے مراد اللہ تعالیٰ، اس کی ذات، اس کی صفات و راس کے افعال کی وہ معرفت ہو جس کا شمار اللہ کی آیات اور نشانیوں میں ہو اور جہل سے مراد ان حقائق سے ناآشنائی ہو۔ بنابریں عقلی ادراکات سے مراد وہ ادراکات ہیں جو اللہ جل جلالہ سے مربوط ہوں اور ادراکات جہلیہ وشیطانیہ سے مراد ہو ادراکات ہیں جو شجرۂ خبیثہ سے مربوط ہوں جو تمام جہالتوں اور ضلالتوں کا اصلی سرچشمہ ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ تمام ممکنات موجودہ کے دو زاوئے اور دو پہلو ہیں؛ ایک زاویہ: نورانیت، وجود، اطلاق اور کمال کا پہلو ہے جو غیبی اور الٰہی زاویہ ہے۔ دوسرا پہلو: ظلمت، محدودیت، عیب اور نقص کا پہلو ہے جو اشیاء کا نفسانی پہلو ہے۔

پہلا پہلو کے لحاظ سے اشیاء کا تعلق اللہ کی نشانیوں اور مظاہر سے ہے۔ کافی شریف میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی حدیث کے الفاظ ﴿اِنَّمَا الْعِلْمُ ثَلاثَةٌ آيَةٌ مُحْكَمَةٌ ... ﴾[1] میں آیت محکمہ سے مراد شاید اشیاء کے نورانی پہلو کا علم ہو جو اللہ کی معرفت کا لازمہ ہے اور عقل کا خاصہ اس نورانی پہلو کا ادراک ہو جو اللہ کی نشانیوں سے عبارت ہے جبکہ وہم اور جہل کا خاصہ اشیاء کی ظاہری اور محدود صورتوں کا ادراک ہو جو جہل مرکب، سراب، دھوکہ، باطل اور حقیقت سے دور ہے، کیونکہ بقول شاعر:

﴿أَلاَ كُلُّ شَيْءٍ مَا خَلاَ اللهَ بَاطِلٌ﴾[2]

رسول اللہ ؐ سے منقول ہے کہ آپ ؐ نے فرمایا:

''لبید کا یہ شعر عربی زبان میں کہے گئے اشعار میں سب سے زیادہ سچا شعر ہے''۔[3]

۱۔ حدیث نبوی ؐ یہ ہے: ﴿اِنَّمَا الْعِلْمُ ثَلاثَةٌ: آيَةٌ مُحْكَمَةٌ أَوْ فَرِيضَةٌ عَادِلَةٌ أَوْ سُنَّةٌ قَائِمَةٌ، وَمَا خَلاهُنَّ فَهُوَ فَضْلٌ﴾۔ علم کی تین اقسام ہیں: محکم نشانی (عقائد) درست فریضہ (احکام) اور پا بر جا سنّت (اخلاقیات) ان کے علاوہ باقی علوم زاید ہیں۔ (اصول کافی، ج۱، ص۲۴، باب۳، کتاب فضل علم، ح۱)۔

۲۔ پورا شعر یہ ہے: أَلاَ كُلُّ شَيْءٍ مَا خَلاَ اللهَ بَاطِلٌ وَكُلُّ نَعِيمٍ لاَ مَحَالَةَ زَائِلٌ (دیوان لبید، ص۱۴۸)۔

۳۔ فیض کاشانی کی علم الیقین، ج۱، ص۱۰۶۔

دوسری فصل

علم سب سے بڑی فضیلت ہے

جان لو کہ علم تمام خوبیوں اور کمالات میں سرفہرست ہے۔ یہ اللہ کے عظیم ترین اسماء اور اس کی وجودی صفات میں سے ایک ہے۔ کائنات کا نظام اور غیب و شہود کا سسٹم علم کی بنیاد پر استوار ہے۔ ہر موجود کے وجود میں یہ حقیقت (علم) سب سے زیادہ شامل ہے۔ یہ مقام ربانی اور بارگاہ واجب الوجود کے زیادہ قریب ہے، بلکہ علم اور وجود میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جہاں جتنا وجود ہوگا وہاں اتنا ہی علم ہوگا۔ بنابریں اگر علم مکمّل طور پر معدوم ہو تو وجود بھی مکمّل طور پر معدوم ہوگا۔ علم نہ ہو تو عدم ہی عدم ہوگا۔

یہ دعویٰ مضبوط عقلی براہین سے ثابت ہے کہ وجود کی دنیا علم کی دنیا ہے اور موجودات کا کوئی ذرّہ یہاں تک کہ جمادات اور نباتات بھی علم سے خالی نہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے وجود کے تناسب سے علم رکھتے ہیں۔[۱] البتہ بعض بڑے فلسفی ''وحدت عاقل و معقول'' کی بحث میں بظاہر اس نظریے کے طرفدار ہیں کہ عالم طبیعیات اور مادی دنیا عالمیّت اور معلومیت سے خالی ہے۔[۲] جبکہ ہماری نظر میں یہ نظریہ قابل قبول نہیں ہے۔ ہم نے اس دعوی کو (جو توحید کا مظہر ہے) برہان لمّی کے ذریعے حقیقتاً ثابت کیا ہے۔[۳] اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں اس نکتے کو بڑی اہمیت دی ہے۔ قرآن کی بہت سی آیات واضح طور پر اعلان کر رہی ہیں کہ موجودات عالم علم و شعور رکھتے ہیں اور اللہ کی تسبیح کرتے ہیں۔[۴] چونکہ محجوب لوگ مشاہدے یا برہان کی کسوٹی پر اس نکتے کا ادراک نہیں رکھتے اس لئے وہ اس تسبیح سے مراد تکوینی تسبیح لیتے ہیں[۵] حالانکہ تکوینی تسبیح کو تسبیح کہنا درست نہیں جو ایک واضح بات ہے لیکن صاحبان معرفت مشاہدۂ حضوری کے ذریعے اس حقیقت کو پہچانتے ہیں۔ احادیث شریفہ میں اس سلسلے میں واضح بیانات موجود ہیں جو تسبیح تکوینی یا ذکر تکوینی پر منطبق

۱۔ الاسفار الاربعہ، ج۱، ص ۱۱۸؛ نیز ج۷، ص ۱۵۳۔

۲۔ الاشارات والتنبیہات (ابن سینا)، ج۳، ص ۲۹۲؛ نیز الشفاء، علم النفس، ص ۲۱۲، فصل ۶، مقالہ ۵۔

۳۔ مصباح الہدایۃ، ص ۷۹؛ نیز شرح چہل حدیث، ص ۲۸۳، ۴۱۶، ۶۵۴۔

۴۔ بطور نمونہ دیکھئے، سورۂ حدید/آیت ۱، حشر ۱، صف ۱، اسراء ۴۴، رعد ۱۳، نور ۴۱ وغیرہ۔

۵۔ التفسیر الکبیر، ج۲۹، ص ۲۰۶، ۲۰۷ میں مرقوم ہے: اگر ہم آیت میں مذکور تسبیح سے مراد زبانی تسبیح لیں تو ''مافی السموات'' سے مراد ''من فی السموات'' لینا پڑے گا۔ (یعنی ما سے مراد صاحبان عقل و تکلم کو لینا پڑے گا بے جانوں کو نہیں)

نہیں ہوتے، جیسا کہ ان احادیث کے مطالعے سے واضح ہے۔[1]

خلاصہ یہ کہ اس بات کے منکرین، عدم مشاہدے کو عدم وجود کی دلیل قرار دیتے ہیں، حالانکہ وہ اللہ کے فرشتوں اور اللہ کی ذات کے مشاہدے سے بھی محروم ہیں۔

انسان ایک محدود وجود کا حامل، نیز عالم طبیعیات و مادیات میں غرق ہونے کی وجہ سے اپنے عالم کے علاوہ دیگر عوالم سے نا آشنا ہے۔ اسی لئے وہ نہ اپنے عالم سے بالاتر عوالم کی پہچان رکھتا ہے نہ اس سے پائین تر عوالم کی، بلکہ وہ اپنے آپ سے بھی مکمّل طور پر نا آشنا ہے اسی لئے وہ اپنے وجود کو صرف گوشت، پوست، ہڈیوں، مادی بدن، حسّی ادراکات اور خیالی تصورات سے ہی عبارت سمجھتا ہے۔ وہ اپنی حقیقت سے غافل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تمام تر توجہ مادی خواہشات، جنسی تمایلات اور شکم پرستی پر مرکوز ہوتی ہے اور چونکہ وہ اپنی حقیقت سے غافل ہوتا ہے اس لئے اپنے انسانی اہداف و مقاصد سے بھی غافل ہوتا ہے اور ان تک رسائی کیلئے اقدام نہیں کرتا۔ بے شک، جو اپنے اندر حیوانی زندگی سے ماوراء کوئی حقیقت نہیں پاتا وہ حیوانی خواہشات و مقاصد کے علاوہ کسی اور چیز کا متلاشی نہیں ہوگا۔

خلاصہ یہ کہ اللہ کی ذات وصفات اور نشانیوں کا علم، نیز اللہ سے مربوط امور کا علم عظیم ترین خوبیوں میں سے ایک ہے۔ دلائل و براہین کے مختلف طریقوں کا علم، فن استدلال کا علم کامیابی اور ہلاکت و ناکامی کے اسباب وعوامل کا علم، نیز اللہ کی پاک شریعت کے آداب وقوانین کا علم حاصل کرنا اس لئے ضروری ہیں، کیونکہ ان کے ذریعے اللہ کی پہچان ہوتی ہے۔ بنابریں ان امور کا علم ذاتاً مطلوب نہیں، یعنی وہ مطلوب ومقصود ذاتی نہیں، بلکہ مطلوب غیری ہے۔ علم کے باب میں مقصد اصلی اور مطلوب ذاتی علم باللہ، یعنی اللہ کی پہچان ہے۔ تمام برحق علوم، ادیان حقہ، احکام شرعیہ اور علم ادیان سے مربوط تمام امور کی برگشت بالواسطہ یا بلاواسطہ معرفت خداوندی کی طرف ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی برہانی وعلمی شناخت بھی کمال انسانی کا اصلی مقصود ومطلوب نہیں، بلکہ اصل مطلوب اللہ کی وہ معرفت ہے جس کا آخری درجہ فنائے مطلق ہے۔ یہ درجہ تمام حدود وقیود کو خیرباد کہنے، نیز اپنی ذات کے ماحول سے نکل کر انانیت اور انّیت کے آثار کو مٹانے سے عبارت ہے۔ اللہ ہمیں اور تمام مؤمنین کو اس کی توفیق دے۔

۱۔ تفسیر نور الثقلین، ج ۳، ص ۱۶۸۔

تیسری فصل

علم فطرت مخمورہ کا لازمہ اور عقل کا لشکری ہے
جبکہ جہل فطرت محجوبہ کا لازمہ اور ابلیس کا لشکری ہے

تمام بنی نوع انسان کی فطرت میں غور وفکر کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سارے انسان کمال مطلق سے عشق رکھتے ہیں جیسا کہ قبل ازیں ذکر ہو چکا۔[۱] نیز سارے انسان فقدان، عدم، نقص اور عیب سے بیزار ہیں، چونکہ علم اور کمال مطلق لازم وملزوم اور مساوی ہیں اس لئے کمال سے عشق، علم سے عشق کے مترادف ہے۔ اسی طرح جہل اور نقص بھی لازم وملزوم اور مساوی ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں علم بذات خود بھی لوگوں کے ہاں فطری طور پر پسندیدہ چیز ہے جبکہ جہل فطری طور پر ایک ناپسندیدہ امر ہے۔ یہ بات انسانی فطرت کی طرف رجوع کرنے سے واضح اور ظاہر ہے۔

البتہ علوم کی تشخیص میں لوگوں کے درمیان اختلاف موجود ہے جو فطرت کی محجوبیت کا نتیجہ ہے وگرنہ علم کی ذات سے ہر کسی کو محبت ہے اور علم مطلق سب کے ہاں پسندیدہ ہے۔ یاد رہے کہ فطرت کے ہاں پسندیدہ علم وہ نہیں جو عام لوگوں کے ہاں معروف ہے، یعنی مفاہیم وعناوین کا علم اور صورتوں کا علم، کیونکہ اگر چہ یہ بھی ایک لحاظ سے علم ہیں لیکن کئی پہلوؤں سے ناقص ہیں۔ واضح رہے کہ فطرت ناقص چیزوں سے عشق نہیں کرتی۔ بنابریں مفاہیم کا ہر علم خواہ وہ جزئی ہو یا کلی فطرت کا محبوب ومعشوق نہیں یہاں تک کہ اللہ کی ذات وصفات اور افعال کا مفہوم، صورت کا علم اور حصولی علم، بلکہ فطرت کو جس علم سے عشق ہے وہ ہے حضوری مشاہدے سے حاصل ہونے والا علم۔ یہ علم تب حاصل ہوتا ہے جب پردے ہٹ جائیں۔ سارے پردے نقص وعدم پر مبنی اور فقدان کا نتیجہ ہیں۔ فطرت اپنے محبوب ومعشوق تک اس وقت پہنچے گی جب تمام ظلمانی اور نورانی پردے ہٹ جائیں۔ اس کے بعد ہی جمیل مطلق کا حسن وجمال حدود وقیود کے پردوں کے بغیر آشکار ہوگا۔ اس مشاہدے کے ذریعے ''کل الکمال'' کا شہود حاصل ہوگا اور فطرت اپنے محبوب تک پہنچ جائے گی، ﴿أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ﴾[۲] ﴿وَإِلَى اللَّهِ الْمَصِيرُ﴾[۳] ﴿وَإِلَيْهِ الْمَرْجِعُ وَالْمَآبُ﴾[۴]

۱۔ دیکھئے، ص ۸۷۔

۲۔ جان لو کہ اللہ کی یاد سے دل مطمئن ہوتے ہیں۔ رعد ۲۸۔

۳،۴۔ سب کی برگشت اللہ کی طرف ہے۔ سورۂ آل عمران ۲۸، سورۂ نور ۴۲۔

سب کی برگشت اور واپسی اسی کے ہاں ہوگی۔

ان عرائض اور سابقہ بیانات سے معلوم ہوا کہ علم فطرت سلیم کا لازمہ ہے، یعنی اگر فطرت محجوب نہ ہو اور مادیت وطبیعیات کے پردے میں نہ چلی جائے تو وہ معرفت مطلقہ کی طرف متوجہ ہوگی۔ لیکن اگر محجوب ہو جائے تو حجابات کے حساب سے معرفت میں کمی آئے گی یہاں تک کہ جاہل مطلق بن جائے۔

چوتھی فصل

قرآن وحدیث کی روشنی میں علم کے بعض فضائل کا بیان

قرآن وسنّت میں موجود علم کے تمام فضائل کا بیان ممکن نہیں اور نہ اس مختصر کتاب میں اس کی گنجائش ہے، کیونکہ قرآن کریم نے علم، علماء اور طالب علموں کو اس قدر اہمیّت دی ہے کہ انسان دنگ رہ جاتا ہے کہ کس آیت سے استفادہ کرے۔ چنانچہ حضرت آدمؑ کی توصیف میں فرماتے ہیں: ﴿وَعَلَّمَ آدَمَ الأَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾[۱] پھر اللہ نے اسماء کی تعلیم کو فرشتوں پر آدمؑ کی برتری کا طرّہ امتیاز قرار دیا۔ اللہ نے ملکوتیوں پر آدم کی فضیلت علم ودانش اور تعلّم اسماء کے ذریعے ثابت فرمائی۔ اگر اس مقام پر علم سے بہتر کوئی چیز ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے فرشتوں کو آدم کے سامنے جھکاتا اور ابوالبشر آدمؑ کو اس کے ذریعے افضل ثابت کرتا۔

یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ ''علم الاسماء'' تمام فضائل میں سب سے بڑی فضیلت ہے۔ البتہ یاد رہے کہ اس علم سے مراد استدلال کے طریقوں سے آشنائی، نیز مفاہیم وکلیات اور وضعی واعتباری امور کا علم نہیں، کیونکہ ان میں کوئی ایسی خوبی وفضیلت نہیں جسے اللہ آدم کیلئے فخر، برتری اور عظمت کا سبب قرار دے۔ پس اس علم سے مراد اسماء کی حقیقت کا علم ہے، نیز یہ خالق برحق کے اندر مخلوقات کے فانی ہونے کو دیکھنا ہے جس پر اسم کی حقیقت کا دارومدار ہے۔ یہ نقطہ نظر ابلیسی نقطہ نظر کی ضد ہے، کیونکہ شیطان نے طین آدم اور اپنی آتش کو براہ راست دیکھا اور انہیں اللہ کے اندر فانی ہونے کی حیثیت میں نہیں دیکھا اور یہی حقیقی جہالت وضلالت ہے۔ ابلیس پر آدم کی یہ برتری تمام انسانوں کیلئے ایک درس اور دعوت عام ہے کہ وہ اپنے آپ کو

۱۔ اور اللہ نے آدم کو تمام اسماء سکھائے۔ سورۂ بقرہ ۳۱۔

مقامِ آدمیت، یعنی تعلّمِ اسماء کی منزل تک پہنچائیں اور وہ موجوداتِ عالم کو آیت، نشان اور اسم کی حیثیت سے دیکھیں نہ کہ ابلیس کی طرح جو موجودات کو براہ راست اور اشیاء کی ظاہری حیثیت میں دیکھتا ہے۔

اللہ نے اپنے رسولؐ پر جو پہلی سورہ نازل کی اس میں فرمایا:

﴿اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِي خَلَقَ ☆ خَلَقَ الاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ☆ اِقْرَأْ وَرَبُّکَ الأَکْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ☆ عَلَّمَ الاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ﴾[۱]

علماء نے ان آیات کو اس بات کی دلیل قرار دیا ہے کہ علم کو دیگر خوبیوں پر فضیلت حاصل ہے۔

وہ اس بات پر درج ذیل دلائل پیش کرتے ہیں:

پہلی دلیل: یہ کہ اللہ نے نزولِ وحی کی ابتداء اور اپنے کتابِ کریم کی افتتاحی آیات میں تخلیق کی نعمت کا ذکر کرنے کے بعد اپنے رسول سے علم کی نعمت کا تذکرہ فرمایا۔ اگر علم سے بہتر کوئی اور خوبی ہوتی تو اس کا ذکر فرماتا۔

دوسری دلیل: یہ کہ اس سورے کی ایک آیت میں فرماتا ہے کہ اللہ نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔ دوسری آیت میں قلم کے ذریعے مجہولات کا علم سکھانے کا ذکر فرمایا۔ ان آیات کے موازنے اور ان میں مناسبت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ اپنی طاقت وقدرت کو دکھانا چاہتا ہے کہ اس نے ایک کثیف اور بدبودار مادے سے کس طرح ایک معزز اور عالم مخلوق پیدا کیا جو اشرف المخلوقات ہے۔ اگر علم تمام انسانی خوبیوں میں سب سے افضل نہ ہوتا تو یہاں اس کا ذکر مناسب نہ ہوتا۔

تیسری دلیل: یہ کہ حکم کو کسی وصف سے منسلک کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ وصف اس حکم میں شامل ہے اور وہ اس کی علت ہے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ اپنی ''اکرمیت'' کا ذکر فرماتا ہے اور علم سکھانے (تعلیم) کو اسی (اکرمیت) سے منسلک فرما رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی ''اکرمیت''، علم سکھانے کی علت ہے۔ اگر علم سے بہتر کوئی چیز ہوتی تو یہاں اس کا ذکر مناسب تھا، کیونکہ اللہ نے یہاں اسمِ تفضیل کا

۱۔ اپنے ربّ کے نام سے پڑھو جس نے پیدا کیا۔ اس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے بنایا۔ پڑھو اور تیرا ربّ سب سے زیادہ اعلیٰ مقام ہے جس نے قلم کے ذریعے تعلیم دی۔ اس نے انسان کو وہ علم سکھایا جسے وہ نہیں جانتا تھا۔ سورہ علق ۱ تا ۵۔

صیغہ استعمال کیا ہے۔ا

چوتھی دلیل: جو راقم کے ذہن میں اللہ نے ڈالی ہے (اور یہ اس کا لطف و کرم ہے کہ وہ انسان کو وہ چیزیں سکھاتا ہے جنہیں وہ نہیں جانتا تھا) یہ ہے کہ اللہ نے ان آیات میں انسان کی خلقت اور اس کی تعلیم کو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ربّ کی طرف منسوب کیا ہے اور محمدؐ کا ربّ (جیسا کہ علم الاسماء میں طے شدہ بات ہے) اسم جامع اور اسم اعظم ہے۔ یہ اسم اعظم انسان کامل کی خلقت کا مبدء اور سرچشمہ ہے۔ دیگر مخلوقات اس بات کے لائق نہیں کہ یہ اسم اعظم ان کی خلقت کا سرچشمہ اور مبدأ ہو۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے علم کی زبردست عظمت اور بلند مرتبے کے پیش نظر اس کی خلقت کو بھی محمدؐ کے ربّ کی طرف منسوب کیا ہے۔ یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ جہاں کسی چیز کو خصوصی اہمیّت دینا چاہتا ہے وہاں ربّ محمدؐ کا ذکر فرماتا ہے۔ اس بارے میں قرآن کریم کی آیات کا مطالعہ کرنے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے۔

چنانچہ سورۂ ہود میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿ما مِنْ دآبَّةٍ اِلاّٰ هُوَ آخِذٌ بِناصِيَتِها اِنَّ رَبّي عَلىٰ صِراطٍ مُسْتَقِيم﴾ ۲ یہاں اللہ نے صراط مستقیم کو حضرت محمدؐ کے ربّ کی طرف نسبت دی ہے۔ یہ اس مناسبت کے علاوہ ہے جو استقامت مطلق کو انسان کامل کے ربّ کے ساتھ حاصل ہے۔ یہاں ربّ کی نسبت حضرت محمدؐ سے دینا صراط مستقیم پر اللہ کی زبردست توجہ کی نشاندہی کرتا ہے۔

اسی طرح سورۂ نساء کی آیۂ تحکیم میں ارشاد فرماتا ہے: ﴿فَلا وَرَبِّكَ لا يُؤمِنُونَ حَتّىٰ يُحَكِّمُوكَ﴾ ۳ سورۂ حجر میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿فَوَرَبِّكَ لَنَسْئَلَنَّهُمْ أَجْمَعِين﴾ ۴ پس یہ وہ موارد ہیں جن کو اللہ نے خصوصی اہمیّت دی ہے۔

خلاصہ یہ کہ تعلیم (سکھانے) کو انسان کامل کے ربّ کی طرف نسبت دینا علم کی زبردست عظمت کی واضح دلیل ہے۔

۱۔ فخر الدین رازی کی التفسیر الکبیر، ج۲، ص۱۸۶ تا ۱۸۹۔

۲۔ کوئی جاندار ایسا نہیں جس کا اختیار اللہ کے پاس نہ ہو بے شک میرا ربّ راہ راست پر ہے۔ سورۂ ہود ۵۶۔

۳۔ نہیں، اے رسول تمہارے ربّ کی قسم یہ لوگ اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک اپنے باہمی تنازعات میں آپ کو منصف نہ بنائیں۔ سورۂ نساء ۶۵۔

۴۔ پس آپ کے ربّ کی قسم ہم ان سب سے ضرور بازپرس کریں گے۔ سورۂ حجر ۹۲۔

علم کی انتہائی عظمت وفضیلت کو واضح کرنے والی آیتوں میں سے ایک سورۂ آل عمران کی یہ آیت ہے:
﴿شَهِدَ اللّٰهُ أَنَّهُ لاَ اِلٰـهَ اِلاَّ هُوَ وَالمَلاَئِكَةُ وَأُولُوا العِلْمِ﴾۱ اس آیت میں اللہ نے صاحبان علم کی گواہی کو اپنی اور فرشتوں کی گواہی کے ساتھ شریک قرار دیا ہے۔ یہ برابری اگر چہ بذات خود ایک عظیم فضیلت ہے لیکن ممکن ہے کہ گواہی کی کیفیت بھی یکساں ہو۔ یہ کمال وعظمت کی انتہا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی شہادت صرف زبانی شہادت نہیں جس طرح فرشتوں کی گواہی بھی صرف زبانی گواہی نہیں، بلکہ یہ ذاتی شہادت ہے، کیونکہ کمال وجود بذات خود وحدت کی دلیل ہے جیسا کہ یہ بات اپنے مقام پر ثابت شدہ ہے۔۲ بنابریں اولوا العلم کیلئے بھی خالص وجود کا مقام ثابت شدہ ہے۔ یہ وہ کمال ہے جس سے بڑھ کر کوئی کمال نہیں۔

سورۂ آل عمران کی ساتویں آیت میں اللہ نے تأویل قرآن کے علم کو اپنے بعد ''راسخون فی العلم'' کے ساتھ مختص قرار دیا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:﴿وَمَا يَعْلَمُ تَأوِيلَهُ اِلاَّ اللّٰهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي العِلْمِ﴾۳ اس کے علاوہ بھی خداوند کریم نے صاحبان علم کی فضیلت اور تعریف میں بہت کچھ فرمایا ہے اور علم کی خصوصیات بیان کی ہیں، مثلاً ایمان۴ توحید۵ خشیت۶ اور خضوع وخشوع۷ وغیرہ۸ کو قرآن مجید میں علم

۱۔ اللہ نے خود شہادت دی ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتوں اور اہل علم نے بھی یہی گواہی دی۔ آل عمران ۱۸۔

۲۔ محی الدین ابن عربی کی تفسیر القرآن الکریم (یہ تفسیر درحقیقت ملا عبدالرزاق کاشانی کی تأویلات ہیں)، ج ۱ ص ۱۷۳؛ نیز فیض کاشانی کی تفسیر صافی، ج ۱ ص ۲۹۹۔

۳۔ اور اس کی (حقیقی) تأویل تو صرف اللہ اور علم میں راسخ افراد ہی جانتے ہیں۔ آل عمران ۷۔

۴۔ سورۂ آل عمران / آیت ۷ کہتی ہے:﴿وَالرَّاسِخُونَ فِي العِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا﴾ ۔علم میں راسخ مقام رکھنے والے کہتے ہیں: ہم ایمان لے آئے۔ ۵۔ مثال کے طور پر سورۂ آل عمران / آیت ۷ جس کا ذکر متن میں ہو چکا۔

۶۔ مثلاً سورۂ فاطر / آیت ۲۸:﴿اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ العُلَمَاءُ﴾ ۔اللہ کے عالم بندے ہی اس سے ڈرتے ہیں۔

۷۔ اللہ تلاوت کے دوران خشوع کی زیادتی کو علم والوں کی خصوصیت قرار دیتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:﴿اِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا العِلْمَ مِنْ قَبْلِهِ ... يَبْكُونَ وَيَزِيدُهُمْ خُشُوعاً﴾ ۔جنہیں پہلے علم دیا گیا ہے جب انہیں قرآن سنایا جاتا ہے...تو وہ روتے ہیں اور ان کے خشوع میں اضافہ ہوتا ہے۔ سورۂ اسراء / ۱۰۷، ۱۰۹۔

۸۔ مثلاً سورۂ اسراء / آیت ۷ میں حزن وبکا کا ذکر ہوا ہے اور سورۂ مجادلہ / آیت ۱۱ میں درجات کی بلندی کا۔

اور صاحبان علم کی خصوصیات میں شمار کیا ہے۔

رہیں احادیث تو اس سلسلے میں ان کی تعداد اس قدر زیادہ ہیں جن کا احاطہ ممکن نہیں۔ بنابریں ہم ان کے ذکر سے اجتناب کرتے ہیں۔ خواہشمند حضرات احادیث کی کتابوں کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔[۱]

منیۃ المرید[۲] میں شہید ثانی ؒ[۳] نے احادیث کی ایک بڑی مقدار کا ذکر فرمایا ہے۔ خواہشمند لوگ اس کتاب پرنور کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔[۴]

۱۔ اصول کافی، ج ۱، ص ۲۳، کتاب فضل العلم؛ نیز بحار الانوار، ج ۲، ص ۱۔۲۵، باب ۸۔

۲۔ منیۃ المرید فی آداب المفید والمستفید، ایک گرانقدر کتاب ہے۔ اس کے مؤلف مرحوم شہید ثانی ؒ ہیں۔ یہ کتاب علم کی اہمیّت، تعلیم وتربیت کے آداب، استاد اور شاگرد کی ذمہ داریوں، مفتی اور مستفتی کی ذمہ داریوں، بحث ومناظرہ کے آداب اور بہت سے دیگر اہم موضوعات پر روشنی ڈالتی ہے جن کی ضرورت ہر استاد اور شاگرد کو ہوتی ہے۔ دوران تألیف سے ہی یہ کتاب علماء وطلاب کی توجہ کا مرکز رہی ہے۔ کئی بار چھپ چکی ہے اور فارسی میں بھی اس کا ترجمہ ہوا ہے۔

۳۔ شیخ زین الدین علی بن احمد عاملی شامی المعروف ''شہید ثانی''۔ وہ اپنے عصر کے معروف ترین فقہاء وزہاد میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ کثرت تحقیق میں مشہور ہیں۔ ۹۱۱ ھ میں پیدا ہوئے اور ۹۶۵ یا ۹۶۶ ھ میں مذہب تشیع کے جرم میں عثمانی وزیراعظم رستم پاشا کے حکم سے گرفتار ہوئے اور استنبول میں شہید کئے گئے۔ ان کی تألیفات زیادہ ہیں جن کی تعداد تقریباً ۸۳ تک بتائی جاتی ہے جن میں سے ایک ''الروضۃ البہیۃ'' ہے جو ''لمعہ دمشقیہ'' کی شرح ہے۔ یہ شیعہ فقہ کا ایک کامل دورہ ہے۔ ان کی دیگر کتابوں میں ''مسالک الافہام فی شرح شرائع الاسلام'' اور ''منیۃ المرید فی آداب المفید والمستفید'' خاص شہرت کی حامل ہیں۔

ریحانۃ الادب، ج ۳ ص ۲۸۸، ۲۸۰۔

۴۔ منیۃ المرید، فصل ۱ تا ۷، ص ۹۳ الی ۱۲۳۔

مقصد / ۱۳

فہم اور اس کی ضد حُمق کا بیان

یہ مقصد تین فصلوں پر مشتمل ہے:

پہلی فصل

فہم اور حماقت کا مفہوم

''فہم'' سے کبھی سرعت انتقال ذہن اور ہوشیاری کو مراد لیا جاتا ہے اور کبھی اس سے نفس کی باطنی پاکیزگی اور حدت کو مراد لیا جاتا ہے جو سریع الفہمی کا موجب ہے۔ سابق الذکر مفہوم کی ضد کند فہمی اور کند ذہنی ہے جبکہ مؤخر الذکر کی ضد نفس کا مکدّر اور اس کی آلودہ ہونا ہے[۱] جس کا لازمہ غباوت، کند فہمی اور حماقت ہے۔ بہر حال ''حماقت'' جامع ضد ہے یا اس کی ضد کا لازمہ۔

اس بات کا بھی امکان ہے کہ چونکہ یہ حدیث وحی و نبوت کے معادن اور انسانیت کی تربیت کرنے والوں سے صادر ہوئی ہے اس لئے ''فہم'' سے مراد باطنی پاکیزگی و صفائی ہو جس کے ذریعے روحانی اور معنوی حقائق کا ادراک ہو سکے جبکہ ''حماقت'' سے مراد نفس کی ظلمت اور آلودگی ہو جو روحانی و معنوی حقائق اور عرفانی نکات کو سمجھنے کے معاملے میں ذہن کی کندی اور غباوت کا موجب بنے۔

یہ جاننا ضروری ہے کہ انسان کا نفس ایک آئینے کی طرح ہے جو ابتدائے فطرت میں صاف ستھرا اور ہر قسم کے گرد و غبار اور تاریکی سے پاک ہو۔ پس اگر یہ نورانی اور صاف آئینہ عالم انوار و اسرار کے روبرو ہو

۱۔ دیکھئے، ابن منظور کی لسان العرب، ج ۱۰، ص ۳۴۳؛ فخر الدین طریحی کی مجمع البحرین، ج ۶، ص ۱۳۳؛ نیز شرتوتی کی اقرب الموارد، ج ۲، ص ۹۴۸۔

(جواس کے ذاتی جوہر سے مناسبت رکھتا ہے) تو وہ نورانیت کے ناقص مرتبے سے ترقی کر کے روحانیت ونورانیت کمال تک رسائی حاصل کر لے گا یہاں تک کہ وہ ہر قسم کی ظلمت اور آلودگی سے رہائی پا لے گا۔ یوں وہ عالم طبیعیات کی تاریک بستی اور نفس کے ظلمت کدے سے نجات حاصل کر کے اسے خیر باد کہدے گا۔ پھر اسے جمیل کے جمال کا مشاہدہ نصیب ہوگا اور اس کا اجر اللہ کے ذمے ہوگا۔ قرآن کریم کی یہ آیت شریفہ شاید اسی نکتے کی جانب اشارہ ہو: ﴿وَمَنْ يَخْرُجْ مِنْ بَيْتِهِ مُهَاجِراً اِلَى اللهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ يُدْرِكْهُ المَوتُ فَقَدْ وَقَعَ أجْرُهُ عَلَى اللهِ﴾[1] اسی طرح یہ آیت بھی: ﴿اللهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمٰاتِ اِلَى النُّور﴾[2]

ہاں! جس کے ظاہر و باطن کا اختیار حق تعالیٰ کے پاس ہو اور اس کے ملک وجود پر اللہ کے سوا کسی کی حکومت نہ ہو اس کی تاریک زمین اللہ کے نور سے منور ہوگی: ﴿وَأشْرَقَتِ الأرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا﴾[3] یوں وہ تمام تاریکیوں، آلودگیوں اور حجابوں سے رہائی پائے گا اور نور مطلق تک رسائی حاصل کرے گا جو وحدت مطلق کے مترادف ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اللہ نے نور کیلئے مفرد کا صیغہ اور ظلمت کیلئے جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے۔

لیکن اگر انسان، نفس کے صاف وشفاف آئینے کو آلودگیوں اور ظلمتوں کی دنیا، نیز مادہ وطبیعت کی منزل (جو اسفل سافلین ہے) کی نذر کرے تو مادی وطبیعیاتی آلودگیاں آہستہ آہستہ اس آئینے پر اثر انداز ہوں گی اور اسے بھی آلودہ، تاریک اور دھندلا بنا دیں گی۔ یوں مادی گرد وغبار اور زنگ اس کی ذات کے آئینے کو مکمّل طور پر ڈھانپ لیں گے۔ پھر وہ روحانی امور کو سمجھنے سے عاجز ہوگا، نیز معارف الٰہیہ اور آیات ربانیہ کے فہم وادراک سے محروم ومحجوب بن جائے گا۔ پھر اس محجوبیت وحماقت میں روز بروز اضافہ ہوگا یہاں تک کہ نفس جہنم کا ایک قید خانہ بلکہ سجین (جہنم کی ایک وادی) کی ایک قسم بن جائے گا: ﴿فِي قُلُوبِهِمْ

۱۔ جو شخص اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کیلئے اپنے گھر سے نکلے پھر اسے موت آلے تو بہ تحقیق اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے۔ سورۂ نساء ۱۰۰۔

۲۔ اللہ مؤمنوں کا مددگار ہے۔ وہ انہیں تاریکیوں سے نکال کر نور تک لے جاتا ہے۔ سورۂ بقرہ ۲۵۷۔

۳۔ اور زمین اس کے ربّ کے نور سے روشن ہوگی۔ سورۂ زمر ۶۹۔

مَرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضاً ﴾۱ ﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَوْلِيَاؤُهُمُ الطَّاغُوتُ يُخْرِجُونَهُمْ مِنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ ﴾۲ ﴿وَجَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْراً ﴾۳

قرآن کی آیات میں ان دومراتب کی طرف بہت اشارہ ہوا ہے اور ذات مقدس حق جلّ جلالہ نے ان پر خوب توجہ دی ہے، کیونکہ تمام قوانین وشرائع الٰہیہ کا اصلی مقصد علوم ومعارف کو پھیلانا ہے اور یہ مقصد نفس کا علاج کئے بغیر اور انہیں مادی ظلمتوں سے خارج کئے بغیر، نیز انہیں نورانیت سے ہمکنار کئے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا۔

دوسری فصل

اس موضوع کی مزید توضیح اور مناسب نصائح

اے عزیز! ذرا خواب گراں سے بیدار ہوجاؤ اور عاشقان بارگاہ خداوندی کی روش پر چلو۔ اس تاریک، غلیظ اور شیطانی دنیا سے اپنا دامن بچالو۔ کوچہ یاراں میں قدم رکھو، بلکہ کوی دوست کی طرف چل پڑو۔

اے عزیز! یہ چندروزہ مہلت جو خدا نے دی ہے جلد ختم ہوجائے گی۔ ہم اس دنیا سے چاہیں نہ چاہیں لے جائے جائیں گے۔ پس اگر اپنی مرضی سے جاؤ گے تو آرام وراحت اور اللہ کے لطف وکرم کے روبرو ہوجاؤ گے لیکن اگر زبردستی لے جائے جاؤ تو نزع، فشار، سختی، ظلمت اور تکدر سے روبرو ہونا پڑے گا۔

اس دنیا میں ہماری مثال اس درخت کی سی ہے جس نے زمین میں اپنی جڑیں پکڑلی ہوں۔ یہ درخت جس قدر نوعمر ہوگا اس کی جڑیں اسی حساب سے بآسانی باہر نکل سکیں گی۔ اگر درخت کو درد کا احساس ہوتا ہو اس کی جڑیں جس قدر کم ہوں اسی قدر اسے درد کا احساس کم ہوگا۔ نوعمر پودے کو بآسانی مکمّل طور پر جڑ سے اکھاڑا جاسکتا ہے لیکن جب وہ سالہا سال پرانا ہوجائے اور اس کی اصلی وفرعی جڑیں زمین کی گہرائیوں میں راسخ ہوجائیں تو پھر اسے اکھاڑنے کیلئے تیشے اور کلہاڑے کی ضرورت ہوگی تاکہ اس کی جڑیں کاٹی جائیں۔

۱۔ ان کے دلوں میں ایک بیماری ہے اور خدا نے ان کی بیماری میں اضافہ کیا ہے۔ سورۂ بقرہ ۱۰۔

۲۔ کافروں کے مددگار طاغوت ہیں، وہ انہیں نور سے نکال کر تاریکیوں کی طرف لے جاتے ہیں۔ سورۂ بقرہ ۲۵۷۔

۳۔ ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دئے تاکہ وہ اسے نہ سمجھ سکیں اور ان کے کانوں کو سنگین بنادیا۔ سورۂ اسراء ۴۶۔

اب اگر درختوں کو درد کا احساس ہو تو اکھاڑتے وقت نوعمر پودے اور عمر رسیدہ درخت میں کس قدر فرق ہوگا۔

دنیا کی محبت اور حبّ نفس اپنی فروعات، یعنی حرص، طمع، اہل وعیال سے لگاؤ، مال وجاہ سے محبت اور اس قسم کی دیگر اشیاء سے محبت کیلئے جڑ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ جڑ جب تک نوعمر اور نورس ہو اس کو اکھاڑنا آسان ہے۔ ایسے انسان کو اس دنیا سے جدا کر کے آخرت کی طرف لے جانا سہل ہے۔ اس کیلئے نہ موت کے فرشتوں کی سختی درکار ہے نہ اس کی روح درواں کو فشار اور زحمت کا سامنا ہوگا، لیکن اگر خدانخواستہ حبّ دنیا اور حبّ نفس کی جڑیں دل میں محکم اور پھیل چکی ہوں تو یہ پھیلاؤ درخت کے جڑوں کے پھیلاؤ کی طرح نہیں، بلکہ یہ پورے عالم مادہ وطبیعت (طبیعیات) میں پھیل جائے گا۔

درخت جتنا بھی بڑا ہو وہ چند میٹر سے زیادہ جگہ نہیں گھیرتا اور نہ چند میٹر سے زیادہ اس کی جڑیں زمین میں پھیلتی ہیں، لیکن حبّ دنیا کا درخت اس پوری دنیا کو مادی ومعنوی لحاظ سے اپنی لپیٹ میں لے لے گا اور اس کی جڑیں ہر سو پھیل جائیں گی۔ لہذا اس درخت کو آسانی کے ساتھ صحیح وسلامت اکھاڑنا ممکن نہیں ہوگا۔ دنیا کی محبت انسان کیلئے ایک عظیم خطرہ ہے۔ جب وہ موت کے وقت عالم غیب کا مشاہدہ کرے گا جبکہ ابھی دنیوی زندگی کی بھی کچھ رمق باقی ہو اور کچھ حد تک عالم ملکوت کے پردے ہٹ جائیں تو وہ دیکھ لے گا کہ عالم ملکوت میں اس کیلئے کن چیزوں کا بندوبست ہے۔ پھر اسے اپنے ربّ حق تعالیٰ اور اسکے کارندوں سے جدا کیا جائے گا اور عالم برزخ کی تاریکیوں اور برائیوں کی طرف لے جایا جائے گا۔ یوں انسان اللہ تعالیٰ اور اس مأمور فرشتوں کی عداوت دل میں لے کر دنیا سے خارج ہوگا۔ واضح ہے کہ ایسے انسان کا کیا انجام ہوگا۔

کافی شریف کی ایک حدیث میں اس کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ راوی کہتا ہے: میں نے حضرت امام صادقؑ سے سوال کیا جسے اللہ سے ملاقات پسند ہو کیا اللہ کو (بھی) اس کی ملاقات پسند ہے؟ اور جسے اللہ کی ملاقات ناپسند ہو کیا اللہ بھی اس کی ملاقات سے خشمگین ہوگا؟ فرمایا: ''ہاں!'' راوی نے کہا: اللہ کی قسم ہم موت کو پسند نہیں کرتے۔ فرمایا: ''ایسا نہیں جیسا تم خیال کرتے ہو۔ بہ تحقیق یہ مشاہدے کا وقت ہے۔ جب وہ اپنی پسندیدہ چیز کو دیکھے گا۔ اس وقت اللہ کے پاس جانے سے زیادہ محبوب تر چیز اس کیلئے کوئی نہ ہوگی۔ اس وقت اللہ اس سے ملاقات کا خواہاں ہوگا اور وہ اللہ سے ملاقات کا اور جب وہ اپنے لئے ناپسندیدہ امر کا مشاہدہ کرے گا تو اس کے نزدیک اللہ کی ملاقات سے زیادہ ناپسندیدہ کوئی چیز نہ ہوگی اور ایسے میں اللہ تعالیٰ

بھی اس کے ساتھ ملاقات سے ناراض ہوگا"۔[۱]

معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا سے خارج ہونے سے پہلے انسان اپنے بعض اخروی درجات، مقامات و درکات کا معاینہ کرے گا۔ یوں یا وہ مکمّل کامیابی کے ساتھ دنیا سے خارج ہوگا جس کی کامل ترین شکل اللہ کی محبت ہوگی یا مکمّل ناکامی کے ساتھ جس کا باطن بغض پروردگار ہے۔ احادیث واخبار[۲] اور بزرگان دین[۳] کے مکاشفات میں اس امر کا کثرت سے ذکر آیا ہے۔

اگر انسان یہی احتمال دے کہ حبّ دنیا کے اتنے زیادہ نقصانات ہو سکتے ہیں اور اس کا انجام برا ہے تو اسے چاہیئے کہ وہ ایک لحظہ کیلئے بھی چین سے نہ بیٹھے تاکہ وہ اس دنیاوی محبت کو دل سے اکھاڑ پھینکے۔ علمی اور عملی ریاضتوں کے ذریعے انسان اس مقصد تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔

البتہ شروع میں عرفان وسلوک کا ہر مرحلہ مشکل نظر آتا ہے۔ شیطان اور نفس امارہ کی بھی کوشش ہوتی ہے کہ انسان سیر وسلوک کے راستے پر نہ چلے، لیکن اس طریقے پر گامزن ہونے کے بعد آہستہ آہستہ راستہ آسان ہوتا جاتا ہے۔ انسان حق اور آخرت کی راہ میں جو بھی قدم اٹھاتا ہے وہ دوسرے قدم کیلئے ہدایت خداوندی کا نور ثابت ہوتا ہے۔ یہ نور اس کے راستے کو روشن اور اس کے مقدس سفر کو آسان بنا دیتا ہے۔

تیسری فصل

فہم فطرت مخمورہ کا لازمہ اور عقل کا لشکری ہے

جبکہ حماقت فطرت محجوبہ کا لازمہ اور جہل کا لشکری ہے

اگر فہم سے مراد شدید ذکاوت، ذہن کی تیز رفتاری اور باطنی پاکیزگی (جس کا لازمہ سریع الفہمی اور انتقال ذہنی ہے) ہو تو اس کا فطری ہونا اس لحاظ سے ہے کہ وجود اور کمال وجود کی نعمت اللہ کا عطیہ ہیں۔ اس ذات کی طرف سے عطا شدہ ہر چیز پاک و پاکیزہ، صاف اور ہر قسم کے کمال سے آراستہ ہوگی جیسا کہ اپنے

۱۔ فروع کافی، ج۳، ص۱۳۴، کتاب الجنائز، باب مایعاین المؤمن والکافر، ح۱۲۔

۲۔ بحار الانوار، ج۶، ص۱۷۳، باب۷؛ نیز علم الیقین 'فیض کاشانی'، ج۲، ص۸۵۳۔

۳۔ احیاء العلوم 'غزالی'، ج۳، ص۲۱۴۔

مقام پر واضح اور ثابت ہے[1] نیز کثافات آلودگیاں، نقائص وعیوب اور ظلمتیں وغیرہ ثانوی عوارض ہیں جو اجنبی عناصر کے اختلاط اور فطرت کی محجوبیت کا نتیجہ ہیں۔

لیکن اگر ''فہم'' سے مراد جمیل کے جمال اور روحانیات ومعنویات کا ادراک کرنے والی باطنی پاکیزگی ہو تو بات زیادہ واضح ہے، کیونکہ فطرت ذاتی طور پر کمال مطلق کی طرف مائل اور کامل کے جمال کی عاشق ہے، نیز اگر مادیت اور طبیعیات کے پردے حائل نہ ہوتے تو فطرت جمال مطلق سے بالذات اور ذات خداوندی سے مربوط چیزوں سے بالعرض لگاؤ رکھتی اور ان کے سوا کسی چیز کی طرف متوجہ نہ ہوتی اور اس کے دل کی آنکھ کائنات کی کسی چیز پر نظر نہ کرتی۔ نہ ہی اس کی روح کے شفاف اور باطنی آئینے میں اللہ جل جلالہ، اس کے اسماء وصفات اور ان کے آثار (آثار خداوندی ہونے کے ناطے) کے علاوہ کسی اور چیز کا عکس نظر آتا۔ یہ دل کی سلامتی سے عبارت ہے۔

شاید آیہ شریفہ: ﴿سَلامٌ هِيَ حَتَّىٰ مَطْلَعِ الفَجْرِ﴾[2] اسی نکتے کی طرف اشارہ ہو، کیونکہ یہ سورہ (سورہ قدر) مقام نبوت وولایت کی طرف اشارہ کرتی ہے اور ''اہل بیت کی سورہ ہے'' جیسا کہ حدیث میں مذکور ہے[3] بنابریں ممکن ہے کہ یہ آیت مطلق اور ہر طرح کی سلامتی کی طرف اشارہ ہو جو خلقت کی تاریک رات، جو ولی مطلق کیلئے لیلۃ القدر ہے، کی ابتداء سے لے کر طلوع فجر مطلق جو ﴿قابَ قَوسَينِ أَوْ أَدْنىٰ﴾ کی طرف ولی مطلق کی برگشت یا ترک حجابات سے عبارت ہے، تک ولی مطلق کو حاصل ہو۔

اصول کافی میں قول خداوندی: ﴿إلّا مَنْ أتى اللهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ﴾[4] کی تفسیر میں حضرت امام صادقؑ سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا: ''قلب سلیم وہ دل ہے جو اللہ سے اس حالت میں ملاقات کرے کہ اس کے اندر اللہ کے علاوہ کوئی اور نہ ہو''۔[5]

۱۔ الاسفار الاربعہ، ج ۷، ص ۱۰۶، فصل ۹، موقف ۸۔

۲۔ یہ رات طلوع فجر تک سلامتی ہی سلامتی ہے۔ سورۂ قدر ۵۔

۳۔ تفسیر نور الثقلین، ج ۵، ص ۶۲۹، احادیث ۸۰، ۸۱۔

۴۔ سوائے اس کے جو قلب سلیم کے ساتھ اللہ کے پاس آئے۔ سورۂ شعراء ۸۹۔

۵۔ حدیث کے الفاظ یہ ہے: ﴿القَلْبُ السَّلِيمُ الَّذِي يَلْقىٰ رَبَّهُ وَلَيْسَ فِيهِ أحَدٌ سِواه﴾۔
اصول کافی، ج ۲، ص ۱۳ و ۱۴، کتاب الایمان والکفر، باب الاخلاص، ح ۵۔

نیز حضرت امام صادقؑ سے منقول ہے کہ قلب سلیم وہ دل ہے جو دنیا کی محبت سے خالی ہو۔[۱] چونکہ دنیا حقیقت میں غیر اللہ سے عبارت ہے اس لئے یہ صفت ولی کامل کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں ہوسکتی۔

اس آیت کی دونوں تفسیریں سورۂ قدر کی مذکورہ آیت کے ساتھ ایک ہی مفہوم کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور ان دونوں کا مقصود یکساں ہے۔

مذکورہ بیان سے ''حماقت'' کا مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے جو جہل اور ابلیس کا لشکری، نیز فطرت محجوبہ کا لازمہ ہے۔ جب فطرت محجوب ہو جائے تو وہ حق، معنویات اور روحانیات (جو اللہ کے لشکر ہیں) کے ادراک سے محروم ہو جاتی ہے۔ اس طرح دنیا کی جانب اور اپنی طرف راغب ہو جاتی ہے۔ نتیجتاً وہ خود پرستی اور انانیت (خاص کر دنیوی انانیت جو درحقیقت وہ خود نہیں) کے پردوں کے اندر معنویت کے تمام مراتب اور معارف الٰہیہ کی تمام صورتوں سے محروم ہو جاتی ہے۔ حماقت کی بلندترین منزل یہ ہے کہ انسان اپنے اور اپنی معنویت سے بھی بیگانہ اور محجوب ہو، ﴿نعوذ باللہ منہ﴾۔

۱۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں: ﴿هُوَ الْقَلْبُ الَّذِي سَلِمَ مِنْ حُبِّ الدُّنْيَا﴾۔
مجمع البیان طبرسیؒ، ج ۷، ص ۳۰۵؛ نیز تفسیر نور الثقلین، ج ۴، ص ۵۸، ح ۵۰۔

مقصد / ۱۴

''عفت'' اور اس کی ضد ''ھتک'' کا بیان

یہ مقصد پانچ فصلوں پر مشتمل ہے:

پہلی فصل
عفت کا مفہوم

قبل ازیں بھی اشارہ ہو چکا ہے کہ انسان کے پاس قوت تعقّل کے علاوہ تین اور قوتیں بھی ہیں۔ ان میں سے ایک ''قوت وہمیہ'' ہے جسے قوت شیطانیہ بھی کہا جاتا ہے۔ دوسری ''قوت غضبیہ'' ہے جسے ''وحشی قوت'' بھی کہا جا سکتا ہے۔ تیسری ''قوت شہویہ'' ہے جسے ''جذبۂ حیوانی'' کا نام دیا جاتا ہے۔

انسان کی صفات حمیدہ اور صفات رذیلہ کا معیار یہی تین قوتیں ہیں۔ ان میں افراط و تفریط صفت رذیلہ ہے جبکہ ان کے درمیان اعتدال اخلاقی و روحانی خوبی ہے۔

بنابریں ''جذبہ حیوانی'' میں ایک پہلو افراد کا ہوتا ہے جسے ''شَرَہ'' کہتے ہیں۔ شرہ (حرص) سے مراد ہے جذبہ حیوانی اور شہوت و خواہشات کو بے لگام چھوڑ دینا تاکہ وہ حد اعتدال سے گزر جائیں اور انسان جہاں موقع ملے ہر چیز سے اپنی خواہشات کی تسکین اور لذت حاصل کرتا رہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے اندر موجود ہر قوت کے مختلف شعبوں میں بے لگام ہونے اور اپنے حدود سے تجاوز کرنے کا مادہ موجود ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ''قوت شہویہ'' میں ذاتی طور پر لذتوں کے حصول کی بے لگام و بے قید خواہش موجود ہوتی ہے اگرچہ یہ خواہش عقل و شرع کے تقاضوں سے متصادم ہی کیوں نہ ہو۔ اسی لئے انسان حرام چیزیں کھاتا پیتا ہے اور جنسی خواہشات کی تکمیل بھی حرام چیزوں سے (یہاں تک کہ گاہے محارم اور ماؤں سے) کرتا ہے۔ پس ''شرہ'' سے مراد ہے: شہوت اور خواہشات میں ضرورت کی حد سے آگے بڑھنا اور عقل و شرع کی

حدود کو پھلانگنا۔

اسی طرح ''جذبۂ حیوانی'' میں ''تفریط'' (حد اعتدال سے پیچھے رہ جانے) کا پہلو بھی موجود ہوتا ہے جسے ''خمود'' بھی کہا جاتا ہے اور وہ عبارت ہے خواہشات کی قوت کو اس قدر لگام دینا کہ وہ حد اعتدال اور ضرورت کی مقدار کو بھی نہ پہنچ سکے اور اس قوت پر توجہ نہ دینا جبکہ اللہ نے اسے یہ قوت انفرادی واجتماعی نظام کی حفاظت کیلئے عطا کی ہے۔ جب یہ قوت عقل وشرع کے معیاروں کے مطابق چلنے کی مشق اور عادت حاصل کر کے افراط وتفریط اور غلو وتقصیر سے محفوظ ہو، نیز عقل وشرع اور اللہ کے کارندوں کی تابع بن جائے، نیز وہ شیطان اور نفس کے تصرف اور ان کے فریب سے نجات حاصل کرے تو وہ اطمینان وسکون کی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے اور اس میں اعتدال ومیانہ روی کی عادت پیدا ہوتی ہے۔ عقل وشرع کے رنگ میں رنگی ہوئی اس قوت اور صفت کو ''عفت'' کہا جاتا ہے۔

ان عرائض سے واضح ہوا کہ ''ہتک'' (جس کا ذکر حدیث شریف میں ''عفت'' کی ضد کے طور پر ہوا ہے) سے کیا مراد ہے؟ بظاہر ''ہتک'' سے مراد غلو اور افراط ہے۔ یہاں صرف افراط کے پہلو کا ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ لوگ عام طور پر اسی افراط کا ہی شکار ہوتے ہیں۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کوئی حد اعتدال سے نیچے تفریط اور تقصیر) کی طرف مائل ہو جائے۔ افراط وتفریط دونوں کو ''ہتک'' قرار دینا مجاز ہوگا، کیونکہ ''ہتک'' پردہ دری اور پردہ چاک کرنے سے عبارت ہے۔ پس اعتدال سے نکلنا اور میانہ روی کا پردہ چاک کرنا اس کی ضد ہے جو دونوں صورتوں کو شامل ہے۔

تکمیل

گزشتہ اور آئندہ فصول کے مطالعے سے واضح ہوگا کہ ''عفت'' فطرت مخمورہ کا لازمہ ہے اور اس کا تعلّق عقل کے لشکروں سے ہے جبکہ ''ہتک'' فطرت محجوبہ کا لازمہ ہے، نیز وہ شیطان اور جہل کا سپاہی ہے، کیونکہ باطنی قوتوں کو حد اعتدال پر رکھنا (جو عفت کیلئے جنس کی حیثیت رکھتا ہے) فطری امر ہے اور ظلم وجود فطرت کے برخلاف ہے جیسا کہ قبلاً ذکر ہو چکا۔

اسی طرح ''کُمّل'' کی مکمّل اطاعت بھی فطرت میں شامل ہے جبکہ ایسا نہ کرنا فطرت کے برخلاف ہے۔ علاوہ ازیں عفت اور حیاء بجائے خود تمام انسانوں کی فطرت میں داخل ہیں جبکہ بے حیائی، پردہ دری

اور ہتک عفت تمام لوگوں کی فطرت کے برخلاف ہیں۔ اسی لئے تمام بنی نوع انسان کی فطرت وجبلّت میں عفت وحیاء کے ساتھ محبت اور عشق کا جذبہ موجود ہوتا ہے، نیز ہتک اور بے حیائی سے نفرت کا جذبہ بھی موج زن ہوتا ہے۔

دوسری فصل

قوت شھویہ کے آثار

جان لو کہ خواہشات نفسانی اور شہوت کی قوت ایک خداداد نعمت ہے۔ یہ قوت اللہ نے اس لئے عطا کی ہے تاکہ انسان اس عالم رنگ وبو میں اپنے وجود اور اپنی بقاء کی حفاظت کر سکے، نیز وہ نوع انسان کی بقاء وحفاظت کا سامان کر سکے۔ اگر انسان کے پاس یہ قوت نہ ہوتی تو وہ اندرونی اور بیرونی عوامل تحلیل کی وجہ سے جلد ہی فنا اور زوال کا شکار ہو جاتا اور تحلیل شدہ عناصر کا نعم البدل تلاش نہ کرتا چونکہ ابدی کامیابی کا حصول اس مادی دنیا میں رہے بغیر ممکن نہیں، اس لئے اس کی ابدی فلاح اور ملکوتی حیات اس قوت کی مرہون منت ہے۔
علاوہ ازیں یہ قوت گھریلو زندگی کی تشکیل، مثالی معاشرے کے قیام اور ناقص نفوس کی تربیت میں بھی مکمّل طور پر شریک ہے۔

بنابریں نہ صرف انسان کی اپنی کامیابی کا دارومدار اس قوت پر ہے، بلکہ تمام بنی نوع بشر کی کامیابی وسعادت بھی اس آسمانی اور خداداد نعمت پر موقوف ہے۔ یہ قوت انسان کی انفرادی واجتماعی فلاح وکامیابی کی ضامن تب بن سکتی ہے جب یہ قوت اعتدال کے حدود کو پامال نہ کرے، نیز عقل اور شرع مقدس کے تقاضوں سے تجاوز نہ کرے، کیونکہ اگر یہ قوت اپنے حدود سے یعنی حد اعتدال سے تجاوز کرے اور افراط وتفریط کا شکار ہو جائے تو نہ صرف یہ کہ انسان مذکورہ کامیابیوں سے ہمکنار نہیں ہوگا بلکہ اپنی اور دیگر انسانوں کی سیاہ بختی کا بھی باعث بنے گا۔ بسا اوقات چند دنوں یا چند گھنٹوں کی شہوت رانی کسی انسان کے گھریلو نظام کا شیرازہ بکھیر دیتی ہے وران کی دائمی بدبختی وناکامی کا سبب بنتی ہے۔ بسا اوقات اس قوت کی بے لگامی سے انسان کی اپنی حیثیت اور اس کے گھرانے کی حیثیت خاک میں مل جاتی ہے۔ آج کل کے بے لگام معاشروں میں نظر آنے والے اکثر المیے اور شرمناک واقعات اسی قوت کی بے لگامی کا نتیجہ ہیں۔
اگر کوئی بیدار دل انسان غور کرے تو وہ بخوبی دیکھ لے گا کہ اللہ تعالیٰ نے عائلی نظام زندگی کی حفاظت

اور دنیوی واخروی کامیابی وحیثیت کی بقا کیلئے اسے جس قوت سے نوازا ہے اس قوت کی حیثیت کا پاس نہ رکھنا کس قدر بڑا جرم ہے اور اس قوت کو اس کے اصلی مقاصد واہداف کے برخلاف استعمال کرنا کس قدر سنگین اقدام ہے۔

اس سے بڑا جرم اور اس سے سنگین خیانت کیا ہوسکتی ہے؟ یہ وہ قوت ہے جو نسل انسانی کی بقا کی ضامن ہے۔ اگر اسے عقل کے تقاضوں کے برخلاف اور بے موقع استعمال کیا جائے تو یہی امر قطع نسل کا سبب ہوگا۔ اگر اس سنگین جرم کے بعد کوئی نسل باقی بھی رہے تو وہ قسم قسم کی آفات اور بیماریوں میں مبتلا رہے گی۔

آج کل کے ماہرین طب بہت سی بیماریوں کو تحقیق وتجزیہ اور تجربات کی روشنی میں مریض کے اپنے موروثی امراض یا اس کے آباء واجداد سے نسل در نسل منتقل ہونے والے موروثی امراض کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ یہ اس بے لگام قوت کے نقصانات ومفاسد کا ایک ہزارواں حصہ ہے۔ اگر ہم ماوراء الطبیعی دنیا میں اس کے نقصانات کا تھوڑا جائزہ لیں تو روحانی، اطباء، وحی خداوندی سے مربوط افراد اور روحانی علماء کی تعلیمات کی روشنی میں یہ دیکھ لیں گے کہ ان نقصانات کے مقابلے میں دنیوی نقصانات کی کوئی خاص حیثیت نہیں۔ اس نکتے کی وضاحت کیلئے ایک الگ فصل کی ضرورت ہے تا کہ بات مکمّل طور پر واضح ہوسکے۔

تیسری فصل

اعمال کی تأثیر قلب پر

یاد رہے کہ ہر اچھا یا برا عمل عالم ملکوت اور عالم غیب میں ایک ملکوتی اور غیبی صورت کا حامل ہوتا ہے۔ ارباب قلوب، معارف الٰہیہ [۱] سے آشنا افراد، کتاب خداوندی وصحیفہ آسمانی [۲] کے اشارات وتصریحات کے شناساؤں اور اہل بیت طاہرینؑ سے منقول احادیث [۳] کی روشنی میں ان اعمال کے ذریعے ''اعمال کی بہشت'' اور ''اعمال کا جہنم'' وجود میں آتے ہیں۔ عالم ملکوت کی سرزمین بذات خود ابتداء میں بنجر اور خالی میدان ہے۔ انسان کا عمل ہے جو اس خالی زمین کو آباد اور معمور کرتا ہے۔

۱۔ الاسفار الاربعہ، ج۹، ص۲۹۰، فصل ۲۰، باب ۱۱۔

۲۔ مثلاً سورۂ زلزال آیت ۶۔۸۔

۳۔ بحار الانوار، ج۸، ص۷۱، کتاب العدل والمعاد، باب الجنۃ ونعیمھا۔

قرآن کریم نے مختلف پیرایوں میں اس غیبی حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے۔ چنانچہ سورۂ آل عمران کی تیسویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿يَومَ تَجِدُ كُلُّ نَفسٍ مٰا عَمِلَتْ مِنْ خَيرٍ مُحْضَراً وَمٰا عَمِلَتْ مِنْ سُوءٍ تَوَدُّ لَو أَنَّ بَيْنَهٰا وَبَيْنَهُ أَمَداً بَعِيداً﴾[1]

یہ آیت مبارکہ تقریباً صریح انداز میں کہہ رہی ہے کہ انسان نفس اعمال کا مشاہدہ کرے گا خواہ وہ اعمال صالحہ ہوں یا برے اعمال۔ اس بات کی تائید آیت کے آخری حصے سے بھی ہوتی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ اس دن ہر کوئی یہ آرزو کرے گا اس کے برے ''اعمال'' اور اس کے درمیان بہت فاصلہ ہوتا۔

سورہ مبارکہ زلزال میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿يَومَئِذٍ يَصْدُرُ النّٰاسُ أَشْتٰاتاً لِيُرَوا أَعْمٰالَهُمْ ☆ فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقٰالَ ذَرَّةٍ خَيراً يَرَه ☆ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقٰالَ ذَرَّةٍ شَرّاً يَرَه﴾[2] یہ آیت ظاہراً بلکہ صریحاً کہتی ہے کہ لوگ آخرت میں اپنے برے یا اچھے اعمال کا مشاہدہ کریں گے۔

اہل معرفت کے نزدیک یہ مسئلہ (اعمال کا تجسّم اور ان کی غیبی صورت) ایک مسلّمہ اور یقینی امر ہے[3] جس طرح اعمال ملکوتی صورتوں اور ملکوتی وجود کے حامل ہوتے ہیں اسی طرح ہر عمل قلب انسانی پر ایک خاص اثر مرتب کرتا ہے جسے احادیث میں ''سفید نقطہ'' یا ''سیاہ نقطہ'' کہا گیا ہے[4] کیونکہ ہر نیک عمل کے باعث دل کے اندر ایک روشنی پیدا اور ایک باطنی پاکیزگی حاصل ہوتی ہے بشرطیکہ وہ عمل اپنے ظاہری و معنوی اور جسمانی و قلبی آداب و شرائط کے ساتھ بجالایا گیا ہو۔ یہ سفید نقطہ انسان کو اللہ کی معرفت اور توحید سے نزدیک کرتا ہے یہاں تک کہ توحید کے اسرار اور حقائق دل میں جاگزین ہوجاتے ہیں اور وہاں سے جسم کی سرزمین میں بھی سرایت کرجاتے ہیں پھر دنیائے طبیعت و بدن نور خداوندی سے منور اور روشن ہوجاتی ہے۔ یہ انسان کی

۱۔ اس دن ہر کوئی اپنے نیک و بد اعمال کو حاضر پائے گا۔ وہ (اس دن) آرزو کرے گا کہ کاش اس کے اور برے اعمال کے درمیان بڑا فاصلہ ہوتا۔

۲۔ اس دن لوگ قبروں سے بکھری ہوئی صورت میں نکلیں گے تا کہ انہیں ان کے اعمال دکھائے جائیں۔ پس جو کوئی ذرہ برابر نیکی کرے وہ اسے دیکھ لے گا اور جو کوئی ذرہ برابر بدی کرے اسے دیکھ لے گا۔ سورۂ زلزال ۶۔۸۔

۳۔ الاسفار الاربعہ، ج۹ص ۲۹۶، فصل ۲۱، باب ۱۱۔

۴۔ اصول کافی، ج۲، ص ۱۰۷، کتاب الکفر والایمان، باب ۹۴ ﴿إنَّ اللّٰهَ إنّمٰا يُعْطِي الدّينَ مَنْ يُحِبُّه﴾، ح۷؛ نیز اصول کافی، ج۲، ص ۲۰۸ کتاب الکفر والایمان، باب الذنوب؛ نیز، ص ۲۰۹، ح ۲۰۔

عظیم ترین کامیابی ہے جس کی تفصیلات اور مراتب کے بیان کی ان اوراق میں گنجائش نہیں۔

اسی طرح ہر برے عمل سے دل کے اندر ایک تاریکی پیدا ہوتی ہے جو انسان کو اللہ کے تقرب کی منزل سے دور اور معارف الٰہیہ سے محروم کرتی ہے، نیز اسے مادی دنیا سے نزدیک کرتی ہے جس کا باطن سجین (جہنم کی ایک وادی) اور ہاویہ (دوزخ) سے عبارت ہے یہاں تک کہ دل اور اس کی غیبی کیفیات عالم مادہ وطبیعت میں فانی ہوجاتی ہیں یوں اس کا رشتہ روحانیت ومعنویت اور انسانیت سے کٹ جاتا ہے۔

یادرہے کہ انسان چار قوتوں کا مالک ہے: ایک؛ روحانی اور عقلی قوت، دوسری؛ درندوں والی قوت غصبیہ، تیسری؛ حیوانوں والی قوت شہویہ اور چوتھی؛ شیطانوں والی قوت وہمیہ۔ بنابریں عالم آخرت میں انسان کی صورت آٹھ حالتوں سے خالی نہیں، کیونکہ انسان کی جسمانی اور ظاہری صورت آخرت اور ماوراء الطبیعی عالم میں روحانی صورت اور مقام نفس کی تابع ہوتی ہے (وہ عالم موجودہ عالم کی طرح نہیں جس میں مادہ وطبیعت باطن سے مختلف ہے، نیز بدن تابع نفس نہیں۔ یہ نکتہ فلسفہ الٰہیہ میں دلائل عقلی سے ثابت ہے)[۱]

پس اگر انسان اس دنیا میں انسانیت کے صراط مستقیم پر چلے اور مذکورہ تین قوتوں کو اعتدال پر رکھے، نیز انہیں عقل اور روحانیت کی تابع رکھے اور اس کا ظاہر وباطن شریعت کے اصولوں کا تابع فرمان ہو تو اس کا باطن استقامت کی صفت سے آراستہ ہوگا۔ اس طرح اس کی روح اور باطن کی شکل وصورت انسان کی حقیقی اور درست صورت اختیار کرے گی۔ پس اس عالم میں اس کی جسمانی اور ظاہری صورت درست اور خوبصورت انسانی صورت پر ہوگی۔

لیکن اگر نفس کی روحانی اور عقلی کیفیت دوسری تین قوتوں میں سے ایک کی تابع ہوجائے تو ان تینوں میں سے جو بھی دوسری قوتوں پر غالب آئے اور انسان کے ظاہر وباطن کو اپنا تابع بنالے باطنی اور ملکوتی صورت اسی کی تابع ہوگی۔ پس اگر قوت غصبیہ کو غلبہ حاصل ہو تو غیبی اور ملکوتی صورت کسی درندے کی سی ہوگی اور اگر قوت شہویہ کو غلبہ حاصل ہو تو غیبی اور ملکوتی شکل کسی چوپائے جیسی ہوگی، نیز اگر قوت وہمیہ وشیطانیہ کو غلبہ حاصل ہو تو وہ کسی شیطان کی صورت میں ہوگی۔ یہ سب بسیط اور ملکوتی صورتیں ہیں۔ گاہے ان تینوں قوتوں میں سے دو کو غلبہ حاصل ہوتا ہے، مثلاً عین اس وقت جب انسان کا غصہ جوبن پر ہو اس کی

۱۔ الاسفار الاربعہ، ج۹، ص۳۳۰، فصل ۲۶، باب ۱۱۔

شہوت بھی عروج پر ہو، اسی طرح جذبہ شیطانی کے ساتھ شہوت یا غضب کا جذبہ بھی عروج پر ہو۔ پس ان دونوں قوتوں کے امتزاج سے ایک مخلوط ملکوتی صورت وجود میں آئے گی جو نہ خالص درندوں والی ہوگی نہ مکمّل چوپایوں والی اور نہ ہی مکمّل شیطانی صورت ہوگی۔ دوقوتوں کے امتزاج سے تین صورتیں حاصل ہوں گی۔ گاہے انسان کے اندر تینوں قوتیں جوبن پر ہوتی ہیں۔ اس صورت میں اس کا باطن بھی ان تینوں کا تابع ہوگا اور ان تینوں کی ایک امتزاجی صورت وجود میں آئے گی۔

یہ بھی ممکن ہے کہ اس عالم میں انسان ایک ہی وقت میں ایک سے زائد مختلف اشکال کا حامل ہو یا ہر حال میں ایک ہی صورت کا حامل ہو، مثلاً گاہے درندے، گاہے چوپائے اور گاہے شیطان کی شکل اختیار کرے۔

پس معلوم ہوا کہ انسان کی صورت ان آٹھ صورتوں سے خالی نہیں رہ سکتی، باقی ماندہ صورتیں غیر انسانی ہوں گی جس طرح دو نقطوں کے درمیان خط مستقیم ایک سے زیادہ نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ قرآن کی آیات شریفہ میں اس نکتے کی طرف اشارے ہوئے ہیں۔ سورۂ انعام کی آیت ۱۵۳ میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَ اَنَّ هٰذا صِراطِي مُسْتَقِيماً فَاتَّبِعُوهُ وَلاَ تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِه﴾ [1]

روایت ہے کہ ایک دفعہ رسول خداؐ نے ایک سیدھی لائن کھینچی اور فرمایا: ''یہ وہ راستے ہیں جن میں سے ہر ایک کے اوپر ایک شیطان ہے جو اس کی طرف دعوت دیتا ہے'' اس کے بعد آپؐ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی۔ [2]

۱۔ بے شک یہ میرا سیدھا راستہ ہے پس اس کا اتباع کرو اور مختلف راستوں پر نہ چلو کہ وہ تمہیں اللہ کے راستے سے ہٹا کر پراگندہ کر دیں گے۔

۲۔ عبداللہ بن مسعود کی روایت کے مطابق حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

خَطَّ رَسُولُ اللهِ خَطّاً بِيَدِه، ثُمَّ قالَ: هٰذا سَبِيلُ اللهِ مُسْتَقِيماً. ثُمَّ خَطَّ خُطُوطاً عَنْ يَمِينِهِ وَعَنْ شِمالِه، ثُمَّ قالَ: وَهٰذِهِ السُّبُلُ لَيْسَ مِنْها سَبِيلٌ اِلاّ عَلَيْهِ شَيْطانٌ يَدْعُوا اِلَيْه. ثُمَّ قَرَأَ: ﴿وَاَنَّ هٰذا صِراطِي مُسْتَقِيماً فَاتَّبِعُوهُ وَلاَ تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِه﴾۔

(دیکھیے، سیوطی کی الدر المنثور، ج ۳، ص ۵۶، تفسیر آیت ۱۵۳، سورۂ انعام)۔

چوتھی فصل

اصلاح نفس کی نصیحت

اے عزیز! اگر انسان ان باتوں کا، جو دلائل و براہین کے ذریعے علماء کے ہاں ثابت ہیں[۱] اور کشف وشہود کے نور کے ذریعے صاحبان معرفت کے ہاں مشہود ہیں[۲] نیز کتاب خداوندی[۳] اور اہل بیت وحیؑ وتنزیل[۴] کے اشارات، بلکہ ان کی تصریحات کے مطابق ہیں، احتمال بھی دے تب بھی اسے اس وقت تک سکھ کا سانس نہیں لینا چاہئے جب تک وہ اپنے نفس کی اصلاح نہ کرے۔

مصیبت کا مقام یہ ہے کہ آسمانی کتابوں کی آیات باہرہ، اہل بیت عصمتؑ کی احادیث، انبیاء واولیاء کے فرامین، فلسفہ وحکمت کے ماہرین کے براہین اور ارباب ریاضت وشہود کے شاہدات کے باوجود ہمارے سنگلاخ اور پتھریلے دلوں میں احتمال کی چنگاری پیدا نہ ہوسکی اور ہمارے اعمال ان لوگوں کے اعمال کے مشابہہ ہیں جو (نعوذ باللہ) ان سب باتوں کے بطلان کا یقین رکھتے ہیں۔

اے عزیز! اگر ہم میں سے کسی کو کوئی دس سالہ بچہ یہ خبر دے اور کہے: تیرے گھر میں آگ لگ گئی ہے یا تیرا بیٹا پانی میں غرق ہو رہا ہے تو کیا ہم ہر قسم کے اہم کام سے ہاتھ کھینچ کر اس ہولناک خبر کے پیچھے نہیں دوڑیں گے یا ہم آرام وسکون سے بیٹھے رہیں گے اور اس خبر کو کوئی اہمیت نہیں دیں گے؟ پھر کیا وجہ ہے کہ اس قدر آیات، احادیث اور دلائل و براہین کا ہمارے دلوں پر اتنا بھی اثر نہیں ہوتا جتنا ایک دس سالہ بچے کی اطلاع سے ہوتا ہے۔ اگر اثر ہوتا تو ہمارا سکون چھن جاتا۔ دل کے اس اندھے پن اور باطنی تاریکی کا علاج کیونکر ہوسکتا ہے؟ کیا اس قلبی بیماری کو علاج اور طبیب کی ضرورت ہے؟ کیا اس تاریکی وظلمت کے علاج کا کوئی راستہ موجود ہے؟ کیا وہ شخص مؤمن ہوسکتا ہے جو انبیاء اور کتب آسمانی کی تعلیمات کو ایک نابالغ بچے کی اطلاع کے برابر بھی اہمیت نہ دے؟ کیا ہم اس کے اندر ایمان کی خاصیتوں کی موجودگی کو تسلیم کرسکتے ہیں؟

۱۔ الاسفار الاربعہ، ج۹، ص ۲۲۵، فصل ۹، باب ۱۱؛ نیز ص ۲۹۰، فصل ۲۰، باب ۱۱۔

۲۔ ابن عربی کی الفتوحات المکیہ (چار جلدی)، ج۱، ص ۲۹۷ و ۳۰۱؛ اور طبع جدید، ج۴، ص ۳۶۶ و ۳۹۰۔

۳۔ سورۂ حج ۲، نازعات ۳۶ تا ۳۹ اور سورۂ فجر ۲۳۔۲۶۔

۴۔ طبرسی کی مجمع البیان، ج ۱۰، ص ۶۴۲؛ تفسیر نور الثقلین، ج ۵، ص ۴۹۳، ح ۲۰؛ تفسیر علی بن ابراہیم قمی، ج ۲، ص ۸۰ و ۸۱ اور فیض کاشانی کی علم الیقین، ج ۲، ص ۱۰۳۳۔

اگر آپ اپنے احوال درونی کا ملاحظہ کریں اور اپنے اندر مذکورہ حالت کا مشاہدہ کریں تو جان لیں گے کہ شہوت، غضب اور خواہشات کے دھویں نے ہمارے چشم دل کو اندھا اور ہمارے ادراک کے راستوں کو مسدود کر دیا ہے، نیز شیطان اور نفس امارہ نے ہمارے کانوں کو حرف حق اور آیات الٰہی کی سماعت سے محروم اور بہرا بنا دیا ہے۔ بے نور آنکھوں اور بہرے کانوں کے ذریعے حقائق کا ادراک ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ سورۂ اعراف کی آیت ۱۷۹ میں ہم میں سے بعض افراد کی حالت بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

﴿وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيراً مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ﴾ ۱

جہنمی ہونے کی علامت یہ ہے اللہ نے جس دل کو کتب تکوین وتدوین کی آیات میں غور وفکر کرنے کیلئے خلق فرمایا ہے، نیز جس آنکھ اور کان کو حقائق الٰہیہ دیکھنے اور سننے کیلئے عطا فرمایا ہے ان کا استعمال مذکورہ مقاصد کیلئے نہ کیا جائے اور انسان حیوانی خواہشات وافکار کے دائرے سے نہ نکلے، نیز انسانیت کے کمترین مقام (جو تدبیرات عقلیہ سے عبارت ہیں) تک بھی رسائی حاصل نہ کرے۔ ایسا آدمی درحقیقت انسان کی شکل میں حیوان ہے، بلکہ حیوانات سے بھی بدتر ہے۔ اس کی متعدد وجوہات ہیں جن میں سے ایک یہ ہے:

اگر انسان راہ مستقیم سے منحرف ہو تو وہ حیوانیت، درندگی اور شیطنت کے ہر شعبے میں تمام چوپایوں، درندوں اور شیاطین سے آگے نکل جاتا ہے، کیونکہ اس کی قوتیں اور خواہشات کی کوئی حد معین نہیں جبکہ دیگر موجودات حدود وقیود کے پابند ہیں۔ انسان کی حیوانی خواہشات کی کوئی انتہا مقرر نہیں۔ اس کا آتش غضب عالم سوز ہے۔ اس کی شیطنت اور اس کا مکر وفریب اہل عالم کو بدبخت اور بے چارہ بنا دیتے ہیں۔

اے عزیز! ان آیات خداوندی اور تعالیم ربانی کا مقصد ہمیں خواب گراں سے جگانا اور ہم غافلوں کو بیدار کرنا ہے۔ قرآن میں مذکور قصہ کہانیوں کا مقصد داستان گوئی اور تاریخ نویسی نہیں۔ یہ قصے تمام انبیاء کی

۱۔ اور بہ تحقیق ہم نے جن وانس کی ایک کثیر تعداد کو (گویا) جہنم ہی کیلئے پیدا کیا ہے۔ ان کے پاس دل تو ہیں مگر وہ ان سے سوچتے نہیں اور ان کی آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں۔ وہ جانوروں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی گئے گزرے ہیں۔ یہی لوگ تو حق سے غافل ہیں۔

تعالیم اور تمام اولیاء کی سیرت ورہنمائی کا خلاصہ ہیں۔ان میں تمام روحانی عیوب وامراض اوران کے طریقہ علاج کا بیان موجود ہے۔یہ انسانیت اوراللہ کے راستے پر چلنے والوں کیلئے چراغ ہدایت ہیں۔ان داستانوں کا مقصد گزشتہ لوگوں کا قصہ پارینہ بیان کرنا نہیں نہ ان کا ہدف تاریخ دانی اوراطلاع رسانی ہے۔

خدائی اہداف ومقاصد اور مسعودی ۱ طبری ۲ اوران جیسے لوگوں کے اہداف میں فرق کرو۔قرآن کوصرف تاریخ وادب اور فصاحت وبلاغت کے نظر سے نہ دیکھو، کیونکہ یہ خوداک ضخیم پردہ اور دبیز حجاب ہے۔

قرآن کتاب ہدایت اور تعالیم الٰہیہ کا نسخہ ہے۔یہ دنیا والوں کے مقاصد کی تکمیل کیلئے نہیں۔تمام دنیوی مقاصد حیوانی مقاصد ہیں۔اگر انسان ان مقاصد کے پیچھے جائے جن کی برگشت دنیا کی طرف ہوتی ہے تو وہ حیوانیت کے دائرے سے خارج نہیں ہوگا، بلکہ وہ جب تک خواہشات ولذات کی رسی میں بندھا رہے گا حیوانیت کے زمرے سے خارج نہیں ہوگا خواہ وہ خواہشات ولذات دنیوی ہوں یا اخروی۔یوں وہ بعض مراتب کے لحاظ سے ﴿أولَئِکَ کَالْأَنعَام﴾۳ والی آیت کا مصداق ٹھہرے گا۔

وہ شخص جو انبیاء واولیاء کی جملہ زحمتوں اور مشقتوں، تمام آیات الٰہی، صحف سماوی اور جملہ احادیث وروایات کو چھوڑ کر صرف شکم پری اور جنسی خواہشات کے پیچھے لگ جائے، نیز اللہ اور انبیاء کی تعلیمات کا

۱۔ ابوالحسین علی بن حسین مسعودی، چوتھی صدی ہجری کے اوائل کے عظیم مورخ ہیں۔وہ امامیہ مکتب فکر سے تعلّق رکھتے تھے اورمعروف صحابی عبداللہ بن مسعود کی نسل سے تھے اسی لئے مسعودی کے نام سے معروف ہیں۔وہ سیروسیاحت کے دلدادہ تھے۔انہوں نے شرق وغرب کا سفر کیا۔سنہ ۳۴۵ یا ۳۴۶ ھ میں فسطاط (مصر) میں وفات پا گئے۔مسعودی کی تا ٔلیفات جو باقی ہیں یہ ہیں: التنبیہ والاشراف، اخبار الزمان، اثبات الوصیہ اور سب سے مشہور ''مروج الذہب'' جوان کی دو کتابوں (اخبار الزمان اکبر اور اخبار الزمان اوسط) کا خلاصہ ہے۔یہ کتاب تاریخ، شہروں کی جغرافیائی صورتحال، گزشتہ بادشاہوں کے حالات وآثار کے بیان پر مشتمل ہے۔ (ریحانۃ الادب، ج۵،ص ۳۰۷۔۳۰۹)۔

۲۔ ابوجعفر محمد بن جریر بن غالب طبری، ایک ایرانی مورخ فقیہ اور دانشور ہیں۔ ۲۲۵ ھ میں پیدا ہوئے اور ۳۱۰ میں وفات پائی۔اکثر علوم میں انہوں نے کتابیں لکھیں۔ان کی باقیماندہ کتب یہ ہیں: اخبار الرسل والملوک (المعروف تاریخ طبری) جامع البیان فی تفسیر القرآن اور اختلاف الفقہاء یا اختلاف العلماء۔ (ریحانۃ الادب، ج۴،ص ۴۲۔۴۳)۔

۳۔ یہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں۔ سورۂ اعراف ۱۷۹۔

بنیادی مقصد اور محور فکر شکم اور جنسی تسکین کو قرار دے، علاوہ ازیں تمام عبادات اور حصول علم و معارف کو مذکورہ لذتوں تک رسائی کا زینہ قرار دے وہ ایک چوپایہ ہے جو غلطی سے اپنے آپ کو انسان سمجھ بیٹھا ہے۔ انسان کی علامت یہ ہے کہ وہ علم الاسماء سے آراستہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو علم الاسماء سکھا کر فضیلت عطا کی اور انہیں علم و معارف کے ذریعے تمام موجودات پر برتری سے نوازا وگرنہ فکر شکم، جنسی خواہشات، حیوانی مقاصد اور ان کے آثار کسی فضیلت اور برتری کا موجب نہیں بن سکتے۔

پانچویں فصل

عفت کی فضیلت پر مشتمل بعض احادیث کا بیان

محمد بن یعقوب کلینیؒ نے اپنی سند کے ساتھ ابو جعفر علیہ السلام سے نقل کیا ہے کہ آپؑ نے فرمایا: ﴿مَا مِنْ عِبَادَةً أَفْضَلُ مِنْ عِفَّةِ بِطْنٍ وَفَرْجٍ﴾[1] اس مضمون کی بہت سی احادیث منقول ہیں[2]

محمد بن علی بن حسین اپنی اسناد کے ساتھ امیر المؤمنین علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ آپؑ نے محمد بن حنفیہ کے نام اپنی وصیت میں فرمایا: ﴿وَمَنْ لَمْ يُعْطِ نَفْسَهُ شَهْوَتَهَا، أَصَابَ رُشْدَهُ﴾[3]

انسانیت کے بلند مرتبے تک رسائی لذات وخواہشات کی روک تھام کے بغیر ممکن نہیں۔ جو لوگ خواہشات ولذات کے پیچھے بھاگتے ہیں وہ ہدایت حاصل نہیں کر سکتے اور وہ راہ حق کا مشاہدہ کرنے سے محروم ہوتے ہیں۔

الوسائل میں امام صادقؑ سے مروی ہے کہ فرمایا:

﴿[اِنَّمَا] شِيعَةُ جَعْفَرٍ مَنْ عَفَّ بَطْنَهُ وَفَرْجَهُ وَاشْتَدَّ جِهَادُهُ وَعَمِلَ لِخَالِقِهِ وَرَجَا ثَوَابَهُ

۱۔ کوئی عبادت پیٹ اور شرمگاہ کی حفاظت وعفت سے افضل نہیں۔ (اصول کافی، ج ۲، ص ۶۵، باب العفہ، ح ۷)۔

۲۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۶۴، باب العفہ؛ نیز وسائل الشیعہ، ج ۱۵، ص ۲۴۹۔۲۵۲، باب وجوب العفہ (۲۲) ابواب جہاد النفس؛ نیز فیض کاشانی کی کتاب الوافی، ج ۴، ص ۳۳۱، باب العفہ (۴۴)۔

۳۔ جو کوئی اپنے نفس کو نفسانی خواہشات سے دور رکھے وہ ہدایت ورشد کو حاصل کرتا ہے۔

وسائل الشیعہ، ج ۱۵، ص ۲۵۰، باب وجوب العفہ، ح ۹؛ نیز من لایحضرہ الفقیہ، ج ۴، ص ۳۹۰، ۳۹۱، باب النوادر، ح ۵۸۳۴۔

وَخافَ عِقابَهُ فَإِذا رَأَيتَ أُولٰئِكَ، فَأُولٰئِكَ شِيعَةُ جَعْفَر﴾۱

جولوگ عفت سے محروم ہوں وہ حضرت امام صادقؑ کے شیعہ نہیں ہیں اگر چہ وہ اپنے آپ کو امام صادقؑ کے شیعہ کہیں۔ جو لوگ حیوانی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں وہ حیوانی روح کے حامل ہیں اور عقل کی متابعت کے زمرے سے خارج ہیں کہاں یہ کہ وہ اللہ کی اطاعت سے سرافراز ہوں۔ حضرت صادقؑ کے شیعہ اللہ کے رنگ میں رنگے ہوتے ہیں ﴿وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللهِ صِبْغَةً﴾۲ وہ خواہشات، شہوت، غیظ وغضب اور شیطنت کی آلودگیوں سے پاک رہتے ہیں، بلکہ ان کے دل عقل کی زنجیر سے آزاد ہوتے ہیں۔

جی ہاں! ﴿وَإِنَّ مِنْ شِيعَتِهِ لَإِبْراهِيمَ ☆ إِذْ جاءَ رَبَّهُ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ﴾۳ احادیث میں مذکور ہے کہ حضرت ابراہیمؑ امیر المومنینؑ کے شیعہ تھے۴ کیونکہ وہ قلب سلیم کے ساتھ اپنے پروردگار کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ قلب سلیم کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ وہ غیر اللہ سے خالی ہوتا ہے اور اللہ کے سوا کسی سے مربوط نہیں ہوتا۔۵

تفسیر برہان میں ایک طویل حدیث امام علیہ السلام کی تفسیر سے منقول ہے۔ راوی کہتا ہے کہا یک شخص نے علی بن حسین (علیہما السلام) سے عرض کیا:

﴿يابْنَ رَسُولِ اللهِ! أَنَا مِنْ شِيعَتِكُمُ الخُلَّص. فقالَ لَهُ: يا عَبْدَاللهِ! فَإِذا أَنْتَ كَإِبْراهِيمَ الخَلِيلِ علیہ السلام، إِذْ قالَ اللهُ تَعالىٰ: ﴿وَإِنَّ مِنْ شِيعَتِهِ لَإِبْراهِيمَ ☆ إِذْ جاءَ رَبَّهُ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ﴾

۱۔ بہ تحقیق جعفر کا شیعہ وہ ہے جو اپنے شکم اور اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرے، سخت کوش ہو، اپنے خالق کیلئے عمل کرے، اس کے ثواب کی امید رکھے اور اس کے عقاب سے ڈرے۔ پس جب تم ایسے لوگوں کو دیکھو تو جان لو کہ یہی جعفر کے شیعہ ہیں۔
وسائل الشیعہ، ج ۱۵، ص ۲۵۱، باب وجوب العفہ، ح ۱۳۔

۲۔ اللہ کے رنگ سے اچھا کس کا رنگ ہو سکتا ہے؟۔ سورۂ بقرہ ۱۳۸۔

۳۔ اور ابراہیم یقیناً ان کے شیعوں میں سے تھے جب وہ اپنے ربّ کی بارگاہ میں قلب سلیم کے ساتھ آئے۔
سورۂ صافات ۸۳، ۸۴۔

۴۔ امام صادقؑ سے مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: ﴿إِنَّ مِنْ شِيعَتِهِ لَإِبْراهِيمَ﴾ أي إِبْراهِيمَ (ع) مِنْ شِيعَةِ عَلِيٍّ (ع)۔
تفسیر برہان، ج ۴، ص ۲۰، تفسیر آیت ۸۳ سورۂ صافات، حدیث ۲۔

۵۔ تفسیر البرہان (سید ہاشم بحرانی)، ج ۴، ص ۲۵، ح ۲۔

فَإِنْ کانَ قَلْبُکَ کَقَلْبِهِ فَأَنْتَ مِنْ شِیْعَتِنا...؂۱

۱۔ ایک شخص نے امام علی بن الحسین (علیہما السلام) سے عرض کیا: اے فرزند رسول! میں آپ کا خالص شیعہ ہوں۔
امام ؑ نے اس سے فرمایا: اے بندہ خدا! پس تم ابراہیم خلیل (علیہ السلام) کی طرح ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "بہ تحقیق ابراہیم اس کے شیعوں میں سے ہے، کیونکہ وہ قلب سلیم کے ساتھ اللہ کے ہاں حاضر ہوا" پس اگر تمہارا دل ابراہیم ؑ کے دل جیسا ہے تو پھر تم ہمارے شیعہ ہو۔
تفسیر البرہان، ج ۴، ص ۲۲۔

مقصد / ۱۵

''زھد'' اور اس کی ضد ''رغبت''

یہ مقصد چھ فصلوں پر مشتمل ہے:

پہلی فصل

''زھد'' اور ''رغبت'' کا مفھوم

لغوی لحاظ سے زہد کا مفہوم ہے: کسی چیز کو ترک کرنا، اس سے بے رغبتی برتنا اور منہ موڑنا۔ زہد کسی چیز کو حقیر اور قلیل شمار کرنے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ ''زُھد'' اور ''زَھادت'' مصدر ہیں۔ فعل ماضی زَھَدَ، زَھِدَ اور زَھُدَ ہیں۔ زَھِدَ في الشيء یا عَنِ الشيء سے مراد ہے کسی چیز سے بے رغبتی برتنا اور اسے ترک کرنا۔ فُلانٌ یَزْدَھِدُ عَطاءَ فُلان سے مراد ہے: فلاں شخص نے فلاں آدمی کی دی ہوئی چیز کو حقیر اور کم سمجھا۔ الزُّھْدُ اور الزَّھادَة سے مراد ہے کسی چیز کو حقیر سمجھتے ہوئے اس سے منہ پھیرنا۔ چنانچہ تھوڑی اور قلیل چیز کو شَيءٌ زَھِید کہا جاتا ہے۔[1]

راقم عرض کرتا ہے: اگر اصطلاح میں زہد سے مراد (حصول آخرت کی خاطر) ''ترک دنیا'' کو لیا جائے تو اس کا شمار جسمانی اعمال میں ہوگا۔ لیکن اگر اسے مراد دنیا سے ''بے رغبتی'' لی جائے تو اس کا شمار قلبی و باطنی اعمال میں ہوگا۔ البتہ اس بات کا بھی احتمال ہے کہ ترک دنیا کی بنیاد دنیا سے بے رغبتی ہو یا مطلق بے رغبتی ہو۔ بنابریں زہد چار صورتوں سے خالی نہیں:

۱۔ زہد سے مراد دنیا سے مطلق بے رغبتی ہو خواہ وہ ترک دنیا کرے یا نہ کرے۔

۱۔ صحاح اللغہ (جوہری)، ج ۲، ص ۴۸۱؛ نیز ابن منظور کی لسان العرب، ج ۶، ص ۹۷۔

۲۔ زہد سے مراد ترک دنیا ہو خواہ بے رغبتی ہو یا نہ ہو۔

۳۔ زہد سے مراد وہ بے رغبتی ہو جس کے ساتھ ترک دنیا بھی ہو۔

۴۔ اس سے مراد وہ ترک دنیا ہو جو بے رغبتی کی بناء پر کی جائے۔

ان چار احتمالات میں سے شاید تیسرا احتمال سب سے زیادہ بہتر ہو اور اس کے بعد چوتھا احتمال، پھر پہلا احتمال۔ رہا دوسرا احتمال تو یہ بعید ہے، کیونکہ لغت لکھنے والوں کی تصریح کے مطابق زہد ''رغبت'' کی ضد ہے۔[1] چنانچہ اس حدیث میں بھی زہد کا یہی مفہوم بیان کیا گیا ہے۔ اور اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ ''رغبت'' سے مراد قلبی لگاؤ اور جھکاؤ ہے نہ کہ اس کا عملی مظاہرہ۔ اگرچہ رغبت کے ساتھ ہمیشہ اس کا عملی مظاہرہ ضروری نہیں، لیکن غالباً جہاں رغبت ہو وہاں اس کا عملی مظاہرہ بھی ہوتا ہے۔ بنا بریں یہ کہا جا سکتا ہے کہ زہد سے مراد بھی بے رغبتی اور عدم لگاؤ ہے جو غالباً ترک و اعراض کے ہمراہ ہوتا ہے اگرچہ ہمیشہ ایسا نہ ہو۔ البتہ یہ زہد کے مفہوم کا پانچواں احتمال ہے۔

خلاصہ یہ کہ زہد کے مفہوم میں بے رغبتی اور بے میلی (جو ایک باطنی و نفسانی کیفیت ہے) شریک ہے۔

دوسری فصل

زہد کے درجات

جان لو کہ دیگر نفسانی صفات اور انسانی خصائل کی طرح زہد کے بھی لاتعداد مراتب و درجات ہیں جن کا شمار ممکن نہیں۔ یہاں ہم زہد کے بعض بنیادی درجات کی طرف کتاب ہذا کے اوراق کی گنجائش کے مطابق اشارہ کرتے ہیں:

پہلا درجہ: یہ عام لوگوں کا زہد ہے۔ اس سے مراد ہے: اخروی نعمتوں کے حصول کیلئے دنیا سے منہ موڑنا۔ درحقیقت یہ درجہ، آخرت کی بعض منازل پر ایمان کے نتیجے میں حاصل ہونے والا درجہ ہے۔ اس درجے کے زاہد لوگ خواہشات کے اسیر ہوتے ہیں۔ البتہ وہ حکم عقل کی متابعت کرتے ہوئے دنیا کی زود گزر اور حقیر لذتوں کو ترک کرتے ہیں تاکہ آخرت کی ابدی اور بہتر لذتوں کو حاصل کریں۔ پس یہ ''ترک

۱۔ القاموس المحیط (فیروز آبادی)، ج ۱، ص ۳۰۹۔

شہوت برائے شہوت" ہے، یعنی اخروی خواہشات کے حصول کیلئے دنیوی خواہشات سے دستبردار ہونا۔

عقاب آخرت کے خوف سے ترک دنیا کرنا بھی اسی زمرے میں شامل ہے اگرچہ عموماً خوف آخرت کی بنا پر ترک دنیا کرنے کو "زہد" کا نام نہیں دیا جاتا۔ البتہ "عیون اخبار الرضا"[1] سے منقول حدیث میں مذکور ہے کہ حضرت امام صادقؑ سے اس شخص کے بارے میں سوال کیا گیا ہو جو دنیا میں زہد اختیار کرتا ہے تو آپؑ نے فرمایا: "زاہد وہ ہے جو دنیا کے حلال کو ترک کرے اس پر ہونے والے حساب کے خوف سے اور دنیا کے حرام کو ترک کرے اس پر ہونے والے عقاب کے خوف سے"۔[2]

البتہ ان بزرگان دین اور نفوس کی تربیت کرنے والوں کے بیانات لوگوں کے فہم وادراک میں اختلاف کے حساب سے مختلف ہیں، یعنی یہ معصومینؑ ہر کسی کے مقام ومرتبے اور حیثیت کے مطابق انسانیت کے مختلف مقامات میں سے کسی مرتبے کا ان سے ذکر فرماتے تھے۔ مقامات نفس اور فرامین اہل اللہ کے اسلوب کی شناخت رکھنے والوں کیلئے ضروری ہے کہ ان فرامین کے مقصود کو سمجھنے کیلئے مذکورہ نکتے کو مدنظر رکھیں تا کہ انبیاء اور اولیاء کے بیانات وفرامین کے اندر موجود ظاہری اختلاف کو حل کیا جا سکے۔

دوسرا درجہ: یہ خاص لوگوں کا "زہد" ہے۔ اس سے مراد ہے: حیوانی خواہشات اور شہوانی لذات سے اس لئے اجتناب کرنا تا کہ معنوی، روحانی اور انسانی مقامات تک رسائی حاصل ہو۔ انسان اس درجے تک اس وقت رسائی حاصل کرتا ہے جب وہ آخرت کے بعض مراتب عالیہ کا علم حاصل کرے اور ان پر ایمان رکھے۔ اس علم وایمان کی بدولت س کی نظر میں حیوانی خواہشات اور جسمانی لذات حقیر اور بے قیمت نظر آتی ہیں۔ لہذا نفس ان خواہشات سے اپنا منہ موڑ لیتا ہے۔

۱۔ عیون اخبار الرضاؑ امامیہ فرقے کی احادیث کے مآخذ میں سے ایک ہے۔ یہ شیخ المحدثین محمد بن علی بن بابویہ قمی المعروف "شیخ صدوق رہ" (متوفی ۳۸۱ھ) کی تالیف ہے۔ شیخ نے یہ کتاب امام رضاؑ کے حالات اور آپؑ کی احادیث کے حوالے سے لکھی ہے جو ۱۳۹ ابواب پر مشتمل ہے اور اسے صاحب بن عباد دیلمی (وزیر) کے نام منسوب کیا ہے۔ شیخ آغا بزرگ تہرانی، ج ۱۵، ص ۳۷۵۔

۲۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں: عن الصادق علیہ السلام: ﴿سُئِلَ عَنِ الزّاهِدِ في الدُّنيا؟ قالَ: الَّذي يَترُكُ حَلالَها مَخافَةَ حِسابِهِ، وَيَترُكُ حَرامَها مَخافَةَ عِقابِهِ﴾۔

وسائل الشیعہ، ج ۱۶، ص ۱۶، باب ۶۲، ابواب جہاد النفس، ح ۱۶؛ نیز عیون اخبار الرضاؑ، ج ۱، ص ۲۴۳، ح ۸۱۔

معنوی، عقلی اور روحانی لذات، نیز غیر مادی، غیر حسّی اور بسیط و مطلق ادراکات پر اگر چہ فلسفیوں، بڑے بڑے علماء اور عظیم دانشوروں کی ہمیشہ توجہ رہی ہے۔ عظیم فلسفی ''ارسطو'' (جو معلم اول کے نام سے معروف ہیں) نے اس مسئلے کو بڑی اہمیت دی ہے[۱] لیکن اصحاب معرفت و یقین اور ارباب حقیقت و عرفان کے نزدیک زہد کا یہ مرتبہ بھی ناقص اور کمزور ہے، چونکہ دنیا سے یہ بے رغبتی ایک اور لذت کے حصول کی خاطر ہے (اگر چہ روحانی لذت ہی سہی) اس لئے یہاں بھی نفسانی خواہش کارفرما ہے۔ بنابریں یہ درجہ بھی حقیقی ''زہد'' نہیں ہے، بلکہ یہ لذت و شہوت کے حصول کی خاطر ترک لذت و شہوت سے عبارت ہے۔

تیسرا درجہ: یہ خاص الخاص لوگوں کا زہد ہے۔ اس سے مراد ہے: عقلی و روحانی لذتوں سے دستبرداری تاکہ جمیل مطلق کے جمال کا مشاہدہ نصیب ہو اور معارف ربانی کی حقیقتوں تک رسائی حاصل ہو۔ یہ اولیاء و محبین کے درجات و مقامات کا اولین زینہ ہے اور زہد کے بلند مراتب میں سے ایک ہے۔ پس اس مقام کے حامل انسان کو پہلے مرتبے کی مناسبت سے حقیقی ''زہد'' حاصل ہوگا۔ حقیقی زہد سے مراد ہے: اللہ کی خاطر غیر اللہ کو ترک کرنا۔

اس مقام کے بعد سالک کیلئے فنا کا پہلا مرتبہ حاصل ہوتا ہے جس سے مراد ہے: لذتوں کا فنا ہونا، یعنی ان کی طرف توجہ نہ دینا۔ اس کے بعد اولیاء کے دیگر مقامات آتے ہیں جن کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں۔ یہاں ہم انہی تین درجات کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں جو بنیادی نوعیت کے حامل ہیں۔

تیسری فصل

کمال انسانیت و روحانیت کے حوالے سے زھد کا مقام

کسی گزشتہ فصل میں ہم ذکر کر چکے ہیں[۲] کہ اللہ کی ہر برحق دعوت اور اس کی ہر کامل شریعت دو مقاصد سے خالی نہیں ہیں خواہ وہ حقائق توحید اور اسرار تفرید و تجرید کو کشف کرنے کے لحاظ سے ہوں یا اخلاقی خوبیوں اور اچھائیوں کی ترویج کے لحاظ سے یا احکام خداوندی کو بیان کرنے کے زاویۂ نگاہ سے۔ ان دونوں مقاصد

۱۔ اثولوجیا (اتھولوجی) جو ''فلوطین عندالعرب'' کے ساتھ چھپی ہے۔ دیکھئے، ص ۵۶ میمر ۴؛ نیز، ص ۸۴، میمر ۷۔

۲۔ اس سے قبل کسی چیز کا ذکر نہیں کیا ہے، البتہ آگے چل کر بیسویں مقصد، ص ۳۳۹ میں اس بات کا صریحاً تذکرہ فرمایا ہے۔

میں سے ایک مقصد اصلی اور ذاتی نوعیت کا ہے جبکہ دوسرا مقصد ضمنی، فرعی اور ثانوی نوعیت کا ہے۔

انبیاء (علیہم السلام) کی بعثت اور اولیاء (علیہم السلام) کی مجاہدت ومکاشفت کا اصلی اور ذاتی مقصد یہ ہے کہ یہ مادی، طبیعی، جسمانی، حیوانی اور بشری انسان لاہوتی، الٰہی، ربانی اور روحانی انسان میں بدل جائے، کثرت وحدت سے متصل ہو جائے اور اول وآخر ایک دوسرے سے مل جائیں۔ یہ معرفت کی حقیقت کا آخری درجہ ہے جس کی طرف حدیث قدسی میں یوں اشارہ ہوا ہے: ﴿كُنتُ كَنزاً مَخفِيّاً فَأَحبَبتُ أَن أُعرَفَ، فَخَلَقتُ الخَلقَ لِكَي أُعرَف﴾ [۱] اسی طرح ایک اور حدیث شریف میں ارشاد ہوا ہے: ﴿أَوَّلُ الدِّينِ مَعرِفَتُه﴾ [۲]

تمام ظاہری وباطنی اعمال، نیز تمام جسمانی وروحانی افعال کا مقصد اسی مقدس مقام تک رسائی اور معارف الٰہیہ کو وسعت دینا ہے۔ یہ بنیادی اور اصلی مقصد دو چیزوں کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ پہلی چیز اللہ کی طرف توجہ ہے اور دوسری چیز غیر اللہ سے ناطہ توڑنا۔ اسی لئے ہر خدائی دعوت یا اللہ کی طرف توجہ اور رخ کرنے (اقبال) یا غیر اللہ سے رخ پھیرنے (ادبار) اور اعراض کرنے پر مشتمل رہی ہے۔

اسی طرح جملہ ظاہری وباطنی، نیز قلبی وجسمانی اعمال یا تو خدا کی طرف توجہ سے عبارت ہیں یا اس توجہ میں معین ومددگار ہیں یا غیر اللہ سے منہ موڑنا ہیں یا اس کام میں مدد دیتے ہیں۔

جس حدیث کی ہم تشریح کر رہے ہیں، نیز دیگر احادیث میں فرمایا گیا ہے: ''ہم نے عقل کو 'اقبال' (سامنے رخ کرنے) کا حکم دیا تو اس نے ایسا کیا۔ پھر ہم نے اسے ادبار (پیچھے مڑنے) کا حکم دیا تو اس نے ایسا کیا'' [۳] یہاں امر خداوندی کو ''اقبال'' اور ''ادبار'' میں منحصر رکھنے کی وجہ شاید اس نکتے کی طرف اشارہ ہو کہ اللہ کے تمام اوامر ونواہی کی برگشت انہی دو باتوں کی طرف ہوتی ہے۔

اب جب یہ مسئلہ واضح ہو چکا تو ساتھ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ زہد، ترک دنیا اور غیر اللہ سے منہ موڑنے (جو حقیقی زہد ہے) کا مقام سیر وسلوک انسانی کے حوالے سے کیا ہے اور یہ بھی ثابت ہو گیا کہ غیر اللہ سے رخ

۱۔ میں ایک پوشیدہ خزانہ تھا، پھر میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں۔ پس میں نے مخلوقات کو خلق کیا تا کہ میری شناخت ہو۔ موسوعۃ اطراف الحدیث النبوی الشریف، ج۶، ص۵۰۷۔

۲۔ دین کی ابتداء معرفت خداوندی سے ہوتی ہے۔ نہج البلاغہ، ص۳۹، خطبہ۱۔

۳۔ اصول کافی، ج۱، ص۸ کتاب العقل والجہل، ح۱، نیز ص۲۰، ح۲۶۔

پھیرنا تمہید ہے جمیل مطلق کے جمال تک رسائی اور معارف وتوحید کے سمندر میں غوطہ زن ہونے کی اور یہ کہ زہد بنفسہ ایک انسانی کمال اور روحانی مقام نہیں جو براہ راست اور ذاتی طور پر مطلوب ہو۔ چنانچہ احادیث شریفہ میں اس نکتے کی طرف بہت سے موقعوں پر اشارہ ہوا ہے۔

الوسائل میں الکافی کی سند کے ساتھ حضرت امام باقرؑ سے مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: قَالَ أمیر المؤمنین (ع): ﴿إنَّ مِنْ أعْوَنِ الاَخْلاقِ عَلَى الدِّينِ الزُّهْدَ فِي الدُّنْيا﴾۱

نیز کافی ہی کی سند کے ساتھ امام صادقؑ سے مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: ﴿حَرامٌ عَلىٰ قُلُوبِكُمْ أنْ تَعْرِفَ حَلاوَةَ الايْمانِ حَتّىٰ تَزْهَدَ فِي الدُّنْيا﴾۲

امام صادقؑ ہی سے منقول ہے کہ فرمایا: ﴿كُلُّ قَلْبٍ فِيهِ شَكٌّ أوْ شِرْكٌ فَهُوَ ساقِطٌ وَإنَّما أرادُوا بِالزُّهْدِ فِي الدُّنْيا لِتَفْرَغَ قُلُوبُهُمْ لِلآخِرَةِ﴾۳

بظاہر اس حدیث شریف کا ابتدائی حصہ کچھ یوں ہے کہ قلب سلیم وہ دل ہے جو اللہ تعالیٰ سے اس حالت میں ملاقات کرے کہ اس کے اندر اللہ کے سوا کوئی چیز نہ ہو۔۴ اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے: ہر وہ دل جس میں شک یا شرک موجود ہو وہ ساقط ہے اور دنیا میں زہد اختیار کرنے کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں کہ دل کے اندر آخرت کے سوا کچھ نہ ہو۔ حدیث کے ابتدائی حصہ کا ملاحظہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں آخرت سے مراد اللہ کے دروازے تک رسائی اور جمیل مطلق کے جمال کا مشاہدہ ہے، نیز حقیقی زہد عبارت ہے اس بات سے کہ دل شک اور شرک سے خالی ہو جائے اور اللہ کے سوا اس میں کچھ بھی نہ ہو۔

نیز امام صادقؑ سے مروی ہے کہ آپؑ فرماتے تھے: ﴿إذا تَخَلَّى الْمُؤْمِنُ مِنَ الدُّنْيا سَما وَوَجَدَ حَلاوَةَ حُبِّ اللهِ فَلَمْ يَشْتَغِلْ بِغَيْرِهِ﴾۵

۱۔ امیر المؤمنینؑ نے فرمایا: "دین کیلئے سب سے زیادہ مددگار خصلت دنیا سے بے رغبتی ہے۔ (وسائل الشیعہ، ج ۱۶ ص ۱۲، باب ۶۲، ابواب جہاد النفس، ح ۴؛ نیز اصول کافی، ج ۲، ص ۱۰۴، باب ذم الدنیا والزہد فیہا، ح ۳)۔

۲۔ تمہارے دلوں پر ایمان کی مٹھاس کا چکھنا حرام ہے جب تک تمہارے دل دنیا سے بے رغبت نہ ہو جائیں۔ وسائل الشیعہ، باب ۶۲، ص ۱۲، ح ۵؛ نیز اصول کافی، مذکورہ بالا باب، ح ۲۔

۳، ۴۔ وسائل الشیعہ مذکورہ بالا باب، ص ۱۲، ح ۷؛ نیز اصول کافی، مذکورہ باب، ص ۱۰۵، ح ۵۔

۵۔ جب مؤمن دنیا سے کوچ کرے تو وہ بلند ہو جاتا ہے اور محبت الٰہی کی مٹھاس کو درک کرتا ہے۔ پھر وہ اللہ کے سوا -->

مصباح الشریعہ میں امام صادقؑ سے منقول ہے: ﴿الزُّهْدُ مِفْتاحُ بابِ الآخِرَةِ وَالبَرائَةِ مِنَ النّارِ، وَهُوَ تَرْکُکَ کُلَّ شَيْءٍ یُشْغِلُکَ عَنْ اللهِ تَعالیٰ مِنْ غَیْرِ تَأَسُّفٍ عَلیٰ فَوْتِها وَلا اِعْجابٍ فِي تَرْکِها...﴾۱

چوتھی فصل

دنیا سے رغبت حق کی محجوبیت کا باعث ہے

جان لو کہ دنیا سے رغبت اور لگاؤ حق سے دوری اور اللہ کی قربت سے محرومی کا موجب ہے۔ دنیا سے مراد ہر وہ چیز ہے جو انسان کو اللہ تعالیٰ سے غافل کر کے اپنی طرف متوجہ کر لے، چونکہ یہ چیز اس مادی دنیا میں زیادہ وقوع پذیر ہوتی ہے اس لئے یہ نام اسی کیلئے زیادہ سزاوار ہے۔ مصباح الشریعہ کی مذکورہ حدیث اسی نکتے کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ اس حدیث کے مطابق زہد سے مراد ہر اس چیز کا ترک کرنا ہے جو انسان کو اللہ تعالیٰ سے غافل کر دے اور اس کی توجہ اللہ سے ہٹائے۔

صاحبان معرفت نورانی اور ظلمانی حجابوں جن کا ذکر حدیث میں یوں ہوا ہے: ''اللہ تعالیٰ کے ہاں نور کے ستر ہزار حجاب اور ظلمت کے ستر ہزار حجاب ہیں''۲ سے اشیاء و عوالم کے وجود اور تعین و تقید کو مراد لیتے ہیں۳ کیونکہ ان میں سے ہر کسی کی طرف توجہ اور رغبت انسان کو جمیل مطلق کے جمال سے محروم و محجوب بنا دیتی ہے۔ بعض احادیث میں ان بہت سارے حجابوں کو (کلیات کے حساب سے) سات حجابوں میں سمویا گیا ہے جیسا کہ احادیث شریف میں مذکورہ ہے۔ سجدہ کی بحث میں مذکور ہے کہ حسین بن علی (علیہما السلام) کی قبر

<- کسی چیز سے سروکار نہیں رکھتا۔ (دیکھئے، وسائل الشیعہ، سابقہ بات، ص ۱۳، ح ۸)۔

۱۔ زہد جہنم سے نجات اور آخرت کے دروازے کی چابی ہے۔ زہد یہ ہے کہ تم ہر اس چیز کو ترک کر دو جو تمہیں اللہ سے غافل بنا دے بغیر اس طرح کہ تمہیں نہ اس چیز سے محرومی کا افسوس ہو اور نہ اس کے ترک کرنے پر غرور۔

مصباح الشریعہ کی فارسی شرح از عبدالرزاق گیلانی، باب ۳۱، در بیان زہد، ص ۱۹۱-۱۹۴۔

۲۔ بحارالانوار، ج ۵۵ ص ۴۴، کتاب اسماء والعالم، باب الحجب والاستار (۵)، ح ۱۲؛ نیز ص ۴۵، ح ۱۳۔

۳۔ ملا عبداللہ زنوزیؒ کی انوار جلیہ، ص ۳۶۰۔

کی تربت پر سجدہ سات حجابوں کو چاک کرتا ہے۔۱ ممکن ہے کہ یہ سات حجاب ان حجابوں سے بالاتر ہوں جیسا کہ علل الشرائع کی حدیث سے ظاہر ہوتا ہے۔

علل الشرائع میں ہشام بن حکم سے مروی ہے کہ ہشام نے کہا: میں نے ابوالحسن موسیٰؑ سے عرض کیا: کیا وجہ ہے کہ نماز کی ابتداء میں سات بار تکبیر کہنا مستحب ہے؟ فرمایا: اے ہشام! بہ تحقیق آسمان سات ہیں اور زمین بھی سات، نیز پردے (حجاب) بھی سات ہیں۔ جب معراج کی شب رسول اللہؐ کو سیر کرائی گئی اور آپؐ ﴿قَابَ قَوسَینِ أَوْ أَدْنیٰ﴾ کے برابر اپنے ربّ کے نزدیک ہوئے تو حق کے حجابوں میں سے ایک حجاب آپؐ کے سامنے سے ہٹ گیا۔ پس رسول اللہؐ نے تکبیر پڑھی اور ان کلمات کو پڑھنا شروع کیا جو نماز کے شروع میں پڑھے جاتے ہیں۔ پھر جب دوسرا پردہ بھی ہٹ گیا تو آپؐ نے (دوبارہ) تکبیر پڑھی۔ پھر یہ سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ ساتویں حجاب کی باری آئی اور آپؐ نے سات تکبیریں پڑھیں، پس نماز کی ابتدا میں سات تکبیریں پڑھنے کی وجہ یہی ہے۔۲

بہر حال ہر چیز کا وجود بجائے خود ایک حجاب ہے۔ ہر عالم کی موجودگی حجاب ہے اور اس کا تعین وتقید بھی حجاب ہے۔ یہ حجاب اور پردے انسان کو جمال محبوب کے مشاہدے سے روکتے ہیں۔ اللہ کے علاوہ ہر چیز سے لگاؤ اور دلبستگی اس کی قربت کے راستے کا کانٹا ہے۔ پس راہ خدا کے سالک، لقاء اللہ کے طالب اور معارف الٰہیہ کی بلندیوں تک رسائی کے عاشق کو چاہئے کہ راستے کے اس کانٹے کو شرعی ریاضتوں کے ذریعے دور کرے۔ غیر اللہ کے ساتھ لگاؤ، شکم پرستی اور جنسی خواہشات کی موجودگی میں روحانی کمالات تک رسائی اور جمیل مطلق کے جمال کا دیدار ممکن نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک لحاظ سے تمام حجابات کی بازگشت خود انسان کی طرف ہوتی ہے۔ بقول حافظ:

(میان عاشق ومعشوق ہیچ حائل نیست) تو خود حجاب خودی حافظ از میان برخیز ۳

۱۔ امام صادقؑ کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں: ﴿إنَّ السُّجُودَ عَلیٰ تُرْبَةِ أبِي عَبْدِ اللهِ علیہ السلام يَخْرُقُ الحُجُبَ السَّبْعَ﴾۔ وسائل الشیعہ، ج۵، ص۳۶۶، کتاب الصلاۃ، باب۱۶، ابواب مایسجد علیہ، ح۳۔

۲۔ وسائل الشیعہ، ج۶، ص۲۳، کتاب الصلاۃ، باب۷ ابواب تکبیرۃ الاحرام، ح۷؛ نیز علل الشرائع (صدوقؒ)، ج۲، ص۳۳۳، حد۴۔

۳۔ دیوان حافظ بہ تصحیح انجوی شیرازی، ص۳۰۱:

عاشق اور معشوق کے درمیان کچھ حائل نہیں تم خود ہی اپنا حجاب ہو حافظ درمیان سے اٹھ جاؤ۔

دیوان حلاج میں مرقوم ہے:

بيني وبينک 'اِنّي' يُنازعني　　　　فارفعْ بلطفک 'اِنّي' من البين[1]

اس اجمال کی تفصیل بیان کرنے کی یہاں گنجائش موجود نہیں۔

پانچویں فصل

"زهد" فطرت مخمورہ کا لازمہ ہے اور "رغبت" فطرت محجوبہ کا

قبل ازیں یہ معلوم ہوگیا کہ انسان اپنی خداداد فطرت (جس پر سارے انسان خلق ہوئے ہیں) کی رو سے دو فطرتوں کا حامل ہے۔ ان میں سے ایک فطرت اصلی ہے اور دوسری فرعی و ضمنی اور شاید تمام فطری امور کی بازگشت ان دونوں کی طرف ہوتی ہو۔

پہلی فطرت: کمال مطلق سے عشق کی فطرت ہے۔ یہ اصلی اور مقصود بالذات فطرت ہے۔

دوسری فطرت: نقص اور فقدان سے نفرت کی فطرت ہے جو فرعی اور ضمنی حیثیت رکھتی ہے۔

اللہ نے انسان کو اپنے لئے خلق فرمایا ہے جیسا کہ حدیث قدسی میں مذکور ہے: ﴿يابْنَ آدمَ خَلقْتُ الأشياءَ لِأجلِکَ وَخَلَقْتُکَ لِأجلِي﴾[2] قرآن کریم اور احادیث شریف میں بہت سے مقامات پر اس جانب اشارہ ہوا ہے[3] بنابریں اللہ نے خلقت تکوینی کے ذریعے اسے ان دو فطرتوں پر خلق فرمایا ہے تاکہ ان میں سے ایک کے ذریعے انسان ماسوی اللہ سے اپنا ناطہ توڑ لے اور دوسرے کے ذریعے جمیل مطلق کے جمال سے اپنا رشتہ جوڑ لے۔ انسان کے اندر موجود دیگر تمام فطریات کی بازگشت انہی دونوں کی طرف ہوتی ہے اور وہ سب ان دونوں کی شاخیں ہیں۔ شریعت مطہرہ کا پورا نظام اسی اصول فطرت پر استوار ہے۔

پس زہد (جو نقائص سے نفرت اور غیر اللہ سے اجتناب سے عبارت ہے) کا تعلق خداداد فطرت مخمورہ

۱۔ میرے اور تیرے درمیان میری انانیت مجھ سے دست بگریبان ہے پس اپنے لطف و کرم سے میری اس انانیت کو درمیان سے ہٹا دے۔ (دیوان حلاج، ص ۹۰)۔

۲۔ اے فرزند آدم! میں نے تمام چیزوں کو تیرے لئے خلق کیا ہے اور تجھے اپنے لئے۔
ملاحظہ ہو، فیض کاشانی کی علم الیقین، ج ۱، ص ۳۸۱۔

۳۔ سورۂ طٰہٰ/۱۳ و ۴۱؛ نیز دیکھئے موسوعۃ اطراف الحدیث النبوی الشریف، ج ۴، ص ۶۲۹۔

سے اور فطرت خداوندی کے فرعی احکام سے ہے۔ اسی طرح غیر اللہ سے ہر قسم کی رغبت فطرت کی محجوبیت کا نتیجہ ہے، کیونکہ مادی وطبیعی پردوں میں چھپ جانے کے بعد فطرت اپنے محبوب حقیقی کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہوتا ہے اور اسے طبیعیات ومادیات کے مختلف شعبوں اور مظاہر میں ڈھونڈتا ہے اور انہی میں سے کسی کو اپنا محبوب قرار دیتا ہے پھر اپنی محبت کا رشتہ اسی سے منسلک کردیتا ہے۔ پس وہ جمیل مطلق کے حسن وجمال سے محروم رہتا ہے، نیز لقاء اللہ کی سعادت سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔

بنابریں حقیقی زہد عقل اور رحمٰن کے بہت بڑے لشکروں میں سے ایک ہے جس کے ذریعے انسان طہارت وپاکیزگی کے آسمانوں میں پرواز کرتا ہے اور دنیا سے اپنا ناطہ مکمل طور پر توڑ لیتا ہے۔ یوں وہ ہر چیز سے کٹ کر صرف اللہ کا ہو رہتا ہے۔ اس کے برعکس حبّ دنیا اور دنیا کی رنگینیوں سے لگاؤ جہل اور شیطان کے سب سے بڑے لشکروں میں سے ایک ہے۔ یہ نفس کے پیچیدہ ترین داموں میں سے ایک دام ہے جس کے ذریعے انسان دام بلا میں گرفتار، راہ ہدایت سے دور، انسانیت کی منزل سے مہجور اور شجرۂ ولایت کے ثمرات سے محروم ومحجوب قرار پاتا ہے۔

جب انسان اس نکتے کو درک کرلے، نیز انصاف وبصیرت کی نظر سے اپنے معاملے کی ابتداء وانتہا کا جائزہ لے تو وہ اپنے اوپر لازم قرار دے گا کہ راستے کے اس پتھر، یعنی دنیا اور اس کے مال ومنال سے محبت کو اپنے جادہ سلوک سے ہٹالے اور اس مہلک جرم کو جو ہر جرم کا سرچشمہ[۱] اور ہر بیماری کی جڑ ہے اپنے خانہ دل سے خارج کردے، نیز اس خانہ دل کو جو محبوب کی جائے نزول اور مطلوب کی تجلی گاہ ہے غلاظتوں سے منزہ، نیز ابلیس کے لشکروں اور شیطان کے عمل دخل سے پاک کرے۔ یوں وہ پلید دیو کے غاصبانہ تسلّط سے اس خانہ خدا کو آزاد کرے اور اس کے اندر رکھے ہوئے بتوں کو پاش پاش کرے تاکہ گھر کا مالک اپنے گھر کی طرف توجہ دے اور اپنے جلوؤں سے اسے منور کرے۔

خداوندا! ہم نفس اور شیطان کے پیچیدہ داموں میں گرفتار ہیں، ہم اس دشمن کے مضبوط پنجوں سے نکلنے کی سکت نہیں رکھتے، اس سے مقابلہ کرنے کی ہم میں تاب نہیں۔ جب ہم ایک دام سے نکل بھاگیں تو

۱۔ حدیث شریف: ﴿حُبُّ الدُّنیا رأسُ کُلِّ خَطِیئَة﴾ سے ماٴخوذ ہے۔ (اصول کافی، ج۲، ص ۲۳۸، باب حبّ الدنیا والحرص علیھا، ح ۸)۔

دوسرے دام میں پھنس جاتے ہیں جو پہلے سے زیادہ سخت اور پیچیدہ ہوتا ہے۔ اب ایک ہی راہ نجات ہے اور وہ یہ کہ تیرا لطف بے کراں ہماری دستگیری کرے اور ہمیں مکمّل کامیابی اور فلاح سے ہمکنار کرے، نیز خواہشات اور حبّ دنیا کے اس تاریک کنویں سے ہمیں رہائی دے۔

اے میرے مولا! اس پر رحم کر جس کا سرمایۂ حیات امید و رجاء ہے اور اس کا واحد اسلحہ گریہ و بکاء ہے!۱

چھٹی فصل

زھد قرآن وحدیث کی روشنی میں

زہد کے بارے میں دلائل نقلیہ اس قدر زیادہ ہیں کہ جن کے بیان کی یہاں گنجائش نہیں۔ یہاں ہم ان میں سے چند ایک کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں۔

قالَ اللهُ تعالیٰ: ﴿لِکَیْلا تَأسَوا عَلیٰ ما فاتَکُمْ وَلاٰ تفرَحُوا بِما آتاکُمْ﴾۲

الوسائل میں حضرت سید السجاد علیہ السلام سے منقول ہے کہ ''زہد'' قرآن کی ایک آیت میں ہے۔ پھر آپؑ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی۔۳

اس سے ہمارے گزشتہ کلام کی تائید ہوتی ہے جس میں ہم نے ''زہد'' کو ان نفسانی صفات میں سے ایک قرار دیا ہے جس کے ساتھ عمل بھی موجود ہو۔ ہم نے کہا تھا کہ ''زہد'' صرف ''ترک دنیا'' کا نام نہیں۔ البتہ جو دل محبت دنیا سے خالی اور دنیا سے روگرداں ہو۔ حصول دنیا سے محرومی پر نہ اسے افسوس ہوگا اور نہ حصول دنیا پر فرحاں و نازاں بلکہ زاہد کے دل میں دنیا سے ایک قسم کی بے نیازی و بے اعتنائی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے جس کے باعث وہ دنیا اور اس کی رنگینیوں کی طرف توجہ نہیں دے گا۔ بنابریں دنیا کے ہاتھ سے نکل

۱۔ دیکھئے، اقبال الاعمال، ص ۷۰۹-۷۱۰، دعائے کمیلؒ۔

۲۔ ارشاد خداوندی ہے: تاکہ تم اس چیز پر رنجیدہ خاطر نہ ہو جو تم لوگوں کے ہاتھ سے چلی جائے اور جو چیز وہ تمہیں دے اس پر اترایا نہ کرو۔ سورۂ حدید ۲۳۔

۳۔ حدیث کے الفاظ یوں ہیں: اِنَّ رَجُلاً سَئَلَ عَلِیَّ ابنَ الحُسَین (علیهما السلام) عَنِ الزُّهدِ، فقالَ: ألاٰ وَاِنَّ الزُّهدَ في آیةٍ مِنْ کِتابِ اللهِ: ﴿لِکَیْلا تَأسَوا عَلیٰ ما فاتَکُمْ وَلاٰ تفرَحُوا بِما آتاکُمْ﴾۔

وسائل الشیعہ، ج ۱۶، ص ۱۲، باب ۶۲، ابواب جہاد النفس، ح ۶۔

جانے پر افسوس کرنے اور اس کے حصول پر اترانے کی نوبت ہی نہیں آتی۔

اللہ تعالیٰ قارون کے بارے میں فرماتا ہے:

﴿فَخَرَجَ عَلَىٰ قَوْمِهِ فِي زِينَتِهِ قَالَ الَّذِينَ يُرِيدُونَ الْحَيَوٰةَ الدُّنْيَا يَا لَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَا أُوتِيَ قَارُونُ إِنَّهُ لَذُو حَظٍّ عَظِيمٍ ☆ وَقَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللَّهِ خَيْرٌ لِمَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحاً وَلَا يُلَقَّيهَا إِلَّا الصَّابِرُونَ﴾۱

جولوگ دنیوی زندگی کے دلدادہ تھے، نیز دنیا اور اس کی رنگینیوں کو اپنی منزل مقصود سمجھتے تھے وہ قارون اور اس کی آرائش کو دیکھ کر للچانے لگے۔ ان کی خواہشات اور تمناؤں کا لاوا ابلنے لگا۔ وہ اس کی آرائش دیکھ کر حسرت میں مبتلا ہو گئے۔ لیکن جنہیں اللہ کی جانب سے غیب کا علم دیا گیا تھا وہ قارون اور اس کی نمود و نمائش سے متاثر نہ ہوئے، کیونکہ وہ ثواب خداوندی کے طالب تھے اور سمجھتے تھے کہ وہ صبر واستقامت کے ذریعے اس اخروی ثواب کو حاصل کر سکتے ہیں۔

یہ آیت زہد کے پہلے مرحلے کی طرف اشارہ کررہی ہے۔ اس بات کا بھی احتمال ہے کہ اس آیت شریفہ کا موضوع بحث ''زہد'' نہ ہو۔ البتہ ہم بہت سے محققین اور شُرّاح حدیث۲ کی پیروی کرتے ہوئے اس آیت کا ذکر کیا ہے۔

مروی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شرح صدر کے بارے میں سوال ہوا جس کا ذکر اس آیت میں آیا ہے: ﴿فَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلإِسْلَامِ﴾ ۳ اور یوں سوال ہوا کہ یہ ''شرح'' کیا ہے؟ تو حضورؐ نے فرمایا: ﴿إِنَّ النُّورَ إِذَا دَخَلَ الْقَلْبَ انْشَرَحَ لَهُ الصَّدْرُ وَانْفَسَحَ. قِيلَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! وَهَلْ لِذَٰلِكَ عَلَامَةٌ؟ قَالَ: نَعَمْ، التَّجَافِي عَنْ دَارِ الْغُرُورِ وَالإِنَابَةُ إِلَىٰ دَارِ

۱۔ (ایک دن) قارون بڑی آرائش کے ساتھ اپنی قوم کے سامنے نکلا۔ دنیا پسند لوگوں نے کہا: اے کاش ہمارے لئے بھی وہی کچھ ہوتا جو قارون کو دیا گیا ہے۔ بے شک وہ تو بڑا ہی قسمت والا ہے۔ اور جنہیں علم دیا گیا تھا وہ کہنے لگے تم برباد ہو جاؤ! اللہ کے پاس جو ثواب ہے وہ ایمان لانے والوں اور نیک عمل انجام دینے والوں کیلئے اس سے کہیں بہتر ہے۔ لیکن وہ صرف صبر کرنے والوں کو ملے گا۔ سورۂ قصص ۷۹، ۸۰۔

۲۔ دیکھئے، شرح اصول کافی، ج۱، ص ۴۳۹، صدر المتألہین شیرازی کی تألیف ہے۔

۳۔ اللہ جسے ہدایت دینا چاہے اس کے دل کو اسلام کیلئے کھول دیتا ہے۔ سورۂ انعام ۱۲۵۔

الخُلُودِ وَالاِستِعدادُ لِلمَوتِ قَبلَ نُزُولِه﴾۱

ظاہر ہے کہ جب تک دل اس دنیا کے تاریک و عمیق کنویں میں مقید رہے گا اور جب تک مادیت اور دنیا کا اسیر رہے گا تب تک وہ خود بھی تنگ اور تاریک رہے گا، نیز وہ نور ہدایت اور جلال و جمال کے جلوؤں سے ہمکنار ہونے کی صلاحیت سے محروم رہے گا۔ اس کے برخلاف دل دنیا اور اس کی رنگینیوں سے جس قدر بے رغبت ہو جائے اسی قدر اس کا سینہ کشادہ ہو جائے گا اور معنوی نور حاصل کر سکے گا یہاں تک کہ وہ پر فریب اور بے ثبات دنیا سے مکمّل طور پر روگرداں، بے رغبت اور لاتعلق ہو جائے۔ اس وقت دل نور مطلق اور حسن ازلی کے جلوؤں کے مشاہدے کی صلاحیت پیدا کر لے گا۔ ممکن ہے کہ یہاں موت سے مراد صرف طبیعی اور جسمانی موت نہ ہو، بلکہ موت کا وسیع تر مفہوم مقصود ہو۔ بنابریں حدیث کا مقصود زہد کے تمام مراتب ہوں۔

احادیث

محمد بن یعقوب (قدس سرّہ) اپنی سند کے ساتھ حضرت امام جعفر صادقؑ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؑ نے فرمایا: ﴿مَن زَهَدَ فِي الدُّنيا أثبَتَ اللهُ الحِكمَةَ فِي قَلبِهِ وَأنطَقَ بِها لِسانَهُ وَبَصَّرَهُ عُيُوبَ الدُّنيا دائَها وَدَوائَها، وَأخرَجَهُ مِنَ الدُّنيا سالِماً اِلىٰ دارِ السَّلامِ﴾۲

زہد اور دنیا سے بے رغبتی کے باعث دل میں حکمت کا نور مستحکم اور راسخ ہو جاتا ہے۔ نور حکمت کامیابی کے راستے کا چراغ اور انسانیت کے کمال تک رسائی کا ذریعہ ہے۔ زہد کے باعث حکمت دل سے نکل کر زبان پر آ جاتی ہے جیسا کہ اخلاص کے بارے میں بھی مروی ہے کہ: ''جو شخص چالیس دن تک اللہ کیلئے مخلص

۱۔ جب دل میں نور داخل ہوتا ہے تو سینہ کشادہ اور وسیع ہو جاتا ہے۔ سوال ہوا: اے اللہ کے رسولؐ! کیا اس کی کوئی علامت بھی ہے؟ فرمایا: ہاں! دارغرور (دنیا) سے دوری اور دار خلود (آخرت) کی طرف توجہ اور موت سے پہلے موت کی تیاری۔ دیکھئے، طبرسی کی مجمع البیان، ج ۴، ص ۵۶۱؛ نیز الدرالمنثور (سیوطی)، ج ۳، ص ۴۴ (معمولی اختلاف کے ساتھ)۔

۲۔ جو دنیا سے بے رغبتی (زہد) اختیار کرے اللہ اس کے دل میں حکمت کو راسخ کرتا ہے، اس کی زبان پر حکمت جاری کرتا ہے، اسے دنیا کے عیوب، اس کی بیماریوں اور اس کے علاج سے آشنائی عطا فرماتا ہے اور اسے دنیا سے صحیح و سالم نکال کر دار السلام پہنچا دیتا ہے۔ (اصول کافی، ج ۲، ص ۲۰۴، ح ۱، باب ذم الدنیا والزہد فیہا)۔

رہے حکمت کے چشمے اس کے دل سے نکل کر اس کی زبان سے جاری ہوں گے''۔ ۱

دنیوی خواہشات کو ترک کرنے اور دیگر مقاصد کے لحاظ سے اخلاص اور حقیقی زہد ایک دوسری سے ہم آہنگ ہیں۔ خود پرستی، انانیت اور خود بینی کی تاریکی اور حکمت یکجا نہیں ہو سکتے، کیونکہ یہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ جب تک دنیا اور اس کی رنگینیاں دل کے اندر موجود ہوں دل عیوب دنیا کا مشاہدہ نہیں کر سکتا، کیونکہ محبت کا پردہ سب سے دبیز پردہ ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: ﴿حُبُّ الشَّيءِ يُعْمِي وَيُصِمُّ﴾ ۲

جب تک دنیا کی محبت اور اس سے رغبت دل میں جاگزیں رہے دنیا کے سارے عیوب خوبصورت نظر آئیں گے اور اس کی قباحتیں حسین لگیں گی۔ اللہ ہمیں اس کے عیوب، اس کی بیماریوں اور اس کے علاج سے اس دن آگاہ فرمائے گا جب ہم دنیا کی محبت سے دل کو خالی اور اس کے سیم وزر سے اعراض کریں۔ پس جب یہ دبیز پردہ ہٹ جائے تو دنیا کے وہ عیوب جو ہماری نظروں میں خوبی، نیکی، اچھائی اور خوبصورتی کی شکل میں جلوہ گر ہوتے تھے اپنی اصلی صورت میں ظاہر ہوں گے۔ پس جب انسان اپنے مسائل اور ان کے حل کو پہچان لے گا تو اس کیلئے حق کا راستہ روشن اور اصلاح کا طریقہ سہل ہو جائے گا۔

چونکہ دنیا کی محبت تمام خرابیوں اور غلطیوں کا سرچشمہ ہے اس لئے زہد کے ذریعے ہی دنیا میں نفس کی سلامتی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اگر انسان حقیقی زہد سے ہمکنار ہو جائے تو وہ ہر لحاظ سے سالم اور بے عیب طریقے سے اس دنیا سے رخصت ہوگا۔ چونکہ تمام عیوب غیر اللہ سے روابط کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اس لئے اگر غیر اللہ سے روابط منقطع ہو جائیں تو مکمّل سلامتی حاصل ہو جائے گی۔

حفص بن غیاث حضرت ابو عبداللہ علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں:

﴿سَمِعْتُهُ يَقُولُ: جُعِلَ الخَيرُ كُلُّهُ فِي بَيْتٍ وَجُعِلَ مِفْتاحُهُ الزُّهْدَ فِي الدُّنْيا.
ثُمَّ قالَ: قالَ رَسُولُ اللهِ ؐ: لايَجِدُ الرَّجُلُ حَلاوَةَ الايْمانِ حَتّىٰ لايُبالِي مَنْ أكَلَ الدُّنْيا.
ثُمَّ قالَ أبُوعَبْدِاللهِ ؑ: حَرامٌ عَلىٰ قُلُوبِكُمْ أنْ تَعْرِفَ حَلاوَةَ الايْمانِ حَتّىٰ تَزْهَدَ

۱۔ اس متواتر حدیث نبوی کا متن یوں ہے: ﴿ما أخْلَصَ عَبْدٌ لِلّٰهِ - عزّوجل - أرْبَعِينَ صَباحاً إلّا جَرَتْ يَنابِيعُ الحِكْمَةِ مِنْ قَلْبِهِ عَلىٰ لِسانِهِ﴾۔ بحارالانوار، ج ۶۷، ص ۲۴۲، ۲۴۳، ح ۱۰۔

۲۔ کسی چیز کی محبت، اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے۔ (بحارالانوار، ج ۷۴، ص ۱۷۵، کتاب الروضۃ، باب ما جمع من مفردات کلماتہ، ح ۲۔ بحارالانوار میں حدیث یوں ہے: ﴿حُبُّكَ لِلشَّيءِ يُعْمِي وَيُصِمُّ﴾)۔

فِي الدُّنيـا﴾۱

اس حدیث سے معلوم ہوتا کہ بھلائی وسعادت اور کامیابی دنیا سے لگاؤ ختم کئے بغیر حاصل نہیں ہوسکتیں۔ دنیا سے رغبت اور لگاؤ ناکامی وبدبختی اور مجوبیت کی اصلی جڑ ہے، نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ زہد اچھائیوں کی چابی ہے اور جیسا کہ قبل ازیں ذکر ہوچکا ''زہد'' بذات خود انسان کا مقصود ومطلوب نہیں جس طرح چابی بذات خود مقصود نہیں ہوتی، بلکہ اصلی مقصد دروازہ کھولنا ہوتا ہے۔ پس زہد کی ضرورت اس وجہ سے پیش آتی ہے تاکہ اس کے ذریعے سعادت وکامیابی اور معرفت کا دروازہ کھل جائے۔

اس کے بعد حضرت امام صادقؑ نے خود ہی بطور اختصار زہد کے پہلے درجے اور بھلائی کے پہلے درجے کو بیان فرمایا اور رسول اکرمؐ سے نقل فرمایا کہ ایمان کی مٹھاس کوئی نہیں چکھ سکتا مگر زہد کے ذریعے اور ماکولات دنیا وغیرہ سے بے رغبتی کے طفیل۔ انسان جب تک حیوانی خواہشات شکم پرستی اور جنسی خواہشات کے گرداب سے نہ نکلے روحانی مقام اور انسانیت کی منزل تک رسائی حاصل نہیں کرسکتا۔

چونکہ ہم اس وقت حیوانات اور چوپایوں کے درجے میں ہیں اس لئے ہم ایمان کی حقیقت بلکہ اسلام کی حقیقت سے بھی آگاہ نہیں۔ ہم اسلام وایمان کے صرف نام سے واقف ہیں۔ ہم ایمان کی حلاوت اور مٹھاس کو محسوس نہیں کرتے۔ جب تک دل کا ذائقہ ٹھیک نہ ہو وہ مٹھاس کو نہیں چکھ سکتا۔ جب تک وہ حیوانیت کے درجے سے خارج نہیں ہوتا دل ہی نہیں کہلایا جاسکتا پھر اس کا ذائقہ کہاں سے آئے گا؟

اصول کافی میں امام صادقؑ سے منقول ہے کہ کتاب علیؑ میں مرقوم ہے: ﴿اِنَّما مَثَلُ الدُّنيا كَمَثَلِ الحَيَّةِ؛ ما أَلْيَنَ مَسَّها وَفِي جَوفِها السَّمُّ النّاقِعُ! يَحذَرُها الرَّجُلُ العاقِلُ، وَيَهْوِي اِلَيها الصَّبِيُّ الجاهِلُ﴾ ۲

۱۔ حفص کہتا ہے کہ میں نے حضرت امام صادقؑ سے سنا کہ آپؑ نے فرمایا: تمام خوبیاں ایک گھر میں بند ہیں اور اس کی چابی دنیا سے بے رغبتی (زہد) ہے۔ پھر فرمایا: رسول خداؐ نے فرمایا ہے: انسان ایمان کی مٹھاس کو اس وقت چکھ سکتا ہے جب اسے اس بات کی پروانہ ہو کہ کون دنیا کو کھا جاتا ہے۔ پھر حضرت امام صادقؑ نے فرمایا: تمہارے دلوں پر ایمان کی مٹھاس کا ادراک حرام ہے جب تک وہ دنیا میں زہد اختیار نہ کرے۔ (وسائل، ج۱۶، ص۱۲، باب ۶۲، ابواب جہاد نفس، ح۵)۔

۲۔ بہ تحقیق دنیا کی مثال سانپ جیسی ہے جسے مس کیا جائے تو نہایت ملائم ہے جبکہ اس کے اندر مہلک زہر ہے۔ عقلمند انسان اس سے پرہیز کرتا ہے اور نادان بچہ اس کی طرف راغب ہوتا ہے۔ (اصول کافی، ج۲، ص۱۰۴، باب ذم الدنیا، ح۲۲)۔

امیر المؤمنین علیہ السلام روحانی مقامات کے محرم راز اور انسانیت کے راستوں کے ہادی ہیں، نیز اشیاء کا ظاہر و باطن آپؑ کے سامنے ظاہر و آشکار ہیں۔ آپؑ دنیا کو ہر کسی سے زیادہ پہچانتے ہیں۔ آپؑ کو معلوم ہے کہ دنیا کا ظاہر پر فریب اور لذت بخش ہے لیکن ہر لذت انسان کو کئی کامیابیوں سے محروم کرتی ہے اور کئی ہلاکت خیز خطرات میں دھکیل دیتی ہے جسے غافل اور جاہل انسان نہیں جانتا اور نہ وہ اس پر یقین کرتا ہے۔ بچے کی نظر ظاہری خوبصورتی پر ہوتی ہے اس لئے وہ خوبصورت سانپ کو دیکھ کر پورے اشتیاق کے ساتھ اس کی طرف چل پڑتا ہے۔ اسے جس قدر خبردار کیا جائے وہ یقین نہیں کرتا۔ بقول سعدیؒ:

بی چارہ بر ہلاک تن خویشتن عجول [1]

اتنے سارے پیران طریقت، سالکان راہ ہدایت، انسانیت کے رہنما، آسمانی کتب، انبیاء کے صحیفے، اولیائے کرام کی روایات، اہل معرفت اور ارباب قلوب کی نصیحتیں ہم جاہلوں اور غافلون کے دلوں پر نہ کوئی اثر نہ کرسکیں اور نہ کر رہی ہیں!

دنیا کی ظاہری خوبصورتی اور رنگینیوں نے ہمیں اس زہر ہلاہل سے غافل بنا دیا ہے جو اس کے اندر پوشیدہ ہے۔ ہمارے اوپر اس کی باطنی کیفیت تب ظاہر ہوگی جب پانی سر سے گزر جائے اور اس کے نقصانات سے اجتناب ممکن نہ رہے، کیونکہ دنیا کی ظاہری صورت انسان کے باطن میں نقش اور اس کی پاکیزہ فطرت اس سے آلودہ ہو چکی ہوتی ہے، جس طرح سونا دیگر اشیاء کے ساتھ مخلوط ہو جائے۔ اب اگر سونے کو نہ پگھلایا جائے تو خالص سونے کو دوبارہ حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ انسانی فطرت خالص سونے اور چاندی کے معادن کی طرح ہے: ﴿النّاسُ مَعادِنُ کَمَعادِنِ الذَّهَبِ وَ الفِضَّةِ﴾ [2]

فطرت سلیم کے اندر حق تعالیٰ (جو کمال مطلق ہے) کی محبت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ جب یہ محبت غیر اللہ کی محبت کے ساتھ مخلوط ہو جائے تو یہ خالص نہیں رہتی۔ سب سے بدتر اختلاط یہ ہے کہ محبت دنیا کی محبت سے مخلوط ہو جائے۔ جب یہ آلودگی اور اختلاط وجود میں آئے تو دل کا آئینہ جو فطری طور پر صاف و شفاف تھا گرد

۱۔ کلیات سعدیؒ، ص ۶۲۷، طیبات:

گنجشک بین کہ صحبت شاہینش آرزوست — بی چارہ در ہلاک تن خویشتن عجول

۲۔ لوگ سونے اور چاندی کی کانوں جیسی ایک کان ہیں۔ (مسند احمد بن حنبل، ج ۲، ص ۵۲۹)۔

آلوداور تاریک ہو جائے گا اور اس میں کوئی حقیقت کما حقہ جلوہ گر نہیں ہو سکے گی یا سرے سے کسی حقیقت کا عکس اس میں نظر نہیں آئے گا یا اگر نظر بھی آئے تو ٹیڑھا اور غلط نظر آئے گا: ﴿فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ﴾۱

وہ منحرف اور ٹیڑھے دل جو نفسانی خواہشات، نیز دنیا اور نفس کی محبت میں گرفتار ہوں وہ قرآن کریم اور اس کی آیات اور اللہ کی تکوینی نشانیوں کی تأویل اپنی نفسانی خواہشات کے مطابق کرتے ہیں۔ یہ وہی تفسیر بالرائے ہے جس میں شیطان اور نفس امارہ شریک ہوتے ہیں۔ یہ تفسیر باطل اور حرام ہے۔

قرآن کی تأویل سے مراد ہے: ظاہر کو باطن کی طرف اور صورت کو معنی کی طرف پلٹانا۔ یہ تأویل صرف انہی لوگوں کیلئے ممکن ہے جو خود منحرف اور ٹیڑھے نہ ہوں اور ان کے دلوں میں نور حق جل جلالہ کے علاوہ کوئی چیز نہ ہو، نیز جو مشیت مطلقہ اور فنائے مطلق (جو مقام تأویل ہے) تک رسائی حاصل کر چکے ہوں۔ لیکن یہ مقام کسی کو حاصل نہیں ہے سوائے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ ؑ کے معصوم جانشینوں ؑ کے جو علم ومعرفت میں راسخ مقام رکھتے ہیں۔۲

وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ۳

یہ موضوع تفصیل طلب اور تشریح کا سزاوار ہے لیکن فی الحال ہم اس سے معذور ہیں۔

والحمدللہ اولا وآخرا

۱۔ جن کے دل باطل کی طرف مائل ہیں وہ فتنہ جوئی اور تأویل کی غرض سے متشابہات کے پیچھے چلتے ہیں۔ آل عمران ۷۔

۲۔ ایک روایت کے مطابق امام صادق ؑ فرماتے ہیں: ﴿نَحْنُ الرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ وَنَحْنُ نَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ﴾ یعنی، ہم ہی علم میں راسخ مقام رکھنے والے ہیں اور ہم ہی قرآن کی تأویل جانتے ہیں۔

اصول کافی، ج ۱، ص ۱۶۶، کتاب الحجۃ، باب ۲۲، ح ۱؛ نیز، باب ۲۲، ح ۲، ۳ میں بھی تقریباً یہی مضمون ملاحظہ ہو۔

۳۔ اس کی (حقیقی) تأویل تو صرف خدا اور علم میں راسخ مقام رکھنے والے ہی جانتے ہیں۔ سورۂ آل عمران ۷۔

''رِفق'' اور اس کی ضد ''خُرق''

یہ مقصد چار فصلوں پر مشتمل ہے:

پہلی فصل
رفق اور خرق کا مفہوم

رفق، عنف (سختی کی ضد ہے۔ رفق سے مراد ہے: نرمی، ملائمت اور مدارات۔ اس کا ماضی رَفَقَ ہے۔ رَفَقَ بِه، رَفَقَ لَه اور رَفَقَ عَلَيه سے مراد ہے: فلاں نے فلاں کے ساتھ نرمی اور لطف کا سلوک کیا۔ رَفَقَهُ سے مراد ہے: اس کی مدد کی، اسے فائدہ پہنچایا۔ رَفُقَ سے مراد ہے: وہ رفیق بن گیا۔ اس کا مصدر رَفَـاقَةً ہے۔[1]

دوست کو ملائمت اور نرمی کی مناسبت سے رفیق کہتے ہیں۔ رفق سے مراد، نرم دلی ہے۔[2]

مجمع البحرین میں مذکور ہے کہ رِفْــق، خُــرُق کی ضد ہے۔ رفق سے مراد ہے کہ انسان عمل کو درست انجام دے۔ حدیث میں مذکور ہے: ﴿اِذا كانَ الرِّفُقُ خُرُقاً كانَ الخُرُقُ رِفُقاً﴾[3] اس کی یہ تشریح کی گئی ہے: جب نرمی و رفق کسی کام میں فائدہ نہ دے تو ''خرق'' یعنی جلدی سے کام لو۔ اور جب خرق مفید واقع نہ ہو تو ''رفق'' سے کام لو۔ مقصد یہ ہے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک کا برمحل استعمال ہو اور بے جا استعمال نہ ہو، کیونکہ اگر ''رفق'' کا مظاہرہ وہاں ہو جہاں نہیں ہونا چاہئے تو یہ ''خرق'' کا باعث ہوگا اسی طرح اگر ''خرق'' کا استعمال وہاں ہو جہاں نہیں ہونا چاہئے تو یہ ''رفق'' کا موجب ہوگا۔ اسی حدیث کی قریب المعنی یہ

۱۔ المنجد في اللغه، ص۲۷۲۔ ۲۔ لسان العرب، ج۵، ص۲۷۳۔

۳۔ دیکھئے، نہج البلاغہ، ص۴۰۲، مکتوب ۳۱۔

حدیث بھی ہے: ﴿رُبَّمَا كَانَ الدَّوآءُ دَآءً وَالدّآءُ دَوَاءً﴾۱ یعنی کبھی علاج بیماری کا موجب بنتا ہے اور کبھی بیماری علاج کا موجب بنتی ہے۲ (انتہی کلامہ)۔

حدیث کا مفہوم اگر چہ بہت واضح ہے لیکن بہت تعجب ہے کہ اس کی اس قدر پیچیدہ اور غیر ضروری تشریح کی گئی ہے، کیونکہ حدیث کا درست مفہوم یہ ہے کہ اگر گاہے رفق ونرمی اور مدارات سختی وزحمت اور خرق کا باعث بن جائے تو نرمی ورفق کو چھوڑ کر خرق سے کام لینا ہی عین رفق ہے، مثلاً اگر کسی کے معیوب اور بیمار ہاتھ کو کاٹنا ضروری ہو لیکن آرام اور نرمی سے اسے کاٹنا مشکل اور خرق وسختی کا موجب ہو تو اسے سختی، جلدی اور تندی کے ساتھ کاٹنا چاہئے، کیونکہ یہ تندی وسختی عین نرمی ورفق ہے۔

خَرُق (جس کا ماضی خَرِقَ اور مضارع یَخْرَقُ ہے) رفق ونرمی کی ضد ہے۔ علاوہ ازیں خُرق، عقل کی کمزوری، حماقت، جہل، سختی، ڈانٹ، اور جلد بازی کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔۳

حدیث میں مذکور ہے: ﴿الخُرْقُ شُؤمٌ وَالرِّفْقُ يُمْنٌ﴾۴ "خَرْقِ لباس" سے مراد ہے: لباس کو پھاڑنا اور پارہ پارہ کرنا۔۵ خَــــرَقَ خوفزدہ اور دہشت زدہ ہونے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے جبکہ أَخْرَقَ أَدْهَشَ یعنی کسی اور کو خوفزدہ کرنے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔۶ بظاہر مختلف لغوی الفاظ عموماً ایک دوسرے سے مأخوذ ہوتے ہیں اور ان سب کا مادہ ومأخذ ایک ہی ہوتا ہے جیسا کہ الفاظ کے موارد استعمال میں غور کرنے سے واضح ہوتا ہے۔

۱۔ نہج البلاغہ، ص ۴۰۲، مکتوب ۳۱۔

۲۔ دیکھئے، فخر الدین طریحی کی مجمع البحرین، ج ۵، ص ۱۷۱۔

۳۔ ایضاً، ج ۵، ص ۱۵۳؛ نیز، لسان العرب، ج ۴، ص ۴۷۔

۴۔ رسول کریمؐ نے فرمایا: تندی نحس ہے جبکہ نرمی مبارک ہے۔ (اصول کافی، ج ۲، ص ۹۷، کتاب الایمان والکفر، باب الرفق، ح ۴)۔

۵۔ دیکھئے، فیروز آبادی کی القاموس المحیط، ج ۳، ص ۲۳۳؛ نیز، لسان العرب، ج ۲، ص ۲۷۔

۶۔ صحاح اللغہ، ج ۴، ص ۱۴۶۸؛ نیز، لسان العرب، ج ۴، ص ۴۷۔

دوسری فصل

انسانی امور میں "رفق" کا کردار

جان لو کہ مختلف کاموں کی انجام دہی میں رفق و نرمی مکمّل طور پر شریک ہے خواہ ان کاموں کا تعلّق لوگوں کے ساتھ میل جول اور دنیوی امور کی انجام دہی سے ہو خواہ دینی امور، لوگوں کی ہدایت و رہنمائی امر بالمعروف، نہی از منکر، روحانی ریاضت اور سیر و سلوک سے۔

مذکورہ حدیث شریف میں یہ جو فرمایا گیا ہے کہ "رفق مبارک ہے اور خرق نحس" شاید یہ انہی امور میں سے بعض کی طرف اشارہ ہو۔ مثال کے طور پر دنیوی امور کی انجام دہی کے دوران انسان جس طرح نرمی و مدارات کے ذریعے دوسروں کے دل موہ لے سکتا اور انہیں رام کرسکتا ہے، سخت گیری اور تندی کے ذریعے وہ ایسا نہیں کرسکتا۔ اگر بالفرض سخت گیری اور طاقت کے استعمال کے ذریعے کوئی کسی کی اطاعت کرے تو چونکہ وہ دل سے ایسا نہیں کرتا اس لئے وہ انسان خیانت سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اس کے برعکس نرمی و رفق اور دوستانہ سلوک دل کو رام کرتا ہے۔ اگر دل رام ہو تو انسان کی تمام باطنی و ظاہری قوتیں بھی رام ہو جاتی ہیں۔ دلوں کو فتح کرنا ملکوں کو فتح کرنے سے زیادہ اہم ہے۔ لکن، اخلاص اور سچے دل سے جو خدمات انجام دی جاتی ہیں وہ دلوں کو فتح کرنے کا موجب ہوتی ہیں۔ جب دل فتح ہوں تو اس کے ذریعے ملکوں کو بھی فتح کیا جاسکتا ہے۔ اسلام کی فتوحات کا راز دلوں کو فتح کرنے میں پوشیدہ ہے۔ وگرنہ اس بے سر و سامانی اور کم افراد کے ساتھ اس قدر فتوحات ممکن نہ تھیں۔

خلاصہ یہ کہ رفق و مدارات حصول مقاصد میں پیشرفت کیلئے ہر چیز سے زیادہ مؤثر ہے، نیز جس طرح دنیوی امور میں ایسا ہے اسی طرح دینی اہداف و مقاصد مثلاً لوگوں کی ہدایت میں بھی رفق و مدارات کو بڑی اہمیت حاصل ہے جس کے بغیر یہ عظیم مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔

جب اللہ تعالیٰ نے جناب موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) کو فرعون کے پاس جا کر اسے اسلام کی دعوت دینے اور ہدایت کرنے کا حکم دیا تو انہیں یہ بھی حکم دیا: ﴿اِذْهَبَا اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی ☆ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰی﴾[1] یعنی فرعون کے سخت دل کو بھی نرمی اور مدارات کے ذریعے بہتر طریقے

۱۔ سورۂ طٰہ ۴۳، ۴۴۔

سے رام کیا جاسکتا ہے اگر چہ اس کا تکبّر اس حد تک جا پہنچا تھا کہ وہ دعوائے خدائی کر بیٹھا۔ اسی لئے فرمایا: ''دونوں فرعون کے پاس جاؤ کہ وہ سرکش ہوگیا ہے۔ پس دونوں اس سے نرم لہجے میں بات کرنا۔ شاید وہ نصیحت قبول کرے یا (آخرت سے) ڈرے''۔

یہ ایک حکم عام ہے راہ حق کی طرف دعوت دینے والوں کیلئے، کیونکہ ''رفق'' دلوں کو فتح کرنے کی چابی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کی تعریف کرتے ہوئے فرماتا ہے: ﴿اِنَّکَ لَعَلیٰ خُلُقٍ عَظِیم﴾ ۱ جی ہاں! اس قدر عظیم مقصد تک رسائی کیلئے عظیم اخلاق کی ضرورت تھی تا کہ ہر قسم کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کی قوت موجود ہو اور کوئی چیز آپ ؐ کو لوگوں کی ہدایت کے راستے سے نہ ہٹا سکے۔

راہ حق پر گامزن افراد کیلئے سب سے مشکل کام اور سب سے تکلیف دہ مسئلہ جاہلوں کے ساتھ رہنا اور نادانوں کو دعوت حق دینا ہے۔ بنابریں ان ہستیوں کیلئے ضروری ہے کہ وہ عظیم ترین اخلاق حسنہ سے لیس ہوں۔ انہیں رفق و مدارات اور حسن معاشرت کے اس مقام پر فائز ہونا چاہیئے کہ وہ جاہلوں اور نادانوں کی جاہلانہ حرکتوں کے مقابلے میں ثابت قدم رہیں۔ زود پشیمانی، زود رنجی، کینہ اور اعصابی کمزوریاں اس کام سے مکمّل منافات رکھتی ہیں۔ سخت گیری، تندی اور جلد بازی اللہ کی طرف دعوت دینے والوں کی ذمہ داریوں کے منافی ہیں۔ احادیث میں اس نکتے کی طرف بہت سے اشارے ہوئے ہیں۔ ۲

امر بالمعروف اور نہی از منکر کی راہ میں بھی ایک اہم ترین عنصر یہی ''رفق و مدارات اور نرمی'' کا عنصر ہے۔ ۳ اگر کوئی انسان کسی گناہگار یا کسی واجب کے ترک کرنے والے کو سختی و تندی کے ساتھ روکنا چاہے تو ممکن ہے کہ وہ شخص چھوٹے گناہ سے بڑے گناہوں کی جانب یا ارتداد و کفر کی جانب بڑھ جائے۔ انسان امر و نہی کو تلخ محسوس کرتا ہے۔ امر و نہی انسان کے غصے اور عصابنیت کو حرکت میں لاتے ہیں۔ امر بالمعروف اور نہی از منکر کرنے والے کو چاہیئے کہ اس تلخی و ناگواری کو شیریں زبانی، رفق و مدارات اور حسن خلق کے ذریعے ختم کرے تا کہ اس کی بات میں اثر ہو اور اس کی تبلیغ گناہگار کے سخت دل کو نرم اور رام کرے۔

۱۔ بے شک آپ اخلاق کے عظیم مرتبے پر فائز ہیں۔ سورۂ قلم ۴۔

۲۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۹۵، باب المدارات؛ نیز، ص ۹۶ باب الرفق؛ نیز، وسائل الشیعہ، ج ۱۶، ص ۱۵۹، باب ۱۴، ابواب الامر والنہی۔

۳۔ دیکھئے، مستدرک الوسائل (محدث نوری ؒ)، ج ۱۲، ص ۱۸۶، باب ۲، ابواب الامر والنہی، ح ۱؛ نیز، ص ۱۸۷، ح ۴۔

شیخ صدوقؒ کی کتاب ''الخصال'' میں مذکور ہے کہ جب حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جدا ہونے کا ارادہ فرمایا تو ان کا آخری کلام یہ تھا: ''کسی شخص کے گناہ پر اس کی سرزنش نہ کرو۔ اللہ کے نزدیک تین چیزیں سب سے زیادہ محبوب ہیں: خوشی کے وقت میانہ روی، طاقت کے وقت درگزر اور اللہ کے بندوں کے ساتھ نرمی۔ جو شخص بھی دنیا میں کسی کے ساتھ نرمی کرتا ہے قیامت کے دن اللہ اس کے ساتھ نرمی فرماتا ہے اور حکمت کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کا خوف ہے''۔[1]

روحانی ریاضتوں اور سیر و سلوک کیلئے بھی نفس کے ساتھ نرمی و رفق نہایت ضروری ہے، کیونکہ اپنے نفس پر سخت گیری (خاص کر ابتدائی مراحل میں اور خصوصاً جوانوں کیلئے) اس بات کا سبب بن سکتا ہے کہ نفس ریاضت و سلوک سے متنفر ہو جائے اور حق سے دوری اختیار کرے۔

بہت سے موقعوں پر دیکھنے میں آیا ہے کہ نوجوان حضرات کچھ عرصہ مستحبات پر سختی اور باقاعدگی سے کاربند رہنے کے بعد اس سے مکمل طور پر متنفر اور منحرف ہو جاتے ہیں اور دین سے لاپروائی برتنے لگتے ہیں۔ احادیث شریفہ میں مذکورہ امور میں سے بہت سے امور کی طرف اشارہ موجود ہے۔[2] جن میں سے بعض کی طرف، ہم آیندہ صفحات میں انشاء اللہ اشارہ کریں گے۔

تیسری فصل

''رفق'' عقل کا لشکری اور فطرت مخمورہ کا لازمہ ہے
جبکہ ''خرق'' جہل و ابلیس کا لشکری اور فطرت محجوبہ کا لازمہ ہے

یہ نکتہ اس وقت واضح ہوگا جب یہ معلوم ہو جائے کہ رفق و مدارات، نرمی، مصاحبت اور رفاقت، رحمت رحمانیہ کے جلوے اور آثار ہیں۔ جس دل کے اندر رحمت خداوندی جلوہ گر ہو جائے اور جو دل اللہ کے بندوں

۱۔ امام سجادؑ کی اس حدیث کا متن کچھ یوں ہے:

﴿كَانَ آخِرُ مَا أَوْصَىٰ بِهِ الْخِضْرُ مُوسَىٰ بْنَ عِمْرَانَ - عليهما السلام - أَنْ قَالَ لَهُ: لَا تُعَيِّرَنَّ أَحَداً بِذَنْبٍ، وَإِنَّ أَحَبَّ الْأُمُورِ إِلَى اللهِ عَزَّوَجَلَّ ثَلَاثَةٌ: الْقَصْدُ فِي الْجِدَةِ، وَالْعَفْوُ فِي الْمَقْدِرَةِ، وَالرِّفْقُ بِعِبَادِ اللهِ، وَمَا رَفَقَ أَحَدٌ بِأَحَدٍ فِي الدُّنْيَا إِلَّا رَفَقَ اللهُ عَزَّوَجَلَّ بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَرَأْسُ الْحِكْمَةِ مَخَافَةُ اللهِ تَبَارَكَ وَتَعَالَىٰ﴾۔

کتاب الخصال، ج۱، ص۱۱۱، ح۸۳۔

۲۔ اصول کافی، ج۲، ص۷۰، باب الاقتصاد فی العبادۃ۔

کی طرف رحم وکرم کی نظر سے دیکھے وہ دل گزشتہ فصل میں مذکورہ تمام حالات اور مراحل میں دوسرے انسانوں کے ساتھ اجتماعی زندگی میں نرمی ومدارات کا مظاہرہ کرے گا، بلکہ وہ انسانوں سے پرے حیوانوں (جواس کے اختیار اور استعمال میں ہوں) کے ساتھ نیز نوکروں اور غلاموں کے ساتھ خصوصاً رشتہ داروں اور ہمسایوں کے ساتھ۔ خلاصہ یہ کہ تمام لوگوں کے ساتھ نرمی، رحم، عطوفت اور شفقت کا سلوک کرے گا۔

اسی طرح لوگوں کی تعلیم وتربیت، رہنمائی امر بمعروف اور نہی از منکر کا فریضہ انجام دینے کی وجہ بھی رحم وشفقت کا جذبہ ہوگا۔ اس بات میں شک کی گنجائش نہیں کہ جو چیز رحمت خداوندی کے نور کے پرتو سے وجود میں آئے وہ نرمی اور رفق ومدارات کے ساتھ انجام پائے گی۔ اس میں سختی، تندی اور اس قسم کی چیزوں کا شائبہ بھی نہ ہوگا۔

اس تمہید سے یہ بات واضح ہوگئی کہ نرمی کا تعلّق فطرت سلیم یعنی فطرت مخمورہ سے ہے اور نرمی (رفق) فطرت خداوندی کا لازمہ ہے، کیونکہ تمام بنی نوع انسان کے قلوب فطری طور پر رحم وعطوفت سے مخمور اور معمور ہوتے ہیں۔ یہ پوری کائنات رحمٰن کے رحم کی تصویر ہے۔ اسی لئے اہل معرفت فرماتے ہیں: ﴿ظَهَرَ الوُجُودُ بِبِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ﴾[۱] خدائے رحمٰن ورحیم کی رحمت عالم وجود کی چابی ہے۔ اسی طرح اس کا رحم وکرم نزول کتاب کی بھی اصلی وجہ ہے۔

جس دل میں بندگان خدا کی عداوت موجود ہو اور جو لوگوں کے ساتھ سختی اور تندی سے پیش آتا ہو وہ فطرت خداوندی سے دور ہے۔ وہ دنیا اور اس کی رنگینیوں میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اور حبّ نفس، خود پسندی اور خود بینی کی غلاظتوں سے آلودہ ہونے کی بنا پر اس کی فطرت تاریک اور محجوب ہو جاتی ہے۔

علاوہ ازیں اللہ کی محبت جس کا تعلّق فطریات اصلیہ سے ہے (جیسا کہ قبل ازیں معلوم ہو چکا) جس کا لازمہ اس کی نشانیوں اور اس کی مخلوقات سے محبت ہے۔ محبت کا لازمہ رفق ومدارات اور نرمی وشفقت ہے۔ بنابریں رفق فطرت مخمورہ کا لازمہ ہے جبکہ خرق جو رفق کی ضد ہے محجوبیت کا لازمہ ہے۔

۱۔ دیکھئے، ابن عربی کی الفتوحات المکیہ، ج۱، ص۱۰۲ (چار جلدی)۔

چوتھی فصل

موضوع بحث کے بارے میں بعض احادیث کا اجمالی بیان

محمد بن یعقوب کلینیؒ اپنی سند کے ساتھ امام باقرؑ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؑ نے فرمایا: ﴿اِنَّ اللہَ رَفِیقٌ یُحِبُّ الرِّفْقَ وَیُعْطِي عَلَی الرِّفْقِ مَا لاٰ یُعْطِي عَلَی العُنفِ﴾۱ تقریباً اسی مضمون کی کئی احادیث منقول ہیں۔۲

اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات کے ساتھ تمام امور میں نرمی اور رفق کا سلوک کرتا ہے یہاں تک کہ شریعتوں کے احکام بھی عین رفق ونرمی پر مبنی ہیں، کیونکہ شریعت، کامیابی اور کمال تک رسائی کے راستے کی رہنمائی سے عبارت ہے۔ اسی طرح سرکشوں کی تأدیب اور حدود وتعزیرات کی قانون سازی بندوں کے ساتھ مکمّل نرمی وشفقت کی دلیل ہیں، کیونکہ اگر ایسا نہ کیا جائے تو یہ ''خرق'' اور خرابی کا موجب ہوگا یہاں تک کہ ان کا ارتکاب کرنے والے کیلئے بھی: ﴿وَاِذا کانَ الرِّفقُ خُرقاً کانَ الخُرقُ رِفقاً﴾ (جب نرمی سختی کی موجب بنے تو سختی نرمی کی موجب بنے گی) جیسا کہ حدیث میں مذکور ہے۔۳ بلکہ اسباب ونتائج سے آگاہی رکھنے والوں کے نزدیک اخروی عذاب بھی رفق ورحمت ہے۔۴ امام باقرؑ کی حدیث میں یہ جو فرمایا گیا کہ ''اللہ تعالیٰ رفق کی وجہ سے وہ کچھ عطا فرماتا ہے جو عنف (سختی) پر عطا نہیں فرماتا'' یہ اس بات کی دلیل ہے جس کا ذکر دوسری فصل میں تفصیل سے ہوا ہے۔

کافی شریف کی ایک اور حدیث کے مطابق راوی کہتا ہے: میں نے حضرت امام صادقؑ سے سنا: ''جو شخص اپنے کاموں میں رفق ومدارات سے کام لے وہ لوگوں سے جو چاہے گا پائے گا''۔۵

رسول اکرمؐ سے منقول ہے کہ: ''بے شک نرمی اور رفق میں زیادتی اور برکت ہے جو شخص رفق سے

۱۔ اللہ نرمی کرنے والا ہے اور نرمی وشفقت کو پسند کرتا ہے۔ وہ نرمی پر وہ جزا دیتا ہے جو سختی پر نہیں دیتا۔
اصول کافی، ج۲، ص۹۷، کتاب الایمان والکفر، باب الرفق، ح۵۔

۲۔ اصول کافی، ج۲، ص۹۸، باب الرفق، ح۱۲،۱۴۔

۳۔ نہج البلاغہ، ص۴۰۲، نامہ (۳۱)۔

۴۔ الفتوحات المکیہ، ج۲، ص۱۶۱، باب۸۷؛ نیز الاسفار الاربعہ، ج۹، ص۳۴۵، ۳۴۶، فصل ۲۷، باب ۱۱۔

۵۔ حدیث یہ ہے: ﴿مَنْ کانَ رَفِیقاً فِي أَمْرِهِ نالَ ما یُرِیدُ مِنَ النّاس﴾ اصول کافی، ج۲، ص۹۸، باب الرفق، ح۱۶۔

محروم ہوا ہو بھلائی سے محروم ہوا''۔ ۱

محمد بن یعقوب کلینیؒ حضرت امام باقر علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ آپؑ نے فرمایا: ﴿مَنْ قُسِّمَ لَهُ الرِّفْقُ قُسِّمَ لَهُ الايْمٰانُ﴾ ۲

ابو جعفر (الباقر، علیہما السلام) سے مروی ہے کہ فرمایا: ﴿إنَّ لِكُلِّ شَيءٍ قُفلاً وَقُفلُ الايْمٰانِ الرِّفْقُ﴾ ۳

یہ دونوں احادیث قبل ازیں ذکر شدہ بات پر دلالت کرتی ہیں کہ نفس کی ریاضت اور اللہ کی قربت حاصل کرنے کیلئے نفس کے ساتھ نرمی، رفق اور مدارات کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ جب آپ نفس کے ساتھ نرمی برتیں گے تو نفس عبادت واطاعت سے مأنوس ہو جائے گا۔ اس انس ومحبت کے باعث اسے ذات حق کے ساتھ لگاؤ ہو جائے گا۔ اور اسی لگاؤ کے باعث معارف الٰہیہ کا دروازہ کھل جاتا ہے جو ایمان کا سرچشمہ ہے۔ اس کے برعکس سخت گیری اور تندی گا ہے اس بات کا باعث بنتے ہیں کہ روح کا ذائقہ عبادت وعبودیت کو تلخ اور ناگوار محسوس کرے جس کے باعث دل حق سے روگرداں ہو جاتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ ایمان کا تالا ''رفق'' ہے۔ جسے رفق حاصل ہو جائے اسے ایمان بھی حاصل ہو جاتا ہے۔

محمد بن یعقوب کلینیؒ نے امام صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ﴿مٰا اصْطَحَبَ اثْنٰانِ إلاّ كٰانَ أعْظَمُهُمٰا أجْراً وَأحَبُّهُمٰا إلَى اللهِ، أرْفَقَهُمٰا بِصٰاحِبِهِ﴾ ۴

عمر بن حنظلہؒ حضرت امام صادق علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ آپؑ نے فرمایا: ﴿يٰا عُمَرُ! لاٰ تَحْمِلُوا عَلىٰ شِيعَتِنٰا وَارْفُقُوا بِهِمْ؛ فَإنَّ النّٰاسَ لاٰ يَحْتَمِلُونَ مٰا تَحْمِلُونَ﴾ ۵ امامؑ عمر بن

۱۔ حدیث کا متن یوں ہے:

﴿إنَّ في الرِّفْقِ، الزِّيٰادَةَ وَالبَرَكَةَ، وَمَنْ يُحْرَمِ الرِّفْقَ يُحْرَمِ الخَيْرَ﴾۔ اصول کافی، ج۲، ص۹۷، ح۷۔

۲۔ جس کی قسمت میں رفق لکھی جائے اس کی قسمت میں ایمان لکھا جاتا ہے۔ اصول کافی، ج۲، ص۹۶، ح۲۔

۳۔ ہر چیز کا ایک تالا ہوتا ہے اور ایمان کا تالا رفق ونرمی ہے۔ اصول کافی، ج۲، ص۹۶، ح۱۔

۴۔ جہاں کہیں بھی دو افراد میں دوستی ہو جائے ان دونوں میں سے زیادہ اجر وثواب کا حامل اور اللہ کے نزدیک زیادہ محبوب وہ ہے جو اپنے ساتھی کے ساتھ زیادہ نرم خو ہو۔ (اصول کافی، ج۲، ص۹۸، باب الرفق، ح۱۵)۔

۵۔ روضہ کافی، (ج۸) ص۲۷۵، ح۵۲۲۔

حنظلہ سے فرماتے ہیں: ''اے عمر! ہمارے شیعوں پر زبردستی مت کرو بلکہ ان سے نرمی کرو، کیونکہ جو چیز تم برداشت کرتے ہو اسے دوسرے لوگ برداشت نہیں کر سکتے''۔

یہ حدیث خواص کیلئے ایک حکم عام ہے، کیونکہ لوگ علوم و معارف اور ظاہری و باطنی اعمال کے تحمل کرنے میں مختلف ہوتے ہیں۔ بنابریں ہر کسی کے سامنے ہر علم کو فاش نہیں کرنا چاہئے خصوصاً معارف الٰہیہ سے مربوط علوم کو۔ معارف الٰہیہ اور توحید کے اسرار کو ان کے اہل افراد کے پاس محفوظ و مخزون ہونا چاہئے۔ بہت سی گمراہیاں، گمراہ کن افکار اور تکفیر کے فتوے یہیں سے پیدا ہوئے ہیں۔

کیا وجہ ہے کہ عام لوگ یہاں تک کہ ظاہری علوم کے حامل علماء علوم الٰہیہ سے پرہیز کرتے ہیں اور معارف و حقائق کے نزدیک جانے کی کوشش نہیں کرتے؟ اس کی وجہ یہی ہے کہ ظاہر بین دانشوروں اور ارباب ذوق نے یا رسمی علم عرفان کے حامل بعض افراد نے پردہ دری کی اور پاکیزہ علوم کو قبیح اور نازیبا الفاظ کے روپ میں پیش کیا۔ یوں وہ قرآن و حدیث کے انداز بیان سے دور ہو گئے حالانکہ وہی چیزیں کتاب اللہ اور ائمہ ہدیٰؑ کی احادیث میں بطور اتم و اکمل موجود ہیں لیکن ان لوگوں نے ان کو غلط انداز میں پیش کیا۔ اس وجہ سے ظاہر بین لوگوں کے مزاج ان سے متنفر ہو گئے۔ ان لوگوں میں یہ صلاحیت نہیں کہ وہ مغز کو چھلکے سے، باطن کو ظاہر سے اور معنی کو لفظ سے الگ کریں۔ اس لئے وہ سرے سے ان پاکیزہ علوم و مفاہیم کے ہی مخالف ہو جاتے ہیں۔

شاید اسی نکتے کی طرف اشارہ ہوں وہ احادیث جن میں ایمان کو سات حصوں[۱]، یا دس درجوں[۲]، یا انچاس[۳] اجزاء میں تقسیم کیا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے کہ جو ایک حصے کا حامل ہو اس پر دو حصوں کو نہیں ٹھونسنا چاہئے اور جو شخص دو حصوں کا حامل ہو اس پر تین حصوں کو لادنے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے۔[۴] دیگر درجات کے حامل افراد کا بھی یہی حال ہے۔ چونکہ ایمان کے درجات میں اختلاف کی وجہ سے اعمال کے درجات

۱۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۳۵، کتاب الایمان والکفر، باب درجات الایمان، ح ۱۔

۲۔ ایضاً، ص ۳۷، ح ۲۔

۳۔ ایضاً، ص ۳۷، ح ۱۔

۴۔ امام صادقؑ کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں: ﴿لَا تَحْمِلُوا عَلَىٰ صَاحِبِ السَّهْمِ سَهْمَيْنِ، وَلَا عَلَىٰ صَاحِبِ السَّهْمَيْنِ ثَلَاثَةً...﴾۔ سابقہ ماخذ، ص ۳۵، ح ۱۔

میں، نیز اعمال کو انجام دینے کی طاقت اور اعمال کی طرف شوق ورغبت کے درجات میں کمی بیشی ہوتی ہے، اس لئے احادیث شریفہ میں سمجھانے کیلئے ایک مثال مذکور ہے جو یہ ہے:

''کسی مسلمان نے ایک عیسائی کو اسلام کی دعوت دی اور اس نے اسلام قبول کیا۔ صبح کے وقت مسلمان نے آ کر اس نومسلم کو جگایا۔ پھر وہ اسے اپنے ہمراہ مسجد لے گیا اور اس سے نماز پڑھوائی۔ پھر اس نومسلم نے جانے کی جتنی بار کوشش کی اس نے نہیں چھوڑا اور ہر بار کسی اور عمل کا مشورہ دیتا رہا یہاں تک کہ ظہر ہوگئی۔ دونوں نے ظہر کی نماز پڑھی۔ جب نومسلم نے جانا چاہا تو مسلمان نے کہا: ظہر اور عصر میں فاصلہ ہی کتنا ہے؟ یوں عصر کا وقت ہو گیا اور دونوں نے نماز پڑھی۔ پھر اس نے جانا چاہا لیکن اس نے نہیں چھوڑا یہاں تک کہ مغرب اور عشاء کی نمازیں بھی دونوں نے پڑھ لیں، پھر دونوں چلے گئے۔ دوسرے دن مرد مسلمان دوبارہ اس نومسلم کے گھر گیا۔ اس نے اسے بیدار کیا تاکہ پہلے دن والے اعمال کا اعادہ کرے۔ اس عیسائی (نومسلم) نے کہا: جاؤ اس دین کیلئے ایسا آدمی تلاش کرو جو میری بہ نسبت زیادہ بے کار اور فارغ وقت رکھتا ہو۔ میں ایک فقیر اور بال بچوں والا آدمی ہوں''۔[۱]

ان احادیث شریفہ میں امامؑ حکم دیتے ہیں: ''اللہ کے بندوں کے ساتھ نرمی اور مدارات سے کام لو اور ان پر ایسی چیز مسلّط نہ کرو جس کی وہ طاقت نہ رکھتے ہوں ورنہ وہ متنفر ہو جائیں گے اور جان چھڑانے کی کوشش کریں گے''۔

خلاصہ یہ کہ نرمی اور رفق و مدارات کی تعریف میں بہت سی احادیث مروی ہیں۔ اسی طرح سخت گیری اور تندی کی مذمت میں بھی احادیث منقول ہیں۔ ان میں سے ایک روایت وہ ہے جو کلینیؒ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت امام باقر العلومؑ سے روایت کی ہے: ''جسے خُرق (تندی وسخت گیری) نصیب ہو جائے اس کا ایمان محجوب ہوگا''۔[۲] حضرت امام باقرؑ ہی سے مروی ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا: ''اگر خُرق ایسی چیز ہوتی جو نظر آئے تو اللہ کی خلق کردہ چیزوں میں اس سے زیادہ قبیح کوئی چیز نہ ہوتی''۔[۳]

۱۔ اصول کافی، ج۲، ص۳۶۔۳۷، ح۲۔

۲۔ ﴿مَنْ قُسِمَ لَهُ الخُرْقُ، حُجِبَ عَنْهُ الايْمانُ﴾ سابقہ ماٴخذ، ص۲۴۲، باب الخرق، ح۱۔

۳۔ ﴿لَو كانَ الخُرْقُ خَلْقاً يُرىٰ ما كانَ شَيْءٌ مِمّا خَلَقَ اللهُ أَقْبَحَ مِنْه﴾ سابقہ ماٴخذ، ص۲۴۲، ح۲۔

''رَہبت'' اور اس کی ضد ''جرأت''

یہ مقصد تین فصلوں پر مشتمل ہے:

پہلی فصل

رہبت کا مفہوم

''رہبت'' سے مراد ہے: خوف۔ اس کا ماضی ''رَہِبَ'' اور ''رَہَبَ'' ہے، (یعنی اس نے خوف کھایا) اس کے مصدر کی یہ صورتیں ہیں: ''رَہبان'' (بروزن خشیان) مبالغہ کا صیغہ ہے، (یعنی بہت زیادہ خوفزدہ)۔ (اسم فاعل ''راہِب'' ہے) اور راہب کی جمع ''رُہبان'' ہے جبکہ رُہبان کی جمع ''رہابین'' ہے۔

رَہبانیت سے مراد ہے: عبادت کی خاطر لوگوں سے کنارہ گیری اور دنیوی لذتوں سے اجتناب۔[۱] اسلام میں رہبانیت کی ممانعت ہے۔ حدیث ہے: ﴿لاٰ رَهْبَــانِيَّةَ فِــي الاِسْــلام﴾[۲] نیز حدیث ہے: اِنِّي أُرِيدُ أَنْ أَتَرَهَّبَ. فقالَ: ﴿لاٰ تَفْعَلْ! وَاِنَّ تَرَهُّبَ أُمَّتِي القُعُود فِي المَساٰجِد﴾[۳]

اگر رہبانیت سے یہ مراد ہو کہ معاشرے سے گوشہ نشینی اختیار کی جائے، عورتوں سے اجتناب کیا جائے اور خداداد انسانی صلاحیتوں کو عمل اور جدوجہد سے دور رکھا جائے تو یہ جہل کی انتہا ہے۔ یہ بہت سی خرابیوں کا

۱۔ دیکھئے، ابن اثیر کی النہایۃ، ج ۲، ص ۲۸۱، ۲۸۰؛ نیز مجمع البیان، ج ۲، ص ۷۵، ۷۶؛ نیز زبیدی کی تاج العروس، ج۱، ص ۲۸۰، ۲۸۱۔

۲۔ اسلام میں رہبانیت کی کوئی گنجائش نہیں۔ (موسوعۃ اطراف الحدیث النبویؐ، ج ۷، ص ۲۴۹۔

۳۔ کسی نے کہا: میں رہبانیت اختیار کرنا چاہتا ہوں۔ معصوم نے فرمایا: ایسا نہ کرو، کیونکہ میری امت کی رہبانیت مسجدوں میں بیٹھنا ہے۔ (بحار الانوار، ج ۸۰، ص ۳۸۱، حدیث ۴۹ کے ذیل میں)۔

موجب ہے۔ یاد رہے کہ خوف الٰہی کا لازمہ رہبانیت نہیں ہے اگر چہ خوف خداوند عقل کے لشکروں سے ہے اور نفس کی اصلاح کرتا ہے، نیز خوف الٰہی خدا کے مقابلے میں جرأت کی ضد ہے اور جرأت جہل کے لشکروں میں شامل ہے۔ اہل معرفت کے ہاں معروف ''خلوت'' کا مطلب بھی گوشہ نشینی اور لوگوں سے کنارہ گیری نہیں ہے،[۱] بلکہ خلوت سے مراد ان کے ہاں غیر اللہ سے دل نہ لگانا ہے۔[۲] اگر چہ یہ مقصد گاہے یا عموماً اس وقت حاصل ہوتا ہے جب آدمی ایک مرتبہ وقتی طور پر گوشہ نشینی اختیار کرے، ظاہر ہے یہ عمل رہبانیت نہیں، بلکہ عقل اور شرع کے نزدیک ایک پسندیدہ امر ہے۔

خلاصہ یہ کہ جس ''رہبت'' کا تعلّق عقل کے لشکروں سے ہے اس سے مراد خوف خداوندی ہے۔ یہ خوف، رحمت خداوندی سے امید ورجاء رکھنے کے منافی نہیں۔ اس لئے ''رجاء'' کا تعلّق بھی عقل کے لشکروں سے ہے اور اس کی ضد ''قنوطیت'' اور مایوسی ہے جس کا ذکر قبل ازیں ہو چکا ہے۔[۳]

دوسری فصل

خوف کے مختلف درجات

یاد رہے کہ عبادت کرنے والوں کے درجات، سالکین راہ حق کے مراتب اور معرفت کے درجات میں اختلاف کے تناسب سے خوف کے درجات بھی مختلف ہوتے ہیں:

پہلا درجہ: خوف کا پہلا درجہ عذاب اور عقاب خداوندی کا خوف ہے۔ یہ عام لوگوں کا خوف ہے۔ اکثر خائفین کا خوف اسی درجے سے تعلّق رکھتا ہے۔

ثواب خداوندی اور اخروی نعمتوں سے محرومی کا خوف بھی اسی درجے کے خوف سے ملحق ہوتا ہے۔ اس درجے کے خوف کو خوف خداوندی محسوب نہیں کرنا چاہئے۔ اس خوف کے تحت بجالائی جانے والی عبادات کو خالص عبادت نہیں کہا جاسکتا۔ احادیث شریفہ میں اس قسم کی عبادت کو غلاموں کی عبادت کہا گیا ہے۔[۴]

۱۔ المحجۃ البیضاء، ج۴، کتاب العزلہ، ص۲۶۔

۲۔ عبدالرزاق کاشانی کی اصطلاحات الصوفیہ، ص۱۶۱ ملاحظہ ہو۔

۳۔ دیکھئے، ص۱۲۳۔

۴۔ وسائل الشیعہ، ج۱، ۵۹و۶۰، باب ۹، ابواب مقدمات العبادات، ح۱ تا ۳۔

انسان جب تک نفس کا اسیر، خواہشات نفسانی کا غلام خود بین اور خود سر ہو، یعنی نفسانی رنگ جو شیطانی رنگ ہے اس پر غالب ہو اس وقت تک نہ اس کی عبادت و عبودیت اللہ کی عبادت ہو سکتی ہے نہ اس کا خوف، خوف خداوندی اور نہ اس کی رجاء، اللہ سے مربوط، بلکہ اس کے تمام ظاہری و باطنی اور جسمانی و قلبی اعمال نفسانی ہیں اور نفسانی و شیطانی رنگ میں رنگے ہوئے۔

دوسرا درجہ: یہ خواص کا خوف ہے جو عقاب کا خوف ہے۔ یہ لوگ اس بات سے خائف ہیں کہ کہیں وہ مولا کی بارگاہ سے دور، نیز اس کے عقاب اور بے التفاتی کا شکار نہ ہو جائیں۔ یہ لوگ مادی لذتوں اور حیوانی خواہشات سے تو دور ہوتے ہیں لیکن ان کی روح معنوی لذتوں سے آشنا ہوتی ہے۔ وہ قربت کا مقام حاصل کرنے کے در پے ہوتے ہیں۔ جب تک یہ خواہش باقی ہے نفسانی رنگ اور شیطانی ڈھنگ باقی رہیں گے۔ اگر عبادت و عبودیت کا یہ مقصد ہو تو اللہ کا وہ دین جسے ہر قسم کی ملاوٹ سے خالص ہونا چاہئے موجود نہ رہے گا:

﴿أَلَا لِلّٰهِ الدِّينُ الْخَالِصُ﴾ ۱

تیسرا درجہ: یہ خاص الخاص لوگوں کا خوف ہے۔ یہ مجوبیت کا خوف ہے۔ ان لوگوں کی نظر نعمتوں پر نہیں ہوتی۔ شوق ملاقات اور اس کی لذت انہیں دونوں جہانوں سے غافل رکھتی ہے، لیکن جب تک نفس اور ذات کا احساس موجود ہو اور شوق شہود و حضور اپنے لئے مطلوب ہو تب تک اس شوق حضور کو اللہ کی محبت اور حقیقی اخلاص محسوب نہیں کیا جا سکتا اگرچہ یہ مقام خود ایک عظیم اور بلند مقام ہے جس تک رسائی سوائے خالص صاحبان معرفت کے اور کسی کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ ہم جیسے مجوب لوگوں کا دست طمع اس مقام بلکہ اس سے کمتر مقام تک بھی نہیں پہنچ سکتا۔

چوتھا درجہ: یہ ان اولیاء اللہ کا خوف ہے جو انانیت اور اپنی ذات کی طرف توجہ سے منزہ اور اللہ کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں ﴿وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً﴾ ۲ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے صاف و شفاف دلوں پر ظاہر ہونے والے جمالی و جلالی جلوؤں کے باعث خوف و رہبت کے حامل ہوتے ہیں۔

واضح رہے کہ ہر جمالی کے اندر ایک جلال اور عظمت پوشیدہ ہوتی ہے۔ بنابریں جلوۂ جمال سے خوف

۱۔ آگاہ رہو کہ خالص دین اللہ کا ہی ہے۔ سورۂ زمر ۳۔

۲۔ اور کس کا رنگ اللہ کے رنگ سے بہتر ہے۔ سورۂ بقرہ ۱۳۸۔

ورہبت حاصل ہوتی ہے۔ عظمت کا یہ خوف مجموعی طور پر تین مراتب سے زائد ہے، کیونکہ خوف یا تو افعالی جلوے سے حاصل ہوتا ہے یا جلوۂ اسماء سے یا جلوۂ ذات سے۔ ان سب کی تفصیل بیان کرنے کی ان اوراق میں گنجائش نہیں۔ حقیقی خوف اور رہبت اسی آخری (چوتھے) درجے سے عبارت ہے جس میں نفسانیت، انانیت اور اپنی ذات کی طرف توجہ کارفرما نہیں ہے۔

خوف ورہبت کے ان درجات میں سے ہر ایک کے مقابلے میں ''جرأت'' اور گستاخی کا ایک درجہ ہوتا ہے۔ چنانچہ خوف کے پہلے درجے (خوف عذاب) کے مقابلے میں گناہوں کی جرأت کا درجہ آتا ہے۔ خوف کے دوسرے درجے کے مقابلے میں غلطیوں اور لغزشوں کی جرأت اور تیسرے درجے کے مقابلے میں اپنی مرضی سے حجابوں کے وارد ہونے کی جرأت اور چوتھے درجے کے مقابلے میں ذات وصفات وافعال کے لحاظ سے خود بینی اور نفسانی وشیطانی رنگ اختیار کرنے کی جرأت کے درجے آتے ہیں۔

تیسری فصل

خوف کا تعلّق فطرت مخمورہ سے اور عقل ورحمن کے لشکروں سے ہے جبکہ جرأت کا تعلّق فطرت محجوبہ اور جہل وشیطان کے لشکروں سے ہے

یاد رہے کہ تمام بنی نوع انسان کی فطرت میں شامل امور میں سے ایک یہ کہ انسان اپنے سے زیادہ عظیم کی تعظیم کرتا اور اس سے خوف کھاتا ہے۔ اگر تمام انسانوں کے دلوں کا جائزہ لیا جائے تو سب کے اندر یہی جذبہ نظر آئے گا۔ ممکن ہے کہ عظیم کی شناخت اور اس کے حقیقی مصادیق میں اختلاف ہو لیکن اصل جذبے کی موجودگی ہر جگہ یکساں ہے۔ صاحبان اقتدار، سلاطین اور ڈکٹیٹروں کا جو خوف دلوں کو لاحق ہوتا ہے (اگرچہ ان سے کسی ضرر کا خطرہ نہ بھی ہو) وہ عظیم کی تعظیم کرنے کا فطری جذبہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عادل بادشاہ کے سامنے وہ لوگ بھی جو کسی قسم کی نافرمانی اور سرکشی کے مرتکب نہ ہوں، حقیر، مرعوب اور خائف ہوتے ہیں۔ جو لوگ کسی عالم کی عظمت وبزرگی سے واقف ہوں وہ فطری طور پر اس سے خائف ومرعوب ہوتے ہیں اگرچہ وہ مکمّل طور پر ان سے بے خوف ہوں۔

اگر ہم جیسے محجوب لوگوں کے دلوں میں اللہ جلّ جلالہٗ کا خوف موجود نہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اس کی عظمت کو درک نہیں کرتے، چونکہ ہماری فطرت مادیت وطبیعت کے دبیز پردوں کی وجہ سے محجوب ہو جاتی

ہے اس لئے ہم اپنے پروردگار کے آگے جری اور گستاخ ہو جاتے ہیں۔ جو لوگ مادیت وطبیعت کے حجاب سے آزاد ہوئے تھے اور ان کے دلوں پر عظمت پروردگار جلوہ گر ہوئی تھی وہ سود وزیاں کی پروا کئے بغیر اور جہنم وجنت کی طرف ملتفت ہوئے بغیر عظمت ربانی اور سطوت کبریائی کے نور سے لرزتے تھے۔[۱] اور خوف خدا سے غش کھاتے تھے۔[۲] نماز کے وقت ان کا رنگ زرد پڑ جاتا تھا[۳] کیونکہ نماز اللہ کی بارگاہ میں اولیاء علیہم السلام کی حاضری کا وقت اور ان کی معراج تقرب ہے۔ ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے اور ان پر بے خودی کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔[۴]

معراج کی رات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ہر جلوۂ عظمت کے مشاہدے پر غش کھاتے تھے پھر انس ورحمت کے جلوؤں کے ذریعے دوبارہ ہوش میں لائے جاتے تھے۔[۵] وہاں مقام خوف مشاہدہ عظمت سے عبارت تھا۔ وہاں عذاب وعقاب کا نام ونشان تک نہ تھا۔ وہاں عشق ومحبت کا فطری جذبہ اپنی تمامتر حقیقت کے ساتھ کارفرما تھا۔ اسی طرح خوف ورہبت کا فطری جذبہ کسی مجوبیت کے بغیر مکمّل صورت میں آپ کے وجود کے اندر جلوہ گر تھا۔ وہاں فطرت کے تقاضوں اور حکم خداوندی میں کوئی جدائی نہیں تھی۔

یہاں سے یہ جاننا چاہئے کہ جرأت کا ہر مرتبہ فطرت کی مجوبیت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مجوبیت کے درجات میں اضافے کے حساب سے خوف خداوندی دیگر اشیاء کے خوف ورہبت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ خوف کا سبب یا تو افعالی تجلیات کے نقطہ نظر سے عظمت وجلال خداوندی کا مشاہدہ ہے آخری

۱۔ چنانچہ حضرت سید الساجدین علی بن حسین (علیہما السلام) کے بارے میں مروی ہے: ﴿كانَ أعضائُهُ تَرتَعِدُ مِنْ خَشيَةِ اللهِ﴾۔ یعنی، آپؑ کے اعضاء خوف الٰہی سے لرزتے تھے۔ (بحار الانوار، ج ۴۶؛ نیز، تاریخ امام سجادؑ، ص ۸۰)۔

۲۔ جیسا کہ امیر المؤمنینؑ دعا ومناجات کے بعد غش کی کیفیت میں مبتلا ہوتے تھے۔
دیکھئے، بحار الانوار، ج ۴۱، تاریخ الامام امیر المؤمنین علیؑ، ص ۱۲۔

۳۔ سبط اکبر حضرت امام حسنؑ وضو کرتے وقت اس کیفیت سے دوچار ہوتے تھے۔
دیکھئے، بحار الانوار، ج ۷۷، ص ۳۴۶، باب سنن الوضوء وآدابہ، ح ۳۰؛ نیز دیگر ائمہؑ کے بارے میں بھی نقل ہوا ہے۔
دیکھئے، سابقہ ماخذ، ص ۳۴۷، ح ۳۲۔

۴۔ بحار الانوار، ج ۴۶، تاریخ الامام علی بن الحسینؑ، ص ۵۵، باب ۵، ح ۴؛ نیز، ج ۴۶، ص ۸۰، ح ۷۵۔

۵۔ بحار الانوار، ج ۷۹، ح ۷، کتاب الطہارۃ، باب علل الصلاۃ ونوافلہا وسننہا، ص ۲۴۱، ح ۱۔

مراتب تک جو تجلیات صفاتی سے عبارت ہیں۔

ہم نے صفاتی تجلیات کو آخری مراتب اس لئے قرار دیا ہے کیونکہ ذاتی تجلیات خوف کے ازالے اور رہبت کے خاتمے سے عبارت ہے۔ ﴿أَلاَ إِنَّ أَوْلِيَآءَ اللهِ لاَ خَوفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُونَ﴾[1]، نیز شاید اشارہ ان اولیائے مطلق کی طرف ہو جو مکمّل فنا کی منزل تک پہنچ چکے ہوں، نیز اپنے وجود اور خوف کے تمام مراحل سے آگے گزر چکے ہوں۔

یا خوف کا سبب محجوبیت ہو۔ اس قسم کا ہر خوف نفس اور ابلیس کے تصرفات کا نتیجہ ہے۔ یہ اللہ کی بارگاہ میں جرأت اور گستاخی ہی گستاخی ہے، کیونکہ غیر اللہ کا خوف غیر اللہ کیلئے برحق نہیں ہوسکتا۔

یہی وجہ ہے کہ انبیائے عظام؏ اور اولیائے کرام؏ کو لاحق ہونے والے خوف (جو بیداری کے بعد حاصل ہوتے تھے) اور محجوبین کو لاحق ہونے والے خوف کے درمیان واضح فرق کو سمجھا جاسکتا ہے، نیز ان کے خوف ورجاء اور دوسروں کے خوف ورجاء کے درمیان فرق صاف ظاہر ہے۔

۱۔ جان لو کہ اللہ کے اولیاء کو نہ کوئی خوف لاحق ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ سورۂ یونس ۶۲۔

مقصد / ۱۸

’’تواضع‘‘ اور اس کی ضد ’’کبر‘‘

یہ مقصد سات فصلوں پر مشتمل ہے:

پہلی فصل

تواضع اور کبر کا مفہوم

یاد رہے کہ اس حدیث میں تواضع کا ذکر ’’تکبّر‘‘ کے مقابلے میں نہیں، بلکہ ’’کبر‘‘ کے مقابلے میں کیا گیا ہے اس لئے تواضع کو نفسانی صفات میں شمار کرنا چاہئے جیسا کہ ’’کبر‘‘ بھی ایک نفسانی صفت ہے جبکہ ’’تکبر‘‘ کبر کا عملی اظہار ہے اگر چہ عرف عام میں تواضع سے مراد اپنے آپ کو چھوٹا اور حقیر ظاہر کرنا ہے۔[۱] بہر حال چونکہ انسان خود بین اور خود پسند ہوتا ہے اس لئے اس کی یہ خود پسندی اور اپنی ذات سے حد سے زیادہ لگاؤ اس بات کا سبب بنتا ہے کہ وہ اپنے نقائص وعیوب سے بیگانہ اور غافل ہو، نیز اپنی برائیوں کو دیکھنے سے عاجز ہو جائے، بلکہ گاہے انسان اپنی برائیوں اور عیوب کو خوبی سمجھنے لگتا ہے اور اسے اپنی اچھائیاں کئی گنا بڑی نظر آنے لگتی ہیں۔ پھر اسی نسبت سے بسا اوقات دوسروں کی خوبیاں اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں اور ان کی برائیاں زیادہ بڑی نظر آتی ہیں۔

پس جب وہ اپنے آپ کو کامل اور دوسروں کو ناقص سمجھنے لگتا ہے اور نفس سے محبت بھی حد سے بڑھ جاتی ہے تو اس کے اندر خود بینی اور عجب کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے آپ کو دوسروں سے برتر سمجھتا ہے اور بڑائی کا احساس جنم لیتا ہے۔ اپنے آپ کو دوسروں سے برتر سمجھنے کا نام کبر ہے۔ جب یہ باطنی

۱۔ دیکھئے، جوہری کی صحاح اللغہ، ج ۳، ص ۱۳۰۰؛ نیز لسان العرب، ج ۱۵، ص ۳۲۷ اور منتہی الادب، ج ۳، ص ۱۳۲۳۔

کیفیت انسان کے اعمال اور اعضا وجوارح کے ذریعے ظاہر ہو اور وہ دوسروں پر اپنی بڑائی اور خودسری کا اظہار کرنے لگے تو یہ ''تکبر'' کہلائے گا۔

پھر اگر انسان اس گھمنڈ اور غلط فہمی سے نکل آئے اور اس کی آنکھوں سے پردہ ہٹ جائے اور وہ اپنے آپ کو اسی طرح دیکھے جیسا وہ ہے، بلکہ اپنے عیوب کو زیادہ دیکھے اور اپنے بارے میں بدظن ہو جائے تو اب وہ اپنی نظر میں معمولی اور حقیر ہو جائے گا اور اپنی ذلت واحتیاج کو دیکھ لے گا۔ جب یہ باطنی کیفیت پیدا ہو جائے تو دوسروں سے حسن ظن بھی پیدا ہوگا اور وہ دیگر مخلوقات اور اللہ کے جلال وجمال کے مظاہر کو اہمیت دے گا۔ یوں وہ رفتہ رفتہ اپنے آپ کو حقیر سمجھے گا اور اس میں تواضع کی کیفیت پیدا ہوگی وہ دوسروں کے مقابلے میں خود کو چھوٹا شمار کرے گا۔ یہ حالت قلبی اور باطنی تواضع سے عبارت ہے۔ جب اس باطنی کیفیت کا اظہار عمل اور اعضاء وجوارح کے ذریعے ہو تو یہ تواضع کہلائے گا اور ہم کہیں گے: فلاں نے تواضع کی اور وہ متواضع ہو گیا۔

دوسری فصل

تواضع اور کبر کے درجات

ہم نے کتاب اربعین (چہل حدیث) میں کبر کے درجات ومراتب کی تفصیل دی ہے جس سے تواضع کے مراتب بھی واضح ہوتے ہیں۔ خواہشمند حضرات وہاں رجوع کریں تو بہتر ہے۔[۱] لیکن یہاں بھی اس کا مختصر تذکرہ کریں گے تاکہ پورا استفادہ ہو سکے۔ یہ تقسیم وہ نہیں جس کا ذکر شرح چہل حدیث میں ہوا ہے۔ جان لو کہ تواضع کے کئی درجات ہیں اور تواضع کے ہر درجے کے مقابلے میں تکبر کا ایک درجہ واقع ہوتا ہے۔

پہلا درجہ: یہ اولیائے کمّل اور انبیائے عظامؑ کی تواضع ہے۔ یہ ہستیاں اپنے دلوں میں اللہ کی ذات، اسماء، صفات اور افعال کی تجلیات کے باعث اللہ تعالیٰ اور اس کے جمال وجلال کے مظاہر کے آگے متواضع ہوتی ہیں۔ ربوبیت کے کمال اور عبودیت کی ذلت کا مشاہدہ ان کے دلوں میں تواضع اور تذلل کا انتہائی

۱۔ دیکھئے، شرح چہل حدیث امام خمینیؒ، حدیث ۴۔

جذبہ پیدا کرتا ہے۔ان دو زاویوں سے ان کا نقطہ نظر جتنا کامل ہوگا ان کا تواضع بھی کامل تر ہوگا۔یہی وجہ ہے کہ اللہ کے آخری نبیؐ جو اعرف المخلوقات اور تمام بندوں میں سب سے زیادہ عبادت گزار تھے تمام مخلوقات میں اللہ کے حضور سب سے زیادہ متواضع تھے اس کی وجہ یہ ہے کہ کمال ربوبیت اور نقص عبودیت کے مشاہدے کے نقطہ نظر سے آنحضرتؐ کاملترین مخلوق تھے۔

تواضع کی پیکر یہ ہستیاں جس طرح اللہ کے آگے تواضع کا اظہار کرتی ہیں اسی طرح اللہ کے جلال و جمالی جلووں اور مظاہر کے آگے بھی متواضع ہوتی ہیں۔وہ اللہ کی خاطر ان مظاہر کے آگے اظہار تواضع کرتے ہیں۔یہ لوگ تواضع کے علاوہ "مقام محبت" کے بھی حامل ہیں۔وہ اللہ سے اپنی محبت کے باعث اللہ کی نشانیوں سے بھی محبت کرتے ہیں۔یہ تواضع جو محبت کے ساتھ مخلوط ہوتی ہے تواضع کا سب سے کامل مرتبہ ہے۔

دوسرا درجہ: یہ اہل معرفت کا تواضع ہے۔ان کے اندر اولیاء کا مذکورہ تواضع ہوتا ہے لیکن یہ اس کے مقابلے میں ناقص ہوتا ہے، کیونکہ معرفت اور مشاہدۂ حضوری میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

تیسرا درجہ: حکماء کا تواضع ہے۔اس تواضع کا رتبہ سابقہ دو رتبوں کے بعد آتا ہے۔اگر وہ حکمت الٰہی کے مقام تک پہنچ جائیں اور ان کے دل حکمت کے نور سے روشن ہوں تو وہ اللہ اور اس کی نشانیوں کے آگے متواضع ہوں گے۔چنانچہ حضرت لقمانؑ کی حکمت آمیز نصیحتوں میں اس نکتے کی خاص طور سے تاکید کی گئی ہے۔[1]

چوتھا درجہ: یہ عام مؤمنین کا تواضع ہے جو نور ایمان کے ذریعے اللہ کی معرفت حاصل کرتے ہیں اور اپنے نور کی روشنی میں حتی المقدور اپنی شناخت رکھتے ہیں۔نتیجتاً یہ لوگ بھی اللہ اور اس کی مخلوقات کے آگے متواضع ہوتے ہیں۔تواضع کے ان چاروں درجات میں سے ہر درجے کے مقابلے میں تکبر کا ایک درجہ واقع ہوتا ہے، کیونکہ ہر محجوبیت کے باعث نفس کے اندر کبر کا ایک احساس پیدا ہوتا ہے۔

یاد رہے کہ تواضع اور چاپلوسی میں بہت فرق ہے اسی طرح تکبر اور عزت نفس میں بھی بڑا فرق ہے۔یہ

۱۔ چنانچہ لقمان نے اپنے بیٹے سے فرمایا: ﴿وَلاَ تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلاَ تَمْشِ فِي الأَرْضِ مَرَحاً...﴾۔یعنی تکبر کی وجہ سے لوگوں سے بے توجہی مت کرلو اور زمین میں اکڑ کر نہ چلو۔ سورۂ لقمان ۱۸۔

فرق اسباب ومقاصد کے لحاظ سے بھی ہے اور آثار ونتائج کے لحاظ سے بھی۔

تواضع کا سرچشمہ اللہ اور نفس کی شناخت ہے۔ اس کا مقصد اللہ ہے یا اللہ کی عظمت۔ تواضع کا نتیجہ اور ثمر نفس کے کمال کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں تملّق اور چاپلوسی کا سرچشمہ شرک اور جہل ہے۔ اس کی منزل مقصود نفس ہے اور اس کا نتیجہ ذلت وخواری اور ننگ وعار ہے۔

ادھر تکبر کا سرچشمہ اور سبب خود بینی، خود پسندی، نفس پرستی، جہل، اللہ سے بیگانگی اور اللہ کی نشانیوں سے غفلت ہے۔ اس کا مقصد نفس اور خود نمائی ہے جبکہ اس کا نتیجہ اور ثمر سرکشی وطغیان ہے۔ اس کے مقابلے میں عزت نفس کا سرچشمہ اللہ پر توکل اور بھروسے کا جذبہ ہے۔ اس کا مقصد اللہ ہے اور اس کا نتیجہ وثمر غیر اللہ کو خیر باد کہنا ہے۔

تیسری فصل

وسیع القلبی اور کم ظرفی

جان لو کہ تواضع اور تکبر کے بہت سے اسباب ووجوہات ہیں جن میں سے ایک شرح صدر (وسیع القلبی) اور دوسرا ضیق صدر (تنگ دلی) ہے۔

جو شخص شرح صدر کا حامل ہو وہ اپنے پاس جس قدر بھی کمال وجمال، مال ودولت اور عزت وحشمت پائے اس کے باوجود وہ انہیں اہمیت نہیں دے گا۔ ان لوگوں کے وجود کی عظمت اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ وہ ہر قسم کی قلبی کیفیات پر غالب آتی ہے اور کوئی چیز ان کے وجود کے ظرف سے چھلک کر باہر نہیں گرتی۔ یہ وسیع القلبی اللہ کی معرفت سے پیدا ہوتی ہے۔ جن دلوں میں اللہ سے انس ومحبت کی صلاحیت اور لیاقت موجود ہو وہ اطمینان وسکون کی منزل تک پہنچ جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی یاد دل کو مادی منازل اور مناظر فطرت سے غافل کر دیتی ہے۔ یہ یاد تمام دنیا اور دنیا والوں کو اس کی نظروں سے گرا دیتی ہے۔ یہ دل اللہ کے علاوہ کسی سے لو نہیں لگاتا اور اس کے علاوہ کسی سے سکون حاصل نہیں کرتا۔ اس کی اہمیت اس قدر بلند ہوتی ہے کہ پوری کائنات اس کی نظروں میں نہیں سماتی۔ پس کسی بھی قسم کی قلبی کیفیت اس کا راستہ نہیں روک سکتی۔ وہ موجودات واشیاء کی وجہ سے اپنے آپ کو بڑا نہیں سمجھتا۔ اللہ اور اس کے جلالی وجمالی جلوؤں اور آثار کے علاوہ ہر چیز اس کی نظر میں معمولی نظر آتی ہے۔ یہ بات

بذاتِ خود حق کے آگے تواضع کا سبب بنتی ہے اور خلق کے آگے بھی، کیونکہ خلق کو بھی حق کی نشانی سمجھتا ہے۔ یہی بات عزتِ نفس اور خودی کا بھی باعث بنتی ہے، کیونکہ چاپلوسی اور تملّق کا جذبہ (جو مفاد پرستی اور خود پسندی کا نتیجہ ہے) اس کے اندر موجود نہیں ہوتا۔

پس خدا پرستی اور اللہ سے محبت وسعتِ قلبی کا باعث بنتی ہے اور وسیع القلبی تواضع اور عزتِ نفس کو جنم دیتی ہے۔ اس کے برعکس خود پسندی اور خود بینی ضیقِ صدر کا نتیجہ بھی ہیں اور سبب بھی۔ کم ظرفی و تنگ دلی سے تکبر پیدا ہوتا ہے، کیونکہ دل کی تنگی اور بے ظرفی کے باعث انسان اپنے اندر جو کچھ دیکھے اسے بڑا سمجھتا ہے اور اس چیز کے سامنے اپنے وجود کو حقیر سمجھتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی چونکہ وہ نفس کا غلام ہوتا ہے اس لئے نفسانی مقاصد تک رسائی کیلئے دنیا والوں کے سامنے ذلت و خواری اختیار کرتا ہے اور ان کی چاپلوسی کرتا ہے، کیونکہ وہ ان سے اپنی خواہشات کو وابستہ کرتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ کمالات کے تمام اسباب کا اصلی سبب معرفتِ خداوندی اور ترکِ نفس ہے، جبکہ تمام عیوب اور خرابیوں کا اصلی سرچشمہ حبِّ نفس اور خود پرستی ہے، نیز تمام خرابیوں کی اصلاح کا راستہ حق کی طرف توجہ دینا اور نفسانی خواہشات کا ترک کرنا ہے: ﴿مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللهِ وَمَا أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ﴾[1] بقول مولویؒ:

مادر بت ھا بتِ نفس شماست [2]

اللہ کی معرفت اللہ سے محبت کا باعث بنتی ہے۔ جب یہ محبت مکمّل ہو جاتی ہے تو یہ انسان کو اپنے آپ سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ جب وہ اپنے آپ سے بیگانہ ہوتا ہے تو وہ تمام عالم سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ پھر وہ اپنی ذات اور دوسروں سے اپنی امیدیں قطع کر لیتا ہے، نیز شیطان اور مادیت کی پلیدیوں سے پاک و منزہ ہوتا ہے۔ پھر اس کے دل کے اندر نورِ ازلی کا طلوع ہوتا ہے۔ پھر وہ نور دل کے باطن سے ظاہر کی طرف سرایت کرتا ہے۔ اس کے نتیجے میں اس کا قول و فعل منور ہو جاتا ہے، نیز اس کے اندر موجود قوتیں، صلاحیتیں اور اس کے اعضاء و جوارح بھی منور ہو جاتے ہیں۔ پس وہ تمام لوگوں کے سامنے متواضع ہونے کے باوجود

۱۔ جو اچھائی بھی تجھے نصیب ہو وہ اللہ کا دیا ہوا ہے اور جو برائی تجھے پہنچے وہ تیری اپنی کارستانی ہے۔ سورۂ نساء ۷۹۔

۲۔ پورا شعر یہ ہے:

مادر بتہا بتِ نفس شماست　　　زانکہ آن بت مار واین بت اژدہاست

مثنوی معنوی مولوی، دفتر اول، نکلسن، ص ۴۸، بیت ۷۷۲۔

کسی کی خوشامد اور چاپلوسی نہیں کرتا اور نہ کسی سے اپنی امیدوں اور اپنے مفادات کو وابستہ سمجھتا ہے اس کی نظریں مخلوقات پر مرکوز نہیں ہوتیں۔

اس کے برعکس حق کی محجوبیت، حق سے غفلت، خود بینی، خود پسندی اور نفس کی محبت انسان کو خدا سے جدا اور خواہشات کا اسیر بنا دیتی ہیں۔ جب انسان نفس کا غلام بن جائے تو پھر جہاں کوئی نفسانی لذت نظر آئے اس کا دل وہیں لپکے گا۔ اس کا دل دنیا والوں، مالداروں اور اغنیاء کے سامنے ذلت اور خضوع اختیار کرے گا۔ اس کی امیدیں ان لوگوں سے وابستہ ہو جائیں گی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے ماتحتوں اور ان لوگوں کے ساتھ جن سے اس کا کوئی مفاد وابستہ نہ ہو تکبر کا مظاہرہ کرے گا۔

چوتھی فصل

بعض نصائح کا ذکر

جان لو کہ جو بھی علم و عمل انسان کو خواہشات نفسانی اور شیطانی صفات سے دور کرے اور نفس کی سرکشی کو کم کرے وہ علم، علمِ نافع اور وہ عمل، عمل صالح ہے۔ اس کے برعکس ہر وہ علم اور عمل جو انسان کے اندر تکبر اور عجب پیدا کرے یا کم از کم انسان کو نفسانی خواہشات اور شیطانی صفات سے پاک نہ کرے وہ علم یا عمل شیطان اور نفس امارہ کے عمل و دخل کا نتیجہ ہے۔ نہ وہ علم، علم نافع اور خدائی ہے اگر چہ اصطلاح میں وہ علم المعارف ہو اور نہ وہ عمل، عمل صالح اور روح کے ساتھ ہماہنگ ہے اگر چہ اس میں دیگر شرائط موجود ہوں۔

حق و باطل کے میدان میں سیر وسلوک کا معیار نفس کا اقدام اور حق ہے۔ اس کے ثمرات و نتائج سے اس کی علامات کو پہچانا جا سکتا ہے۔

اس وقت ہماری بحث اس کے تمام ثمرات و نتائج سے نہیں، بلکہ تواضع اور تکبر کے حوالے سے ہے۔

کافی میں امیر المؤمنین علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا: ''اے طالب علم! علم بہت سی خوبیوں کا حامل ہے۔ اس کا سر تواضع ہے اور اس کی آنکھ حسد سے نجات ہے...''[۱]

۱۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

﴿يا طالِبَ العِلمِ! اِنَّ العِلمَ ذُو فَضائِلَ كَثيرَةٍ، فَرَأسُهُ التَّواضُعُ، وَعَينُهُ البَراءَةُ مِنَ الحَسَدِ﴾

اصول کافی، ج۱، ص ۳۸، کتاب فضل العلم، باب ۱۴، ح ۲۔

اب جو شخص علم و عمل کا حامل ہوا سے چاہئے کہ وہ اپنی ذات، اپنے احوال اور اپنی نفسانی صلاحیتوں میں غور و فکر کرے اور مکمّل طریقے سے اپنا بغور جائزہ لے اور دیکھے کہ علم کے جس شعبے کو اس نے اختیار کر رکھا ہے اس نے اس کے اوپر کیا اثرات چھوڑے ہیں اور اسے کن صفات سے آراستہ کیا ہے؟

پس اگر انسان اہل معارف ہو تو دیکھے کہ اللہ کی معرفت کی روشنی نے اس کے دل کو منور کیا ہے یا نہیں؟ نیز یہ دیکھے کہ وہ اس علم کے باعث حق تعالیٰ اور اس کے جمال و جلال کے آثار و مظاہر سے محبت کرنے اور ان کے آگے تواضع کرنے کا خوگر ہوا ہے یا نہیں؟ بلکہ چند اصطلاحات کو رٹنے کے بعد تمام دنیا اور سارے علماء کو حقارت کی نظر سے (جو ابلیس کی نظر ہے) دیکھنے لگا ہے اور فلسفہ واخلاق کے ماہرین کو ظاہربین قرار دیتا ہے، نیز اپنے علاوہ دوسرے علماء اور دانشمندوں کو کسی حساب میں نہیں لاتا اور لوگوں کو حیوانات کے مانند سمجھتا ہے؟!

اگر ایسا ہے تو وہ جان لے کہ یہ کھوکھلی اصطلاحات معرفت حق کی راہ میں حجاب اور رخ جاناں کیلئے حجاب ہیں۔ اس کا علم اسے نفس کی غلامی سے نجات دلانے اور مادیت کے گرداب سے نکالنے کی بجائے اسے مادیت کی قید میں بند اور شیطان کی زنجیروں میں مقید کرتا ہے۔ یہ بے چارہ عشق و محبت کی منازل کا پرچار کرتا ہے اور لوگوں کو معارف الٰہیہ سے آگاہ کرتا ہے لیکن خود نفس کے زنار اور خود پرستی و خود پسندی کے بت کو چھپائے ہوئے ہے۔ وہ خداوند عالم سے غافل ہے اور اس کے بندوں کا سرکش ہے۔

شیطان آدمؑ کے مقابلے میں تکبر کی وجہ سے قرب خداوندی سے دور ہوا۔ کیا تم اولاد آدم کے مقابلے میں اس تکبر کے ساتھ معارف کے راستے پر گامزن ہونا چاہتے ہو؟ یہ بہت بعید ہے۔ معرفت خداوندی کے نور سے دل خدائی بن جاتا ہے اور شیطان کی پلیدی سے پاک ہو جاتا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ تیرے ساتھ معاملہ ہی الٹا ہو گیا ہے اور نتیجہ برعکس؟ کیا وجہ ہے کہ علم و معرفت نے تیرے دل کو شیطان کا گھر قرار دیا ہے اور ابلیس کو اس پر مسلّط کیا ہے؟

اے بے چارے! کیا تم خیال کرتے ہو کہ تم اللہ والے اور صاحب معرفت ہو؟ یہ بھی نفس کا دھوکہ اور شیطان کا فریب ہے جس نے تجھے اپنی دنیا میں مگن، اللہ سے غافل اور مٹھی بھر نام نہاد مفاہیم والفاظ سے راضی وخوشنود بنا دیا ہے۔ تم علم کی دنیا میں تجلیات ذاتی، تجلیات اسماء اور تجلیات صفاتی کا دم بھرتے نہیں تھکتے۔ تم کائنات کو حق کا مظہر اور تمام موجودات کو حق کے جلوے قرار دیتے ہو لیکن عملی میدان میں شیطان

کے ہمنوا بن جاتے ہو اور انسانوں کے ساتھ تکبر سرکشی کا مظاہرہ کرتے ہو۔ اہل معرفت کے ہاں یہ تکبر اللہ کے ساتھ تکبر ہے۔

وہ عرفانی علوم جو انسان میں فروتنی اور تواضع کی بجائے، تکبر اور خودنمائی پیدا کریں وہ علوم شیطان کا جھوٹا ہیں۔ اگر یہ علوم انسان کے اندر اس قسم کے نتائج وثمرات کے موجب ہوں تو یہ پست ترین علم ہے، کیونکہ دیگر علوم سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ انسان کو خدائی بنا دے اور نفسانی قیود سے اس کو فوری رہائی دے اور اسے مادیت کی تاریک قید سے رہائی دلائے، نیز ان علوم کے ماہرین کا دعویٰ بھی یہ نہیں ہے۔ پس وہ سلامتی سے نزدیک تر ہیں۔ کم از کم یہ مہلک خود بینی (جو شیطان صفت ہے) ان میں پیدا نہیں ہوئی اور معرفت خداوندی کے وسیلے نے انہیں بارگاہ حق سے دور نہیں کیا۔ اگر وہ لوگوں سے تکبر کریں تو یہ مخلوقات کے ساتھ ہوگا۔ تیرا تکبر تیرے اپنے اقرار کی رو سے اللہ کے ساتھ تکبر ہے۔ پس وائے ہو تم پر اے بے چارے! جو مٹھی بھر مفاہیم واصطلاحات کے ہاتھوں اسیر ہو اور اپنی عمر عزیز کو مادیت کے کنویں کے اندر ضائع کر چکے ہو۔ تم حق پر مبنی علوم ومعارف کی وجہ سے حق سے دور ہو چکے ہو، کیونکہ تم نے معارف الٰہی کے ساتھ خیانت کی ہے۔ تم نے حق اور علوم حقانی کو شیطانی اعمال کا وسیلہ قرار دیا ہے۔ ذرا خواب غفلت سے بیدار ہو جاؤ۔ ان مفاہیم سے اپنا دل مت بہلاؤ۔ شیطان لعین کا فریب نہ کھاؤ ورنہ وہ تجھے ہلاک کر دے گا اور اسی طرح منزل انسانیت اور قرب خداوندی سے دور کر دے گا۔

یہیں سے دیگر علوم کا حال بھی جان لینا چاہئے۔ آپ فقیہ ہوں یا فلسفی، محدّث ہوں یا مفسّر، ذرا دیکھئے کہ ان علوم نے آپ کے دل پر کیا اثرات چھوڑے ہیں اور آپ کے وجود کے درخت میں ان علوم کے باعث کون سے میوے لگے ہیں۔ علی بن ابی طالب (علیہما السلام) نے فرمایا: ''علم کا راز تواضع ہے''۔ [۱]

اگر آپ کے اندر تواضع اور فروتنی پیدا ہوئی ہے تو اللہ کا شکر کریں اور اس میں اضافے کی کوشش کریں۔ نفس کی چالوں سے غافل مت رہیں، کیونکہ نفس اور شیطان کمین میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ موقع کی تلاش میں ہیں تاکہ انسان کو راہ حق سے دور کریں۔

اپنی خوبیوں پر ہرگز مغرور مت ہوں، کیونکہ غرور شیطانی صفت ہے۔ اپنے آپ سے ہمیشہ بدظن رہیں

۱۔ اصول کافی، ج۱، ص ۳۸، کتاب فضل العلم، باب ۱۴، ح ۲۔

اور برے انجام سے ڈرتے رہیں۔

اگر آپ مشاہدہ کریں کہ ان علوم کے باعث آپ کے اندر غرور، خود بینی اور خود پسندی کی صفت آ گئی ہے تو جان لیں کہ آپ ابلیس کے جال میں پھنس گئے ہیں اور کامیابی کی راہ سے ہٹ گئے ہیں۔ اس وقت غور کریں کہ مٹھی بھر اصطلاحات اور الفاظ کے علاوہ آپ کے پاس کیا رہ گیا ہے؟ یا ان الفاظ اور اصطلاحات کے ذریعے اللہ کے سخت گیر اور تند خو فرشتوں کو جواب دیا جاسکے گا؟ کیا بعض علمی اصطلاحات مثلاً ہیولاء، صورت، معانی حرفیہ اور اس طرح کے الفاظ کے ذریعے خداوند عالم کو دھوکہ دے سکتے ہیں؟ مان لیا کہ اس دنیا میں جہاں اسرار کی حقیقت ظاہر نہیں ہوتی لوگوں کے ساتھ تکبر اور دکھاوے کا اظہار، نیز ان کی تحقیر وتوہین ممکن ہے لیکن کیا قبر اور قیامت میں بھی انہی مصنوعی پیروں کے ذریعے جاسکتے ہیں؟ کیا صراط سے بھی انہیں پیروں کے ذریعے گزر سکتے ہیں؟

قرآن وحدیث کے علم کے باعث آپ کے حال کی اصلاح ہونی چاہیئے اور آپ کے اندر اللہ کے پسندیدہ بندوں والی صفات پیدا ہونی چاہئیں۔ یہ درست نہیں کہ پچاس سال تک دینی علوم میں مشغول رہنے کے بعد لوگ تمہیں شیطانی صفات سے متصف کریں۔

دوست کی قسم اگر دینی علوم اور خدائی معارف کے باوجود ہم سیدھے راستے سے آشنا نہ ہوئے اور اپنا ظاہری وباطنی تزکیہ نہ کر سکے تو اس سے بہتر یہی ہے کہ انسان اسے چھوڑ کر کوئی پست ترین پیشہ ہی اختیار کرلے، کیونکہ دنیوی پیشے اور مشغلے فوری نتائج کے حامل ہوتے ہیں اور ان کے مفاسد ونقصانات بھی بہت کم ہیں، لیکن اگر علوم دینی حصول دنیا کیلئے استعمال ہوں تو یہ دین فروشی ہے جس کا نقصان اور وبال سب سے زیادہ ہے۔

کس قدر کم ظرفی ہے کہ ہم چند بے سروپا اصطلاحات (جو شیطانی ثمرات کے حامل بھی ہیں) رٹ کر اپنے اوپر ناز کریں، خود بینی میں مبتلا ہو جائیں، اپنے آپ کو دوسرے بندگان خدا سے بہتر سمجھنے لگیں، مخلوق خدا پر برتری جتائیں، نیز اپنے آپ کو عالم اور دوسروں کو جاہل اور بے قیمت قرار دیں۔

کس قدر جاہلانہ سوچ ہے کہ انسان یہ خیال کرے کہ چند کھوکھلے مفاہیم واصطلاحات کی بدولت وہ علماء کی صف میں شامل ہو چکا ہے اور فرشتے اس کے پیروں تلے اپنے پر بچھاتے ہیں۔ پھر وہ ان خام خیالات کے باعث بندگان خدا سے احترام وتعظیم کی توقع رکھتا ہے، نیز گلیوں اور محفلوں میں بندگان خدا کیلئے

راستہ اور جگہ تنگ کر دیتا ہے۔

یہ سب بے جا غرور ہیں۔ یہ جہالت اور شیطنت ہیں۔ یہ ابلیس کا ترکہ ہیں۔ یہ ظلمت در ظلمت ہیں جبکہ علم تو نور ہے اور نور دل کو منور اور وسیع کرتا ہے، نیز ہدایت اور سیر وسلوک کی راہوں کو واضح کرتا ہے۔

کیا وجہ ہے کہ ان رائج علوم نے ہمارے اندر تاریکی، کم ظرفی، خود نمائی اور تکبّر کو جنم دیا ہے؟ کیا ہم ان کھو کھلے الفاظ کو علم قرار دے سکتے ہیں؟ کیا ہم ان کے ذریعے دنیا میں سرفراز ہو سکتے ہیں؟

اے عزیز! خواب گراں سے بیدار ہو جاؤ۔ قرآن وحدیث کے ذریعے ان امراض کا علاج کرو۔ اللہ کی مضبوط رسی اور اولیائے خدا کے دامن سے تمسک کرو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ہمارے لئے یہ دو گرانقدر نعمتیں چھوڑ گئے[1] تاکہ ہم ان دونوں کو مضبوطی سے تھام کر مادیت کے تاریک کنویں سے نکل آئیں اور ان زنجیروں سے اپنے آپ کو چھڑا لیں، نیز انبیاء واولیاء کی سیرت کو اپنا لیں۔

کیا وجہ ہے انبیاء واولیاء کے علوم ہمیں روز بروز خدا اور عقل والوں سے دور کر رہے ہیں، نیز شیطان اور جہل کے لشکر سے قریب کرنے کا باعث بن رہے ہیں؟ آخر ہم اپنی اصلاح کب کریں گے؟

پہلے تم طالب ہوئے پھر ترقی کر کے عالم بنے پھر فقہ، فلسفہ اور حدیث وغیرہ کی مسند پر بیٹھ گئے لیکن اپنی اصلاح نہ کی۔ پس کب ایک قدم اللہ کیلئے اٹھاؤ گے؟ جو کچھ تم کر چکے ہو وہ سب دنیوی کام تھے۔ ان کاموں نے تجھے دنیا سے نزدیک اور خدا وآخرت سے دور کر دیا ہے۔ ان امور نے تیرے دل میں دنیا اور مادیت کی محبت کو مضبوط کر دیا ہے ﴿أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ﴾[2] یہ تو تھا علماء کا حال۔

اب ان میں سے جو باعمل، عابد وزاہد لوگ ہیں انہیں بھی اپنے نفوس کا خوب جائزہ لینا چاہئے۔ انہیں

۱۔ یہ اشارہ ہے رسول اکرمؐ کی معروف اور متواتر حدیث ''حدیث ثقلین'' کی طرف جو درج ذیل کتب میں مذکور ومنقول ہے: اصول کافی، ج ۱، ص ۲۳۳، کتاب الحجۃ، باب ۶۵، ح ۳؛ نیز یہی کتاب، ج ۲، ص ۳۰۵، کتاب الایمان والکفر، باب ادنیٰ ما یکون بہ العبد مؤمناً او کافراً، ح ۱؛ نیز صحیح مسلم، ج ۵، ص ۲۶، باب فضائل علیؑ، ح ۳۶؛ نیز مسند احمد بن حنبل، ج ۳، ۱۷۔

۲۔ کیا وہ وقت نہیں آیا کہ مؤمنین کے دل یاد خدا اور اللہ کی جانب سے نازل شدہ برحق پیغام کے سامنے نرم ہو جائیں؟ سورۂ حدید ۱۶۔

دیکھنا چاہیے کہ پچاس سالہ عبادت اور زہد نے ان کے دلوں پر کیا اثرات مرتب کئے ہیں۔ کیا پچاس سال کی نمازوں نے انہیں اولیاء اللہ اور انبیاء کی سیرت اور ان کے اخلاق سے نزدیک کیا ہے؟ کیا ان نمازوں کی بدولت ان کے اندر خوف خدا، خشیت پروردگار اور تواضع وغیرہ کی صفات پیدا ہوئی ہیں؟ کہیں پچاس سال کی نمازوں نے ان کے اندر خود بینی اور عجب پیدا نہ کردیا ہو جس کے باعث وہ بندگان خدا کے سامنے خودنمائی اور تکبّر کا مظاہرہ کریں اور ان سے احترام و تعظیم کی توقع رکھیں۔ اگر ایسا ہے تو وہ جان لیں کہ ان پر شیطان کا تسلّط ہے اور ان کے اعمال نفسانی اور شیطانی اعمال ہیں۔ اس قسم کے اعمال انہیں کامیابی وفلاح اور اللہ کی شناخت سے دور کردیں گے جبکہ شیطان اور شیطانی لشکروں سے نزدیک اور آشنا کردیں گے۔

نماز معراج المؤمن اور تقرب خداوندی کا باعث ہے اس نماز کا اثر یہ ہونا چاہیے کہ دنیا کی محبت کو دل سے زائل کردے، مادیت کی زنجیروں کو پارہ پارہ کرے اور دل کو خدائی اور ربانی بنادے۔ پچاس سال تک زمین پر پیشانی رگڑنے اور سجدہ کرنے کا نتیجہ یہ نکلنا چاہیے کہ انسان کے اندر تواضع اور انکساری کی صفت اجاگر ہو بشرطیکہ شیطان کا عمل دخل نہ ہو۔ وہ نماز جس میں شیطان کا عمل دخل ہو وہ شیطان کا معجون ہے خدا کا نہیں۔ اس معجون کے ذریعے نہ صرف یہ کہ امراض قلب کا علاج نہیں ہوسکتا بلکہ الٹا اندرونی بیماریوں میں اضافہ ہوتا ہے اور یہ دل کو شیطان اور جہل کے لشکروں کے قریب کردیتا ہے۔

افسوس ہے اس نمازی پر جو پچاس سالوں تک بزعم خویش اللہ کی خوشنودی کیلئے نماز پڑھتا رہا اور نماز کی ابتداء میں ﴿وَجَّهۡتُ وَجۡهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالۡأَرۡضَ﴾[1] اور نماز کے اندر ﴿إِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَإِيَّاكَ نَسۡتَعِينُ﴾[2] کا اللہ کے حضور ورد کرتا رہا لیکن ان تمام دعوؤں کے باوجود ہر روز اللہ سے کوسوں دور اور قربت کے معراج سے محروم ہوتا رہا یہاں تک کہ ابلیس کے مرتبے اور شیطانی لشکر کے قریب ہوا۔ اللہ تعالیٰ سے قریب ہونے اور اس پرفریب دنیا سے دور ہونے کی بجائے اس عبادت کے باعث وہ شیطانی غرور، عجب اور تکبّر (جو شیطان کا ورثہ ہے) میں مبتلا ہوگیا۔

کیا وہ وقت نہیں آیا کہ ہم اصلاح نفس کی کوشش کریں اور امراض نفس کے علاج کیلئے کوئی اقدام

۱۔ میں خلوص کے ساتھ اس ہستی کی طرف رخ کرتا ہوں جس نے آسمانوں اور زمین کو خلق فرمایا۔ سورۂ انعام ۷۹۔

۲۔ ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ سے مدد مانگتے ہیں۔ سورۂ حمد ۵۔

کریں اپنی جوانی تو ہم نے مفت میں گنوادی۔ شیطان اور نفس کا دھوکہ کھاتے ہوئے ہم نے اس جوانی سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جس کے ذریعے ہم دونوں جہانوں کی فلاح وسعادت حاصل کر سکتے تھے۔ عجب یہ کہ اب بھی اصلاح کی کوئی فکر نہیں کرتے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ زندگی ہی ختم ہو جائے اور ہم مکمّل خسارے اور ناکامی وبدبختی کا سودا کر کے اس دنیا سے چلے جائیں۔

نفس کی اصلاح کیلئے جوانی کے ایام سب سے زیادہ مناسب ہیں، کیونکہ ان ایام میں انسان کی قوت ارادی زیادہ مضبوط ہوتی ہے، نفس کی تاریکیاں اور خرابیاں بھی کم ہوتی ہیں اور ہم فطرت کے بھی زیادہ نزدیک ہوتے ہیں، نیز گناہوں کا بوجھ بھی اتنا زیادہ نہیں ہوتا جس کی تلافی مشکل ہو۔ جوانوں کو چاہئے کہ جوانی کے ایام کی قدر کریں اور اس عظیم نعمت کو غفلت کی نذر نہ کریں، کیونکہ بڑھاپے میں اصلاح نفس بہت مشکل ہے۔ بڑھاپے میں انسان بہت سی مشکلات سے دوچار ہوتا ہے۔ یہ مشکلات جوانی میں نہیں ہوتیں، لیکن شیطان اور نفس امارہ انسان کو دھوکہ دیتے ہیں اور اسے جوانی میں اصلاح کرنے نہیں دیتے یہاں تک کہ انسان کمزوری، سستی اور بڑھاپے کا شکار ہو جائے، نیز اس کے گناہ اور نفس کی تاریکیاں زیادہ ہو جائیں۔ اس کے بعد بھی وہ اصلاح کا کام مستقبل پر ٹالتا رہے یہاں تک کہ سرمایہ حیات ہی ختم ہو جائے اور ناکامی وخسارے کا بوجھ اٹھا کر انتقام گاہ کی طرف چلا جائے ﴿وَالعَصرِ ☆ اِنَّ الاِنسَانَ لَفِي خُسرٍ﴾[۱]

اس سے بڑا خسارہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ انسان ابدی سرخروی کا سرمایہ ابدی خسارے میں خرچ کرے اور ابدی حیات ونجات کے اسباب کو اپنی ہلاکت وفنا کیلئے استعمال کرے؟ یوں وہ زندگی کے آخری لمحے تک غفلت اور سستی میں پڑا رہے گا۔

پانچویں فصل

تواضع کے بارے میں بعض احادیث کابیان

کافی میں امام صادقؑ سے مروی ہے: اللہ نے جن باتوں کی داوٗدؑ پر وحی کی ان میں سے ایک یہ تھی: ''اے داوٗد! جس طرح اللہ کے نزدیک لوگ تواضع کرنے والے ہیں، اسی طرح اللہ سے سب سے زیادہ

۱۔ زمانے کی قسم انسان خسارے میں ہے۔ سورۂ عصر ۱،۲۔

دور وہ لوگ ہیں جو تکبّر کرتے ہیں"۔[1]

بیدار لوگوں اور صاحبانِ معرفت کیلئے یہی حدیث کافی ہے۔ اللہ سے قربت تمام کامیابیوں کا سرچشمہ ہے جس طرح اللہ سے دوری تمام ناکامیوں کی جڑ ہے۔ جو لوگ خدا پرست اور رضائے خداوندی کے طالب ہیں اور اپنے آپ کو اللہ کے لشکروں سے مربوط اور عالم سمجھتے ہیں، نیز جو لوگ قرب خداوندی کے حصول کیلئے اعمال و عبادات بجالاتے ہیں انہیں اپنے اوپر مکمّل نظر رکھنی چاہیئے، کیونکہ انسان منزل مقصود تک صرف اس صورت میں رسائی حاصل کرسکتا ہے جب وہ تواضع سے آراستہ ہو اور تکبّر سے اجتناب کرے۔

یہاں ہم ان لوگوں کا ذکر ہی نہیں کریں گے جو حصول دنیا کیلئے علم حاصل کرتے اور عمل کرتے ہیں۔ ان کا احتساب خدائے جبار خود فرمائے گا۔ یہاں ہم ان لوگوں کی بات کریں گے جو خدا جوئی کے مدعی ہیں۔ انہیں چاہیئے کہ اس حدیث کی روشنی میں اپنا احتساب خود کریں۔ یہ حدیث ان لوگوں کیلئے کسوٹی کا کام دے گا جو اس کی روشنی میں نفس امارہ کو پرکھیں۔ اگر پھر بھی ان کے دل میں تکبّر ہو اور ان کے عمل سے بھی اظہار تکبّر ہوتا ہو تو انہیں جاننا چاہیئے کہ ان کے اعمال اور علوم بھی خدا کی خاطر نہیں ہیں، بلکہ نفس امارہ کیلئے ہیں، کیونکہ اگر اللہ کی خاطر ہوتے تو انہیں تواضع اختیار کرنا چاہیئے تھی جو انسان کو ہر چیز سے زیادہ خدا کے نزدیک کرتی ہے۔

کافی شریف میں منقول ہے کہ حضرت عیسٰی بن مریم نے حواریوں سے فرمایا: "تم لوگوں سے میری ایک خواہش ہے اس خواہش کو پورا کرو۔ انہوں نے عرض کیا: اے روح اللہ! آپ کی حاجت پوری کی جائے گی۔ پس آپؑ اٹھے اور آپ نے ان کے پاؤں دھوئے۔ انہوں نے عرض کیا: آپ کی بہ نسبت ہم اس کام کے زیادہ سزاوار تھے۔ فرمایا: خدمت خلق کا سب سے زیادہ سزاوار عالم ہے۔ میں نے اس قسم کی تواضع اس لئے کی ہے تاکہ تم میرے بعد لوگوں کے ساتھ اس طرح تواضع کرو جس طرح میں نے تمہارے ساتھ تواضع کی ہے۔ اس کے بعد عیسٰیؑ نے فرمایا: تواضع کے ذریعے حکمت آباد ہوتی ہے نہ کہ تکبّر کے

۱۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

فِيمَا أَوْحَى اللّٰهُ إِلىٰ دَاوُدَؑ: ﴿يَا دَاوُدُ! كَمَا أَنَّ أَقْرَبَ النَّاسِ مِنَ اللّٰهِ الْمُتَوَاضِعُونَ، كَذٰلِكَ أَبْعَدُ النَّاسِ مِنَ اللّٰهِ الْمُتَكَبِّرُونَ﴾۔

اصول کافی، ج۲، ص۱۰۱، باب التواضع، ح۱۱۔

ذریعے۔اسی طرح ہموار زمین میں کھیتی اگتی ہے نہ کہ پہاڑ میں"۔[1]

بڑے بڑے لوگوں، اولیاء کرام اور انبیاء کا قرآن میں جو تذکرہ ہوا ہے اس کا مقصد تاریخ نویسی نہیں، بلکہ اس کا مقصد انسانیت کی تکمیل ہے، نیز یہ کہ لوگ بزرگان عالم کی سرگزشت سے عبرت حاصل کریں اور اپنے آپ کو ان کی نیک صفات اور اخلاق فاضلہ سے آراستہ کریں خاص کر علماء اور بزرگان کو چاہئے کہ وہ اس حدیث پر زیادہ توجہ دیں، نیز علمائے ربانی اور بزرگان دین سے اخلاقی و دینی تعلیمات حاصل کریں اور بزرگوں کی سیرت سے ماتحتوں اور طالب علموں کو آگاہ کریں اور اپنے آپ کو اس عظیم خصلت سے مزین کریں اور اس بات پر غور کریں کہ حضرت عیسی مسیح ؑ حواریوں کے پیر دھونے کو اپنی خواہش اور حاجت قرار دیتے اور اپنے آپ کو اس کا محتاج سمجھتے تھے۔یہ تواضع اور انکساری کی انتہا ہے۔

آپ ؑ نے فرمایا: "لوگوں کی خدمت کے سب سے زیادہ سزاوار علماء ہیں"۔یہ اس لئے فرمایا کیونکہ تواضع معرفت خداوندی اور معرفت نفس کا نتیجہ ہے۔پس یہ صفت علماء کے اندر پائی جانی چاہئے۔وہ عالم جس میں تواضع کی صفت نہ ہو اور جو دوسروں سے اپنی اطاعت اور تعظیم کا خواہاں ہو حقیقت میں عالم نہیں، بلکہ اس کی معلومات کا ذخیرہ شیطان کی گندگی ہے۔اگر ان معلومات سے کامیابی اور فلاح حاصل ہوتی تو ابلیس کو بھی کامیاب ہونا چاہئے۔وہ علم جو اپنی خاصیت کھو چکا ہوا یک دبیز پردہ ہے جس سے رہائی سب سے مشکل کام ہے۔

حضرت عیسی علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا کہ: "تواضع سے حکمت آباد ہو جاتی ہے"۔ممکن ہے اس سے مراد یہ ہو کہ جب تک دل میں تواضع نہ ہو حکمت کا بیج اس میں نہیں اگ سکتا اور نہ ہی پروان چڑ سکتا ہے جس طرح اس زمین میں سبزہ اگ اور بڑھ نہیں سکتا جو نرم اور ہموار نہ ہو۔نیز ممکن ہے اس سے یہ مراد ہو کہ جب تک علماء کے

۱۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

قَالَ عِيسَى بْنُ مَرْيَمَ ؑ: ﴿يَا مَعْشَرَ الحَوَارِيِّينَ لِي إِلَيْكُمْ حَاجَةٌ اقْضُوهَا لِي. قَالُوا: قُضِيَتْ حَاجَتُكَ يَا رُوحَ اللهِ، فَقَامَ فَغَسَلَ أَقْدَامَهُمْ فَقَالُوا: كُنَّا نَحْنُ أَحَقَّ بِهٰذَا يَا رُوحَ اللهِ. فَقَالَ: إِنَّ أَحَقَّ النَّاسِ بِالخِدْمَةِ العَالِمُ. إِنَّمَا تَوَاضَعْتُ هٰكَذَا لِكَيْمَا تَتَوَاضَعُوا بَعْدِي فِي النَّاسِ كَتَوَاضُعِي لَكُمْ. ثُمَّ قَالَ عِيسَى ؑ: بِالتَّوَاضُعِ تُعْمَرُ الحِكْمَةُ لَا بِالتَّكَبُّرِ، وَكَذٰلِكَ فِي السَّهْلِ يَنْبُتُ الزَّرْعُ لَا فِي الجَبَلِ﴾.

اصول کافی، ج۱، ص ۲۹، کتاب فضل العلم، باب صفۃ العلماء، ح ۶۔

اندر تواضع موجود نہ ہو وہ لوگوں کے دلوں میں حکمت کے بیج نہیں بو سکتے اور نہ انہیں پروان چڑھا سکتا ہے۔ پس ضرورت اس بات کی ہے کہ تواضع کی مدد سے پہلے سخت دلوں کو نرم کیا جائے پھر اس میں بیج بویا جائے اور فصل حاصل کی جائے۔ یہ دونوں احتمالات درست ہیں۔ یہ ایک طرف سے اپنی اصلاح کا حکم ہے اور دوسری طرف سے دوسروں کی اصلاح کا۔

پس جو لوگ وعظ وہدایت کی مسند پر بیٹھتے ہیں اور اپنے آپ کو سبیل نجات کا راہنما قرار دیتے ہیں انہیں چاہئے کہ تواضع کے ساتھ لوگوں کو نیکی کی دعوت دیں۔ انہیں چاہئے کہ انبیاء اور اولیاء (علیہم السلام) کی سیرت کو مدنظر رکھیں کہ وہ اپنی تمامتر عظمتوں کے باوجود خلق خدا کے ساتھ کس طرح کا برتاؤ کرتے تھے اور لوگوں کے دلوں کو کس طرح کے اخلاق کریمہ سے نرم اور رام کرتے تھے۔ جب تک عالم اور مرشد ورہنما کے دل میں نورانیت، پاکیزگی، محبت اور تواضع کی صفات نہ ہوں وہ لوگوں کی ہدایت کرنے اور انہیں علم سکھانے کا مشن اپنے ذمے نہیں لے سکتا، نیز وہ لوگوں کے دلوں میں علم وحکمت کے بیج نہیں بو سکتا۔

کافی میں امام صادقؑ کی حدیث: ''علم طلب کرو، علم کے ساتھ ساتھ بردباری اور وقار کے ذریعے اپنے آپ کو زینت دو۔ جسے تم علم سکھاتے ہو اس کے ساتھ تواضع سے پیش آؤ۔ جس سے تم علم حاصل کرتے ہو اس سے بھی تواضع کرو۔ تم لوگ متکبّر علماء نہ بنو وگرنہ تمہارا باطل (عمل) تمہارے برحق (عمل) کا خاتمہ کردے گا۔[1]

جی ہاں! اخلاق رذیلہ اور صفات قبیحہ کے باعث حق بھی برباد ہو جاتا ہے۔ اگر عالم متکبّر اور خود بین ہو تو اس کا علم ضائع ہو جاتا ہے۔ یہ علم ومعرفت کے ساتھ بڑی خیانت ہے جو لوگوں کو حق سے بیزار کر دیتی ہے۔ جب عالم اپنی علمی ذمہ داری (یعنی اخلاق حسنہ) کے مطابق عمل نہ کرے تو لوگوں کی نظروں میں دین وعلم کا وقار گر جاتا ہے۔ اس سے لوگوں کا عقیدہ بھی کمزور پڑ جاتا ہے اور لوگوں کا اعتماد علمائے حق سے بھی اٹھ جاتا ہے۔ یہ ایک عظیم ترین ضربت ہے جو غیر ذمہ دار علماء کے ہاتھوں دین اور حقیقت کے بدن پر وارد

۱۔ امام صادقؑ کی حدیث کا متن یہ ہے:

﴿أُطْلُبُوا العِلْمَ وَتَزَيَّنُوا مَعَهُ بِالحِلْمِ وَالوَقارِ، وَتَواضَعُوا لِمَنْ تُعَلِّمُونَهُ العِلْمَ، وَتَواضَعُوا لِمَنْ طَلَبْتُمْ مِنْهُ العِلْمَ، وَلا تَكُونُوا عُلَماءَ جَبّارِينَ، فَيَذْهَبَ باطِلُكُمْ بِحَقِّكُم﴾۔

اصول کافی، ج۱، ص۲۸، کتاب فضل العلم، باب صفۃ العلماء، ح۱۔

ہوتی ہے۔

کسی عالم کی ایک اخلاقی غلطی یا اسی طرح دینی علوم کے ایک طالب علم کا غلط عمل لوگوں کے اخلاق واعمال کو خراب کرنے میں جس قدر مددگار ومعاون ثابت ہوتا ہے اس قدر مدد کسی اور چیز سے نہیں ملتی۔ بنابریں ان لوگوں کو چاہئے کہ اپنے اوپر خوب نظر رکھیں، کیونکہ وہ نہ صرف اپنی کامیابی وفلاح کے ذمہ دار ہیں، بلکہ وہ لوگوں کی فلاح وسعادت کے بھی ذمہ دار ہیں۔ ان لوگوں کی خرابی اور برائی اور دوسروں کی خرابی وبرائی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ دوسروں کی بہ نسبت ان پر اتمام حجت زیادہ واضح ہے۔

چھٹی فصل

تکبّر کے بارے میں بعض احادیث کا تذکرہ

کافی میں حضرت امام صادقؑ سے منقول ہے کہ: ''متکبّر لوگ چیونٹی کی صورت میں تبدیل کئے جاتے ہیں۔ لوگ انہیں پامال کرتے ہیں یہاں تک کہ اللہ حساب سے فارغ ہو جائے'' ۔[1]

تکبّر کی غیبی شکل کمزور چیونٹیوں والی ہے۔ اس کی یہ برزخی اور اخروی صورت شاید اس لئے ہو کیونکہ متکبّر کا نفس حقیر اور چھوٹا ہوتا ہے، جیسا کہ قبلاً ذکر ہو چکا ہے کہ تکبّر کا سبب کم ظرفی، نفسانی کمزوری اور تنگ نظری ہے۔ پس چونکہ متکبّر کا باطن چھوٹا ہوتا ہے اور غیبی وملکوتی شکلیں روحانی صفات وخصائل کی تابع ہوتی ہیں، نیز چونکہ عالم ملکوت میں بدن روح کا پرتو ہے اور وہ اس کی متابعت سے انکار نہیں کرسکتا۔ پس روح کی کا چھوٹا اور حقیر ہونا بدن میں سرایت کر جاتا ہے اور اسے ایک حقیر اور چھوٹے جاندار کی شکل میں لاتا ہے جو لوگوں کے پاؤں تلے کچلا جاتا رہتا ہے یہاں تک کہ لوگ حساب سے فارغ ہو جائیں۔

ممکن ہے کہ یہ غیبی ملکوتی اور اخروی شکل دنیوی اعمال وکردار کا ردعمل ہو، چونکہ متکبّر اس دنیا میں خود کو بڑا سمجھتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ اسے دوسرے عالم میں حقیر اور چھوٹا بنا دیتا ہے ﴿كَمٰا تَدِينُ تُدان﴾ ۔[2]

۱۔ اس حدیث کا متن یہ ہے: ﴿إنَّ الْمُتَكَبِّرِينَ يُجْعَلُونَ فِي صُوَرِ الذَّرِّ، يَتَوَطَّأُهُمُ النّاسُ حَتّىٰ يَفْرَغَ اللهُ مِنَ الحِسابِ﴾ ۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۲۳۵، باب الکبر، ح ۱۱۔

۲۔ ﴿كَمٰا تَدِينُ تُدانُ يا مُبْتَغِي العِلْمِ﴾ اے طالب علم! جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔
اصول کافی، ج ۲، ص ۱۰۸، باب ذم الدنیا والزہد فیہا، ح ۱۸؛ نیز یہی کتاب، ج ۲، ص ۱۱۲، ح ۴۔

کافی شریف میں حضرت امام صادقؑ سے مروی ہے: ''جہنم میں متکبروں کے واسطے ایک وادی ہے جسے ''سقر'' کہا جاتا ہے۔ اس نے اللہ سے اپنی گرمی کی شدت کی شکایت کی اور اس سے سانس لینے کی اجازت طلب کی۔ پس اس نے سانس لی اور جہنم کو جلا ڈالا''۔[1]

اے عزیز! اگر کوئی انسان اس قسم کی احادیث کی صداقت کا احتمال دے تو اسے اصلاح نفس کی کوشش کرنی چاہئے۔ جب یہ سقر (جو خود آگ ہے اور عذاب کی جگہ ہے) حرارت کی شدت سے فریاد کرے اور اس کی سانس سے جہنم بھی جل جائے تو اس آگ میں کیسے رہ سکتے ہیں؟ اس چند روزہ دنیوی خودنمائی، بندگان خدا کے ساتھ تکبّر اور عبادت واطاعت پر غرور ونخوت کی خاطر ہم اس عذاب کو کیسے برداشت کریں جو جہنم کو بھی رلائے؟ وائے ہو ہماری غفلت اور مستی پر۔ اس مدہوشی اور خواب گراں سے الحذر!

خداوندا! کیا تو ہم ضعیفوں اور بے چاروں کو جن کے پاس کچھ بھی نہیں ہے اور تیرے سوا ان کی کوئی پناہ گاہ نہیں اس آگ کے ذریعے عذاب دے گا؟

پروردگارا! تو ہماری کمزوری اور بے چارگی کو خود ہی سمجھتا ہے۔ تو ہمارے جلد اور گوشت کی نرمی ونازکی کو خوب جانتا ہے۔ ہم اس آگ کا کیا چارہ کریں؟

اے اللہ! تیرے بندے تیری مملکت ہیں اور تجھ سے مربوط ہیں۔ ہم سب بندے ہیں اور تو ہمارا ربّ ہے۔ تو اپنی خدائی کے مطابق ان سے سلوک کر، ان کی برائی کے مطابق نہیں۔ تو نے ہمیں خلق فرمایا ہے اور ہمیں لامتناہی نعمتوں سے نوازا ہے ہماری کسی خدمت کے بغیر۔ تیری تمام نعمتیں فضل وکرم ہیں کسی خدمت کا صلہ نہیں جو انسان کا حق ہو۔

پروردگارا! تو نے ہم سے اپنا تعارف ''رحمان ورحیم'' جیسی صفات سے کیا ہے، ہمارے لئے تیری رحمت ہی تیری شناخت ہے۔ تو نے اپنی عظیم کتاب میں فرمایا ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِیعاً﴾[2] ہماری امیدیں تیری رحمتوں سے وابستہ ہیں۔ ہم اپنے وجود اور اپنے اعمال سے مایوس ہیں۔ ہم کون ہوتے

۱۔ حدیث کا متن یہ ہے:
﴿اِنَّ فِي جَهَنَّمَ لَوادِياً لِلْمُتَكَبِّرِينَ يُقَالُ لَهُ سَقَر، شَكا اِلَى اللهِ. عَزَّوَجَلَّ. شِدَّةَ حَرِّهِ، وَسَأَلَهُ أَنْ يَأْذَنَ لَهُ أَنْ يَتَنَفَّسَ، فَتَنَفَّسَ فَأَحْرَقَ جَهَنَّمَ﴾۔ دیکھئے سابقہ مآخذ، ج ۲، ص ۲۳۴، ۲۳۵، باب الکبر، ح ۱۰۔

۲۔ اللہ تمام گناہوں کو بخش دیتا ہے۔ سورۂ زمر ۵۳۔

ہیں اپنے اعمال کے ساتھ تیری بارگاہ میں حاضر ہونے والے؟

وَحَمْلُ الزّادِ أقْبحُ کُلِّ شَيءٍ   اِذا کانَ الوُفُودُ عَلَی الکَرِیمِ ۱

ہمیں عذاب دینے سے تیری بزرگی وعظمت میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔ بندوں پر رحم وشفقت کے باعث تیرے بے کراں دریائے رحمت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔ نیکی کرنا تیرا شیوہ ہے اور کرم کرنا تیری عادت ہے۔ ہم جہالت وبے حیائی کی انتہا کرتے ہوئے نافرمانی پر اتر آئے ہیں اگرچہ ہم نے اس قدر رروؤف خدا کی حکم عدولی کی ہے لیکن تیری رحمت مخلوق کی نافرمانی اور اطاعت پر موقوف نہیں۔ اے اللہ ہمارے ساتھ فضل وکرم اور احسان کا سلوک کر ہمارے برے اعمال اور اخلاقی پستیوں کے باعث ہمارا مؤاخذہ نہ فرما ﴿اِنّکَ أنتَ أرحَمُ الرّاحِمِین﴾۔

کافی میں حضرت امام صادقؑ سے مروی ہے کہ حضرت امام باقرؑ نے فرمایا: ﴿العِزُّ رِداءُ اللهِ وَالکِبرُ اِزارُہُ، فَمَنْ تَناوَلَ شَیئاً مِنهُ أکَبَّهُ اللهُ فِي نارِ جَهَنَّمَ﴾ ۲

امام باقرؑ اور امام صادقؑ سے منقول ہے: ﴿لاٰ یَدخُلُ الجَنّةَ مَنْ فِي قَلبِهِ مِثقالُ ذَرّةٍ مِنْ کِبرٍ﴾ ۳

عقاب الاعمال میں امام باقرؑ سے مروی ہے: ﴿الکِبرُ مَطایا النّارِ﴾ ۴

ایضاً امام باقرؑ سے مروی ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا: ﴿أکثَرُ أهلِ جَهَنَّمَ المُتکَبِّرُونَ﴾ ۵

۱۔ زادراہ ہمراہ لینا ہر چیز سے زیادہ قبیح ہے البتہ اس وقت جب صاحب جودوکرم کے پاس جایا جارہا ہو۔
دیکھئے نفس الرحمٰن فی فضائل سلمان، تالیف حاجی نوری، تحقیق جواد قیومی، تہران مطبعۂ آفاق، ص ۵۴۵۔

۲۔ عزت اللہ کی چادر ہے اور کبریائی اس کا تہبند ہے۔ پس جو کوئی ان میں سے کسی کی طرف دست درازی کرے خدا سے سر کے بل جہنم میں ڈال دیتا ہے۔ (اصول کافی، ج ۲، ص ۲۳۴، باب الکبر، ح ۳)۔
کافی کے نسخے میں ''نار'' کا لفظ مذکور نہیں ہے۔

۳۔ جس کے دل میں ذرہ برابر تکبّر ہو وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ (اصول کافی، ج ۲، ص ۲۳۴، ح ۶)۔

۴۔ اپنے آپ کو بڑا سمجھنا جہنم کی سواری ہے۔
عقاب الاعمال (شیخ صدوقؒ) ص ۲۶۷، ح ۷؛ نیز وسائل الشیعہ، ج ۱۵، ص ۳۷۷، باب ۵۸، ابواب جہاد نفس، ح ۱۴۔

۵۔ جہنمیوں کی اکثریت تکبّر کرنے والوں پر مشتمل ہے۔ (ایضاً ص ۲۶۵، ح ۲؛ وسائل، ج ۱۵، ص ۳۷۷، ح ۱۶)۔

ساتویں فصل

تواضع عقل کا لشکری اور فطرت مخمورہ کا لازمہ ھے

جبکہ تکبّر جھل کا لشکری اور فطرت محجوبہ کا لازمہ ھے

تمام انسانوں کی فطرت میں یہ بات شامل ہے کہ وہ اپنے سے بڑی اور عظیم تر ہستی کے سامنے تواضع، فروتنی اور تعظیم سے سر جھکاتے ہیں۔ یہ ایک عام فطری قانون ہے جس سے کوئی مستثنیٰ نہیں۔ اگر انسان کا دل کسی شخص کی عظمت و بزرگی کا احساس کرے تو وہ اپنی فطرت اور جبلّت سے مجبور ہو کر اس کی تعظیم کرے گا اور اس کے سامنے تواضع اور فروتنی کا مظاہرہ کرے گا۔ اس عظیم شخصیت کی تعظیم اور اس کے سامنے فروتنی کے نتیجے میں وہ اس شخصیت کے اعزاء اور اقارب کے ساتھ بھی تواضع سے پیش آئے گا۔

اب چونکہ انسان کی فطرت عظیم مطلق جس کی عظمت و بزرگی لامحدود ہے کے سامنے متواضع ہوتی ہے اس لئے اگر طبعی اور مادی رکاوٹیں اور حجابات اس کی فطرت کو محجوب نہ کریں تو اس کی تعظیم اور اس کی فروتنی کا بنیادی اور اصلی محور اللہ کی ذات ہوگی جس کی عظمت لامحدود ہے۔ باقی چیزوں کی بزرگی وعظمت اور جلال و جمال اللہ کی عظمت اور جلال و جمال کا پرتو اور سایہ ہیں۔

پس انسان اپنی اصلی فطرت (جو مادیت کے پردوں سے محجوب نہ ہو) کی رو سے اللہ کے سامنے بالذات اور اس کے مظاہرہ جمال وجلال کے سامنے بالعرض (اللہ کی خاطر) متواضع ہوگا یوں بندوں کے آگے تواضع خدا کے سامنے تواضع سے عبارت ہوگا۔

فطرت سلیم کے تحت ظاہر ہونے والی یہ تواضع شیطان اور نفس امارہ کے تصرف سے محفوظ ہوگی۔ اس لئے یہ تواضع انسان کی اپنی ذات یا ذاتی خواہشات و مفادات کی خاطر نہیں ہوگی۔

اس غیر محجوب فطرت کا حامل انسان اگرچہ تمام مخلوقات کے سامنے تواضع سے پیش آتا ہے لیکن درحقیقت وہ اللہ کے سوا کسی کے سامنے تواضع اور فروتنی کا مظاہرہ نہیں کرتا۔ اس کے دل کا چہرہ صرف اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ درحقیقت یہ کثرت میں وحدت کا مظاہرہ ہے، نیز بندوں کی طرف یہ توجہ درحقیقت اللہ کی طرف توجہ سے عبارت ہے، چونکہ بندوں کے آگے فروتنی و تواضع، نیز ان کی تعظیم کا سرچشمہ اللہ کی معرفت اور محبت ہیں لہذا یہ خود اللہ کی معرفت اور اللہ کی محبت سے عبارت ہیں۔

اس فطرت سلیم کا حامل انسان کسی مخلوق کی چاپلوسی نہیں کرے گا، کیونکہ چاپلوسی کا سبب خود پرستی اور حق

سے دوری ہے۔ پس یہ بات واضح ہوگئی کہ اللہ اور بندوں کے سامنے تواضع فطرت سلیم (مخمورہ) کا لازمہ ہے۔ یہیں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تکبّر اور چاپلوسی دونوں فطرت محجوبہ کی پیداوار ہیں، کیونکہ جب انسان نفس کے پردوں کے پیچھے محجوب ہوتا ہے اور اس پر خود بینی وخود پرستی کا غلبہ ہوتا ہے تو اس خود بینی کے سبب وہ اپنے لئے بہت سی خوبیاں تراشتا ہے جبکہ خوبیوں کے سرچشمے سے غافل ہوتا ہے، نیز جن لوگوں سے اس کے مادی مفادات وابستہ نہ ہوں انہیں وہ حقیر شمار کرتا ہے۔ اس کے برعکس جن سے اس کے مفادات وابستہ ہوں وہ ان کی تعظیم کرتا ہے۔ بنابریں وہ اپنے ماتحتوں سے تکبّر کرتا ہے جبکہ دنیا والوں کی تعریف وتمجید اور چاپلوسی کرتا ہے، نیز ان لوگوں کی بھی جن سے اس کا مفاد وابستہ ہو۔ پس وہی فطرت (جو اللہ کی طرف اس کے سفر کیلئے وسیلہ اور سواری کی حیثیت رکھتی ہے اور اسی کے ذریعے وہ اللہ اور بندوں کے آگے تواضع سے پیش آتا ہے) جب محجوب ہوجاتی ہے تو شیطان اور مادیت کی طرف سفر کی سواری بن جاتی ہے۔ پھر وہ اسی کے باعث بعض لوگوں سے تکبّر کرتا ہے اور بعض لوگوں ک چاپلوسی کرتا ہے۔

مقصد / ۱۹

"تُؤَدَہ" اور اس کی ضد "تسرّع"

یہ مقصد تین فصلوں پر مشتمل ہے:

پہلی فصل

سنجیدگی اور جلدی بازی، باطنی اور ظاہری صفات ہیں

"تُؤَدَہ" ہُمَزَہ کا ہم وزن ہے۔ اس سے مراد ہے کسی کام میں سنجیدگی، متانت اور بردباری کا ثبوت دینا۔[1] نیز یہ اطمینان سے حرکت کرنے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ ان سب کی ضد "تَسَرُّع" (جلدبازی) ہے۔[2]

متانت وسنجیدگی کا تعلّق باطنی اور نفسانی صفات سے ہے، اطمینان اور سنجیدہ حرکت اس کے ظاہری آثار ہیں۔

اگر دل کے اندر سنجیدگی اور وقار کی صفت آ جائے تو عقاید ونظریات میں سنجیدگی آئے گی۔ اس کے نتیجے میں کردار وگفتار میں بھی سنجیدگی پیدا ہوگی جس طرح جلد بازی اور عجلت بھی باطن سے ظاہر کی طرف سرایت کرتی ہے۔

ایسا نہیں کہ عقل اور جہل کے لشکروں کا تعلّق صرف باطنی صفات سے ہو (جیسا کہ حدیث شریف میں غور وفکر سے معلوم ہوگا) بلکہ ظاہر وباطن اور اول وآخر ہر جگہ جملہ اچھائیاں عقل کے لشکروں سے مربوط ہیں۔

۱۔ لسان العرب، ج۱۵، ص۱۹۱؛ نیز مجمع البحرین، ج۳، ص۱۵۳۔

۲۔ لسان العرب، ج۶، ص۲۴۱؛ نیز مجمع البحرین، ج۴، ص۳۴۵۔

اسی طرح تمام برائیاں جہل کے لشکروں سے مربوط ہیں خواہ وہ برائیاں ظاہری ہوں یا باطنی۔ باطن اور ظاہر کے درمیان (جیسا کہ فلسفہ الٰہیہ میں ثابت شدہ ہے) تباین کی نسبت نہیں ہے، بلکہ ان کے درمیان نقص وکمال، نیز کثرت میں وحدت اور وحدت میں کثرت والی نسبت ہے۔[1] بلکہ ظاہر و باطن کی اصطلاح شاید تمام اصطلاحات سے بہتر ہو۔

روحانی اور باطنی کیفیات وحقائق، نفسانی اخلاق وصفات کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں۔ اسی طرح ظاہری اعمال، نفسانی صفات وخصائل کی ظاہری شکل ہیں۔ نفسانی کیفیات ومقامات کے درمیان اتصال ویگانگت کی شدت کے باعث تمام باطنی امور ظاہر کی طرف اور ظاہری امور باطن کی طرف سرایت کرتے ہیں۔ اسی لئے شریعت مطہرہ نے ظاہری حالت کو ٹھیک رکھنے کی زبردست تأکید کی ہے یہاں تک کہ اٹھنے بیٹھنے، چلنے اور بات کرنے کے آداب بیان کئے گئے ہیں، کیونکہ تمام ظاہری اعمال نفس اور روح پر ایسے اثرات چھوڑتے ہیں جو روح میں بنیادی تبدیلیاں لاتے ہیں۔ اگر انسان راستہ چلتے میں عجلت سے کام لے تو اس کی روح میں بھی عجلت آتی ہے۔ اسی طرح روح کی عجلت ظاہری عجلت کو جنم دیتی ہے۔ اگر انسان ظاہری اعمال میں اطمینان وسکون اور سنجیدگی کا مظاہرہ کرے (اگر چہ بناوٹی اور تصنع میں کیوں نہ ہو) تو رفتہ رفتہ اس کی روح کے اندر بھی سنجیدگی اور اطمینان کی کیفیت پیدا ہوگی۔ یہ اچھی صفت بہت سی خوبیوں اور کمالات کا سرچشمہ ہے۔

دوسری فصل

تُؤدہ اور تسرّع کا مفہوم

حدیث میں تُؤدَہ، تسرّع کے مقابلے میں مذکور ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے مراد تأنی ہے۔ تأنی سے مراد ہے؛ قوت غضبیہ کو اعتدال پر رکھنا۔ اگر یہ قوت حد سے بڑھ جائے تو یہ تسرّع ہے۔ ایک عظیم محقّق نے کہا ہے: اطمینان نفس کا شمار شجاعت کی فروع میں ہوتا ہے۔[2]

۱۔ الاسفار الاربعہ، ج۱، ص۶۸، فصل ۷، منہج ۱؛ نیز، ج۱، ص۳۴۲-۳۴۴، فصل ۴، مرحلہ ۲۔

۲۔ دیکھئے، صدر المتألہین شیرازیؒ کی شرح اصول کافی، ج۱، ص۴۴۷۔

ممکن ہے کہ اس سے مراد ثابت قدمی ہو جو قوۂ غضبیہ کے اعتدال سے عبارت ہے اور شجاعت کی ایک صورت ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ مشکلات اور مختلف حالات کے مقابلے میں نفس صبر کا مظاہرہ کرے اور جلدی ہتھیار نہ ڈال دے، نیز سہل انگاری و سبکی کا ثبوت نہ دے اور خفت و تندی سے کام نہ لے، خواہ کوئی اخلاقی و روحانی مسئلہ پیش آئے یا مادی اور جسمانی۔

جو شخص ثابت قدم ہو وہ روحانی مشکلات کے باعث حوصلہ نہیں ہارتا، نیز ناگوار حالات میں بھی ڈٹا رہتا ہے اور اس کے پائے ثبات میں کوئی لغزش یا اس کے سکون میں کوئی کمی نہیں آتی۔ شاید قرآن کی آیت: ﴿فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ﴾[1] نفس کے اسی مقام کی طرف اشارہ ہو۔

معاشرے میں اس قسم کی خصلت کا پیدا کرنا نہایت ضروری ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ مشکل ترین کاموں میں سے ایک بھی ہے۔ اسی لئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے کہ: ''سورۂ ہود ؑ نے مجھے بوڑھا کردیا اپنی اس آیت ﴿فَاسْتَقِمْ...﴾ کی وجہ سے''۔[2] یہ آیت اگرچہ سورۂ شوریٰ میں بھی ہے[3] لیکن حدیث میں اسے سورۂ ہود سے مختص کرنے کی وجہ شاید اس کا آخری حصہ ﴿وَمَنْ تَابَ مَعَكَ﴾ ہو جو سورۂ شوریٰ میں موجود نہیں ہے۔ چونکہ امت کیلئے استقامت پر عمل پیرا ہونا مشکل ہے اس لئے اس سورت کی آیت کا ذکر فرمایا گیا۔

خلاصہ یہ کہ مختلف امور میں ثابت قدمی جنگی معرکوں میں ڈٹے رہنے کا سبب بنتی ہے تاکہ انسان ناگوار مشکلات کے باعث جنگ سے فرار اختیار نہ کرے، نیز دین خداوندی کی حفاظت کے معاملے میں لغزشوں کا شکار نہ ہو۔ اسی طرح روحانی بحرانوں کے دوران بھی لغزش سے محفوظ رہے اور ثابت قدمی و سکون کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔

اس کے برعکس ''جلد بازی'' ایک قبیح خصلت ہے جو انسان کو کہیں کا نہیں رکھتی۔ جلد باز انسان بہت

۱۔ اے رسول! جیسا کہ آپ کو حکم دیا گیا ہے آپ اور وہ لوگ جو آپ کے ساتھ اللہ کی طرف پلٹ آئے ہیں ثابت قدم رہیں۔ سورۂ ہود ۱۱۲۔

۲۔ حدیث نبوی ؐ کا متن یہ ہے: ﴿شَيَّبَتْنِي سُورَةُ هُودٍ لِمَكَانِ فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ﴾۔
الدر المنثور، (سیوطی)، ج ۳، ص ۳۲۰۔۳۲۱؛ نیز مجمع البیان (طبرسی)، ج ۵، ص ۳۰۴۔

۳۔ سورۂ شوریٰ، آیت ۱۵ میں مذکور ہے: ﴿وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ﴾ اس طرح ثابت قدم رہ جس طرح تجھے حکم دیا گیا ہے۔

جلد بکی اور غیر ذمہ داری کا ثبوت دیتا ہے اور کام خراب کر دیتا ہے۔ وہ نہ روحانی مشکلات میں ثابت قدم ہوتا ہے اور نہ جسمانی شدائد میں پا بر جا ہوتا ہے۔ اس صفت رذیلہ کے باعث انسانی معاشرے میں بہت سی انفرادی اور اجتماعی برائیاں پیدا ہوتی ہیں۔ جلد باز انسان بعض اوقات معمولی واقعات کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا ہے اور اپنی دینی اور روحانی ذمہ داریوں سے چشم پوشی کرتا ہے۔ بسا اوقات نفس امارہ اور شیطان اس پر غلبہ حاصل کرتے ہیں اور اسے راہ حق سے ہٹا دیتے ہیں۔ پھر اس کا ایمان ان کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے دینی، مذہبی اور اخلاقی اصولوں کو مکمل طور پر کھو دیتا ہے۔

اطمینان نفس اور ثابت قدمی انسان کو شیطانی لشکروں کے مقابلے میں محفوظ رکھتی ہے، نیز جہل اور شیطان کے لشکروں پر اسے غلبہ دیتی ہے۔

باطنی اطمینان اور ثابت قدمی انسان کو غصے اور شہوت کی قوت پر غالب کرتی ہے اور وہ ان دونوں کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتی، بلکہ وہ تمام باطنی اور ظاہری صلاحیتوں کو روح کا تابع بنا دیتی ہے۔

انسان کی مستقل مزاجی اور ثابت قدمی ہے جو اسے دنیا کے ناگوار واقعات، مشکلات اور روحانی وجسمانی دباؤ کے مقابلے میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح مستحکم رکھتی ہے اور اسے سستی و کاہلی اور لغزشوں سے محفوظ رکھتی ہے۔ ایمان اور دین کی حفاظت بھی اطمینان نفس اور روحانی سکون کے ذریعے آسانی کے ساتھ کی جا سکتی ہے۔ یہ انسان کو آخری دم تک ''تندیٔ باد مخالف'' سے محفوظ رکھتی ہے۔

ثابت قدمی اور خود اعتمادی ہو تو دشمنوں اور منافقوں کے کردار اور عادات و اخلاقیات کا اثر انسان پر نہیں پڑتا اور وہ حوادث روزگار کی نذر نہیں ہوتا۔ اگر انسان ثابت قدم اور مطمئن ہو تو وہ اپنی ذات میں ایک ملت بن جاتا ہے۔ اس صورت میں اگر تمام لوگ اخلاق رذیلہ اور بے دینی کے سیلاب میں بہہ جائیں تو بھی یہ شخص مضبوط پہاڑ کی طرح تمام مشکلات کا مقابلہ کرتا ہے اور اپنی تنہائی سے خوفزدہ نہیں ہوتا۔

انسان ثابت قدمی اور خود اعتمادی کے ذریعے تمام انفرادی و اجتماعی ذمہ داریوں کو انجام دے سکتا ہے اور زندگی کے تمام معنوی و مادی مراحل و مسائل میں غلطیوں اور لغزشوں سے بچ نکلتا ہے۔

بزرگان دین اس عظیم روحانی قوت کے ذریعے لاکھوں بد اخلاق لوگوں کے مقابلے میں قیام کرتے تھے اور کسی لغزش کے تصور کو اپنے پاس پھٹکنے بھی نہیں دیتے تھے۔ انبیائے کرامؑ اس عظیم روحانی قوت کے سہارے بڑے بڑے معاشروں کے جاہلانہ عقاید و رسوم کے مقابلے میں تن تنہا کھڑے ہو جاتے تھے۔ وہ

اپنی تنہائی اور دشمنوں کی کثرت کے باعث کسی قسم کے خوف و وحشت میں مبتلا نہیں ہوتے تھے۔ یوں وہ تمام جاہلانہ افکار پر غالب آتے، دنیا والوں کے آداب و رسوم کو روند ڈالتے تھے اور انہیں اپنے رنگ میں رنگ لیتے تھے۔ خود اعتمادی اور ثابت قدمی کی روحانی قوت مختصر جماعتوں کو بڑے بڑے گروہوں کے مقابلے میں محفوظ رکھتی ہے، نیز انہیں دنیا کے بڑے ممالک پر مختصر سی تعداد اور محدود ساز و سامان کے ساتھ غالب قرار دیتی ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ثابت قدمی اور خود اعتمادی کی اس قوت کو خصوصی اہمیت دیتے ہوئے فرماتا ہے: ''اگر تمہارے درمیان بیس ثابت قدم افراد ہوں تو وہ دو سو افراد پر غالب آئیں گے''۔[1] یہ بات عملی طور پر بھی ثابت ہوئی۔[2]

تیسری فصل

بردباری فطرت مخمورہ کا لازمہ اور عقل کا لشکر ہے

جبکہ جلدبازی فطرت محجوبہ کا لازمہ اور جہل کا لشکر ہے

ہم اس سے قبل عرض کر چکے ہیں کہ انسان اپنی خداداد اصلی فطرت کی رو سے لامحدود کمالات کا عاشق اور نقائص سے بیزار ہے۔ پس اگر اس کی توجہ ناقص امور کی طرف مبذول ہو اور ناقص و محدود کمالات کی محبت اس کے دل میں پیدا ہو جائے تو جان لو کہ یہ فطرت کی محجوبیت کا نتیجہ ہے۔[3] بنابریں انانیت، خود پسندی، حیوانی خواہشات کی پیروی، نیز اندر کے چھوٹے شیطان یعنی قوت واہمہ اور بیرونی بڑے شیطان کی پیروی فطرت سلیم کے برخلاف ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ہر قسم کی جلد بازی، شتابزدگی، بے ثباتی اور بے قراری کی وجہ نفسانی مقاصد اور حیوانی خواہشات و لذات تک نہ پہنچنے یا حیوانی مقاصد کے ہاتھ سے نکل جانے کا خوف ہے۔

۱۔ ﴿اِنْ یَکُنْ مِنْکُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ یَغْلِبُوا مِائَتَیْنِ﴾ سورۂ انفال ۶۵۔

۲۔ جنگ بدر کی طرف اشارہ ہے۔ دیکھئے، ابن ہشام کی السیرۃ النبویۃ، ج ۲، ص ۳۳۱؛ تاریخ طبری، ج ۲، ص ۴۳۲۱ اور طبرسی کی مجمع البیان، ج ۴، ص ۸۵۷۔

۳۔ دیکھئے، ص ۷۹۔

جس دل میں توحید اور کمال مطلق کی معرفت کا نور ضوفشانی کر چکا ہو وہ اطمینان، سکون، خود اعتمادی، مستقل مزاجی، ثابت قدمی اور روحانی قرار سے مالا مال ہوتا ہے۔ جو دل معرفت حق جل جلالہ سے منور ہو وہ تمام کاموں کی لگام اللہ کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ وہ اپنی اور دیگر تمام موجودات کی کوشش، جدوجہد اور حرکات وسکون کو اختیار خداوندی کا مرہون منت سمجھتا ہے۔ اس کے خیال میں موجودات عالم کے امور کی لگام خود ان کے ہاتھوں میں نہیں ظاہر ہے اس قسم کا دل اضطراب، بے چینی، بے قراری اور جلد بازی سے محفوظ اور خالی ہوگا۔ اس کے برعکس جو دل معرفت سے خالی ہو اور خود بینی، خواہشات اور حیوانی لذتوں کے حجاب میں لپٹا ہوا ہو وہ حیوانی خواہشات ولذات کے چھوٹ جانے کے تصور سے ہی غمگین اور خوفزدہ ہوگا۔ ایسا شخص اطمینان قلب سے عاری ہوگا اور وہ ہر کام میں جلد بازی اور بے چینی کا اظہار کرے گا۔

اہل عرفان کہتے ہیں کہ دعا کی تین اقسام ہیں:

الف: جلد بازی پر مبنی دعا؛ یہ عام لوگوں کی دعا ہے۔ یہ لوگ چونکہ نفسانی خواہشات واہداف کے غلام ہوتے ہیں اس لئے دعا میں بھی جلد بازی کا مظاہرہ کرتے ہیں تاکہ کہیں ان کے دنیوی اور حیوانی اہداف ان کے ہاتھوں سے نہ نکل جائیں۔

ب: احتمال پر مبنی دعا؛ یہ صاحبان فلسفہ وحکمت کی دعا ہے۔ یہ لوگ بھی اپنے مقاصد کے تابع ہیں۔ وہ یہ احتمال دیتے ہیں کہ شاید دعا اللہ کے فیصلوں کے نفاذ میں مؤثر ثابت ہو اور اللہ کے فیصلوں پر عملدرآمد ہماری دعاؤں سے مربوط ہوں، اس لئے وہ دعا کرتے ہیں۔

ج: اطاعت پر مبنی دعا؛ یہ ارباب معرفت کی دعا ہے۔ یہ لوگ نفس کی غلامی سے آزاد ہوتے ہیں۔ وہ نفسانی خواہشات اور ذاتی لذتوں کیلئے دعا نہیں کرتے۔ بقول مولوی ؒ:

من گروہی می شناسم ز اولیا   کہ زبانشان بستہ باشد از دعا [1]

یہ لوگ امر خداوندی کی تعمیل میں دعا کرتے ہیں۔ یہ اس لے دعا کرتے ہیں، کیونکہ دعا اللہ کے ساتھ راز ونیاز اور محبوب مطلق کے ساتھ گفتگو سے عبارت ہے۔[2]

۱۔ میں اولیاء کی ایک جماعت کو جانتا ہوں جو زبان سے دعائیں نہیں کرتے۔ (مثنوی معنوی مولوی، ص ۱۶۷، دفتر ۳۔

۲۔ دیکھئے، داود قیصری کی شرح فصوص الحکم، ص ۹۹ فص شیثی۔

اگر انسان کا دل نور معرفت سے منور ہو، نیز ہماری طرح خواہشات نفس کی زنجیروں میں جکڑا ہوا اور مادیت کا اسیر نہ ہو تو وہ اللہ تعالیٰ سے گفتگو، اس کی توجہ اور اس کی یاد کو کسی اور چیز کا وسیلہ قرار نہیں دے گا۔

اولیائے خدا فنا فی اللہ کی نظر سے دعا کو دیکھتے ہیں۔ وہ اللہ، اس سے گفتگو اور اس کے ساتھ خلوت کو خود پرستی اور ذاتی خواہشات کے حصول کا ذریعہ قرار نہیں دیتے۔ ان کی ہر خواہش کا محور یہ ہوتا ہے کہ اپنے محبوب حقیقی سے دوستانہ روابط کے دروازے کھول دیں۔

در دل دوست بہر حیلہ رہی باید کرد [۱]

ہم لوگ خواہشات اور نفس کے غلام ہیں اللہ کو خرما (لذات) کی خاطر چاہتے ہیں۔ ہم اس لامحدود دوست کی دوستی کو نفسانی لذتوں پر قربان کر دیتے ہیں۔ یہ ایک عظیم ترین غلطی ہے۔ اگر ہمارے دلوں میں معرفت و محبت کا کوئی شائبہ ہوتا تو ہم شرم سے مر جاتے یا قیامت تک شرم کے باعث اپنا سر نہ اٹھاتے جبکہ اللہ کے چاہنے والے جو کچھ چاہتے ہیں محبوب کے کرم کا مظہر ہونے کی وجہ سے چاہتے ہیں۔ ذرا دیکھئے کہ حقیقی عاشق اور مجذوب مطلق علی ابن ابی طالب (علیہم السلام) دعائے کمیل ؒ میں کیا فرماتے ہیں:

﴿فَهَبْنِي يَا اِلٰهِي وَسَيِّدِي وَمَوْلَايَ وَرَبِّي، صَبَرْتُ عَلٰى عَذَابِكَ فَكَيْفَ أَصْبِرُ عَلٰى فِرَاقِكَ، وَهَبْنِي يَا اِلٰهِي، صَبَرْتُ عَلٰى حَرِّ نَارِكَ فَكَيْفَ أَصْبِرُ عَنِ النَّظَرِ اِلٰى كَرَامَتِكَ﴾ [۲]

حقیقی عاشق کو اگر خوف ہوتا ہے تو صرف فراق کا اور اگر اسے کسی چیز کی طلب ہوتی ہے تو صرف وصال کی۔

۱۔ یہ مرزا عبدالوہاب نشاط اصفہانی کی ایک غزل کا مصرع ہے۔ پورا بیت یہ ہے:

طاعت از دست نیاید گنہی باید کرد　　　در دل دوست بہ ہر حیلہ رہی باید کرد

دیکھئے، دیوان نشاط اصفہانی ؒ ص ۹۶۔

۲۔ اے میرے خدا، میرے مولا اور میرے پروردگار! اگر میں تیرے عذاب پر صبر کر بھی لوں تو تیرے فراق پر کیسے صبر کروں؟ اے میرے اللہ! میں تیری آگ کی سختی جھیل بھی لوں لیکن تیرے کرم کی طرف نظر پر کیسے صبر کروں؟

دیکھئے، سید ابن طاؤس ؒ کی اقبال الاعمال، ص ۷۰۸، دعائے کمیل ؒ۔

بقول رومیؒ:
بشنواز نی چون حکایت می کند   از جدائی ہا شکایت می کند
ہر کسی او باز ماند از اصل خویش   باز جوید روزگار وصل خویش ۱

اس عظیم کتاب کی ابتداء لسان فطرت سے ہوتی ہے۔ اللہ کی نعمتوں پر اس کی نظر اس لحاظ سے ہے کہ وہ اس کے لطف وکرم کی نشانی ہیں۔ علی بن ابی طالبؑ (جو عشاق الٰہی کے میر کارواں ہیں) بہشت برائے بہشت کی تمنا نہیں کرتے، بلکہ بہشت کی تمنا اس لئے کرتے ہیں، کیونکہ بہشت لطف خداوندی کا مظہر ہے۔ ہم بے چاروں کی تمام خواہشات اور تمناؤں کا محور ہماری ذات ہے۔ ہم اللہ کو بھی چاہتے ہیں تو اپنے لئے۔ حسن ازلی کے عشاق جو کچھ چاہتے ہیں اپنے محبوب کی خاطر چاہتے ہیں۔ وہ بہشت کو بھی اس لئے چاہتے ہیں کہ کیونکہ وہ اللہ کی کے لطف وکرم کا مظہر ہے۔ وہ بہشت کو وہاں کی اشیائے خورد ونوش کی وجہ سے نہیں چاہتے۔ ہم لوگ حیوانوں کی طرح بہشت کی چراہ گاہ اور سبزہ زاروں کے طالب ہیں۔ بہشت میں ہمارا مقام اس سے زیادہ نہیں جبکہ وہ لوگ بہشت اور بہشتی نعمتوں کو محبوب کی خاطر چاہتے ہیں۔ وہ ہر چیز کو محبوب تک رسائی کا وسیلہ نیز اس کی معرفت اور اس کے کوچے میں فنا ہونے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

خداوندا! ہمیں اس غفلت اور خود پرستی سے نجات عطا فرما اور ہمارے دلوں کو خواہشات کی غلامی اور لذتوں کے دلدل سے نجات عطا فرما۔

پروردگارا! خود پسندی اور خود بینی کے حجاب نے ہمیں تیری بارگاہ میں رسائی سے روک رکھا ہے اور ہمارے دلوں کو محبوب مطلق سے غافل کر دیا ہے، اب تو خود اپنے دست قدرت سے اس حجاب کو دور کر دے۔

بَيْنِي وَبَيْنَكَ اِنِّـيِ يُنَازِعُنِي   فَارْفَعْ بِلُطْفِكَ اِنِّـيِّ مِنَ الْبَيْنِ ۲

۱۔ مثنوی معنوی جلال الدین رومیؒ، ص ا، دفتر اول، بیت اول وسوم۔

۲۔ میرے اور تیرے درمیان میری ذات کا بت مجھ سے دست بگریبان ہے، اپنے لطف وکرم سے اس انانیت کو ہمارے درمیان سے ختم کر دے۔

دیکھئے، دیوان حلاّج، ص ۹۰۔

مقصد / ۲۰

''حلم'' اور اس کی ضد ''سفاہت'' کا بیان

یہ مقصد سات فصلوں پر مشتمل ہے:

پہلی فصل

حلم اور سفاہت کا مفہوم

حلم قوت غضبیہ کے اعتدال کی ایک صورت ہے۔ اس سے مراد وہ راسخ خصلت وصفت ہے جس کے باعث نفس کو ایسا اطمینان حاصل ہو جائے کہ اس کی قوت غضبیہ بے موقع اور جلد مشتعل نہ ہو، نیز اگر اس کی خواہشات کے خلاف کوئی کام ہو جائے یا کوئی ناگوار اور ناپسندیدہ واقعہ پیش آئے تو اپنا حوصلہ نہ ہار بیٹھے اور اعتدال کی کیفیت سے خارج نہ ہو جائے۔

''حلم'' کی ضد ''سَفَه'' ہے۔ اس کا ماضی سَفِهَ ہے۔ یہ عَلِمَ یَعْلَمُ کے باب سے ہے۔ عربی میں ''سَفِهَ الرَّجُلُ'' سے یہ مراد لیا جاتا ہے: اس شخص کا حلم ختم ہو گیا۔ نیز کہا جاتا ہے: ''سَفَّهَ الجَهْلُ حِلْمَهُ''[۱] یعنی نادانی نے اس کا دماغ ماؤف اور اسے سبکی میں مبتلا کر دیا۔ طیش وسبکی کی ضد اطمینان اور بردباری ہے۔

یہ ایک ایسی باطنی خصلت ہے جس کے باعث انسان کا نفس قابو سے باہر ہو جاتا ہے اور وہ مشکلات کا متحمل نہیں ہوتا۔ یوں وہ بغیر کسی ضرورت اور معیار کے نادانی میں بے لگام ہو جاتا ہے اور اس کا غضب جوش کھاتا ہے اور وہ آپے سے باہر ہوتا ہے۔

۱۔ ملاحظہ ہو، زبیدی کی تاج العروس، ج ۹، ص ۳۹۰۔

یہ باطنی کیفیت قوت غضبیہ کے افراط کے آثار میں سے ایک ہے۔ یوں سفاہت کا ایک مفہوم کم عقلی، فکر کی کمزوری اور سبک مغزی ہوا کیونکہ جو شخص قوت غضبیہ پر قابو نہ پاسکتا ہو وہ سبک مغز، کم عقل اور خام فکر ہے۔ بعض افراد نے حلم کے مقابلے میں سفاہت کا ذکر کیا ہے اگر چہ سفاہت در حقیقت حلم کی ضد نہیں ہے۔ یہ قول لغویوں کے قول کے خلاف ہے لیکن اصل لغوی ریشہ اور سب وضع سے مناسبت رکھتا ہے۔ بہر حال ہمارے موضوع بحث سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور اس کی تحقیق ہمارے موضوع سے خارج ہے، نیز اس کی چنداں اہمیت بھی نہیں۔

دوسری فصل

قوت غضبیہ کے ثمرات

جان لو کہ اگر قوت غضبیہ کی تربیت عقل وشرع کی روشنی میں کی جائے تو یہ اللہ کی عظیم ترین نعمتوں میں سے ایک ہے، نیز راہ نجات وفلاح میں مددگار ومعاون ثابت ہونے والے سب سے بڑے عوامل میں سے ایک عامل ہے۔ قوت غضبیہ کے ذریعے نظام عالم، انفرادی بقاء اور اجتماعی زندگی کی حفاظت ہوتی ہے۔ یہ قوت ایک فلاحی معاشرے کی تشکیل میں بھی بڑی حد تک شریک ہے۔ اس قوت کے ذریعے انسان اور حیوان اپنی انفرادی واجتماعی زندگی کی حفاظت کرتے ہیں، نیز ناخوشگوار حالات کے مقابلے میں اپنا دفاع کرتے ہیں اور اپنے آپ کو زوال وفنا سے محفوظ رکھتے ہیں۔ اگر انسان میں یہ قوت نہ ہوتی تو وہ بہت سے کمالات وفوائد سے محروم رہتا اور وہ اپنے خاندانی نظام کی حفاظت نہ کرتا، نیز وہ فلاحی معاشرے کی حفاظت اور دفاع کیلئے جدوجہد نہ کرتا۔

قوت غضبیہ کو اعتدال پر رکھنے اور اسے افراد وتفریط سے بچانے کیلئے علم اخلاق کے ماہرین اور علماء نے بعض اصول بیان کئے ہیں۔ وہ خود قوت غضبیہ کو تفریط سے بچانے کیلئے غیر معمولی اقدامات کرتے تھے۔ چنانچہ ایک عالم کے بارے میں منقول ہے کہ وہ قوت غضبیہ کے علاج کیلئے خوفناک جگہوں میں جاتے اور نفس کو خطرات میں ڈالتے تھے، نیز سمندری طوفان کے وقت کشتی میں سوار ہوتے تھے یہاں تک کہ خوف اور

۱۔ زبیدی کہتا ہے: سفیہ سے مراد ہے کم عقل۔ دیکھئے، تاج العروس، ج ۹، ص ۳۹۱۔

سستی سے نجات حاصل ہو۔[۱] اگر چہ اس قسم کا علاج خود افراط اور تندروی ہے لیکن قوت غضبیہ کو سستی اور تفریط سے نکالنے کیلئے کوئی نہ کوئی علاج ضروری ہے، کیونکہ اس قوت کی کمزوری و سستی سے معاشرتی اور ملکی نظام میں عظیم خلل پیدا ہوتا ہے، نیز انفرادی اور اجتماعی زندگی عظیم خطرات سے دوچار ہوتی ہے۔ اگر یہ قوت ماند پڑ جائے تو بڑے بڑے عیوب ونقائص پیدا ہوتے ہیں، مثال کے طور پر کمزوری، سستی، کم ہمتی، لالچ، بے خبری، بے ثباتی، جنگ سے فرار، ضرورت کے وقت عمل سے اجتناب، امر بالمعروف اور نہی از منکر سے احتراز اور ان کاموں پر راضی ہونا جو باعث ننگ و عار اور موجب ذلت و خواری ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر اس قوت کو بے جا اور عبث خلق نہیں فرمایا، بلکہ اسے دنیا میں کامیابی، سرافرازی، بزرگی اور خوشبختی کا موجب، نیز اخروی کامیابی کا ذریعہ قرار دیا ہے۔

کام اور جدوجہد کے مواقع پر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا، امر بالمعروف اور نہی از منکر سے اجتناب کرنا، ظالموں کے ظلم کا راستہ نہ روکنا حلم اور صبر نہیں، بلکہ سستی اور جمود ہے جو ایک قبیح صفت اور بری خصلت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں مؤمنین کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ ﴿أَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾[۲] نیز قرآن نے مجاہدین اور میدان کارزار میں داد شجاعت دینے والوں کو بیٹھے رہنے والوں پر برتری اور فضیلت دی ہے، نیز اپنے ہاں ان کے مقام و مرتبے کو عظیم قرار دیا ہے[۳] قرآن نے میدان جنگ میں ڈٹے رہنے والوں کی تعریف کی ہے، نیز انہیں جنگ کرنے اور جنگ میں آگے بڑھنے کی ترغیب دی ہے[۴] یہ ساری باتیں قوت غضبیہ کے سائے میں ہی ممکن ہیں۔ اس قوت کی کمزوری اور بے حسی انسان کو ان تمام خوبیوں سے محروم کر دیتی ہے، نیز اس صورت میں وہ ذلت و پستی اور غلامی کو قبول کرتا ہے اور اپنی انسانی و دینی ذمہ داریوں کی انجام دہی میں ناکام ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی میں یہ قوت بے حس اور ماند پڑ جائے تو اس کا علمی و عملی علاج کرنا چاہئے تا کہ نفس اعتدال کی حالت پر آ جائے۔

۱۔ دیکھئے، تہذیب الاخلاق، ص ۱۷۳۔

۲۔ مؤمنین، کافروں پر سخت گیر اور آپس میں مہربان ہیں۔ سورۂ فتح ۲۹۔

۳۔ اشارہ ہے سورۂ نساء کی آیت /۹۵ کی طرف۔

۴۔ اشارہ ہے سورۂ انفال /آیت ۶۵؛ سورۂ توبہ ۳۸ اور نساء ۸۳ کی طرف۔

تیسری فصل

قوت غضبیہ کے انحراف کے خطرات

اس حدیث شریف میں قوت غضبیہ میں افراط اور حد سے تجاوز (جس میں اکثر لوگ مبتلا ہوتے ہیں) کو "سَفَه" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ یہ ایک صفت رذیلہ اور مذموم خصلت ہے جو انسان کو ہلاکت کی طرف لے جاتی ہے۔ بسا اوقات یہ افراط انسان کی دنیوی اور اخروی تباہی و ناکامی کا موجب بنتا ہے۔

وہ انسان جس کے اندر یہ قوت حد اعتدال سے خارج ہو اور افراط و غلبہ کی طرف مائل ہو۔ بسا اوقات یہ اس کی ہلاکت کا موجب بنتی ہے۔ ممکن ہے کہ ایسا انسان اپنے دین و دنیا کو تباہ و برباد کر ڈالے۔

کافی میں حضرت امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "غصہ ایمان کو اس طرح خراب کر دیتا ہے جس طرح سرکہ شہد کو"۔[۱]

بسا اوقات یہ قوت شدت کی حالت میں باؤلے کتے کی طرح انسان کی قوت غضبیہ سلب کر کے سرکشی اختیار کرتی ہے۔ یوں یہ انسان کو ناموس کی بے حرمتی اور مؤمنین کے قتل پر آمادہ کرتی ہے۔ کبھی غصے کی تاریکی ایمان کے نور کو بجھا دیتی ہے۔ کبھی غضب کی شعلہ ور آگ انسان کے برحق عقاید اور معرفت و ایمان کے نور کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے، نیز یہ ہزاروں جہالتوں اور حماقتوں کو جنم دیتی ہے جس کی تلافی انسان عمر بھر نہیں کر سکتا۔

اس قوت کا خطرہ تمام قوتوں سے زیادہ ہے، کیونکہ یہ قوت گاہے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ بہت بڑے خانمانسوز حادثات کو جنم دیتی ہے اور ایک منٹ میں انسان کو اس کے پورے وجود اور دنیا و آخرت کی کامیابی سے محروم کر دیتی ہے۔

ماہرین اخلاق کہتے ہیں کہ: "غصے کے دوران انسان کی مثال ایک غار کی طرح ہے جس میں آگ سلگائی گئی ہو اور اس کے اندر آگ کے شعلے اور دھواں بھر جائے اور ایک دوسرے کے ساتھ لپٹ جائیں اور آگ کے شعلے اپنی تیزی کے باعث سخت آوازیں نکالنے لگے۔ اس قسم کے آتش سوزاں کو بجھانا سخت مشکل

۱۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

﴿الغَضَبُ يُفْسِدُ الإيمَانَ كَمَا يُفْسِدُ الخَلُّ العَسَلَ﴾۔

اصول کافی، ج ۲، ص ۲۲۹، باب الغضب، ح ۱۔

ہے، کیونکہ اسے بجھانے کیلئے غار کے منہ میں جو کچھ ڈالیں آگ اسے نگل جائے گی اور اپنا ایندھن بنالے گی پھر وہ اسے بھی آگ کی صورت میں تبدیل کرکے ان کے ذریعے اپنے بھڑکاؤ میں اضافہ کرے گی''۔[1]

بنابریں اس حالت میں انسان اندھا اور بہرا ہوجاتا ہے۔ یہ حالت سفاہت، جہالت اور درندگی کی حالت ہے۔ اس حالت میں وعظ ونصیحت کا الٹا اثر ہوتا ہے اور اس کے آتش غضب میں اضافہ ہوتا ہے۔ بقراط حکیم کا قول ہے: ''اس شخص کے مقابلے میں جو سخت غضبناک ہو میں اس کشتی کو زیادہ محفوظ سمجھتا ہوں جو سخت ہواؤں اور طوفانوں کی زد میں ہو اور سمندر کی لہروں میں ہچکولے کھارہی ہو، نیز لہروں اور سمندری چٹانوں میں پھنس گئی ہو، کیونکہ کشتی کے ناخدا اس حالت میں مختلف طریقوں سے اسے تباہی سے بچا سکتے ہیں، لیکن اس حالت میں نفس کے علاج کا کوئی چارہ نہیں ہوتا[2] کیونکہ آپ جس قدر کوشش کریں اور وعظ ونصیحت سے کام لیں، نیز اس کے سامنے فروتنی اور گریہ وزاری کریں اس کے شعلے مزید بھڑکیں گے۔

حضرت باقر علیہ السلام سے مروی ہے: ''یہ غصہ شیطانی آگ کا ایک انگارہ ہے جو ابن آدم کے دل میں بھڑکایا جاتا ہے''۔[3]

انسان کے دل میں شیطان کے ہاتھوں بھڑکائی جانے والی یہی آگ ہے جو دوسرے عالم میں (جو اسرار وحقائق کے اظہار کا عالم ہے) ﴿نَارُ اللهِ الْمُوقَدَةُ ☆ الَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ﴾[4] کی صورت میں ظاہر ہو۔ غصے کا باطن شاید غضب خداوندی کی آگ ہو جس سب سے زیادہ سخت اور سوزاں آگ ہے اور دل کے باطن سے نکل کر بدن سے ظاہر ہوتی ہے جس طرح اعمال کی آگ (جو اعمال کے جہنم سے ہے) ظاہر سے گزر کر باطن کی طرف جاتی ہے۔

انسان اس ظاہری آگ اور باطنی آگ کے درمیان ایسے عذاب میں مبتلا ہے جسے ایک لمحے کیلئے سہنے کی طاقت دنیا بھر کے پہاڑوں میں بھی نہیں۔

۱۔ تہذیب الاخلاق، ص۱۶۴، ۱۶۵؛ نیز اخلاق ناصری، ص۱۷۵، ۱۷۶۔

۲۔ تہذیب الاخلاق، ص۱۶۵۔

۳۔ حدیث کا متن یہ ہے: ﴿إِنَّ الغَضَبَ جَمْرَةٌ مِنَ الشَّيطانِ، تُوقَدُ فِي قَلْبِ ابْنِ آدَمَ﴾۔ اصول کافی، ج۲، ص۲۳۱-۲۳۲، باب الغضب، ح۱۲۔

۴۔ اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ جو دلوں تک چڑھ جائے گی۔ سورۂ ہمزہ ۶، ۷۔

جہنم کی آگ کا انسان پر محیط ہونا ان احاطوں کی طرح نہیں جن کا مشاہدہ ہم دنیا میں کرتے ہیں، کیونکہ یہاں ظاہری احاطہ ہوتا ہے، یعنی چیزوں کی ظاہری سطح دوسری چیزوں کی ظاہری سطح کو گھیر لیتی ہے لیکن انکے باطن تک رسائی حاصل نہیں ہوتی جبکہ جہنم کی خدائی آگ ظاہر، باطن، گہرائی اور سطح سب کو گھیر لے گی۔ یہ احاطہ اللہ کی قیومیت کے احاطے کا ظہور ہے، کیونکہ اللہ کی قیومیت تمام چیزوں پر ایک ہی طریقے سے محیط ہے۔ خدا کی آگ جس طرح جسم کے ظاہر و باطن کو باہم جلاتی ہے اسی طرح روح اور قلب کو بھی جلاتی ہے۔ ایسی آگ کا تصور اس عالم میں نہیں ہوسکتا۔ اس دنیا کی کوئی آگ ظاہری حدود سے تجاوز نہیں کرتی اور باطن تک نہیں پہنچتی جبکہ جہنم کی آگ باطن کو زیادہ جلاتی ہے اور ظاہر کی بہ نسبت باطن کو زیادہ گھیرتی ہے۔

اگر قوت غضبیہ نفس کے اندر راسخ ہوجائے اور انسان کی فطرت ثانیہ بن جائے، نیز انسان کے وجود پر جذبہ درندگی کی حکمرانی ہوجائے اور انسان کی آخری صورت درندوں والی ہوجائے تو عالم برزخ اور قیامت میں انسان درندے کی شکل میں محشور ہوگا۔ برزخی واخروی درندے اور دنیوی درندے میں بہت فرق ہے جس طرح انسان کی درندگی دیگر حیوانوں کی درندگی سے بہت مختلف ہے۔

حدیث نبویؐ ہے: ''کچھ لوگ ایسی شکلوں میں محشور ہوں گے جن کے مقابلے میں بندر اور سور زیادہ اچھے لگیں گے''۔[۱]

جس طرح انسان کمال و جمال کے لحاظ سے وجود کی اعلیٰ ترین صف میں واقع ہے اور کوئی موجود اس کا ہم پلہ نہیں اسی طرح صفات رذیلہ اور نقص وعیب کے لحاظ سے بھی کوئی چیز اس کی ہم پلہ ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ اس کے بارے میں فرماتا ہے: ﴿أولٰئِکَ کَالأنْعامِ بَلْ هُمْ أضَلُّ﴾[۲] ان کے قلوب کے بارے میں فرماتا ہے: ﴿فَهِيَ کَالْحِجارَةِ أوْ أشَدُّ قَسْوَةً﴾[۳] اس صفت رذیلہ اور قبیح عادت کے باعث بسا اوقات دیگر خرابیاں بھی پیدا ہوتی ہیں، نیز یہ بہت سی اخلاقی برائیوں، باطل عقاید اور قبیح الاعمال کا موجب بنتی ہے۔

۱۔ حدیث کا متن یہ ہے: ﴿یُحْشَرُ بَعْضُ النّاسِ عَلیٰ صُورَةٍ تَحْسُنُ عِنْدَها القِرَدَةُ وَالخَنازِیرُ﴾۔ فیض کاشانی کی علم الیقین، ج۲، ص۹۰۱۔

۲۔ یہ لوگ چوپایوں کی طرح، بلکہ ان سے زیادہ گمراہ ہیں۔ سورۂ الاعراف ۱۷۹۔

۳۔ پس تمہارے قلوب پتھر کی طرح ہوگئے یا اس سے بھی زیادہ سخت۔ سورۂ بقرہ ۷۴۔

پس آخرت پر ایمان رکھنے والے بیدار انسان پر لازم ہے کہ ہر قسم کی ریاضت اور ہر ممکنہ طریقے سے اپنی اصلاح کرے اور اس صفت رذیلہ سے اپنے دل کو پاک کرے۔ اگر وہ اس قبیح صفت کے ہمراہ خدا نخواستہ اس دنیا سے چلا جائے تو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت نصیب ہونے سے پہلے وہ عذاب، عقاب، آگ اور مصیبت میں مبتلا ہو جائے گا جس کا سلسلہ شاید اس دنیا کی عمر کے برابر عرصے تک جاری رہے۔ پھر کہیں جا کر شاید اسے شفاعت نصیب ہو جائے، کیونکہ آخرت کی شفاعت مفت میں نصیب نہیں ہوگی، بلکہ شافع و مشفوع کے درمیان تناسب کے لحاظ سے نصیب ہوگی۔

بنابریں جو لوگ توحید اور ولایت کے نور سے محروم ہیں وہ شفاعت کے نور سے مستفید نہیں ہو سکیں گے۔ اسی طرح اگر گناہگار لوگوں کے گناہوں کی تاریکی نے ان کا خوب احاطہ کر لیا ہو تو ممکن ہو کہ طویل مدت بعد انہیں شفاعت نصیب ہو جائے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے: "میں نے بروز قیامت اپنی شفاعت کو اپنی امت کے ان لوگوں کیلئے بچا رکھا ہے جو گناہ کبیرہ کرتے ہیں"۔[۱]

عارف کامل شیخ شاہ آبادی (دام ظلہ) فرماتے تھے: "اس حدیث میں ذخیرہ (بچا رکھنے) کا ذکر اس لئے ہوا ہے کہ شفاعت آخری وسیلہ ہے اور ممکن ہے کہ طویل عرصے بعد اس وسیلے سے مدد لی جائے جس طرح بچا کر رکھی ہوئی چیز (ذخیرہ) سے اس وقت استفادہ کیا جاتا ہے جب کوئی اور چارہ نہ رہے اور یہی آخری وسیلہ ہو"۔

اگر ہم اس بات کا صرف احتمال بھی دیں تو یہ احتمال اس بات کیلئے کافی ہے کہ ہم اس خواب غفلت سے بیدار ہوں اور شیطانی فریب کے دام سے نکل جائیں اور اصلاح نفس کی تدبیر کریں اور اولیاء علیہم السلام کی اطاعت و مودت کے ذریعے اپنے آپ کو ان سے ہماہنگ کریں تاکہ ہم ان کی شفاعت کے مستحق ٹھہریں اور ان کی شفاعت کا نور ہماری اطاعت کے نور سے مخلوط ہو جائے، نیز ان کی روحانیت کا جذبہ ہمیں جذب کر لے۔ وَاللهُ الْهَادِي

۱۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں: ﴿وَأنا خَبَأْتُ شَفاعَتِي لِأهْلِ الكَبائِرِ مِنْ أُمَّتِي يَومَ القِيامَةِ﴾۔
بحار الانوار، ج ۸، ص ۴۰، کتاب العدل والمعاد، باب الشفاعۃ، ح ۲۱۔

چوتھی فصل

شدید غیظ وغضب کا علاج

انسان کو اپنی قوت غضب کا علاج اس وقت کرنا چاہئے جب اس کا نفس پر سکون ہو، غصے کی آتش سوزاں شعلہ ور نہ ہوا اور اس کے شعلوں سے اس کی آنکھیں اور اس کے کان مسدود اور عقل کی روشنی ماند نہ پڑ چکی ہوں، کیونکہ جب غصہ عروج پر ہو تو اس کا علاج ممکن نہیں۔ البتہ غصے کے عروج کے وقت بھی اس کے شعلہ سوزاں کو بجھانے کیلئے کچھ وقتی تدبیریں موجود ہیں۔ اگر انسان مکمّل طور پر دیوانہ اور بے شعور نہ ہو چکا ہو تو اس کا معالجہ کرنا چاہیے تا کہ غصہ مزید نہ بھڑکے۔

اس دوران علاج کا طریقہ یہ ہے کہ وہ توجہ ہٹانے کے اسباب فراہم کرے اور اپنی حالت پر توجہ کرے تا کہ غصے کی ابتدا میں اپنی حالت بدل دے اور مکمّل طور پر بے لگام ہونے سے پہلے اپنا چارہ خود کرے۔ اگر ممکن ہو تو اس جگہ سے نکل جائے جہاں غصے کے اسباب پروان چڑھیں اور اپنے آپ کو دیگر کاموں میں مشغول کرے۔ اگر وہ اس جگہ سے نہیں نکل سکتا تو وہیں اپنی حالت میں تبدیلی لائے مثلاً اگر کھڑا ہے تو بیٹھ جائے، اگر بیٹھا ہے تو لیٹ جائے اور اپنے ذہن کو ان کاموں میں مشغول کرے جو اسباب غضب سے مختلف ہوں۔

کافی کی روایت میں غصے کے علاج کے بارے میں ارشاد ہے: ''اگر تم میں سے کسی کو غصہ (جو شیطانی انگارہ ہے) کا خوف لاحق ہو تو وہ زمین سے چپک جائے (یعنی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے) کیونکہ اس طرح شیطان کی پلیدی دور ہو جائے گی''۔[1]

اسی طرح حضرت باقرؑ سے منقول ہے: ''اگر کوئی کسی جماعت سے غضبناک ہو جائے تو اگر وہ کھڑا ہے تو فوراً بیٹھ جائے اس میں شیطان کی پلیدی اس سے دور ہو جائے گی۔ اگر وہ اپنے رشتہ داروں سے غضبناک ہو تو بڑھ کر ان کو مس کرے کیونکہ جب رشتہ داروں کو مس کیا جائے تو اسے سکون آ جاتا ہے''۔[2]

۱۔ حدیث یہ ہے: ﴿فَاِذا خافَ أَحَدُکُمْ ذٰلِکَ مِنْ نَفْسِهِ فَلْيَلْزَمِ الأرْضَ، فَإِنَّ رِجْزَ الشَّيْطانِ لَيَذْهَبُ عَنْهُ عِنْدَ ذٰلِکَ﴾۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۲۳۱، باب الغضب، ح ۱۲۔

۲۔ حدیث یہ ہے: ﴿وَأَيُّما رَجُلٍ غَضِبَ عَلىٰ ذي رَحِمٍ فَلْيَدْنُ مِنْهُ فَلْيَمَسَّهُ، فَإِنَّ الرَّحِمَ إذا مُسَّتْ سَکَنَتْ﴾۔ مذکورہ کتاب، ص ۲۲۹، ح ۲۔

اہل سنّت کی روایت ہے کہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غضبناک ہوتے تھے تو اگر کھڑے ہوتے تو بیٹھ جاتے اور اگر بیٹھے ہوتے تو پشت کے بل لیٹ جاتے تھے، یوں آپ ؐ کا غصہ ٹھنڈا ہو جاتا تھا۔[۱]

لیکن اگر انسان کا غصہ بے لگام اور شعلہ ور ہو جائے تو اب دوسروں کو اس کا علاج کرنا چاہئے۔ اس صورت میں اس کا علاج بہت مشکل ہے اور وعظ و نصیحت سے کام نہیں بنتا۔ یہاں مجبوراً ڈرا دھمکا کر یا ان لوگوں کو حاضر کر کے جن سے یہ دبتا ہے علاج کرنا چاہئے، کیونکہ ان لوگوں کے سامنے جو اس کی نظر میں جاہ وحشمت کے مالک ہیں اس کا غصہ ظاہری طور پر شعلہ ور نہیں ہوگا۔ البتہ اندر ہی اندر جمع ہوگا اور سلگتا رہے گا۔

اکثر یہ باطنی غم و غصہ انسان کو مہلک بیماریوں میں مبتلا کر سکتا ہے۔ اس لئے اس حالت میں غضبناک انسان کو اپنی حالت پر چھوڑ دینا اور عملی تدبیروں سے اس کی حالت بدلنا زیادہ مفید ہے۔ بہرحال یہ ایک بہت مشکل کام ہے۔

پانچویں فصل

سفاہت اور شدید غصے کا علاج اس کے اسباب کے معالجہ کے ذریعے

اس کے اسباب بہت سارے ہیں لیکن ہم یہاں ان میں سے ایک اہم سبب کا ذکر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جو دیگر اسباب کی بنیاد اور جڑ ہے۔

انسان کی قوت غضبیہ کو بھڑکانے والے بنیادی اسباب میں سے ایک اس کی پسندیدہ چیز کی راہ میں رکاوٹ ڈالنا ہے، جس طرح کتے ایک مردار کے گرد جمع ہوتے ہیں اور کوئی مزاحمت پیش آتی ہے تو ان کا جذبہ غضب جوش مارنے لگتا ہے اور باہمی جنگ شروع ہوتی ہے۔ مولی الموالی حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے منقول ہے: ''یہ دنیا مردار ہے اور اسے طلب کرنے والے کتے ہیں''[۲] یہ ایک بہترین تشبیہ ہے، کیونکہ دنیا پرستوں کی جنگ اور کھینچا تانی اس گندے مردار کی خاطر ہے۔

۱۔ حدیث کا متن یہ ہے: ﴿كانَ اِذا غَضِبَ وَهُوَ قائِمٌ جَلَسَ، وَاِذا غَضِبَ وَهُوَ جالِسٌ اضْطَجَعَ، فَيَذْهَبُ غَضَبُهُ﴾۔ کنز العمال (متقی ہندی)، ج ۷، ص ۱۴۱، ح ۱۸۴۰۴۔

۲۔ یہ حدیث یوں بھی نقل ہوئی ہے: ﴿اِنَّما الدُّنْيا جِيفَةٌ، وَالْمُتَوافُونَ عَلَيْها اَشْباهُ الْكِلابِ﴾۔ تصنیف غرر الحکم، ص ۱۳۷، ش ۲۴۰۹۔

بنابریں تمام بیماریوں کی جڑ اور خرابیوں کا سرچشمہ حبّ دنیا کو قرار دینا چاہیئے جو تمام غلطیوں کا منبع ہے۔ حبّ دنیا اگر دل میں جاگزیں ہو جائے تو جونہی کسی دنیوی مفاد کے سامنے کوئی رکاوٹ آجائے غیظ وغضب کا جذبہ جوش مارنے لگتا ہے جو انسان کو بے لگام بنا دیتا ہے اور اسے عقل وشریعت کی راہ سے خارج کر دیتا ہے۔ پس اس قوت کا بنیادی علاج کرنے کیلئے اس کی جڑ کو اکھاڑنا ضروری ہے جو حبّ دنیا سے عبارت ہے۔

اگر انسان دنیا کی محبت سے نفس کو پاک کرے تو دنیوی مفادات سے سہل انگاری اور لاپروائی برتنے لگے گا۔ پھر وہ جاہ ومنصب اور مال ودولت وغیرہ کے فقدان کے باعث بے سکون نہیں ہوگا۔ یوں انسان کے اندر حقیقی حلم، بردباری اور اطمینان قلب کی خصلت پیدا ہوگی اور نفس کے قرار وسکون میں روز بروز اضافہ ہوگا۔

اس فاسد عنصر (جو تمام خرابیوں کا منبع ہے) کا خاتمہ کرنے کیلئے انسان جس قدر ریاضت کرے مناسب اور بجا ہے۔ اسے جڑ سے اکھاڑنے کیلئے گزشتہ لوگوں کے حالات میں غور اور قرآنی حکایتوں میں تفکّر بہترین راہ علاج ہے۔ سلطنت، عظمت، جاہ وجلال اور مال ومنال کے حامل افراد (جو چند دن ان چیزوں سے استفادہ کرکے چلے گئے اور ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ان کی حسرت اور ان کے برے نتائج کے ساتھ قبروں میں دفن ہوگئے) کے حالات سے عبرت حاصل کرنا بیدار لوگوں کیلئے بہترین درس ہے۔

عقلمند انسان کو چاہیئے کہ وہ اپنی دنیوی زندگی کی موت اور دنیوی احتیاجات کا موازنہ اخروی زندگی کی مدت اور وہاں کی احتیاجات سے کرے پھر موازنہ کرے کہ وہ اس دنیا کی ضروریات واحتیاجات کے حصول کو کتنی اہمیت دیتا ہے اور اخروی احتیاجات کے حصول پر کتنی توجہ دیتا ہے۔ پھر یہ دیکھے کہ دنیا کی سو سالہ فرضی زندگی کیلئے کس قدر وسائل جمع کرے اور آخرت کی ابدی زندگی (جس کی کوئی انتہا نہیں) کیلئے کتنا جمع کرے۔ پھر یہ بھی غور کرے کہ آخرت میں اسے کن حسرتوں اور کس کس ندامت سے روبرو ہونا پڑے گا

﴿وَالْعَصْرِ ☆ اِنَّ الْأِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ﴾[1]

اللہ گواہ ہے کہ انسان کو اس قدر عظیم خطرہ اور خسارہ درپیش ہے کہ اگر اسے اس کا حقیقی علم ہو جائے تو

۱۔ زمانے کی قسم! انسان خسارے میں ہے۔ سورۂ والعصر ۱،۲۔

اس کا اطمینان وسکون چھن جائے گا۔اس سے بڑا خسارہ کیا ہے کہ انسان ایک طرف سے اپنی کامیابی وفلاح کے تمام اسباب کو ضائع کرے اور اس سے بھی بدتر یہ کہ فلاح کے اسباب کو ناکامی، تباہی اور بدبختی کے حصول کی خاطر خرچ کرے اور اپنا خون پسینہ ایک کر کے اپنے لئے جہنم اور آگ کا ٹھکانہ تیار کرے؟ اس سے بڑا خسارہ کیا ہے کہ آدمی اس دنیا کی چند سالہ زندگی کی خاطر اپنا سارا وقت ضائع کرے جبکہ اسے چاہئے کہ وہ ان اوقات کو ابدی زندگی کی خاطر صرف کرے، نیز وہ اس جگہ سے محبت کرے جسے وہ چند دنوں بعد خیر باد کہہ کر چلا جائے گا اور حسرت وندامت کے علاوہ اس کیلئے کوئی چیز باقی نہ رہے گی؟

خلیل آسا در علم الیقین زن ندای لا أُحِبُّ الآفلین زن

(خلیل اللہ کی طرح علم الیقین کا دروازہ کھٹکھٹاؤ اور ''لا اُحِبُّ الآفلین'' کا نعرہ لگاؤ)

اگر انسان اولیاء (علیہم السلام) (جو بشریت کے عملی معلم ہیں) کے حالات پر ذرا سا غور کرے تو وہ اپنے خسارے کو جان لے گا۔

خدایا! ہم سوئے ہوئے ہیں، ہم نے اپنی زندگیاں فضول چیزوں میں صرف کی ہیں؛ تو خود ہمیں اس خواب گراں سے بیدار فرما، ہمیں راہ راست کو دیکھنے کی توفیق دے۔اس پر فریب دنیا سے ہمارے دلوں کا رشتہ توڑ دے۔ ہماری آنکھوں کو ایسا بنا دے کہ جو تیرے علاوہ دوسری چیزوں کو نہ دیکھیں۔اپنے حسن وجمال سے ہمارے دلوں کو منور فرما ﴿اِنَّکَ ذُو فَضْلٍ عَظِیم﴾۔

چھٹی فصل

حلم کے حصول کا طریقہ

جان لو کہ انسان جب تک اس دنیا میں ہے وہ اپنی ہر عادت اور خصلت کو کسی دوسری عادت یا خصلت میں تبدیل کر سکتا ہے، کیونکہ یہ دنیا تغیر وتبدل کی دنیا ہے۔بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ: ''فلاں صفت فطری وجبلّی ہے اور نا قابل تغییر ہے اور اس میں تبدیلی ممکن نہیں''[1] یہ دعویٰ بے بنیاد ہے اور اس کی کوئی علمی اساس نہیں۔

۱۔ دیکھئے، غزالی کی احیاء العلوم، ج ۳، ص ۵۵، باب فی بیان قبول الاخلاق للتغیر بطریق الریاضۃ۔

یہ حقیقت فلسفی دلائل و براہین سے ثابت شدہ ہونے کے علاوہ[1] ایک محسوس اور تجربے سے ثابت شدہ حقیقت بھی ہے۔ اس کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ شریعت مطہرہ نے تمام بری صفات و عادات اور اخلاق فاسدہ سے منع کیا ہے اور ان کے علاج کا حکم دیا ہے۔ اسی طرح تمام اچھی عادات وصفات اور اخلاق حسنہ اپنانے کا حکم دیا گیا ہے۔ پس انسان کو چاہئے کہ اس دنیوی زندگی کے خاتمے سے پہلے اس کی قدر و قیمت پہچانے اور اچھی عادات (جو انسان کی فلاح و کامیابی کی بنیاد ہے) کو اپنانے کی کوشش کرے اور ہر طرح کی ریاضت کے ذریعے نفس کو بری عادتوں سے پاک کرنے کے بعد اچھی عادتوں (جو عقل اور رحمٰن کے لشکر ہیں) سے آراستہ کرنے کیلئے جانفشانی کرے اور اس معاملے میں سستی سے کام نہ لے۔ اسے صرف اسی بات پر اکتفا نہیں کرنا چاہئے کہ وہ اخلاق فاسدہ اور بری عادات وصفات سے عاری ہے، کیونکہ خرابیوں کا خاتمہ کرنا نفس کی اصلاح اور اسے کمال تک پہنچانے کی تمہید ہے۔

جو چیز زیادہ ضروری ہے وہ روحانی کمالات کا حصول ہے جو انسان کی کامیابی وخوش بختی کی بنیاد ہے اور توحید کے درجہ کمال تک رسائی کی تمہید ہے۔ اسی طرح تقویٰ بھی بذات خود مطلوب نہیں۔ نفس کو عادات خبیثہ سے پاک کرنا تقوی کے مانند ہے اگر ہم تقوی کے عملی مرحلے کو مدنظر رکھیں۔ جس طرح تقوی آلودگیوں سے نجات حاصل کرنے اور حصول پاکیزگی کا ذریعہ ہے اور یہ پاکیزگی عمل کی تکمیل کا وسیلہ ہے اسی طرح صفات خبیثہ سے نجات (جو تقویٰ کا ایک درجہ ہے بشرطیکہ ہم اس کے عام معنی کو ملحوظ رکھیں) روحانی کمالات کی تمہید ہے جو صفات حسنہ سے عبارت ہیں۔ اسی طرح تقویٰ کا کامل مرتبہ (جو غیر اللہ سے روگردانی اور شرک کی جملہ صورتوں سے نجات سے عبارت ہے) حصول توحید اور اللہ کی طرف توجہ کی تمہید ہے اور یہی تخلیق انسانی کا اصلی ہدف ہے چنانچہ حدیث قدسی میں اس نکتے کی طرف یوں اشارہ ہوا ہے: ﴿كُنتُ كَنزاً مَخفِيّاً فَأَحبَبتُ أَنْ أُعرَفَ، فَخَلَقتُ الخَلقَ لِكَي أُعرَفَ﴾[2]

ہم اس سے قبل ذکر کر چکے ہیں کہ تمام برحق ادیان کی بنیاد دو فطرتوں پر استوار ہے۔ اس میں سے ایک

۱۔ الاسفار الاربعہ، ج ۹، ص ۸۶، فصل ۲ و ۳، باب ۹؛ نیز محقق طوسی کی اخلاق ناصری، ص ۱۰۱، فصل اول، حصہ ۲، مقالہ ۱۔

۲۔ میں ایک پوشیدہ خزانہ تھا۔ پس میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں، پس میں نے مخلوقات کو خلق کیا تا کہ میں پہچانا جاؤں۔ موسوعۃ اطراف الحدیث النبوی الشریف، ج ۶، ص ۵۰۷۔

ذاتی اور اصلی فطرت ہے اور وہ ہے کمال مطلق سے عشق کا جذبہ۔ یہ فطری جذبہ خداجوئی اور خداخواہی کی بنیاد ہے۔ دوسری فطرت فرعی طفیلی اور ثانوی ہے۔ یعنی پہلی فطرت کا لازمہ ہے وہ ہے نقص وعیب اور فقدان سے نفرت کا جذبہ۔ یہ فطری جذبہ تقویٰ اور پاکیزگی کے حصول کی بنیاد ہے اگر ہم تقویٰ سے اس کا عام مفہوم مراد لیں۔ تمام ادیان کے احکام خواہ وہ قلبی احکام ہوں یا جسمانی ان دو خداداد اصولوں کی بنیاد پر استوار ہیں۔[۱]

اب ہم اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہیں اور وہ ہے ''حصول حلم کا طریقہ''

یادرہے کہ بدن اور روح کے درمیان مضبوط ربط کے باعث تمام ظاہری آثار روح میں اور تمام روحانی اثرات بدن میں سرایت کر جاتے ہیں، کیونکہ فلسفے میں ثابت ہو چکا ہے کہ نفس غیب وشہود دونوں مراحل کا حامل ہے۔ وہ پستی کے باوجود بلند ہے اور بلندی کے باوجود پست اور اس کی تمام قوتوں میں وحدت ہے۔[۲] پس اگر کوئی اپنی حرکات وسکنات کا خیال رکھے اور آرام وسکون کا مظاہرہ کرے اور ظاہری اعمال میں حلیم لوگوں کی روش اپنائے تو رفتہ رفتہ یہ ظاہری اثرات روح کے اندر سرایت کر جائیں گے اور روح ان سے متاثر ہوگی۔ اسی طرح اگر انسان ایک مدت تک غصے کو دبائے رکھے اور صبر وحلم کی بناوٹی کوشش کرے تو حلم کو اپنانے کی یہ بناوٹی کوشش اصلی حلم میں بدل جائے گی پھر یہی بناوٹی اور جبری کوشش اس کی عادت بن جائے گی۔ اگر ایک عرصے تک انسان اس عمل پر مکمل پابندی اور توجہ کے ساتھ کاربند رہے تو مطلوبہ نتائج ضرور حاصل ہوں گے۔

اہل بیت وحی (علیہم السلام) کی احادیث میں علاج کا یہ طریقہ مذکور ہے۔ چنانچہ الوسائل میں نہج البلاغہ سے منقول ہے، مولائے متقیان علیہ السلام نے فرمایا: ''اگر تم حلیم نہیں ہو تو حلیم بننے کی بناوٹی کوشش کرو، کیونکہ بہت کم ہیں وہ لوگ جو کسی قوم کی شباہت اختیار کریں (نقل کریں) مگر یہ کہ امید ہے کہ وہ ان میں سے ہو جائیں''[۳]

۱۔ دیکھئے، ص ۲۷۰۔

۲۔ الاسفار الاربعہ، ج۸، ص۲۲۱، فصل۴، باب۵؛ نیز، ج۹، ص۵۶، فصل۵، باب۸۔

۳۔ حدیث کا متن یہ ہے:

﴿اِن لَم تَکُن حَلِیماً فَتحَلَّم، فَاِنَّهُ قَلَّ مَن تَشَبَّهَ بِقَومٍ اِلَّا وَ اَوشَکَ اَن یَکُونَ مِنهُم﴾۔

وسائل الشیعہ، ج۱۵، ص۲۶۸، باب۲۶، ابواب جہاد النفس، ح۱۴؛ نیز نہج البلاغہ، ص۵۰۶، نمبر۲۰۷۔

حضرت امام صادقؑ سے بھی منقول ہے کہ: ''اگر تم حلیم نہیں ہو تو حلم کی بناوٹی کوشش ہی کرو''۔ا

ساتویں فصل

حلم کی فضیلت قرآن وسنّت کی روشنی میں

عقلی لحاظ سے حلم کی فضیلت تو واضح ہے۔حلم کے آثار وفوائد بھی عقل سلیم رکھنے والوں پر پوشیدہ نہیں۔ حلم کی فضیلت میں یہی کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں اپنے آپ کو ''حلیم'' کے نام سے یاد فرماتا ہے۔سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۴۴ میں فرماتا ہے:﴿اِنَّهُ كَانَ حَلِيماً غَفُوراً﴾۲ سورۂ احزاب کی آیت ۵۱ میں ارشاد ہوتا ہے:﴿وَكَانَ اللهُ عَلِيماً حَلِيماً﴾۳ اس سے معلوم ہوا کہ حلم ان اوصاف کمالیہ میں سے ہے جن کا تعلّق کمالات مطلقہ سے ہے اور وہ وجود بلحاظ وجود کا مصداق ہے، کیونکہ فلسفہ میں ثابت ہو چکا ہے کہ اللہ کے اوصاف وہ ہیں جو کمالات مطلقہ میں سے ہوں اور وہ ﴿مَوجُودٌ بِمَا أَنَّهُ مَوجُودٌ﴾ وجود بلحاظ وجود، کے مصداق ہوں۔

تمام اوصاف کمالیہ رحمٰن کے لشکر ہیں، کیونکہ حق اور رحمٰن کے لشکر اس کا سایہ ہیں اور کسی چیز کا سایہ اس سے جدائی اور دوری والی مبانیت نہیں رکھتا۔البتہ صفت کے لحاظ سے اختلاف مبانیت رکھتا ہے جسے تباین وصفی کہتے ہیں۔اس سے مراد کمال ونقص کے لحاظ سے مختلف ہونا ہے۔قرآن شریف میں اس باریک عرفانی نکتے اور برہان کے ذریعے ثابت حقیقت کو آیت اور نشانی کا نام دیا گیا ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم خلیل الرحمٰن کو (جو عالم وجود کے کامل ترین اور عظیم ترین ہستیوں میں سے ہیں) حلیم کا نام دیا ہے۔سورۂ ہود کی آیت ۷۵ میں ارشاد ہے:﴿اِنَّ اِبراهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوّاهٌ مُنِيبٌ﴾۴ حضرت اسماعیل ذبیح اللہ کو بھی اللہ نے حلم کی صفت کا حامل قرار دیا ہے۔سورۂ صافات

۱۔ حدیث کا متن یہ ہے:﴿اذا لَمْ تَكُنْ حَلِيماً فَتَحَلَّمْ﴾۔

اصول کافی، ج۲،ص ۹۱ و ۹۲، باب الحلم، ح۶؛ نیز وسائل الشیعہ، ج۱۵،ص ۲۱۱، ح ۷۔

۲۔ بہ تحقیق وہ بردبار اور بخشنے والا ہے۔

۳۔ اللہ خوب جاننے والا اور بردبار ہے۔

۴۔ بے شک ابراہیم بردبار، نرم دل اور اللہ کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔ سورۂ ہود ۷۵۔

آیت ۱۰۱ میں فرماتا ہے: ﴿فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ﴾، اللہ حضرت ابراہیمؑ کو دی گئی بشارت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے: ''ہم نے اسے ایک بردبار بیٹے کی خوشخبری دی''۔ اللہ نے دیگر صفات کو چھوڑ کر اسماعیل کیلئے اس صفت کا انتخاب فرمایا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت ابراہیم خلیلؑ اس صفت کمالی کو نہایت اہمیت دیتے تھے یا اللہ سے اہمیت دیتا ہے یا دونوں کے ہاں اس کی اہمیت زیادہ ہے۔ بہرحال یہ آیت ''حلم'' کی اہمیت اور خصوصی مقام کو ثابت کرتی ہے۔

احادیث شریف میں اس عادت حسنہ کی شایان شان تعریف کی گئی ہے۔ کافی شریف میں حضرت باقرؑ سے مروی ہے کہ: ''بہ تحقیق اللہ باحیا اور حلیم انسان کو پسند کرتا ہے''۔[۱]

دوسری روایت میں فرماتا ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا: ''بے شک اللہ دوست رکھتا ہے اس باحیا انسان کو جو حلیم، عفیف اور سخت باعفت ہو''۔[۲] درباب محبت و معرفت کے نزدیک یہ تعریف سب سے بڑی تعریف ہے، کیونکہ ان کے نزدیک اللہ کی محبت کا موازنہ کسی چیز سے نہیں کیا جاسکتا نہ کسی چیز کا موازنہ اس سے ہوسکتا ہے۔ شیخ بہائیؒ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے کہا: ''اللہ جس سے محبت کرتا ہے اسے اپنی ملاقات سے محروم نہیں کرتا اور اسے اپنی وصال سے سرافراز فرماتا ہے۔ صاحبان معرفت اور بیدار دل لوگوں کیلئے یہ خصوصیت کافی ہے''۔

الوسائل میں شیخ صدوقؒ سے منقول ہے کہ حضرت امام صادق علیہ السلام اپنے آباء سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امیر المومنین علیہ السلام کو اپنی نصیحت میں فرمایا: ''اے علی! کیا میں تم لوگوں کو اس شخص کی خبر نہ دوں جو اخلاق کے لحاظ سے تم لوگوں میں سب سے زیادہ مجھ سے شبیہ ہو؟ عرض کیا: کیوں نہیں اے رسول اللہ۔ فرمایا: (یہ وہ شخص ہے) جو اخلاق کے لحاظ سے تم میں سب سے بہتر ہو، حلم کے لحاظ سے تم میں سب سے عظیم ہو، اپنے رشتہ داروں کیلئے تم میں سب سے اچھا سلوک کرنے والا ہو اور اپنے بارے میں انصاف سے کام لینے میں تم میں سب سے آگے ہو''۔[۳]

۱۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں: ﴿إِنَّ اللهَ عَزَّ وَجَلَّ، يُحِبُّ الحَيِيَّ الحَلِيمَ﴾۔ اصول کافی، ج۲، ص۹۱، باب الحلم، ح۴۔

۲۔ حدیث نبویؐ یہ ہے: ﴿إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الحَيِيَّ العَفِيفَ المُتَعَفِّفَ﴾۔ اصول کافی، ج۲، ص۹۲، باب الحلم، ح۸۔

۳۔ حدیث کا متن یہ ہے:

﴿يَا عَلِيُّ! أَلاَ أُخْبِرُكُمْ بِأَشْبَهِكُمْ بِي خُلُقاً؟ قَالُوا: بَلَىٰ يَا رَسُولَ الله. قَالَ: أَحْسَنُكُمْ خُلُقاً وَأَعْظَمُكُمْ -->

شیخ صدوقؒ کی الخصال میں حضرت امام صادقؑ اپنے والد گرامی سے اور وہ اپنے جد گرامی سے اور وہ علی ابن ابی طالبؑ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: ''حلم اور علم کے اجتماع سے بہتر اجتماع کسی دوسری چیزوں کے درمیان نہیں ہوا''۔[1]

اس سلسلے میں معتبر کتابوں میں بہت سی احادیث موجود ہیں۔ خواہشمند حضرات ان کتابوں کی طرف رجوع کریں۔[2]

یاد رہے کہ چونکہ بیسویں مقصد کی تیسری فصل سے یہ معلوم ہوگیا کہ حلم فطرت مخمورہ کا لازمہ ہے اور یہ عقل اور رحمٰن کا لشکر ہے، نیز یہ بھی معلوم ہو چکا کہ سفاہت فطرت مخمورہ کی مخالف اور جہل و ابلیس کا لشکر ہے، لہذا ہم یہاں ایک الگ فصل کے تحت اس پر بحث سے گریز کرتے ہیں۔

<-- حِلْمـاً وَأبَرُّكُمْ بِقَرابَتِهِ، وَأشَرُّكُمْ مِنْ نَفْسِهِ اِنْصافـاً﴾۔

وسائل الشیعہ، ج ۱۵، ص ۲۶۷، ابواب جہاد النفس، ح ۹؛ نیز من لایحضرہ الفقیہ، ج ۴، ص ۲۶۸، ح ۴۔

۱۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

﴿وَالَّذي نَفْسي بِيَدِهِ ما جُمِعَ شَيءٌ اِلىٰ شَيءٍ أفْضَلُ مِنْ حِلْمٍ اِلىٰ عِلْمٍ﴾۔

الخصال، ص ۴و۵، ح ۱۱؛ نیز، وسائل الشیعہ، ج ۱۵، ص ۲۶۸، باب ۲۶، ابواب جہاد النفس، ح ۱۲۔

۲۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۹۱، باب الحلم؛ نیز، وسائل الشیعہ، ج ۱۵، ص ۲۶۵، باب استحباب الحلم، (۲۶) ابواب جہاد النفس۔

مقصد / ۲۱

''صَمت'' اور اس کی ضد ''هَذَر''

یہ مقصد چار فصلوں پر مشتمل ہے:

پہلی فصل

خاموشی کے فوائد

''صمت''، سکوت اور خاموشی سے عبارت ہے[1] لیکن یہاں صمت سے مراد ہر خاموشی مراد نہیں، کیونکہ سکوت مطلق (ہر قسم کی خاموشی) عقل کا لشکر نہیں اور نہ گفتگو سے افضل ہے، بلکہ برمحل گفتگو سکوت سے بہتر ہے، کیونکہ گفتگو کے ذریعے علوم وحقایق دینیہ کی ترویج اور معارف وآداب شریعت کی تبلیغ ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کا ایک نام ''متکلم'' ہے اور اس کی صفت تکلّم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس حدیث میں صمت کے مقابلے میں ''تکلّم'' کو نہیں لایا گیا، بلکہ ''ہذر'' کا ذکر کیا گیا ہے جو ہذیان، یعنی فضول اور لایعنی گفتگو سے عبارت ہے[2]

پس جس خاموشی کی شریعت نے تعریف کی ہے اور عقل اس کی تائید کرتی ہے اور جو عقل کا لشکری ہے اس سے مراد ہذیان اور فضول گفتگو سے اجتناب والی خاموشی ہے۔ یہ سکوت اور زبان کو لغو اور فضول باتوں سے محفوظ رکھنا، انسانی کمالات اور خوبیوں میں سے ایک ہے، بلکہ زبان پر کنٹرول اور اس سرکش سانپ کو رام کرنے کی صلاحیت ایک عظیم ترین ہنر ہے جس میں بہت کم لوگ کامیاب ہوتے ہیں۔ اگر کسی کو یہ قوت حاصل ہو جائے تو وہ بہت سے خطرات اور آفات سے محفوظ رہتا ہے، کیونکہ زبان بہت ساری آفات

۱۔ اقرب الموارد (شرتونی)، ج۱، ص۲۶۰۔

۲۔ لسان العرب، ج۱۵، ص۶۵۔

وخطرات کی حامل ہے۔ بعض لوگوں نے زبان کی تقریباً بیس آفتوں کا ذکر کیا ہے[۱] جو بیس سے زیادہ بھی ہوسکتی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ کلام کا تعلّق کمالات وجود سے ہے اور گفتگو بہت سی خوبیوں کی حامل ہے۔ اس کے بغیر علم کے دروازے نہیں کھل سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس کی شایان شان تعریف کی ہے اور سورۂ رحمٰن میں فرمایا ہے: ﴿الرَّحْمٰنُ ... خَلَقَ الاِنْسانَ عَلَّمَهُ الْبَيانَ﴾[۲] اس آیت میں اللہ نے بیان کی تعلیم کو تمام نعمتوں پر مقدم رکھا ہے، لیکن ان سب کے باوجود چونکہ زبان کے نقصانات کا خطرہ ہر دم موجود رہتا ہے اور زبان کو قابو میں رکھنا مشکل ترین کاموں میں سے ایک ہے اس لئے خاموشی کو گفتگو پر ترجیح حاصل ہے۔

ارباب ریاضت اپنے لئے سکوت کو ضروری قرار دیتے تھے[۳] اسی طرح وہ خلوت اور گوشہ گیری کو بھی اسی لئے اہمیت دیتے تھے اگر چہ اہل معرفت، دانشوروں اور ارباب سیر وسلوک وریاضت کے ساتھ رہنے میں بہت سے فوائد اور ثمرات پوشیدہ ہیں۔ گوشہ نشینی بہت سے علوم ومعارف سے محرومی کا باعث ہے۔ خدمت خلق (جو بہترین اطاعت اور قرب خداوندی کے اسباب میں سے ایک ہے) بھی غالباً لوگوں کے ساتھ رہن سہن کی صورت میں ہی ممکن ہوتی ہے، لیکن چونکہ لوگوں کے ساتھ میل جول کے نقصانات بھی بہت زیادہ ہیں اور انسان عام طور پر اپنے آپ کو ان سے محفوظ نہیں رکھ سکتا اس لئے بڑے بڑے اہل ریاضت گوشہ نشینی کو لوگوں کے ساتھ میل جول پر ترجیح دیتے ہیں۔[۴]

حقیقت یہ ہے کہ ابتدائے امر میں جب انسان تعلیم وتربیت حاصل کر رہا ہو تو اسے علماء اور دانشوروں سے میل جول رکھنا چاہئے۔ البتہ اس شرط کے ساتھ کہ میل جول کے آداب کی رعایت کی جائے اور جن کے ساتھ میل جول رکھا جائے ان کے احوال واخلاق کا مطالعہ کیا جائے۔ سیر وسلوک کی ابتداء اور درمیان میں اور آخری مراحل کی ابتداء میں بھی ریاضت کے ماہرین ومشائخ سے استفادہ کرنا چاہئے جس کیلئے میل جول

۱۔ المحجۃ البیضاء، ج ۵، ۱۹۰، کتاب آفات اللسان؛ نیز، احیاء العلوم، ج ۳، ص ۱۰۷۔

۲۔ خداوند رحمٰن نے ... انسان کو خلق کیا، اسے بولنا سکھایا۔ سورۂ الرحمٰن ۱، ۴۔

۳۔ دیکھئے، احیاء علوم الدین، ج ۳، ص ۱۱۱۔

۴۔ احیاء علوم الدین، ج ۲، ص ۲۲۶، باب فی فوائد العزلۃ؛ نیز، ملا عبدالرزاق گیلانی کی شرح مصباح الشریعہ، باب ۲۴، ص ۱۵۷؛ نیز، صدر المتألہین شیرازیؒ کی شرح اصول کافی، ج ۱، ص ۳۶۸۔

ضروری ہے۔ پھر جب آخری مراحل کو طے کر رہا ہو تو کچھ مدت تک اپنی حالت میں مگن رہے، نیز خدا اور ذکر خدا میں مشغول رہے۔ ان ایام میں اگر اللہ کے ساتھ خلوت اور لوگوں کے ساتھ میل جول باہم ساز گار اور قابل جمع نہ ہوں تو گوشہ نشینی اختیار کرے یہاں تک کہ ملکوت اعلیٰ سے اس پر مناسب کمال کا افاضہ ہو۔ پھر جب وہ اپنے اندر اطمینان قلب، ثبات، اور استقامت کا مشاہدہ کرے، نیز نفسانی خطرات اور شیطانی وسوسوں سے اپنے آپ کو محفوظ خیال کرے اور اطمینان حاصل ہو تو اس کے بعد لوگوں کی رہنمائی اور بندگان خدا کی تعلیم وتربیت اور خدمت کی خاطر لوگوں سے میل جول شروع کرے اور اس بات کی کوشش کرے کہ بندگان خدا کی مدد میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرے۔

اسی طرح سکوت، خاموشی، گفتگو اور ارشاد و ہدایت کے حوالے سے یہ ایک عام اصول ہے کہ طالب علمی کے دور میں انسان درس بحث اور حصول علم سے سروکار رکھے اور اس دوران صرف فضول گفتگو اور باتوں سے پرہیز کرے۔ پھر جب کامل ہو جائے تو تفکّر و تدبر میں مشغول ہو جائے اور اللہ کے ذکر اور اپنے امور کے علاوہ دیگر چیزوں کے ذکر سے اپنی زبان بند رکھے یہاں تک کہ اس کے دل پر ملکوتی افاضات کی بارش ہو۔ پھر جب اس کا وجود ربانی ہو جائے اور وہ اپنی گفتگو اور زبان سے مطمئن ہو جائے تو اپنی زبان کھولے اور لوگوں کی تعلیم وتربیت اور دستگیری کا سلسلہ شروع کرے اور ان کی خدمت کے سلسلے میں کوئی کسر نہ چھوڑے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہو جائے اور اسے تربیت کرنے والے بندوں میں شامل کرلے اور اسے معلّم و مرشد ہونے کا شرف عطا کرے اور اگر اس دوران کوئی نقص رہ گیا ہو تو اس خدمت کے طفیل اللہ تعالیٰ اس کا ازالہ کر دے۔

دوسری فصل

فضول گفتگو کے نقصانات

کئی بار ذکر ہو چکا ہے کہ انسان کی روح اور ملکوتی باطن کا اس کے ظاہر اور اس کی مادی وجسمانی قوتوں کے ساتھ اس قدر مضبوط ربط ہے کہ اس کے ظاہر و باطن میں سے ہر ایک کے اثرات دوسرے پر مرتب ہوتے ہیں، نیز ہر ایک کے کمالات و نقائص اور درستی و نادرستی دوسرے تک سرایت کر جاتی ہیں۔

چنانچہ ایک کامل اور سالم روح اپنی سلامتی اور کمال کو جسمانی قوتوں کے ذریعے ظاہر کرتی ہے۔ اس کی

مثال اس کوزے کی طرح ہے جو اپنے صاف اور شیریں پانی کو اپنے مساموں کے ذریعے باہر منتقل کرتا ہے۔ اس کے یہ مسام اس کے ظاہر و باطن کے درمیان رابطے کا کام دیتے ہیں: ﴿قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهِ﴾۱ اسی طرح ایک بیمار اور معیوب روح (جس کے چہرے سے سیہ بختی اور پریشانی ہویدا ہو اور جو شیطانی تصرفات کے باعث اپنی خوبختی اور فطری کمال سے محروم ہو چکی ہو، نیز مختلف قسم کے پردوں میں محجوب ہو چکی ہو) ان مساموں کے ذریعے جو عالم ملکوت اور عالم ملک کے درمیان رابطہ کا کام دیتے ہیں اپنا رنگ (جو شیطانی رنگ ہے اور صبغۃ اللہ، یعنی خدائی رنگ کے مقابلے میں ہے) باہر کی طرف ظاہر کرے گی۔ یہ بیمار روح ظاہری و مادی قوتوں کو اپنی شکل میں ڈھال لیتی ہے اور اپنے رنگ میں رنگ لیتی ہے۔ اس کوزے کی طرح جو اپنے اندر موجود تلخ اور نمکین پانی کو اپنے مساموں کے ذریعے (جو رابطے کا کام دیتے ہیں) باہر خارج کرنا ہے۔

ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ نفس کی روحانی قوت ماسکہ (روکے رکھنے کی قوت) بہت مضبوط ہو اور وہ اپنے باطنی اسرار کسی پر ظاہر نہ ہونے دے۔ یہ کنٹرول اور پابندی چونکہ جبری اور طبیعت کے برخلاف ہے اس لئے ایک نہ ایک دن یہ سلسلہ قطع ہو جاتا ہے۔ یہ اتفاق یا تو دنیا میں ہو اس وقت ہوتا ہے جب نفس اپنی طبعی حالت سے خارج ہو جائے۔ نفس اپنی طبعی حالت سے یا تو شدید غصے کے وقت خارج ہوتا ہے جیسا کہ اکثر ہوتا ہے یا خواہشات کے غلبہ کے وقت (جو قوت ماسکہ کو نسبتاً کم نقصان پہنچاتی ہے)۔

یا اگر دنیا میں اتفاقاً یا قوت ماسکہ کی مضبوطی کی بنا پر روحانی صفات کا اظہار نہ ہو تو آخرت کے دن (جو حقائق و اسرار کے طشت از بام ہونے کا دن ہے)، قوت ماسکہ (جو ایک غیر اختیار چیز ہے) نفس کی قوت غالب ہوگی۔ پس جو کچھ باطن میں ہے وہ خواہ نا خواہ ظاہر ہوگا اور اسرار باطنی فاش ہوں گے۔ البتہ یہاں اس ظہور کی کیفیت اس طرح نہ ہوگی جس طرح دنیا میں باطن کی سرایت ظاہر کی طرف ہوتی ہے، بلکہ آخرت میں علیت و معلولیت کی بنیاد پر ایسا ہوگا یا أَحَدُ التَّعَلُّق روح کے ارادے کی بنیاد پر ﴿يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ﴾۲ ﴿يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ﴾۳

۱۔ کہہ دو ہر کوئی اپنے طریق کے مطابق عمل کرتا ہے۔ سورۂ اسراء ۸۴۔

۲۔ جس دن پوشیدہ امور ظاہر کئے جائیں گے۔ قلم ۴۲۔ ۳۔ جس دن پوشیدہ اسرار ظاہر کئے جائیں گے۔ طارق ۹۔

فاش ہوں گی۔ خوبیاں اور برائیاں سب آشکار ہوں گی۔ اس دن ملکوتی اشکال اور صورتیں ملکوتیوں کیلئے ظاہر ہوں گی۔ اس دن ملکوتی تناسخ (جو دنیا میں واقع ہوا تھا اور مادیت اس کو قبول نہیں کرتی تھی) کی حقیقت ظاہر ہو گی۔

اب تک جو کچھ بیان ہوا وہ ظاہر کی طرف باطن کی سرایت سے عبارت تھا۔ علاوہ ازیں روح اور ظاہری قوتوں کے درمیان موجود اسی رابطے کی وجہ سے ظاہری اعمال واحوال روح پر بہت واضح اثرات مرتب کرتے ہیں۔ اچھے اور برے اعمال کے باعث باطنی صفات حسنہ اور صفات رذیلہ وجود میں آتی ہیں۔ اس طرح باطن کی تشکیل عمل میں آتی ہے اور نسخ ملکوتی کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ (اوراد واذکار اور اعمال صالحہ کے تکرار کا ایک فلسفہ یہی ہے کہ اس تکرار کے باعث روح اور ملکوت کے اندر صفات حسنہ پیدا ہوں)۔

چونکہ برے اور قبیح اعمال کا نفس پر شدید اثر ہوتا ہے (کیونکہ عام طور پر برے اعمال لذت وشہوت سے مربوط ہوتے ہیں اور یہ حضور قلب اور نفس کی توجہ کے ساتھ بجالائے جاتے ہیں) اس لئے ادیان الٰہی میں تاکید کے ساتھ ان سے منع کیا گیا ہے اور مادیت وطبیعت کے تمام مصادیق سے اجتناب کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کے برعکس اچھے اعمال واذکار کے معاملے میں ایک بار یا چند بار کی بجا آوری پر اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ ان کے تکرار کا حکم دیا گیا ہے، کیونکہ روح کے اوپر ان کے اثرات بہت کم اور آہستہ مرتب ہوتے ہیں، نیز چونکہ یہ نفسانی خواہشات اور لذات کے برخلاف ہیں اس لئے غالباً بے رغبتی اور کاہلی کے ساتھ بجالائے جاتے ہیں اور ان میں حضور قلب اور روحانی ذوق وشوق کا فقدان ہوتا ہے پس ان کے اثرات روح اور باطن پر بہت کم مرتب ہوتے ہیں۔ ملکوت نفس ان سے بہت کم اثر لیتا ہے۔ اسی لئے روح کے اندر ان کو مؤثر بنانے کیلئے کچھ آداب وشرائط مقرر کئے گئے ہیں جن میں سے بعض کی تشریح ہم نے اپنی کتاب آداب الصلاۃ میں کی ہے۔[1]

یہاں تک ہم نے جو تشریح بیان کی وہ ہر قسم کے اچھے اور برے اعمال کے بارے میں تھی۔

رہی فضول قبیح اور ناشائستہ گفتگو کی بات تو ان کے بارے میں بھی واضح رہے کہ یہ روح کے اوپر بہت برے اثرات چھوڑتی ہے۔ ناشائستہ اور فضول گفتگو نفس کو پاکیزگی، درستی، سلامتی، وقار، اطمینان اور سکون

۱۔ آداب الصلاۃ، ص ۱۶، فصل ۴۔

سے محروم کر دیتی ہے۔ اس کے برعکس رذالت، تیرگی، قساوت، غفلت اور انکار کو جنم دیتی ہے، نیز یہ ذکر خدا کی اہمیت کو نظروں سے گرا دیتی ہے، عبادت اور ذکر خدا کی مٹھاس سے روح کو محروم کرتی ہے، ایمان کو کمزور بنا دیتی ہے، دل کو مردہ کرتی ہے، دل کی لغزشوں اور پشیمانی میں اضافہ کرتی ہے، دوستوں کے درمیان کدورت اور لوگوں کے درمیان دشمنی پیدا کرتی ہے، لوگوں کو انسان سے بدظن کرتی ہے، اسے لوگوں کی نظروں سے گراتی ہے، اس پر لوگوں کے اعتماد کو ختم کرتی ہے اور لوگوں کی نظروں میں اسے بے قیمت بنا دیتی ہے۔ یہ سب اس صورت میں ہیں جب اس کی گفتگو مختلف لسانی گناہوں پر منتج نہ ہو۔

اگر انسان فضولیات اور لغولیات کا عادی ہو جائے اور اپنی زبان کو درست استعمال نہ کرے تو اس بات کا اتفاق بہت کم ہوتا ہے کہ وہ گناہوں سے محفوظ رہے، بلکہ وہ انہی فضولیات اور لغویات میں آخری دم تک مبتلا رہے گا۔ اسی لئے خاموشی اور سکوت کی بہت تاکید ہوئی ہے۔

تیسری فصل

احادیث میں خاموشی کی فضیلت اور بے فائدہ گفتگو کی مذمت

اس موضوع کے بارے میں احادیث شریفہ اس قدر زیادہ ہیں جن کے ذکر کی اس مختصر کتاب میں گنجائش نہیں۔ یہاں ہم چند احادیث کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں۔

الوسائل میں شیخ طوسیؒ[۱] کی المجالس کی سند کے ساتھ حضرت ابوذرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہؐ نے

۱۔ شیخ طوسی سے مراد محمد بن حسن بن علیؒ ہیں۔ ان کی کینت ابوجعفر ہے۔ وہ شیخ الطائفہ کے نام سے معروف ہیں۔ وہ عظیم شیعہ عالم ہیں اور ثقہ اعیان میں سے ہیں۔ وہ شیخ مفید، سید مرتضی علم الہدیٰ کے شاگرد تھے۔ انہوں نے پہلی بار نجف اشرف کو دینی علوم کا مرکز بنایا تھا۔ وہ گرانقدر کتابوں کے مؤلف ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں:

اصول العقائد، انیس الوحید، التبیان الجامع لعلوم القرآن، تلخیص الشافی، الخلاف، تہذیب الاحکام، الاستبصار، العدّۃ، مصباح المتہجد وغیرہ... شیخ طوسی کی فضیلت میں یہی کافی ہے کہ شیعوں کی کتب اربعہ (کافی، من لایحضرہ الفقیہ، تہذیب، الاستبصار) میں سے دو کتابیں ان کی تالیف ہیں۔

سید بحر العلوم سے منقول ہے کہ شیخ طوسی کی پہلی کتاب نہایہ اور آخری کتاب المبسوط ہے۔ وہ تین سو سے زیادہ شیعہ اور مجتہد شاگردوں کے استاد ہیں۔ کہتے ہیں کہ ان کے سنی شاگرد، شیعہ شاگردوں سے زیادہ تھے۔ عباسی حکام شیخ کی عزت -->

ابوذر سے اپنی نصیحتوں کے ضمن میں فرمایا: ''اے ابوذر! اچھی گفتگو خاموشی سے بہتر ہے اور خاموشی بہتر ہے بری گفتگو سے۔ اے ابوذر! فضول گفتگو سے احتراز کرو۔ تیرے لئے اتنی ہی گفتگو کافی ہے جو تیری حاجت پوری کرے۔ اے ابوذر! آدمی کی دروغگوئی کیلئے یہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات نقل کرے۔ اے ابوذر! زبان سے زیادہ کوئی چیز طولانی قید کی حقدار نہیں ہے۔ اے ابوذر! اللہ ہر بات کرنے والے کی زبان کے پاس موجود ہے۔ پس انسان کو خدا سے ڈرنا چاہئے اور اسے معلوم ہونا چاہئے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ [1]

نہج البلاغہ میں حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے منقول ہے: ''حکمت آمیز گفتگو سے اجتناب کرتے ہوئے خاموشی اختیار کرنے میں کوئی بھلائی نہیں جس طرح جاہلانہ گفتگو میں کوئی اچھائی نہیں''۔ [2]

نیز فرمایا: ''جو زیادہ گفتگو کرے اس کی غلطیاں بھی زیادہ ہوں گی۔ جس کی غلطیاں زیادہ ہوں اس کی حیا کم ہو جائے گی۔ جس کی حیا کم ہو جائے اس کی پرہیزگاری کم ہو جائے گی۔ جس کی پرہیزگاری کم ہو اس کا دل مر جائے گا۔ جس کا دل مردہ ہو جائے وہ آگ میں داخل ہو جائے گا''۔ [3]

آپ ؑ ہی سے منقول ہے: ''زبان ایک کاٹنے والا درندہ ہے اگر اس کو چھوڑ دیا جائے تو وہ کاٹ لیتا ہے''۔ [4]

<-- وتعظیم کرتے تھے یہاں تک کہ انہوں نے شیخ کیلئے تدریس کی خصوصی کرسی معین کی۔ شیخ کی تاریخ وفات ۲ محرم ۴۶۰ ہجری ہے۔ وہ نجف اشرف میں اپنے گھر میں مدفون ہوئے۔ (ریحانۃ الادب، ج ۳، ص ۳۲۵، ۳۲۸)۔

۱۔ اس حدیث کا متن یہ ہے:

﴿يا أبا ذَرّ !... وَاِملاءُ الخَيرِ خَيرٌ مِنَ السُّكوتِ، وَالسُّكوتُ خَيرٌ مِنْ اِملاءِ الشَّرِّ. يا أبا ذَرّ ! أترُكْ فُضولَ الكَلامِ، وَحَسبُكَ مِنَ الكَلامِ ما تَبلُغُ بِهِ حاجَتَكَ. يا أبا ذَرّ! كَفىٰ بِالمَرءِ كِذباً أنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ ما سَمِعَ. يا أبا ذَرّ! أنَّهُ ما مِنْ شَيءٍ أحَقُّ بِطُولِ السِّجنِ مِنَ اللِّسانِ. يا أبا ذَرّ! إنَّ اللهَ عِندَ لِسانِ كُلِّ قائِلٍ، فَلْيَتَّقِ اللهَ امرُؤٌ، وَلْيَعلَمْ ما يَقولُ﴾۔

شیخ طوسی کی کتاب الامالی، ص ۵۳۵؛ نیز، وسائل الشیعہ، ج ۱۲، ص ۱۸۸، باب ۱۱۸، ابواب احکام العشرۃ، ح ۱۔

۲۔ ﴿لا خَيرَ فِي الصَّمتِ عَنِ الحُكمِ كَما أنَّهُ لا خَيرَ فِي القَولِ بِالجَهلِ﴾۔ نہج البلاغہ، ص ۵۰۲، کلمات قصار، ۱۸۲۔

۳۔ ﴿مَنْ كَثُرَ كَلامُهُ كَثُرَ خَطائُهُ وَمَنْ كَثُرَ خَطائُهُ قَلَّ حَيائُهُ وَمَنْ قَلَّ حَيائُهُ قَلَّ وَرَعُهُ وَمَنْ قَلَّ وَرَعُهُ ماتَ قَلبُهُ وَمَنْ ماتَ قَلبُهُ دَخَلَ النّارَ﴾۔ نہج البلاغہ، ص ۵۳۶، حکمت ۳۴۹۔

۴۔ ﴿اللِّسانُ سَبُعٌ عَقورٌ، إنْ خُلِّيَ عَنهُ عَقَرَ﴾۔ نہج البلاغہ، ص ۴۷۸، حکمت ۶۰۔

نیز آپؑ نے فرمایا: ''جب عقل کامل ہو جاتی ہے تو باتیں کم ہو جاتی ہیں''۔[۱]

اپنے بیٹے محمد بن حنفیہ کے نام اپنی نصیحتوں میں فرمایا: ''اللہ نے کلام سے بہتر کسی چیز کو خلق نہیں فرمایا اور نہ کسی چیز کو اس سے بدتر خلق فرمایا۔ کلام کے ذریعے ہی چہرے سفید ہوں گے اور کلام ہی کی بدولت چہرے سیاہ ہوں گے۔ جان لو کہ کلام تیرے اختیار میں ہے مگر جب تک تم بات نہ کرو؛ اور جب تم بات کرو گے تو اب تم اس کے قبضے میں چلے جاؤ گے۔ پس اپنی زبان کو محفوظ اور مستور کرو جس طرح تم اپنے سونے اور رقم کو محفوظ کرتے ہو۔ بہ تحقیق زبان کاٹنے والا کتا ہے۔ اگر تم اسے آزاد چھوڑ دو گے تو وہ کاٹے گا۔ گاہے ایک کلمہ ایک نعمت کو سلب کر دیتا ہے۔ جو شخص اس کی لگام کو آزاد چھوڑ دے وہ اسے ہر ناپسندیدہ اور شرم آور چیزوں کی طرف کھینچ کر لے جائیگا۔ اس کے بعد اسے دنیا میں چھٹکارا نہیں ملے گا اس سے مگر اللہ کی غضب اور لوگوں کی مذمت کے ذریعے''۔[۲]

نیز آپؑ سے ہی منقول ہے: ''جو اپنی زبان کی حفاظت کرے اللہ اس کے اسرار کی حفاظت کرے گا''۔[۳]

رسول اکرمؐ سے منقول ہے: ''ذکر خدا کے علاوہ زیادہ باتیں نہ کرو، کیونکہ ذکر خدا کے علاوہ کثرت کلام سے دل سخت ہوتا ہے۔ بہ تحقیق لوگوں میں جو شخص سب سے زیادہ اللہ سے دور ہے وہ وہی ہے جس کا دل سخت ہو''۔[۴]

۱۔ ﴿اِذا تَمَّ العَقْلُ نَقَصَ الْکَلامُ﴾۔ نہج البلاغہ، ص ۴۸۰، حکمت ۷۱۔

۲۔ ﴿وَما خَلَقَ اللهُ. عَزَّوَجَلَّ. شَيْئاً أَحْسَنَ مِنَ الْكَلامِ وَلاَ أَقْبَحَ مِنْهُ، بِالْكَلامِ ابْيَضَّتِ الْوُجُوهُ، وَبِالْكَلامِ اسْوَدَّتِ الْوُجُوهُ.

وَاعْلَمْ أَنَّ الْكَلامَ فِي وِثاقِكَ مالَمْ تَتَكَلَّمْ بِهِ، فَإِذا تَكَلَّمْتَ بِهِ صِرْتَ فِي وِثاقِهِ، فَاخْزُنْ لِسانَكَ كَما تَخْزُنُ ذَهَبَكَ وَوَرِقَكَ، فَإِنَّ اللِّسانَ كَلْبٌ عَقُورٌ، فَإِنْ أَنْتَ خَلَّيْتَهُ عَقَرَ، وَرُبَّ كَلِمَةٍ سَلَبَتْ نِعْمَةً، مَنْ سَيَّبَ عِذارَهُ قادَهُ إِلى كُلِّ كَرِيهَةٍ وَفَضِيحَةٍ، ثُمَّ لَمْ يُخْلَصْ مِنْ دَهْرِهِ إِلاّ عَلى مَقْتٍ مِنَ اللهِ وَذَمٍّ النّاسِ﴾۔

وسائل الشیعہ، ج ۲، ص ۱۹۲ و ۱۹۳، باب ۱۱۹، ابواب احکام العشرۃ، ح ۱۵۔

۳۔ ﴿مَنْ حَفِظَ لِسانَهُ سَتَرَ اللهُ عَوْرَتَهُ﴾۔ ایضاً، ص ۱۹۳، ح ۱۷۔

۴۔ ﴿وَلاَ تُكْثِرُوا الْكَلامَ بِغَيْرِ ذِكْرِ اللهِ، فَإِنَّ كَثْرَةَ الْكَلامِ بِغَيْرِ ذِكْرِ اللهِ قَسْوُ الْقَلْبِ، إِنَّ أَبْعَدَ النّاسِ مِنَ اللهِ الْقَلْبُ الْقاسِيء﴾۔ ایضاً، ص ۱۹۴، ح ۱۹۔

احتجاج طبرسی[۱] میں منقول ہے کہ حضرت سجادؑ سے سوال کیا گیا کہ: ”کلام بہتر ہے یا سکوت؟ فرمایا: ان دونوں میں سے ہر ایک کی کچھ آفات ہیں۔ اگر یہ آفات نہ ہوں تو بات کرنا بہتر ہے سکوت سے۔ عرض ہوا: یہ کیسے؟ فرمایا: بہ تحقیق خداوند عزوجل نے انبیاء واوصیاء کو سکوت کے ساتھ نہیں بھیجا، بلکہ انہیں کلام کے ساتھ بھیجا۔ بہشت کا حق سکوت کے ساتھ حاصل نہیں ہوتا۔ اسی طرح اللہ کی ولایت بھی سکوت کے ذریعے حاصل نہیں ہوتی، جہنم سے نجات بھی سکوت کے ذریعے حاصل نہیں ہوتی، اللہ کے غضب سے احتراز بھی سکوت کے ذریعے نہیں ہوسکتا، بلکہ یہ سب کلام کے ذریعے حاصل ہوتے ہیں“۔[۲]

چوتھی فصل

خاموشی عقل کا لشکر اور فطرت مخمورہ کا لازمہ ہے

جبکہ فضول گفتگو جہل وابلیس کا لشکر اور فطرت محجوبہ کا لازمہ ہے

جیسا کہ اس کتاب میں بارہا ذکر ہو چکا[۳] انسان کے اندر دو فطری جذبات ہیں۔ ان میں سے ایک اصلی ہے اور وہ ہے کمال مطلق سے عشق۔ کمال مطلق کا مصداق اللہ کی ذات ہے۔ دوسرا جذبہ فرعی اور ثانوی ہے اور وہ ہے نقص سے نفرت۔ نقص سے مراد غیر اللہ ہے۔ اللہ سے اجنبی اور غیر مربوط ہونے کے لحاظ سے۔ ان دونوں امور میں جو چیزیں اس کی مددگار ثابت ہوتی ہیں وہ فطرت کا لازمہ اور اس کے آثار ہیں۔

۱۔ شیخ احمد بن علی بن ابوطالب طبرسیؒ کی کنیت ابومنصور ہے۔ بڑے فاضل وجلیل القدر شیعہ عالم اور ماہر علم کلام ہیں۔ مازندران کے علاقے ساری سے تعلق رکھتے تھے اور ابوالفتوح رازی اور فضل بن حسن طبرسی کے ہم عصر تھے۔ شیخ منتجب الدین اور ابن شہر آشوب کے استاد تھے۔ وہ دو واسطوں سے شیخ طوسی سے روایت کرتے ہیں۔ ان کی کتابوں میں الاحتجاج، تاج المواليد، تاریخ الائمہ...وغیرہ ہیں۔ سب سے معروف الاحتجاج ہے۔ (ریحانۃ الادب، ج۴، ص۳۵)۔

۲۔ ﴿لِكُلِّ واحِدٍ مِنهُما آفاتٌ، فَإذا سَلِما مِنَ الآفاتِ فَالكَلامُ أفضَلُ مِنَ السُّكوتِ. قِيلَ: وَكَيفَ ذاكَ يابنَ رَسولِ اللهِ؟ فَقالَ: لِأنَّ اللهَ. عَزَّوَجَلَّ. ما بَعَثَ الأنبِياءَ وَالأوصِياءَ بِالسُّكوتِ، إنَّما بَعَثَهُم بِالكَلامِ، وَلا استُحِقَّتِ الجَنَّةُ بِالسُّكوتِ، وَلا استُوجِبَ وِلايَةُ بِالسُّكوتِ، وَلا وُقِيَتِ النّارُ بِالسُّكوتِ وَلا تُجُنِّبَ سَخَطُ اللهِ بِالسُّكوتِ، إنَّما ذٰلِكَ كُلُّهُ بِالكَلامِ﴾۔

وسائل الشیعہ، ج۱۲، ص۱۸۸ و۱۸۹، باب۱۱۸؛ نیز طبرسی کی الاحتجاج، ج۲، ص۱۴۶، ح۱۸۴۔

۳۔ دیکھیے، ص۷۸۔

پس چونکہ فضول، لغو اور باطل گفتگو کو چھوڑ کر خاموشی اختیار کرنا، غور وفکر، باطل پر توجہ کرنے اور ظلمتوں سے نجات اور پاکیزگی حاصل کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے اور اسے سرچشمہ کمال (جو فطری طور پر اس کا معشوق ہے) سے نزدیک کرتا ہے اور راستے کی رکاوٹوں کو دور کرتا ہے اس لئے خاموشی فطرت مخمورہ کا لازمہ اور عقل ورحمٰن کا لشکر ہے۔

اس کے برخلاف بے جا، فضول اور نقصان دہ گفتگو انسان کو کمال مطلق سے دور، نیز مادیت اور دنیوی خواہشات سے نزدیک کرتی ہے اس لئے فطرت اس سے نفرت کرتی ہے اور یہ منبع کمال سے فطرت کو محجوب کرتی ہے۔ جب نفس اپنی اصلی فطرت سے محجوب ہو جائے اور عالم رنگ وبو اور دنیوی خواہشات سے وابستہ ہو جائے تو اس محجوبیت کی حالت میں فضول، لغو اور باطل امور سے جھوٹی محبت پیدا ہوتی ہے۔ پھر جب نفس کی محجوبیت دور ہو جائے تو وہ سمجھ لیتا ہے کہ اس کی طبیعت کو اس حال میں جو چیز پسند آ گئی تھی وہ فطرت سلیم کے ہاں ناپسندیدہ تھی، نیز اسے جن چیزوں سے رغبت نہیں تھی، مثلاً ذکر، غور وفکر، خاموشی اور خلوت وغیرہ وہ فطرت کے ہاں محبوب اور پسندیدہ ہیں۔

''استسلام'' اور اس کی ضد ''استکبار''

یہ مقصد دو فصلوں پر مشتمل ہے:

پہلی فصل

استسلام اور استکبار کا مفہوم

استسلام سے مراد ہے: فرمانبرداری کا اظہار، نیز حق کی اطاعت اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنا۔[1] اس کے مقابلے میں ''استکبار'' سے مراد ہے: نافرمانی، سرپیچی، سرکشی اور تکبّر سے کام لینا۔[2]

یاد رہے کہ جب انسان کا دل آفات، عیوب اور نقائص سے پاک ہو تو وہ اپنی فطرت سلیم کی روشنی میں حق کا ادراک کر لیتا ہے۔ جن کا ادراک کرنے کے بعد وہ اس کے آگے سر تسلیم خم کرتا ہے۔ جب اس کے آگے سر تسلیم خم کرتا ہے تو وہ ظاہری اور جسمانی اعمال میں اطاعت سے کام لیتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ قلب سلیم سے تسلیم اور تسلیم قلبی سے ظاہری اطاعت حاصل ہوتی ہے اور یہی استسلام ہے۔

لیکن اگر دل معیوب ہو اور خود بینی اور خود پسندی کی بیماری اس کے اندر رخنہ کر لے تو وہ کبر میں مبتلا ہوگا۔ یہ وہ نفسانی حالت ہے جس کی رو سے انسان اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا اور برتر خیال کرتا ہے۔ اگر اس باطنی کیفیت کا اظہار عمل کے ذریعے کرے اور دوسروں پر اپنی بڑائی جتائے تو اسے تکبّر کہا جاتا ہے۔ اگر اس باطنی خود بینی اور کبر کے باعث نافرمانی اور سرکشی اختیار کرے تو اسے ''استکبار'' کہا جاتا ہے۔ پس

۱۔ لسان العرب، ج۶، ص۳۴۵۔

۲۔ لسان العرب، ج۱۲، ص۱۳۔

استکبار سے مراد ہے: وہ نافرمانی اور سرکشی جو "کبر" کے باعث عمل میں آئے۔ اس کی ضد استسلام ہے جس سے مراد: تسلیم کے باطنی جذبے کی بناء پر اطاعت کا مظاہرہ کرنا ہے۔ بنابریں ہر اطاعت استسلام نہیں ہے اور نہ ہی ہر نافرمانی استکبار ہے۔

دوسری فصل

استسلام عقل کا لشکر جبکہ استکبار جهل کا لشکر ھے

سابقہ فصل سے یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ استسلام فطرت مخمورہ کا لازمہ ہے اور اس کا تعلق عقل کے لشکروں سے ہے، نیز استکبار فطرت محجوبہ کا لازمہ ہے اور اس کا تعلق جہل کے لشکروں سے ہے، کیونکہ جب انسان اپنی اصلی فطرت (جو اللہ کی عطا کردہ نعمت اور خلقت کی خمیر سے مخلوط فطرت سلیم ہے) پر باقی ہو اور وہ نفسانی آفات وعیوب اور روح کی محجوبیت وآلودگی سے محفوظ ہو تو وہ اسی فطرت سلیم کے ذریعے حق کو پالیتا ہے اور حق سے محبت کرتا ہے۔ پس وہ فطری طور پر اس کے آگے سر تسلیم خم ہوتا ہے۔ پس جب وہ سر تسلیم خم ہوتا ہے تو استسلام وجود میں آتا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے:

﴿ المُؤمِنُونَ هَيِّنُونَ لَيِّنُونَ، اِنْ قُيِّدُوا انْقادُوا؛ وَاِنْ أُنيخُوا اسْتَناخُوا ﴾[1]

سہل گیر اور نرم خو ہونا، نیز حق کے سامنے مطیع وفرمانبردار ہونا، مؤمنین کی صفات میں شامل ہے، بلکہ بسا اوقات اگر اس کی پسند کے برخلاف کوئی چیز اس پر ٹھونسی جائے تو بھی وہ اطاعت کرتا ہے۔

چنانچہ کہا جاتا ہے: ﴿ المُؤمِنُ اِذا خَدَعْتَهُ اِنْخَدَع ﴾[2] یعنی، اگر اسے دھوکہ دیا جائے تو اسے بھی قبول کرتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ جب انسان کی فطرت سلیم حق کو قبول کرتی ہے تو استسلام حاصل ہوتا ہے۔ لیکن جب

۱۔ مؤمنین سہل گیر اور نرم خو ہوتے ہیں۔ وہ (تابعدار اونٹ کی طرح) جب باندھے جاتے ہیں تو اطاعت کرتے ہیں اور جب (سخت چٹان پر) بٹھائے جاتے ہیں تو بیٹھ جاتے ہیں۔

بحار الانوار، ج ۶۴، ص ۳۵۵، ح ۵۸۔

۲۔ جب مؤمن کو فریب دیا جاتا ہے تو وہ یوں ظاہر کرتا ہے کہ دھوکہ کھا گیا ہے۔

فطرت محجوب ہو جائے اور اس میں خود بینی، خود پسندی اور تکبّر آ جائے اور مادی عوامل اس پر اثر انداز ہوں تو وہ حق اور حقیقت سے گریزاں ہوتی ہے، اس میں قساوت اور سختی پیدا ہوتی ہے۔ نتیجتاً انسان استکبار کا شکار ہو جاتا ہے اور وہ حق کی نافرمانی کرتا ہے۔

پس ثابت ہوا کہ استسلام کا تعلّق عقل اور رحمٰن کے لشکروں سے ہے اور یہ فطرت مخمورہ کا لازمہ ہے جبکہ استکبار جہل اور شیطان کا لشکر ہے، نیز فطرت محجوبہ کا لازمہ ہے۔

مقصد / ۲۳

''تسلیم'' اور اس کی ضد ''شک'' کا بیان

یہ مقصد تین فصلوں پر مشتمل ہے:

پہلی فصل

تسلیم اور شک کا مفہوم

گزشتہ مقصد میں معلوم ہو چکا کہ تسلیم سے مراد: حق کے مقابلے میں باطنی وقلبی طور پر سر تسلیم خم ہونا اور حق کا قبول کرنا ہے اور اس کیلئے نفس کا عیوب ونقائص سے خالی ہونا اور صفات رذیلہ سے پاک ہونا ضروری ہے، نیز جب دل سالم ہو تو وہ حق کے آگے سر تسلیم خم ہوتا ہے۔

اس کے مقابلے میں شک کا مقام آتا ہے جو حق کے آگے سر نہ جھکانے، سے اور حق کو قبول نہ کرنے سے عبارت ہے۔ حق کو قبول نہ کرنا اور اس کے آگے سر تسلیم خم نہ کرنا نفس کی مجوبیت، باطنی عیوب اور قلب کی بیماری کا شاخسانہ ہے۔

ایک محقق فرماتے ہیں: ''یہاں تسلیم کے مقابلے میں انکار وجود کا ذکر کرنے کی بجائے شک کا ذکر کیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ عقل کی خاصیت یہ ہے کہ وہ تمام امور میں قطعی فیصلہ دیتی ہے جبکہ نفوس وہمی کی خاصیت یہ نہیں کہ وہ تمام امور میں قطعی حکم دیں، بلکہ ان کا خاصہ صرف شک کرنا ہے اور چونکہ تسلیم تمام امور میں تصدیق سے عبارت ہے اس لئے تسلیم کے مقابلے میں شک کو لانا چاہئے''۔[۱]

یہ کلام اشکال سے خالی نہیں، کیونکہ وہمانی نفوس ہر جگہ شک نہیں کرتے، بلکہ کبھی یقین کرتے ہیں اور

۱۔ صدر المتألہین شیرازیؒ کی شرح اصول کافی، ج۱، ص۴۵۰۔

کبھی انکار، تکذیب اور رد کرتے ہیں۔

اس بات کا بھی امکان ہے کہ حق کے آگے سر نہ جھکانا چونکہ غالباً شک کے ہمراہ ہوتا ہے اس لئے شک، تسلیم کے مقابلے میں لایا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ شک سے مراد یقین کی ضد ہو جیسا کہ ماہرین لغت نے اس کی تصریح کی ہے![1] اور یقین کی ضد سے مراد عرف عام میں مستعمل شک نہیں، بلکہ اس کا دائرہ وسیع ہے، یعنی اس سے مراد تردد کی حالت ہے۔

دوسری فصل

تسلیم کے فوائد

تسلیم، مؤمنین کی ایک پسندیدہ صفت ہے جس کے ذریعے وہ معنوی مقامات اور معارف الٰہیہ تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ جو شخص اللہ اور اولیاء اللہ کے سامنے سر تسلیم خم ہو جائے اور ان کے سامنے چون وچرا نہ کرے اور ان کے پیچھے پیچھے ملکوت کی سیر کرے وہ جلد ہی اپنا مقصود پا لیتا ہے۔ اسی لئے بعض اہل عرفان کہتے ہیں کہ: فلسفیوں کے مقابلے میں مؤمنین اپنے مقصود کے زیادہ نزدیک ہوتے ہیں، کیونکہ مؤمنین انبیاء کے پیچھے پیچھے ہیں جبکہ فلاسفہ اپنی عقل وفکر کی روشنی میں حرکت کرتے ہیں۔ واضح ہے کہ جو شخص اللہ کی رہنمائی کے سامنے سر تسلیم خم کرے وہ سیدھے راستے (جو نزدیک ترین راستہ ہے) سے منزل مقصود تک پہنچتا ہے اور اسے کوئی خطرہ درپیش نہیں ہوتا۔ اس کے مقابلے میں جو شخص اپنے پیروں پر چلتا ہے وہ بسا اوقات ہلاکت کی نذر ہو جاتا ہے اور اپنا راستہ کھو دیتا ہے۔

انسان کو چاہئے کہ وہ کسی حاذق طبیب کو ڈھونڈنے کی کوشش کرے۔ ماہر اور کامل طبیب ملنے کے بعد اگر انسان اس کے نسخے میں چون وچرا سے کام لے اور اس کی ہدایات پر عمل کرنے کی بجائے اپنا علاج اپنی دانست کے مطابق خود کرے تو بسا اوقات انسان ہلاکت ہو جاتا ہے۔

انسان کو اپنے ملکوتی سفر میں بھی ہادی ورہنما تلاش کرنے کی جدوجہد کرنی چاہئے۔ پھر جب رہنما مل جائے تو اس کے آگے سر تسلیم خم ہو جائے اور سیر وسلوک میں اس کی پیروی کرے اور اپنا ہر قدم اس کے نقش

۱۔ صحاح اللغہ، ج ۴، ص ۱۵۹۴؛ نیز، لسان العرب، ج ۷، ص ۱۷۴؛ نیز، تاج العروس، ج ۷، ص ۱۵۰۔

قدم پر رکھتا جائے۔

چونکہ ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہادی برحق جانتے ہیں اور آپ ؐ کو تمام علوم کا حامل سمجھتے ہیں اس لئے اپنے ملکوتی سفر میں ہمیں آپ ؐ کی بے چون وچرا پیروی کرنی چاہیے۔

اگر ہم احکام کی حکمت کو اپنی ناقص عقل کی روشنی میں ڈھونڈنا چاہیں تو ہم راہ مستقیم سے ہٹ جائیں گے اور ابدی ہلاکت کی نذر ہو جائیں گے۔ اس مریض کی طرح جو ڈاکٹر کے نسخے کا راز معلوم کرنا چاہے اور اس کے بعد دوا استعمال کرنا چاہے۔ ایسا مریض سلامتی سے ہمکنار نہیں ہوگا۔ نسخے کا راز معلوم ہونے تک علاج کا وقت گزر چکا ہوگا یوں وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دے گا۔

ہم لوگ مریض ہیں اور راہ حق کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ اپنے ملکوتی سفر اور قلبی امراض کے نسخے راہ ہدایت کی نشاندہی کرنے والوں اور ارواح ونفوس کے طبیبوں سے حاصل کریں اور اپنی ناقص آراء اور کمزور نظریات کو ایک طرف رکھ کر ان نسخوں پر عمل کریں تاکہ ہم اپنے مقصود کو حاصل کریں جو اسرار توحید تک رسائی سے عبارت ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی مقدس بارگاہ میں سر تسلیم خم ہونا ہی روحانی امراض کا ایک علاج ہے۔ یہ خود نفس کو غیر معمولی جلا بخشتا ہے اور باطنی روشنی میں روز افزوں اضافہ کرتا ہے۔

قرآن کریم کی سورۂ نساء کی آیت ۶۵ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿فَلا وَرَبِّکَ لا یُؤمِنُونَ حَتّیٰ یُحَکِّمُوکَ فِیمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لا یَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجاً مِمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوا تَسْلِیماً﴾۔[۱]

انسان ایمان کا مزہ اس وقت چکھ سکتا ہے جب وہ اللہ کے مقررہ احکام کے سامنے اس طرح سر تسلیم خم ہو کہ اس کے دل میں کوئی کھٹک باقی نہ رہے، نیز کھلے چہرے اور خندہ پیشانی کے ساتھ اس کا خیر مقدم کرے۔

کافی میں امیر المؤمنین علیہ السلام سے مروی ہے: ''ایمان کے چار ارکان ہیں: اللہ پر توکل کرنا، اپنے امور کو

۱۔ نہیں، تیرے ربّ کی قسم (اے رسول) یہ لوگ کبھی مؤمن نہ ہوں گے جب تک وہ اپنے باہمی جھگڑوں میں آپ کو منصف نہ بنالیں۔ پھر آپ جو فیصلہ کریں اس کے باعث اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں اور آپ کو ایسا مان لیں جیسا ماننے کا حق ہے۔ سورۂ نساء/آیت ۶۵۔

اللہ کے سپرد کرنا، اللہ کے قضا وقدر پر رضامندی اور اللہ کے حکم کے آگے سر تسلیم خم ہونا"۔ ۱؎ جو شخص ان چار ارکان کا حامل نہ ہو وہ صاحب ایمان نہیں اور اللہ پر ایمان کی حقیقت سے اس نے استفادہ نہیں کیا۔

تیسری فصل

تسلیم عقل و رحمن کا لشکر ہے اور فطرت مخمورہ کا لازمہ، جبکہ شک جہل کا لشکر اور فطرت محجوبہ کا لازمہ ہے

یاد رہے کہ انانیت، خودسری اور خود بینی فطرت اللہ کے برخلاف ہے، کیونکہ فطرت مخمورہ کی بنیاد خدابینی، خداجوئی اور خداپسندی پر استوار ہے۔ فطرت سلیم کو غیر اللہ اور غیر اللہ کی اطاعت سے نفرت ہے جیسا کہ قبل ازیں اس کا تذکرہ ہو چکا۔ ۲؎

جب فطرت اپنی اصلی حالت پر باقی ہو اور عالم رنگ و بو کے حجابوں سے محجوب نہ ہو چکی ہو اس وقت تک وہ خودسری اور خود بینی کا مظاہرہ نہیں کرتی، نیز وہ نفسانی اثرات ظاہر نہیں کرتی، بلکہ فطرت کی سلامتی کے باعث حق کے آگے سر تسلیم خم کرے گی۔ اس کی مثال ایک آئینے کی طرح ہے جس کا چمکدار حصہ حق کی طرف ہو کہ عالم غیب سے جو کچھ اس پر واقع ہو اسے بلا کم وبیشی اس میں منقش ہو اور وہ غیبی جلووں اور اثرات کے سامنے اس طرح سر تسلیم خم ہو کہ اپنے آپ کو مکمّل طور پر فنا کر دے۔ اگر یہ قلبی کیفیت اپنے کمال کو پہنچ جائے اور باطن میں گھر کر لے تو محو مطلق اور کامل مدہوشی کی حالت حاصل ہو سکتی ہے۔

کبھی اللہ اپنی خصوصی عنایات کے ذریعے (اگر اللہ انسان کو اپنا حقیقی محبّ اور طالب پائے، نیز اسے اپنے نفس اور اپنی انا کے دائرے سے خارج پائے) ایک ہی جلوے اور ایک ہی چنگاری کے ذریعے اسے کامل بے ہوشی کی منزل تک پہنچاتا ہے، جیسا کہ موسیٰ کلیم ؑ کے ساتھ ہوا تھا ﴿فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهُ لِلْجَبَلِ جَعَلَهُ دَكًّا وَخَرَّ مُوسٰى صَعِقًا﴾ ۳؎ پس اگر اس کے اندر کچھ نقائص موجود بھی ہوں تو اللہ کی خصوصی

۱۔ ﴿الایمانُ لَهُ أرْكانٌ أرْبَعَةٌ: التَوَكُّلُ عَلَى اللهِ، وَتَفْوِيضُ الأمْرِ اِلَى اللهِ، وَالرِّضا بِقَضاءِ اللهِ، وَالتَّسْلِيمُ لأمْرِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ﴾۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۳۹، باب خصال المؤمن، ح ۲۔

۲۔ دیکھئے، ص ۸۷۔

۳۔ جب اس کے ربّ نے پہاڑ پر تجلّی ظاہر کی تو اسے ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰؑ بے ہوش ہو کر گرے۔ (اعراف ۱۴۳)۔

عنایت سے حاصل شدہ اس جلوۂ رحمانی کے باعث وہ نقائص رفع ہوجائیں گے۔ تسلیم کا یہ مقام توکل اور قضائے خداوندی پر رضامندی سے بالاتر مقام ہے جو واضح ہے۔

پس معلوم ہوا کہ تسلیم کا تعلق فطرت مخمورہ سے ہے اور یہ عقل و رحمان کا لشکر ہے۔ جس طرح اس کی ضد، یعنی شک (اپنے عام معنی میں جو انکار، تکذیب اور جحود کو شامل ہے) کا تعلق جہل کے لشکروں سے ہے اور وہ فطرت مخمورہ کے برخلاف ہے۔ مادیت، انانیت، خودسری، خودپسندی اور تکبر خداداد فطرت کے برخلاف ہیں اور فطرت کو محجوب کرتی ہیں۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اہل بیت وحی و عصمتؑ کی ایک حدیث کے ذکر کے ذریعے ان اوراق کو منور کریں:

کلینیؒ کافی میں اپنی سند کے ساتھ سفیان بن عُیَیْنَۃ سے نقل کرتے ہیں کہ اس نے کہا: میں نے امام صادق علیہ السلام سے اللہ کے قول: ﴿اِلاَّ مَنْ أتیٰ اللهَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ﴾[1] کے بارے میں پوچھا تو آپؑ نے فرمایا:

﴿اَلْقَلْبُ السَّلِیْمُ الَّذِي یَلْقیٰ رَبَّهُ وَلَیْسَ فِیْهِ أحَدٌ سِواهُ. قالَ: وَكُلُّ قَلْبٍ فِیْهِ شِرْكٌ أوْ شَكٌّ، فَهُوَ ساقِطٌ. وَاِنَّما أرادَ بِالزُّهْدِ فِي الدُّنْیا لِیُفْرِغَ قُلُوبَهُمْ لِلآخِرَةِ﴾[2]

یعنی قلب سلیم وہ دل ہے جس میں اللہ کے سوا کچھ نہ ہو اور وہ شک و شرک سے خالی ہو۔ دنیا سے اجتناب (جس کی اولیائے خدا نے بڑی تاکید کی ہے) کا فلسفہ یہ ہے کہ دل دنیا سے خالی ہوں اور آخرت (جو لقاء اللہ کا مقام ہے) کیلئے آمادہ ہوں، بلکہ تمام ادیان، مذاہب، شرائع، احکام، اخلاقیات، معاملات اور ریاضتوں کا مقصد اللہ سے ملاقات کا شرف حاصل کرنا ہے۔ یہ تمام امور کا مقصد اصلی ہے۔ حقیقت کاملہ کے آگے سر تسلیم خم کرنا ان تمام امور کا ضامن ہے۔

۱۔ سوائے اس شخص کے جو قلب سلیم کے ساتھ اللہ کے پاس حاضر ہو۔ سورۂ شعراء ۸۹۔

۲۔ سفیان بن عیینہ کہتا ہے کہ میں نے امام صادقؑ سے آیت قرآن ﴿اِلاَّ مَنْ أتیٰ اللهَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ﴾ کے بارے میں سوال کیا۔ فرمایا: قلب سلیم وہ دل ہے جو اللہ سے اس حالت میں ملاقات کرے کہ اس میں سوائے اللہ کے کچھ نہ ہو۔ فرمایا: جس دل میں شرک یا شک ہو وہ ساقط ہے۔ اللہ چاہتا ہے کہ زہد کے ذریعے دلوں کو آخرت کیلئے فارغ کرے۔
اصول کافی، ج ۲، ص ۱۳ و ۱۴، باب الاخلاص، ح ۵۔

شرک اور شک کی تمام اقسام کا بنیادی سبب یہی ہے کہ انسان اپنی روح کو اپنے ولی مطلق، یعنی اللہ کے حوالے نہیں کرتا۔ اگر روح مطیع ہو تو پورا وجود مطیع ہو جائے گا۔ پس ظاہری اعضاء اور جسمانی قوتیں بھی مطیع ہو جائیں گی۔ ان کی اطاعت وتسلیم یہ ہے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کوئی حرکت کریں اور نہ کوئی سکون اختیار کریں، بلکہ ان کا قبض وبسط ارادہ خداوندی کے تابع ہو اور نوافل کے ذریعے حاصل ہونے والے تقرب کا نمونہ روح کے اندر جلوہ گر ہو جو یہ ہے:

﴿كُنتُ سَمْعَهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِهِ، وَبَصَرَهُ الَّذِي يُبْصِرُ بِهِ . . . . الخ﴾[1]

تسلیم مطلق کے مقابلے میں تزلزل اور شک وتردد کی کیفیت ہے جس کے کئی مراتب ہیں۔ ان میں سے بعض کو شک جلی بعض کو شک خفی اور بعض کو شک اخفیٰ کہا جاتا ہے۔

شک جلی، ظاہری اور جلی عقائد میں تزلزل سے عبارت ہے۔ شک خفی سے مراد: معارف، اسرار توحید، اسرار تجرید اور اسرار تفرید میں تزلزل وتردد ہے۔ اور شک اخفیٰ سے مراد: مذکورہ مقامات ومراتب میں ثبات وقرار کا فقدان اور تغیّر وتزلزل ہے۔

۱۔ میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس کے ذریعے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس کے ذریعے وہ دیکھتا ہے... الخ۔

یہ ایک حدیث نبویؐ سے اقتباس ہے جسے حدیث ''قرب نوافل'' کہا جاتا ہے۔

اصول کافی، ج ۲، ص ۲۶۲ و ۲۶۳، باب من اذی المسلمین واحتقر ہم، ح ۷، ۸۔

''صبر'' اور اس کی ضد ''جزع'' کا بیان

یہ مقصد پانچ فصلوں پر مشتمل ہے:

پہلی فصل

صبر اور جزع کا مفہوم

صبر کی کئی تعریفیں کی گئی ہیں۔ یہاں ہم ان میں سے بعض کا ذکر کرتے ہیں:

عارف و محقق خواجہ عبداللہ انصاری کہتے ہیں: ﴿الصَّبْرُ حَبْسُ النَّفْسِ عَلیٰ جَزَعٍ کامِنٍ عَنِ الشَّکْویٰ﴾[۱] صبر سے مراد ہے: باطنی بے چینی اور تکلف کے باوجود شکایت سے اجتناب کرنا۔ پس اس تعریف کی رو سے باطنی بے چینی و پریشانی کا اظہار نہ کرنا اور ناگوار باتوں کی شکایت نہ کرنے کا نام صبر ہے۔ حکیم بزرگ خواجہ طوسی (قدس سرّہ) نے بھی تقریباً اسی مفہوم پر مشتمل تعریف کی ہے۔[۲]

پس صبر دو چیزوں پر مشتمل ہے: ایک یہ کہ انسان کو باطنی طور پر کسی چیز سے کوفت ہو۔ دوسرا یہ کہ وہ شکایت کا اظہار نہ کرنے اور نہ بے چینی ظاہر ہونے دے۔

شیخ عارف عبدالرزاق کاشانی کہتے ہیں: ''یہاں شکایت سے مراد وہ شکایت ہے جو غیر اللہ کے پاس کی جائے، کیونکہ اللہ کے پاس کی جانے والی شکایت صبر کی منافی نہیں۔ چنانچہ حضرت ایوبؑ نے اللہ کے حضور شکایت کرتے ہوئے کہا: ﴿اِنِّي مَسَّنِيَ الشَّيْطانُ بِنُصْبٍ وَعَذابٍ﴾[۳] اس شکایت کے باوجود

۱۔ کمال الدین عبدالرزاق کاشانی کی کتاب منازل السائرین، ص ۱۹۵ و ۱۹۶۔

۲۔ دیکھئے، محقق طوسی کی اوصاف الاشراف، ص ۵۹، باب الصبر۔

۳۔ شیطان نے مجھے رنج اور تکلیف میں ڈال دیا ہے۔ سورۂ صاد ۴۱۔

اللہ حضرت ایوبؑ کے بارے میں فرماتا ہے: ﴿اِنَّا وَجَدْنَاهُ صَابِراً نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهُ أَوَّابٌ﴾[۱]" انتہیٰ[۲]
یاد رہے کہ صبر کا یہ مرتبہ جو مذکور ہوا "متوسطین" کا مقام ہے، کیونکہ جب تک نفس اللہ کی طرف سے اس پر وارد ہونے والی آزمائشات اور تکالیف کو ناپسند کرے اور اپنے باطن میں ان سے پریشان ہو اس وقت تک اس کی معرفت اور کمالات کا مقام ناقص رہے گا۔

اس سے بہتر اور بالاتر مقام قضائے خداوندی پر رضا کا مقام ہے۔ وہ یہ ہے کہ انسان نفس کی آزمائشات اور آفات ومشکلات سے خوش اور راضی ہو اور محبوب کی طرف سے ملنے والی ہر چیز کو دل وجان سے قبول کرے۔

حدیث ہے کہ حضرت امام باقر علیہ السلام نے بچپن میں جابر بن عبداللہ انصاریؓ سے پوچھا: "کس حال میں ہو؟ جابر نے عرض کیا: اس حال میں ہوں کہ میں بیماری کو صحت سے بہتر چاہتا ہوں اور فقر کو مالداری سے زیادہ چاہتا ہوں۔ فرمایا: لیکن ہم اہل بیتؑ کی حالت یہ ہے کہ اگر اللہ صحت دے تو اسے بہتر سمجھتے ہیں اور اگر وہ بیماری دے تو اسی کو زیادہ چاہتے ہیں۔ اگر وہ فقر دے تو اسے اور اگر مال دے تو اسے بہتر چاہتے ہیں"۔[۳]
شاید جابر نے یہ بات اسی لئے کی تھی، کیونکہ اسے اپنے اوپر اطمینان حاصل نہیں تھا اور اسے خطرہ تھا کہ شاید صحت وسلامتی اور مالداری وخوشی کے وقت وہ اپنے دل کو سنبھال نہ سکے اور اس کا دل دنیا اور اس ظالم بستی کی طرف مائل ہو جائے۔ لیکن مقام ولایت وہ مقام ہے کہ خدائی آزمائشات اس مقام کے تحت واقع ہوتی ہیں۔

اگر پوری دنیا کی حکومت ولی کامل کو دی جائے یا اس سے ہر چیز کو چھین لیا جائے دونوں صورتوں میں اس کے قلب پر کوئی اثر نہ ہوگا اور کوئی آزمائش اس میں تبدیلی پیدا نہ کر سکے گی۔

خلاصہ یہ کہ صبر کا مذکورہ مرتبہ متوسط لوگوں کا مقام ہے۔ رہا یہ سوال کہ گاہے اولیائے کامل کو اس سے متصف کیوں کیا گیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ: یہاں صبر سے مراد، صبر کے اعلیٰ مراتب ہیں، جیسا کہ بعد

۱۔ ہم نے اسے صابر پایا، وہ بہترین بندہ تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف بہت رجوع کرنے والا تھا۔ سورۂ صاد ۴۴۔

۲۔ شرح منازل السائرین، ص ۱۹۵ و ۱۹۶۔

۳۔ اوصاف الاشراف، ص ۶۰؛ جامع السعادات، ج ۳ فصل فی مراتب الصبر، ص ۲۸۵؛ نیز، اعیان الشیعہ، ج ۴، ص ۴۶۔

ازیں اس نکتے کی طرف اشارہ ہوگا[1] یا اس سے مراد یہ ہے کہ وہ جسمانی تکالیف پر صبر کرتے تھے، کیونکہ انسان کی مادی اور طبیعی ساخت کے تقاضوں کے مطابق جسمانی تکالیف روح پر اپنے اثرات چھوڑتی ہیں اور ان سے وہ تکلیف میں مبتلا ہوتے ہیں۔

دوسری فصل

صبر کے مراتب

صبر کے مراتب زیادہ ہیں؛ ہم آیندہ فصل میں صبر کے کامل مراتب کا ذکر کریں گے[2]۔ یہاں ہم صبر کے بعض مراتب کو جو حدیث نبوی ؐ کے مطابق ہے ذکر کریں گے تاکہ یہ فصل اس حدیث کی شرح کی جگہ لے۔

کافی شریف میں امیر المؤمنین علیہ السلام سے منقول ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

﴿الصَّبرُ ثَلاثَةٌ: صَبرٌ عِندَ المُصِيبَةِ، وَصَبرٌ عَلَى الطّاعَةِ، وَصَبرٌ عَنِ المَعصِيَةِ. فَمَنْ صَبَرَ عَلَى المُصِيبَةِ حَتّىٰ يَرُدَّها بِحُسنِ عَزائِها، كَتَبَ اللهُ لَهُ ثَلاثَمِائَةِ دَرَجَةٍ ما بَينَ الدَّرَجَةِ اِلَى الدَّرَجَةِ كَما بَينَ السَّماءِ اِلَى الأَرضِ؛ وَمَنْ صَبَرَ عَلَى الطّاعَةِ، كَتَبَ اللهُ لَهُ سِتَّمِائَةِ دَرَجَةٍ ما بَينَ الدَّرَجَةِ اِلَى الدَّرَجَةِ كَما بَينَ تُخُومِ الأَرضِ اِلَى العَرشِ؛ وَمَنْ صَبَرَ عَلَى المَعصِيَةِ كَتَبَ اللهُ لَهُ تِسعَمِائَةِ دَرَجَةٍ ما بَينَ الدَّرَجَةِ اِلَى الدَّرَجَةِ كَما بَينَ تُخُومِ الأَرضِ اِلَى مُنتَهى العَرشِ﴾[3]

۱۔ دیکھئے، مقصد ۲۴، فصل ۲، ص ۳۶۸۔

۲۔ ایضاً فصل ۳، ص ۳۷۲۔

۳۔ صبر کے تین درجے ہیں: مصیبت پر صبر، اطاعت پر صبر، گناہ پر صبر۔ پس جو مصیبت پر صبر کرے اور اسے اچھی طرح برداشت کرلے اللہ اس کیلئے تین سو درجے لکھتا ہے ہر درجے کا فاصلہ دوسرے درجے سے اتنا ہے جتنا زمین و آسمان کا درمیانی فاصلہ۔ جو اطاعت پر صبر کرے اللہ اس کیلئے چھ سو درجے لکھتا ہے ہر درجہ دوسرے سے اتنے فاصلے پر ہے جتنا فاصلہ زمین کے آخری حصے سے عرش تک ہے۔ جو کوئی گناہ پر صبر کرے اللہ اس کیلئے نو سو درجے لکھتا ہے ہر درجہ دوسرے درجے کا درمیانی فاصلہ زمین کی آخری حد سے عرش کے آخری حصے تک ہے۔ (اصول کافی، ج ۲، ص ۷۵، باب الصبر، ح ۱۵)۔

اس حدیث شریف سے صبر کے تین درجات کا علم ہوتا ہے جو صبر کی دیگر اقسام کا سرچشمہ ہیں۔ یہ متوسطین کے صبر کے اہم درجات ہیں:

پہلا درجہ: یہ مصیبتوں اور بلاؤں پر صبر سے عبارت ہے، یعنی یہ کہ انسان اس طرح کی آزمائشوں میں اپنے اوپر قابو رکھے اور لوگوں کے سامنے شکایت اور بے قراری کا اظہار نہ کرے۔ البتہ اللہ کے ہاں شکایت کرنے میں کوئی عیب نہیں، بلکہ صاحبان معرفت کے نزدیک اللہ کے پاس شکایت نہ کرنا عیب ہے، کیونکہ یہ تجلّد ہے، یعنی استقامت اور طاقت کا اظہار ہے جبکہ مکتب عشق میں یہ اظہار بہت بڑا عیب ہے، بلکہ محبوب کے سامنے عجز و نیازمندی کا اظہار اچھا ہے۔ بقول شاعر:

وَيَحْسُنُ اِظْهارُ التَّجَلُّدِ لِلْعِدىٰ　　　وَيَقْبُحُ اِلاّ العَجزَ عِندَ الأحِبَّةِ [۱]

علاوہ ازیں اپنی طاقت اور استقامت کا اظہار خودنمائی ہے جو اہل معرفت کے ہاں سخت ترین جرائم میں سے ایک جرم ہے۔[۲]

مصیبت پر صبر کرنے والے کو تین سو درجات ثواب کے ملتے ہیں جن میں سے ہر دو درجوں کا درمیانی فاصلہ زمین وآسمان کے درمیانی فاصلے کے برابر ہے۔

دوسرا درجہ: اطاعت پر صبر ہے، یعنی یہ کہ انسان اللہ کی اطاعت میں استقامت کا مظاہرہ کرے اور نفس امارہ کا تابع فرمان اور بے لگام نہ بن جائے۔

بنیادی طور پر دو مقامات پر انسان لے لگام ہوجاتا ہے جن میں سے ایک مقام میں صبر کا مظاہرہ کرنا دوسرے کے مقابلے میں بہت مشکل ہے۔

پہلا مقام: جس میں صبر نسبتاً آسان ہے یہ ہے کہ آدمی بے لگام ہوجائے اور ترک اطاعت کرے۔ یہاں صبر سے مراد یہ ہے کہ انسان نفس اور شیطان کا مقابلہ کرے اور احکام الٰہی کو شرعی حدود وقیود اور قلبی آداب وشرائط کے ساتھ بجالائے۔ ان آداب وشرائط اور حدود کی پابندی مشکل ہے۔ ہم نے آداب الصلاۃ

۱۔ دشمنوں کے پاس استقامت کا مظاہرہ اچھا ہے لیکن دوستوں کے پاس اظہار عجز کے علاوہ کوئی چیز اچھی نہیں۔
دیوان ابن فارض، ص ۶۸، قصیدۂ نظم السلوک (المعروف تائیہ کبریٰ)۔

۲۔ ملا عبدالرزاق کاشانی کی منازل السائرین، ص ۱۹۸۔

نامی رسالے میں تمام عبادتوں خاص کر نماز کے آداب وشرائط کا مختصر تذکرہ کیا ہے۔[1]

دوسرا مقام: یہ مقام پہلے مقام کے مقابلے میں زیادہ مشکل ہے۔اس مقام میں عمل کی انجام دہی اور اطاعت کے بعد انسان بے لگام ہوتا ہے۔ یہاں نفس کو خبردار رہنا چاہئے کہ کہیں ظاہری وباطنی آداب وشرائط کے ساتھ بجالائی جانے والی عبادت یا اطاعت انسان کو بے لگام نہ کردے اور اسے عجب، تکبّر اور خود بینی وغیرہ میں مبتلا نہ کردے۔

بسا اوقات شیطان اور نفس امارہ انسان کو سالہا سال اعمال صالح، اخلاق حمیدہ اور پابندیٔ شریعت کی دعوت دیتے رہتے ہیں تاکہ اسے عجب، غرور اور خود بینی میں مبتلا کرے۔یوں انسان اپنی تمامتر ریاضتوں اور زحمتوں کے بعد سقوط ناکامی اور خسارے کا شکار ہوجائے۔ پس علمی وعملی غرور نیز خود پسندی اور خود بینی کی خصلت اور ایک مہلک بیماری ہے جو انسان کو سیاہ بختی اور ناکامی سے دوچار کرتی ہے۔

اگر آدمی مکمّل طور پر اپنے اوپر نظر نہ رکھے، نیز ایک ماہر طبیب یا دلسوز تیماردار کی طرح اپنا خیال نہ رکھے اور اپنے باطنی عیوب کی خبر نہ لے تو اس کے وہی اعمال وعبادات اور ظاہری اعمال صالح اس کو ہلاکت کے گھڑے میں ڈال دیں گے۔اپنے نفس کی مکمّل اور مسلسل اور غیر متزلزل حفاظت ونگہبانی ایک مشکل ترین کام ہے جس کیلئے اللہ سے مدد طلب کرنے اور اس کے ہاں پناہ لینے کی ضرورت ہے۔

اطاعت پر صبر کیلئے چھ سو درجات کا حامل ثواب ہے۔ ہر دو درجوں کا درمیانی فاصلہ زمین کی گہرائیوں سے لے کر عرش تک کے فاصلے کے برابر ہے۔

صبر کا یہ درجہ اس سے پہلے والے درجے کے مقابلے میں درجات کی تعداد کے لحاظ سے بھی بالاتر ہے اور درجات کی وسعت کے لحاظ سے بھی کیونکہ ہر درجے کی وسعت زمین کی گہرائیوں سے لے کر عرش تک ہے۔

اطاعت پر صبر کے مقامات اور بھی ہیں جن کا اس حدیث میں تذکرہ نہیں ہوا۔ یہ اس صورت میں ہے کہ ہم اطاعت کے دائرے کو وسیع تر کریں یہاں تک کہ وہ توحید کے اسرار وحقائق کو بھی شامل ہو۔اس صورت میں صبر کرنے والے کے ثواب کی درجہ بندی نہیں ہوسکے گی۔اس کے درجات کی وسعت اور تعداد کی کثرت کی

۱۔ دیکھئے، امام خمینیؒ کی آداب الصلاۃ، فصل اول، مقالہ اولیٰ۔

حد بندی کرنا بارگاہ خداوندی کے شایان شان نہیں۔ اس کا اجر اللہ کے ذمے ہوگا، بلکہ اس کا اجر خود اللہ ہوگا۔ چنانچہ ان لوگوں کے بارے میں مروی ہے کہ وہ جنت اور اس کی نعمتوں پر نظر نہ رکھیں۔[۱]

وہ قلب سلیم جس میں اللہ کے سوا کوئی نہ ہو وہ دوسری دنیا میں بھی غیر اللہ سے خالی ہوگا، کیونکہ آخرت صفات باطنی اور اسرار قلب کے ظہور کا مقام ہے۔

در ضمیر ما نمی گنجد بہ غیر از دوست کس   ہر دو عالم را بہ دشمن دہ کہ ما را دوست بس[۲]

شاید آیہ شریفہ: ﴿يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ☆ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَرْضِيَّةً ☆ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ☆ وَادْخُلِي جَنَّتِي﴾ ۔[۳] کا اشارہ بھی اس طرح کے افراد اور اولیاء کامل کی طرف ہو، کیونکہ اس آیت میں نفس مطمئنہ کے حامل انسان کو اس کے ربّ کی طرف لوٹنے کی دعوت دی جا رہی ہے۔ یہ ربّ اللہ تعالیٰ ہے اسماء کے رنگ کے بغیر۔ راضی اور مرضی ہونا، عاشق و معشوق کے جذبوں سے عبارت ہے جو اللہ کی طرف سفر کیلئے مرکب اور سواری کی حیثیت رکھتا ہے، نیز یہ اللہ کے بندوں کی صف میں شامل ہونے کا ثمرہ ہے۔ وہ بندے جو ہر قسم کے رنگوں سے بری اور حقیقی اخلاص سے آراستہ ہیں۔ اس کا ثمرہ اللہ کی ذات والی جنت میں دخول ہے جو لقاء اللہ کی جنت ہے۔

صبر کا تیسرا درجہ: یہ گناہوں پر صبر سے عبارت ہے۔ یہ اس طرح کہ انسان نفس اور شیطانی لشکروں کے ساتھ جہاد میں صبر و استقامت کا ثبوت دے اور اس استقامت و ثابت قدمی کے باعث ان پر غلبہ پالے۔ اس درجے کے مقامات، حقائق اور اسرار و دقائق بہت ہیں۔ اس درجے کے ہر مقام میں صبر کا مظاہرہ کرنا اطاعت پر صبر (دوسرے درجے) سے زیادہ مشکل اور زیادہ دقیق ہے، بلکہ اگر کوئی اس مرحلے (گناہوں پر صبر) سے گزر جائے تو اطاعت پر صبر کرنا اس کیلئے سہل و آسان ہو جائے گا۔ پس سالک راہ حق کیلئے سب سے اہم چیز گناہوں پر صبر کرنا ہے۔

۱۔ یہ اشارہ ہے ان احادیث کی طرف جن میں کہا گیا ہے کہ احرار کی عبادت کی بنیاد، محبت خداوندی ہے۔ اصول کافی، ج ۲، کتاب الایمان والکفر، باب العبادۃ، ص ۶۸، ح ۵؛ نیز، نہج البلاغہ، ص ۵۱۰، حکمت ۲۳۷۔

۲۔ دیوان حافظ شیرازیؒ، ص ۲۰۰۔

۳۔ اے اطمینان یافتہ نفس! تو اپنے ربّ کی طرف پلٹ آ، اس حالت میں کہ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی ہو، پس تو میرے بندوں میں داخل ہو جا اور میری جنت میں آ جا۔ سورہ فجر ۲۷ تا ۳۰۔

یاد رہے کہ جس طرح شہوت، غضب اور شیطنت کی قوت (جو ظاہری گناہوں کا سرچشمہ ہے) کے ساتھ مقابلہ کرنے میں صبر کا مظاہرہ کرنا سخت ترین کاموں میں سے ایک ہے اور اس صبر پر باقی رہنا ظاہری اطاعت سے زیادہ مشکل ہے اسی طرح نفس اور بڑے شیطان (جو قلبی اور باطنی گناہوں کا سرچشمہ ہیں) کے مقابلے میں ڈٹے رہنا بھی ایک مشکل ترین جہاد ہے، کیونکہ اس جہاد میں دونوں جہانوں کو خیرباد کہنا پڑتا ہے۔ اس جہاد میں سالک کو چاہیئے کہ اپنی پیشانی پر قدم رکھے اور ولایت مآبی کے مضبوط بازوؤں کے ذریعے انانیت کے بت کو کعبہ دل سے باہر پھینک دے اور اسے ریزہ ریزہ کردے تاکہ اخلاص کی حقیقتوں سے آشنا ہو اور خلوص کے اسرار سے ہمکنار ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ اللہ کی دستگیری اور توفیق یزدانی کے بغیر ممکن نہیں۔

گناہ پر صبر کے بدلے نوسو درجے ملیں گے۔ ایک درجے سے دوسرے درجے تک کا فاصلہ زمین کی گہرائیوں سے لیکر عرش کے آخری حصے تک کے فاصلے جتنا ہوگا۔ صبر کی اس قسم کا ثواب سابق قسم کے مقابلے میں درجات کی تعداد کے لحاظ سے بھی زیادہ ہوگا اور درجات کی وسعت کے لحاظ سے بھی، کیونکہ اس کا فاصلہ عرش کے آخری حصے تک ہوگا۔ گناہ پر صبر بعض ایسے حقائق اور سرایر کا حامل ہے جو مادی وجسمانی درجات اور وسعت سے ماوراء ہیں، بلکہ یہ خود صبر کی طرح روحانی مقامات اور معارف یزدانی سے مربوط ہوں گے۔

یہاں اس نکتے کا ذکر کرتے چلیں کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کی یوں توصیف کی ہے کہ: "اس کا پھیلاو آسمانوں اور زمین کے برابر ہے"۔[۱] جبکہ اس حدیث میں صبر کرنے والوں کے درجات کا ذکر ہوا ہے جن میں سے ایک درجے کی وسعت آسمانوں اور زمین سے زیادہ ہے۔

یہاں راقم کی نظر میں مسئلہ دو صورتوں سے خالی نہیں:

پہلی صورت: یہ کہ قرآن میں ذکر شدہ جنت سے مراد "اعمال کی جنت" ہو۔ اسی لئے فرمایا: ﴿أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ﴾[۲] دوسری آیت میں ارشاد ہے: ﴿أُعِدَّتْ لِلَّذِينَ آمَنُوا﴾[۳] ان دونوں میں ﴿أُعِدَّتْ﴾

۱۔ قرآن کہتا ہے: ﴿وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ﴾۔ سورۂ آل عمران ۱۳۳۔

۲۔ بہشت متقین کیلئے تیار کی گئی ہے۔ سورۂ آل عمران ۱۳۳۔

۳۔ بہشت تیار کی گئی ہے ایماں لانے والوں کیلئے۔ سورۂ حدید ۲۱۔

کہا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ تیار اور مہیا کیا جانا اعمال کی بہشت کے ساتھ مناسب ہے۔ جبکہ حدیث شریف میں ذکر شدہ درجات سے مراد اخلاق کی جنت کے درجات ہوں اس مناسبت سے کہ یہ درجات صبر کیلئے ہیں اور صبر کا تعلق اخلاق سے ہے اور اخلاق کی بہشت کی وسعت اتنی ہے جتنی متوسط مرتبے میں کمال انسان کی وسعت۔ جبکہ اس کی کوئی حد مذکورہ معیاروں کے مطابق معین نہیں کی جاسکتی۔

دوسری صورت: یہ کہ قرآن میں مذکور آسمانوں اور زمین سے مراد صرف جسمانی آسمان اور زمین نہ ہوں، بلکہ اس میں ارواح کے آسمان اور اشباح کی زمینیں بھی شامل ہوں جبکہ حدیث میں مذکور درجات سے مراد جسمانی بہشت کے درجات ہوں۔

تیسری فصل

صبر کے وہ مراتب جو اہل سلوک اور کُمّل اولیاء سے مخصوص ہیں

رُوِي أَنَّ شَابّاً مِنَ الْمُحِبِّينَ سَأَلَ الشِّبْلِي عَنِ الصَّبْرِ؛ فَقالَ: أيُّ الصَّبْرِ أشَدُّ؟ فَقالَ: الصَّبْرُ لِلّٰهِ. فَقالَ: لا. فَقالَ: الصَّبْرُ بِاللهِ. فَقالَ: لا. فَقالَ: الصَّبْرُ عَلَى اللهِ. فَقالَ: لا. فَقالَ: الصَّبْرُ فِي اللهِ. فَقالَ: لا. فَقالَ: الصَّبْرُ مَعَ اللهِ. فَقالَ: لا. فَقالَ: وَيْحَكَ فَأيٌّ؟ فَقالَ: الصَّبْرُ عَنِ اللهِ. فَشَهِقَ الشِّبْلِيُّ، فَخَرَّ مَغْشِيّاً عَلَيْهِ۔[۱]

یہاں ہم اجمالی طور پر ان مراتب کی شرح بیان کریں گے جو اس عبارت میں مذکور ہیں:

الصَّبْرُ لِلّٰه (اللہ کیلئے صبر): یہ ان سالکین کے ابتدائی مقامات میں سے ہے جو اپنے آپ سے اور اپنی نفسانی خواہشات سے جدا ہو چکے ہوں اور اللہ کی طرف ہجرت اختیار کر چکے ہوں۔ جدائی کی اس حالت میں وہ جو کچھ کریں وہ اپنے لئے نہیں، بلکہ حق کیلئے ہوگا۔ انسان جب تک نفسانیت کی قید میں بند ہوگا اس کی

۱۔ منقول ہے کہ ایک اہل محبت جوان نے شبلی سے صبر کے بارے میں سوال کیا اور کہا کہ کونسا صبر زیادہ سخت ہے؟ کیا اللہ کیلئے صبر؟ شبلی نے کہا نہیں۔ کہا: کیا اللہ کے ہمراہ صبر؟ کہا: نہیں۔ بولا: اللہ پر صبر؟ بولا: نہیں۔ کہا: اللہ میں صبر؟ کہا: نہیں۔ بولا: اللہ کے ساتھ صبر؟ کہا: نہیں۔ اس نے کہا: وای ہو تم پر! پھر کونسا صبر؟ جواب ملا: اللہ سے صبر۔ یہ سن کر شبلی نے چیخ ماری اور بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ (احیاء العلوم، ج ۴، ص ۸۰، فصل فی بیان دواء الصبر وما یستعان بہ علیہ؛ نیز، شرح منازل السائرین، ص ۲۰۲ و ۲۰۳، باب الصبر)۔

تمام حرکات وسکنات اور اعمال وعبادات خود اس کیلئے ہوں گی۔ وہ اللہ تعالیٰ، توحید اور اطاعت خداوندی کو بھی اپنے لئے ہی چاہے گا اور جب تک انسان نفس کی قید میں ہوگا اور اس کا سفر اپنے باطن کی طرف ہوگا وہ اللہ کی طرف ہجرت کرنے والوں میں سے نہیں ہوگا اور نہ سالک راہ حق کہلائے گا۔ اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو شہر کے اندر چکر لگاتا رہے۔ وہ شہر کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک جس قدر چلتا رہے مسافر نہیں کہلائے گا۔

پس جب تک نفس کے زندان اور انانیت کی زنجیر سے رہائی نہ ملے اللہ کی طرف سفر اور ہجرت کی نوبت نہیں آئے گی۔ اہل معرفت کے ہاں ایسے شخص کی تمام ریاضتیں باطل اور لغو ہیں۔ البتہ جب اس قید سے رہائی ملے تو وہ سالک راہ حق ہوگا اور اس مرحلے میں اس کا صبر خدا کیلئے ''الصبر للہ'' ہوگا۔

الصَّبرُ باللہ (اللہ کے ہمراہ صبر): اس کے دو مقام ہیں؛ ایک مقام سالک کیلئے ثابت ہے جبکہ دوسرا ارباب صَحو بعد المحو کیلئے۔

یہاں پہلا مقام مراد ہے۔ وہ یہ ہے کہ نفس کی قید سے نکلنے اور اللہ کی طرف ہجرت اختیار کرنے کے بعد سالک یہ مشاہدہ کرے کہ اس کی تمام حرکات وسکنات اللہ کی قوت اور طاقت کی مرہون منت ہیں اور اس کا اپنا عمل دخل کسی چیز میں نہیں ہے۔ پس وہ اپنی ہر چیز کی طرح اپنے صبر کو بھی اللہ ہی کی طرف سے سمجھتا ہے۔ اس مشاہدے سے مراد: اعتقاد یا برہان نہیں، بلکہ عینی مشاہدہ ہے، کیونکہ اعتقاد و برہان اہل حجاب سے مربوط ہیں۔

رہا دوسرا مقام جو اہل صَحو سے مربوط ہے تو اس کی نوبت تب آتی ہے جب سلوک کے مراحل طے ہو جائیں اور فنائے کلی اور محو مطلق کی منزل آجائے۔ اس کے بعد اللہ کے نظر کرم کی بدولت اسے دوبارہ اپنے دائرہ کار میں لوٹایا جاتا ہے تاکہ وہ بے چاروں کی مدد کرے۔ اس مرحلے میں اس کا وجود اور اس کے وجود سے مربوط صفات ومظاہر حقانی ہوتے ہیں اور اس کی تمام حرکات وسکنات اللہ کے ہمراہ (باللہ)، یعنی اس کے حقانی وجود کے ہمراہ انجام پاتی ہیں۔ پس وہ اس مقام میں عین اللہ (اللہ کی آنکھ) اذن اللہ (اللہ کا کان) اور ید اللہ (اللہ کا ہاتھ) ہے ﴿عَلِيٌّ عَيْنُ اللهِ وَأُذُنُ اللهِ وَيَدُ اللهِ﴾[1]

۱۔ امیر المومنین علیہ السلام کے فرمان کی طرف اشارہ ہے جس میں فرمایا: ﴿أَنَا عَيْنُ اللهِ، وَأَنَا يَدُ اللهِ، وَأَنَا جَنْبُ اللهِ، -->

الصَّبْرُ عَلَى الله: یہ مرحلہ تب آتا ہے جب الصبر باللہ کا دوسرا مقام کامل اور مستحکم ہو جائے۔ پس جب سالک اپنے آپ کو تمام تصرفات واختیارات سے عاری دیکھے اور تمام تصرفات اور فیصلوں کو اللہ کی طرف سے دیکھے، نیز اسے اپنے اور کائنات کے اندر اللہ کے علاوہ کسی کا عمل دخل اور تصرف نظر نہ آئے تو اب اس کا صبر ''الصبر علی اللہ'' ہو جائے گا، بلکہ وہ تمام مصیبتوں، آزمایشوں اور بلاؤں کو اسماء وصفات الٰہیہ کے جلوے سمجھے گا۔ پس جس طرح محجوب لوگ بلاؤں پر صبر کرتے ہیں یہ لوگ اللہ پر، نیز اسماء اور ذات کے آثار ومظاہر پر صبر کرتے ہیں۔

الصَّبْرُ في الله: یہ اہل حضور کا صبر ہے جو جمال اسمائی کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ پس وہ ان مشاہدات وجلوات میں جس قدر صبر کریں اور دل کو استہلال واضمحلال سے بچائیں یہ ''الصبر فی اللہ'' کہلائے گا۔

الصَّبْرُ مع الله: یہ جمال ذات کا مشاہدہ کرنے والوں کیلئے ہے جو مشاہدۂ جمال اسمائی سے گزر کر مشاہدۂ ذاتی تک پہنچ گئے ہوں۔ وہ ان مشاہدات وجلوات میں صبر اور ثابت قدمی دکھائیں یہ ''الصبر مع اللہ'' ہوگا۔ اس کے بعد استہلاک وفنا کا مقام ہے جس میں سالک، صبر اور سلوک کا نام ونشان بھی نہیں ہوتا۔

الصَّبْرُ عَنِ الله: یہ جمال محبوب کے مشتاق مگر اس جمال کے دیدار سے محجوب لوگوں کا صبر ہے جو اپنے وجود کے احاطے میں واپسی کے بعد صبر پر مجبور ہوتے ہیں، کیونکہ وہ جمیل مطلق کی اطاعت کی خاطر اس کے جمال سے محروم ومحجوب ہوتے ہیں۔ یہ صبر کا سب سے سخت مرحلہ ہے۔ شاید قول نبوی ؐ: ﴿مَا أُوذِيَ نَبِيٌّ مِثْلَ مَا أُوذِيتُ﴾ [۱] کا ایک معنی یہی، کیونکہ محبت اور عشق جس قدر شدید ہو اسی قدر جدائی پر صبر کرنا بھی زیادہ سخت ہوگا۔ چنانچہ علی علیہ السلام بھی فرماتے ہیں: ﴿وَهَبْنِي صَبَرْتُ عَلىٰ عَذابِكَ، فَكَيْفَ أَصْبِرُ عَلىٰ فِراقِكَ﴾ [۲] چونکہ ہم محجوب لوگوں کی دسترسی مقامات اولیاء کی بلند شاخوں تک رسائی سے

۷۔ ﴿وَأَنَا بَابُ اللهِ﴾۔ یعنی میں اللہ کی آنکھ، اس کا ہاتھ، پہلو اور دروازہ ہوں۔

اصول کافی، ج ۱، ص ۱۱۳، باب ۲۳، کتاب التوحید، ح ۸۔ اسی حدیث کی طرح کی ایک حدیث صدوق ؒ نے کتاب التوحید، ص ۶۴، باب ۲۲، ح ۱ میں نقل کیا ہے۔

۱۔ کسی نبی کو اتنی اذیت نہیں دی گئی جتنی مجھے۔ (بحار الانوار، ج ۳۹، ص ۵۶، باب ۷۳، ح ۱۵)۔

۲۔ پروردگارا! اگر میں تیرے عذاب پر صبر کر بھی لوں تو میں تیری جدائی پر کیسے صبر کروں؟
ملاحظہ ہو سید بن طاؤس ؒ کی اقبال الاعمال، ص ۷۰۸، دعائے کمیل ؒ۔

قاصر ہیں لہذا اس سے زیادہ زبان درازی جائز نہیں۔

چوتھی فصل

صبر عقل کا لشکر اور فطرت سلیم کا لازمہ، جبکہ بے تابی جہل کا لشکر اور فطرت محجوبہ کا لازمہ ھے

جمال وکمال سے محبت انسان کی اصلی اور خداداد فطرت میں شامل ہے۔ یہ اصلی فطرت خدا خواہ اور خدابین ہے۔ پس اللہ کی جانب سے اس پر آزمائشیں نازل ہوں (اگر چہ وہ طبعی طور پر ناگوار ہوں) وہ ان پر بے تابی کا اظہار نہیں کرتا۔ وہ اللہ کی فیصلوں پر اظہار بے چینی کو عیب سمجھتا ہے۔ جب فطرت نفسانی اور مادی حجابوں کے باعث محجوب ہو جائے، نیز خود بینی وخود پسندی کا غبار دل کے آئینے کو ڈھانپ لے تو انسان آفات ومشکلات پر بے چینی کا اظہار کرتا ہے اور دنیوی و مادی مرادوں کے پورا نہ ہونے پر بے صبری کا اظہار کرتا ہے۔

وہ روحانی انسان جو اپنی خداداد اصلی فطرت پر باقی ہو وہ ہر چیز میں صبر اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کرے گا اور بے لگام نہیں ہوگا۔ اس کی روحانی قوت مادی خواہشات پر غالب آئے گی۔ حادثات کے دوران اس کے اوسان خطا نہیں ہوں گے۔ چونکہ وہ دنیا اور نفس کی محبت سے آزاد ہے۔ اس لئے مادی اشیاء کے فقدان سے اس کے قدم نہیں ڈگمگائیں گے، کیونکہ ساری لغزشیں دنیا اور نفس کی محبت کا نتیجہ ہیں۔

تمام حجابوں کا سرچشمہ دنیا اور نفس کی محبت کا حجاب ہے۔ جن ظلمانی حجابوں کا ذکر حدیث شریف[1] میں ہوا ہے وہ دنیا اور نفس سے محبت کے وہی حجاب ہیں۔

پس جب فطرت (جو کمال مطلق کی عاشق ہے) نفس اور دنیا کے حجابوں سے محجوب ہو جائے تو اب وہ مادی اور نفسانی خواہشات میں کمال کو تلاش کرے گی اور ان کے فقدان پر بے تابی، بے چینی اور تزلزل کا ثبوت دے گی۔ اگر وہ اس محجوبیت سے باہر آجائے تو اب صرف وصال محبوب کا فقدان ہی اسے ناگوار گزرے گا۔ اب اس کی بے تابی صرف محبوب حقیقی کے فراق پر ہوگی۔ اس کیلئے مشکل ترین مسئلہ ''الصبر عن اللہ'' ہوگا۔ واللہ الہادی۔

۱۔ بحار الانوار، ج ۵۵، ص ۴۲ تا ۴۴، کتاب السماء والعالم، باب ۵، حدیث ۳، ۵، ۱۰، ۱۲۔

پانچویں فصل

صبر کے بارے میں بعض احادیث کا تذکرہ

کافی کی روایت ہے کہ حضرت امام صادق علیہ السلام نے فرمایا: ''جب قیامت کا دن آئے گا تو لوگوں کی ایک جماعت کھڑی ہوگی جنت کے دروازے پر آئے گی اور اسے کھٹکھٹائے گی۔ ان سے کہا جائے گا: تم کون ہو؟ وہ کہیں گے ہم صبر والے ہیں۔ ان سے کہا جائے گا: تم نے کس چیز پر صبر کیا ہے؟ وہ کہیں گے: ہم اللہ کی اطاعت پر صبر کرتے تھے اور اس کی معصیت پر صبر کرتے تھے۔ پس اللہ عز وجل فرمائے گا: انہوں نے سچ کہا ہے۔ ان کو جنت میں داخل کرو۔ یہ ہے اللہ کے قول: ﴿إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾[1]'' [2]

امیر المؤمنین علیہ السلام سے ہی مروی ہے: ''صبر دو طرح کے ہیں۔ ایک مصیبت پر صبر جو اچھا اور خوبصورت عمل ہے، لیکن اس سے بہتر ان چیزوں پر صبر کرنا ہے جو اللہ نے تم پر حرام کی ہیں'' [3]

حضرت امام باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: ''جب میرے والد علی بن الحسین کی وفات قریب ہوئی تو آپؑ نے مجھے اپنے سینے سے لگایا اور فرمایا: اے میرے بیٹے! میں تجھے اس بات کی وصیت کرتا ہوں جس کی وصیت مجھے میرے باپ نے اس وقت کی تھی جب آپؑ کا وقت وفات آیا، نیز اس چیز کی وصیت بھی جس کے بارے میں آپؑ نے فرمایا کہ: آپؑ کے والد نے آپ کو اس کی وصیت کی تھی۔ اے میرے بیٹے! حق پر صبر کر اگرچہ وہ تلخ ہی کیوں نہ ہو'' [4]

۱۔ بے تحقیق صبر والوں کو ان کا اجر بغیر کسی حساب کے پورا پورا دیا جائے گا۔ سورۂ زمر ۱۰۔

۲۔ متن حدیث یہ ہے: ﴿إذا كانَ يَومَ القِيامَةِ يَقُومُ عُنُقٌ مِنَ النّاسِ فَيَأتُونَ بابَ الجَنَّةِ فَيَضرِبُونَهُ. فَيُقالُ لَهُم: مَن أنتُم؟ فَيَقُولُونَ: نَحنُ أهلُ الصَّبرِ فَيُقالُ لَهُم: عَلىٰ ما صَبَرتُم؟ فَيَقُولُونَ: كُنّا نَصبِرُ عَلىٰ طاعَةِ اللهِ، وَنَصبِرُ عَن مَعاصِي اللهِ. فَيَقُولُ اللهُ۔ عَزَّوَجَلَّ۔ صَدَقُوا؛ أدخِلُوهُمُ الجَنَّةَ۔ وَهُوَ قَولُ اللهِ۔ عَزَّوَجَلَّ۔: إنَّما يُوَفَّى الصّابِرُونَ أجرَهُم بِغَيرِ حِسابٍ﴾۔ اصول کافی، ج۲، ص۶۰ الی ۶۱، باب الطاعۃ والتقویٰ، ح۴۔

۳۔ ﴿الصَّبرُ صَبرانِ: صَبرٌ عِندَ المُصِيبَةِ حَسَنٌ جَمِيلٌ، وَأحسَنُ مِن ذٰلِكَ الصَّبرُ عِندَ ما حَرَّمَ اللهُ۔ عَزَّوَجَلَّ۔ عَلَيكَ﴾۔ اصول کافی، ج۲، ص۷۴، ح۱۱۔

۴۔ ﴿لَمّا حَضَرَتْ أبي عَلِيَّ بنَ الحُسَينِ (علیهما السلام) الوَفاةُ ضَمَّنِي إلىٰ صَدرِهِ، وَقالَ:

<--

صبر اور جزع کا بیان / ۳۷۷

حضرت امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے: ''دنیا پر صبر کرو کہ یہ ایک گھڑی ہے۔ اس سے جو گزر چکا تم نہ اس کیلئے کوئی غم والم محسوس کرو گے نہ خوشی اور جو ابھی نہیں آیا اس کے بارے میں تمہیں خبر نہیں کہ وہ کیا ہے۔ جو کچھ ہے وہ یہی گھڑی ہے جس میں تم اب ہو۔ پس تم اس میں صبر کرو، اللہ کی اطاعت پر اور اس میں تم صبر کا مظاہرہ کرو، اللہ کی معصیت سے (بچنے میں)''۔[1]

ثواب الاعمال میں حضرت امام باقر علیہ السلام سے مروی ہے: ''میں اپنے اس غلام اور اپنے گھرانے سے اس امر پر صبر کرتا ہوں جو حنظل (یعنی تمہ: اندرائن کا پھل) سے زیادہ تلخ ہے۔ بہ تحقیق جو کوئی صبر کرے وہ اپنے صبر کی بدولت روزے کی حالت میں نماز پڑھنے والے کا درجہ پاتا ہے اور اس شہید کا درجہ پاتا ہے جس نے اپنی تلوار سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے (دشمن پر) ضرب لگائی ہو''۔[2]

نہج البلاغہ میں فرمایا: ﴿لا تـعـدم الصَّبُورُ الظَّفَرَ، وَاِنْ طَالَ بِهِ الزَّمانُ﴾[3] نیز فرمایا: ﴿مَن لَمْ يُنجِهِ الصَّبرُ أهلَكَهُ الجزعُ﴾[4]

اس موضوع پر اخبار و احادیث کی تعداد اتنی زیادہ ہے[5] کہ ان سب کے ذکر کی گنجائش اس مختصر کتاب میں نہیں ہے۔

ح۔ يا بُنَيَّ أوصيكَ بِما أوصاني بِهِ أبي حِينَ حَضَرَتْهُ الوَفاةُ، وَبِما ذَكَرَ أنَّ أباهُ أوصاهُ بِهِ، يا بُنَيَّ! اصْبِرْ عَلَى الحَقِّ وَإنْ كانَ مُرّاً﴾۔ اصول کافی، ج۲، ص۴۷، ح۱۳۔

۱۔ اِصْبِرُوا عَلَى الدُّنْيا فَإنَّما هِيَ ساعَةٌ فَما مَضىٰ مِنْهُ فَلا تَجِدُ لَهُ ألَماً وَلا سُرُوراً، وما لَمْ يَجِيءُ فَلا تَدْرِي ما هُوَ، وَإنَّما هِيَ ساعَتُكَ الَّتِي أنْتَ فِيها، فَاصْبِرْ فِيها عَلىٰ طاعَةِ اللهِ؛ وَاصْبِرْ فِيها عَنْ مَعْصِيَةِ اللهِ﴾۔

اصول کافی، ج۲، ص۳۲۸ و۳۲۹، ح۴۔

۲۔ ﴿إنّي لَأصْبِرُ مِنْ غُلامِي هٰذا وَمِنْ أهلِي عَلىٰ ما هُوَ أمَرُّ مِنَ الحَنْظَلِ، إنَّهُ مَنْ صَبَرَ نالَ بِصَبْرِهِ دَرَجَةَ الصّائِمِ القائِمِ وَدَرَجَةَ الشَّهِيدِ الَّذِي قَدْ ضَرَبَ بِسَيْفِهِ قُدّامَ مُحَمَّدٍ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم﴾۔

وسائل الشیعہ، ج ۱۵، ص ۲۶۳ و ۲۶۴، باب ۲۵، ابواب جہاد النفس، ح ۵؛ نیز شیخ صدوق کی ثواب الاعمال، ج۱، ص ۲۳۵، باب ثواب الصبر، ح۱۔

۳۔ بہت صبر کرنے والا کامیابی سے محروم نہیں ہوتا اگرچہ طویل عرصہ گزر جائے۔ نہج البلاغہ، ص۴۹۹، حکمت۱۵۳۔

۴۔ جسے صبر کامیابی نہ دے، بے تابی اور بے صبری اسے ہلاک کردے گی۔ نہج البلاغہ، ص۲۰۵، حکمت۱۸۹۔

۵۔ وسائل الشیعہ، ج۱۵، ص۲۶۱، باب استحباب الصبر فی جمیع الامور۔

"صفح" اور اس کی ضد "انتقام" کا بیان

یہ دو فصلوں پر مشتمل ہے:

پہلی فصل

درگزر کے فوائد اور انتقام کے نقصانات

انسان کے عظیم ترین کمالات میں سے ایک ان افراد سے درگزر کرنا ہے جو اس کے ساتھ بدی کریں۔ عفو اور درگزر کی صفت اللہ تعالیٰ کی جمالی صفات میں سے ایک ہے۔ اس صفت کا حامل ہونا مبادی عالیہ کی شباہت اختیار کرنے سے عبارت ہے۔ جو شخص ربّ العالمین کے ہاں تربیت حاصل کرے اس کے اندر اللہ کی صفت جمالی کا جلوہ نظر آنا چاہئے اور اسے جمیل مطلق کے جمال کا آئینہ ہونا چاہئے واضح ہے کہ اللہ کی عظیم ترین صفات میں سے ایک بندوں پر رحم کرنا اور ان کے گناہوں کو معاف کرنا ہے۔

اگر کسی انسان کے اندر ان اوصاف کا شائبہ بھی موجود نہ ہو تو جب نکیرین قبر میں اس سے یہ سوال کریں گے: ﴿مَنْ رَبُّکَ؟﴾ (تیرا ربّ کون ہے؟) تو اس کے جواب میں ﴿رَبِّي اللّٰهُ﴾[1] (میرا ربّ اللہ ہے) نہیں کہہ پائے گا۔ یاد رہے کہ یہ اسرار کے فاش ہونے کا وقت ہے۔ یہاں اللہ کے دیگر ناموں کو چھوڑ کر "ربّ" کے انتخاب کی وجہ شاید یہ پوچھنا ہو کہ تمہیں کس نے تربیت دی ہے اور دنیوی زندگی میں کس کا دست قدرت تیرے اندر کارفرما رہا ہے؟ پس اگر انسان نے ذات حق کی نگرانی میں تربیت حاصل کی ہو اور

۱۔ اشارہ ہے ان احادیث کی طرف جو قبر میں کافروں سے ہونے والے سوالات کو بیان کرتی ہے۔

بطور نمونہ دیکھئے، بحار الانوار، ج ۶ ص ۲۲۲، کتاب العدل والمعاد، باب احوال البرزخ والقبر (۸)، ح ۲۲۔

اس کا ظاہر و باطن اسی تربیت سے مستفیض ہوئے ہوں تو وہ جواب دے سکے گا وگرنہ وہ یا تو جوب ہی نہیں دے گا یا اگر جواب دے تو شاید ﴿رَبِّـيَ الشَّيْـطَـانَ﴾ (مجھے تربیت دینے والا شیطان ہے!) یا ﴿رَبِّـيَ النَّفْسُ الأَمَّـارَةُ﴾ (میرا مربی نفس امارہ ہے!) کہے گا۔

یاد رہے کہ عفو و درگزر کا مادہ اس وقت پیدا ہوگا جب انسان حبّ دنیا اور حبّ نفس سے دستبردار ہو جس طرح حبّ دنیا، حبّ نفس اور دنیوی خواہشات کی پیروی جذبہ انتقام اور جذبہ غضب کو جنم دیتے ہیں۔

ان عرائض سے یہ بات واضح ہوگئی کہ عفو و درگزر عقل و رحمان کا لشکر ہے اور فطرت مخمورہ کا لازمہ ہے، جبکہ اس کی ضد انتقام جہل و ابلیس کا لشکر اور فطرت محجوبہ کا لازمہ ہے، کیونکہ جو لوگ اپنی اصلی فطرت اور فطری روحانیت پر باقی ہوں وہ دنیا کی محبت اور نفس کی محبت سے آلودہ نہیں ہوتے اور حصول دنیا کی دوڑ یعنی تکالب (جو جذبہ درندگی کا خاصہ ہے) سے عاری اور مبرا ہوتے ہیں۔

رہے وہ لوگ جن کی فطرت مادی اور دنیوی پردوں کے باعث محجوب ہو چکی ہو وہ نفسانی مادی اور دنیوی خواہشات کے تابع ہوتے ہیں۔ اس لئے کتوں کی طرح اس مردار پر جھپٹتے اور ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوتے ہیں اور مادیت کی خاطر اپنی قوت غضبیہ کا استعمال کرتے ہیں، نیز جو ذرائع و وسائل اللہ نے اسے دنیا کے دام سے نکلنے کی خاطر عطا کئے ہیں وہ انہی وسائل کے باعث دنیا کے دام میں مبتلا ہوتے ہیں، اللہ کی امانتوں اور نعمتوں میں خیانت کرتے ہیں اور نفس امارہ کا ناپاک ہاتھ ان کی طرف دراز ہوتا ہے۔

دوسری فصل

عفو و درگزر کے بارے میں بعض احادیث

کافی میں امام صادقؑ رسول اکرمؐ سے نقل فرماتے ہیں: ﴿عَلَيْكُمْ بِالْعَفْوِ فَإِنَّ الْعَفْوَ لَا يَزِيدُ الْعَبْدَ إِلَّا عِزّاً، فَتَعَافَوْا يُعِزَّكُمُ اللّهُ﴾[۱]

نیز حضرت امام باقرؑ سے مروی ہے: ''عفو پر ندامت زیادہ بہتر اور زیادہ آسان ہے عقوبت اور سزا پر

۱۔ تم پر لازم ہے کہ عفو سے کام لو، کیونکہ عفو بندے کی عزت میں اضافہ کرتی ہے۔ پس ایک دوسرے سے درگزر کرو تا کہ اللہ تمہیں عزت دے۔

اصول کافی، ج ۲، ص ۸۸، باب العفو، ح ۵۔

ندامت کے مقابلے میں''۔۱

نہج البلاغہ میں امیر المؤمنین علیہ السلام سے مروی ہے: ''جب اپنے دشمن پر غلبہ پاؤ تو اس غلبے کے شکرانے کے طور پر اسے معاف کر دو''۔۲

نیز فرمایا: ﴿أَولَی النّاسِ بِالْعَفْوِ أَقْدَرُهُمْ عَلَی الْعُقُوبَةِ﴾۔۳

کافی میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک خطبہ میں فرمایا:

﴿ألا أخبِرُکُم بِخَیرِ خَلائِقِ الدُّنیا وَالآخِرَةِ؟ العَفوُ عَمَّن ظَلَمَکَ، وَتَصِلُ ۴ مَنْ قَطَعَکَ، وَالاِحْسانُ اِلیٰ مَنْ أساءَ اِلَیْکَ وَاِعْطاءُ مَنْ حَرَمَکَ﴾۔۵

محمد بن علی ابن الحسین، امیر المؤمنین علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ؑ نے محمد بن حنفیہ سے اپنی نصائح میں فرمایا: ﴿لا یَکُونَنَّ أخوکَ عَلیٰ قَطِیعَتِکَ أقْویٰ مِنکَ عَلیٰ صِلَتِهِ، وَلا عَلَی الاِسائَةِ اِلَیْکَ أقْدَرُ مِنکَ عَلَی الاِحْسانِ اِلَیْهِ﴾۔۶

ظلم کرنے والے کو بخشنے اور غصے کو پی جانے کے بارے میں احادیث زیادہ ہیں۔۷ ان میں سے

۱۔ ﴿النَّدامَةُ عَلَی العَفوِ أفضَلُ وَأیسَرُ مِنَ النَّدامَةِ عَلَی العُقُوبَةِ﴾۔ اصول کافی، ج۲، ص۸۸، ح۶۔

۲۔ ﴿اِذا قَدَرْتَ عَلیٰ عَدُوِّکَ فَاجْعَلِ العَفوَ شُکراً لِلْقُدْرَةِ علیه﴾۔ نہج البلاغہ، ص۴۷۰، حکمت ۱۱۔

۳۔ عفو و درگزر کرنے کا سب سے سزاوار وہ شخص ہے جو سزا دینے پر سب سے زیادہ قادر ہو۔
نہج البلاغہ، ص۴۷۸، حکمت ۵۲۔

۴۔ بظاہر '' تَصِلُ '' کی جگہ '' صِلَة '' درست ہے۔ (امام خمینیؒ)۔

۵۔ کیا میں تمہیں دنیا و آخرت کی سب سے بہترین مخلوق کی خبر نہ دوں؟ (اس شخص کی نشانی یہ ہے) کہ تم اس شخص کو بخش دو جو تم پر ظلم کرے اور اس شخص سے رابطہ استوار کرو جو تم سے رابطہ قطع کرے اور اس شخص سے نیکی کرو جو تم سے برائی کرے اور اسے عطا کرو جو تجھے محروم کر دے۔ (اصول کافی، ج۲، ص۸۷، باب العفو، ح۱)۔

۶۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تیرا بھائی تجھ سے قطع رابطہ کرنے میں تجھ سے زیادہ قوی ہو لیکن تو اس سے رابطہ استوار کرنے اور اس سے نیکی کرنے میں (اس کی قطع رحمی سے) اس سے زیادہ ضعیف ہو۔ اسی طرح کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تیرے ساتھ برا سلوک کرنے میں قوی تر ہو لیکن تو اس کے ساتھ نیکی کرنے میں اس سے زیادہ کمزور ہو۔
من لا یحضرہ الفقیہ، ج۴، ص۲۷۹ الی ۲۸۰، ح۱۰۔

۷۔ دیکھئے، اصول کافی، ج۲، ص۸۷، باب العفو؛ نیز ص۸۹، باب کظم الغیظ؛ نیز وسائل الشیعہ، ج۱۲، ←

ایک حدیث غصے کو پی جانے کے بارے میں جو کافی شریف میں امام سجاد علیہ السلام سے مروی ہے، یہ ہے:

قالَ رَسُولُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: ﴿مِنْ أحَبِّ السَّبِيلِ اِلَى اللهِ-عَزَّوَجَلَّ- جُرْعَتَانِ: جُرْعَةُ غَيْظٍ تَرُدُّها بِحِلْمٍ، وَجُرْعَةُ مُصِيبَةٍ تَرُدُّها بِصَبْرٍ﴾ ۱

کافی میں امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ فرمایا: ”جو شخص اپنے غصے کو اس وقت پی جائے جب وہ اسے عملی جامہ پہنانے پر قادر ہو تو اللہ اس کے دل کو قیامت کے دن امن وسکون اور ایمان سے بھر دے گا“ ۲

محمد بن علی ابن الحسین سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ﴿مَنْ يَكْظِمِ الغَيْظَ يَأجُرُهُ اللهُ وَمَنْ يَصْبِرُ عَلَى الرَّزِيَّةِ يُعَوِّضُهُ اللهُ﴾ ۳

من لایحضرہ الفقیہ میں امیر المومنین علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

﴿ يٰا عَلِيُّ! أوْصِيكَ بِوَصِيَّةٍ فَاحْفَظْها، فَلا تَزالُ بَخَيْرٍ ما حَفَظْتَ وَصِيَّتِي. يٰا عَلِيُّ ! مَنْ كَظَمَ غَيْظاً وَهُوَ يَقْدِرُ عَلىٰ اِمْضٰائِهِ، أعْقَبَهُ اللهُ أمْناً وَاِيْماناً يَجِدُ طَعْمَهُ . . . ﴾ ۴

<-- باب ۱۱۴و۱۱۵، ابواب احکام العشرۃ۔

۱۔ رسول اللہ ؐ نے فرمایا: اللہ کی طرف لے جانے والے راستوں میں سب سے پسندیدہ دو گھونٹ ہیں: ایک غصے کا وہ گھونٹ جسے تم حلم وبردباری کے ذریعے پی جاؤ اور دوسرا مصیبت کا وہ گھونٹ جسے صبر کے ساتھ پی جاؤ۔

اصول کافی، ج ۲، ص ۹۰، باب کظم الغیظ، ح ۹۔

۲۔ ﴿مَنْ كَظَمَ غَيْظاً وَهُوَ يَقْدِرُ عَلىٰ اِمْضٰائِهِ، حَشَا اللهُ قَلْبَهُ أمْناً وَاِيْماناً يَومَ القِيٰامَةِ﴾۔

اصول کافی، ج ۲، ص ۹۰، باب کظم الغیظ، حدیث ۷۔

۳۔ جو غصے کو پی جائے اللہ اسے اجر دیتا ہے اور جو مصیبت پر صبر کرے اللہ اسے جزا دیتا ہے۔

من لایحضرہ الفقیہ، ج ۴، ص ۲۷۲، حدیث ۸۲۸۔

۴۔ اے علی! میں تمہیں ایک نصیحت کرتا ہوں، پس اسے یاد رکھو۔ جب تک تم میری وصیت کو یاد رکھو گے ہمیشہ خیر وخوبی کے ہمراہ رہو گے۔ اے علی! جو شخص اپنے غصے پر عملدرآمد پر قادر ہونے کے باوجود اسے پی جائے اللہ تعالیٰ امن اور ایمان کے ذریعے اسے جزا دے گا اور وہ اس کا مزہ چکھے گا۔

من لایحضرہ الفقیہ، ج ۴، ص ۲۵۴، حدیث ۸۲۱۔

اس حدیث کی شرح کی موجودہ جلد کو ہم یہیں ختم کرتے ہیں۔ حدیث کے باقی ماندہ حصے کی شرح ہم انشاءاللہ دوسری جلد میں کریں گے[1]۔

خداوند تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ہمیں عقل کے لشکروں سے آراستہ اور ملحق ہونے، نیز جہل اور شیطان کے لشکروں سے اجتناب اور دوری کی توفیق عطا فرمائے۔

والحمدلله أولاً وآخراً وظاهراً وباطناً

۲ رمضان المبارک ۱۳۶۳ کو محلات نامی قصبے میں یہ جلد مکمّل ہوئی
یہ ان دنوں کی بات ہے جب قم کی گرمی سے بچنے کیلئے میں وہاں چلا گیا تھا

والسلام

بحمداللہ تمّ

۱۔ افسوس کہ اپنی خواہش کے باوجود حضرت امام خمینی'' دوسری جلد نہیں لکھ سکے۔ (مترجم)

فہرست

(وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین)

(التماس دعا)